07
چینی، نکتہ چینی
مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں؟

14
رقصِ ابلیس
ڈاکٹر سلیم عادل
دل تھام لینے والی ساعتوں سے لبریز
ایک شعلہ و شبنم کہانی کے اتار چڑھاؤ

65
دور کی آواز
تمکین رضا
ڈاکٹر اور مریض کی
ملاقاتوں کا پریشان کُن احوال

71
قصۂ جدید
منظر امام
قارئین کے لیے منفرد
ذائقے کی ایک یادگار کہانی

79
جال
تنویر ریاض
ماں اور بیٹے کی محبت میں لالچ
کی دراڑ ڈالنے والے مجرم کا قصہ

90
انگارے
طاہر جاوید مغل
سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

131
قاتل تکون
محمد یاسر اعوان
سفاک قاتلوں کی تکون...... جو
مفاد کی ڈور سے بندھے تھے

146
دامِ صیاد
سلیم انور
اپنے ہی جال میں الجھ کر گر
جانے والے۔ صیاد کا دل دوز انجام

جاسوسی ڈائجسٹ

MEMBER APNS
CPNE

جلد 47 • شمارہ 09 • ستمبر 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خطوکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

20
کھوٹ
تنویر واسطی
فراڈ سے باز نہ آنے والوں کا المیہ......

149
پہچان
جمال دستی
اپنی ذات کے اسرار کھوج لینے والے فوجی کا ماجرا......

160
آوارہ گرد
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

195
پرستار
سیرینا راض
جرم کی انوکھی کہانیوں میں سے ایک منفرد سوغات

218
وہ ایک لمحہ
ارشد بیگ
درندہ صفت سفاک شخص کا ایک یادگار پل......

221
سویرا
سرور اکرام
دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی اثر انگیز داستان

229
لہو کا کھیل
روبینہ رشید
معاشرے کے ان سیاہ چہروں کے گھناؤنے عکس جو زندگی کو دھندلا رہے تھے

258
خود کردہ را
سید شکیل کاظمی
چند ایسے کرداروں کی کہانی جو ہماری حقیقی زندگی سے مستعار لیے گئے ہیں

مدیرِ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: لبنیٰ خیال

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من......السلام علیکم......!

ستمبر کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ مہینا دفاعِ پاکستان کے حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ابلاغ بلکہ عرفِ عام میں قارئین اور ناظرین تک خبر پہنچانے کے ذرائع ہمیشہ بہت اہم رہے ہیں۔ زمانہ قدیم میں نامہ بر اور تاجروں کے قافلے چلتے تھے تو مہینوں اور بعض اوقات سالوں بعد ایک کونے کی خبر دوسرے کونے تک پہنچتی تھی اور وہ بھی راویوں کی رنگ آمیزی کے ساتھ۔ آج یہ سب بدل چکا ہے۔ ہر خبر آنِ واحد میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ خبر کی کمی بیشی کو آج کا سوشل میڈیا بے نقاب کر دیتا ہے۔ پاکستان میں میڈیا بڑی حد تک آزاد ہے مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ مقابلے اور ریٹنگ کے چکر میں کم و بیش ہر سو سنسنی خیزی نظر آتی ہے۔ یوں بھی ہو رہا ہے کہ ذاتی خواہشات کو خبر بلکہ بریکنگ نیوز کا عنوان دے کر اسکرین پر چوپالیس جمالی جاتی ہیں۔ چٹ پٹی اور سنسنی خیز خبروں کی اس بھیڑ میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ اصل میں ہو کیا رہا ہے۔ عبدالستار ایدھی مرحوم، چھیپا صاحب، مادام رتھ فاؤ اور مدر ٹریسا جیسے لوگوں کا ذکر خال خال ہی سننے میں آتا ہے۔ اداکاروں کے نجی جھگڑے، کھلاڑیوں کے خانگی معاملات، فلموں کے ٹریلر، رہنماؤں کی ایک دوسرے پر دشنام طرازی حقیقی خبروں کو نہایت غیر محسوس طریقے سے نگل جاتی ہے۔ کراچی جیسے شہر میں بڑی خبر یہ ہونی چاہیے تھی کہ نیو کراچی میں ایک نیک دل خاتون قطعی غیر سرکاری وسائل سے ایک ایسا ہوٹل چلا رہی ہے جہاں مزدوروں اور غربا کو صرف چھ روپے، جی ہاں چھ روپے میں دو روٹیاں اور دال یا سالن شکم پُری کے لیے فراہم کیا جا رہا ہے جبکہ شہر میں ایک روٹی ہی دس روپے میں ملتی ہے۔ اس ضمن میں سیلانی، عالم گیر اور دیگر رفاہی اور خیراتی ادارے بھی ملک بھر میں انفرادی اور اجتماعی طور پر جانفشانی سے کام کر رہے ہیں لیکن نجی سطح پر سستے ترین ہوٹل کا قیام یقیناً ایسا اقدام ہے جو دوسرے صاحبِ حیثیت لوگوں کو بھی اس کارِ خیر کی ترغیب دیتا ہے۔ ابلاغِ عامہ کے جملہ ذرائع پر خبر رسانی اور تفریحات کی فراہمی کے ساتھ معاشرے کی تربیت کی بھاری ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔ ریٹنگ کے فریبِ حسن سے نکل کر اچھے کاموں کی موزوں تشہیر اس تربیت میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے۔ ”کاروبار“ کے ساتھ اس پہلو پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ اور اب وہاں چلتے ہیں جہاں پرچے کی ہر سطر پر گہری نظر رکھی جاتی ہے۔

لاہور سے **اشفاق شاہین** کی دلچسپ باتیں ”جاسوسی حسبِ معمول بروقت مل گیا۔ سگریٹ نوش شخص حسینۂ سرورق کے خیالوں میں گم تھا جبکہ حسینہ کسی سوچ میں گم تھی۔ 14 اگست کے حوالے سے قومی پرچم سے بھی سرورق چمک رہا تھا۔ چینی نکتہ چینی پہنچے۔ کوثر اسلام ابتدائی صفحے پر براجمان تھے۔ اپنا خط تلاش کیا نہ ملا، اتنی محبت سے لکھا تھا جانے کس دیس چلا گیا، سعدیہ قادری، طلعت سعود، ایمانے زارا شاہ، انیلہ ظفر، وصلی برادران، رانا بشیر، حفصہ طارق کے خطوط چینی نکتہ چینی کا خاصہ تھے۔ شاہد ذوالفقار، نوار گل، آصف محمود، ادریس خاں، دشتِ دل، محمد اقبال اور صفدر معاویہ کے خوب صورت نامے بھی محفل کی رونق بڑھانے میں پیش پیش تھے، انجم فاروق ساحلی کی عنایت مختصر سی تھی اور انور یوسف صاحب مرحومہ کے لیے تہِ دل سے نیک دعائیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے چلتے ہیں تبصرے کی طرف سب سے پہلے انگارے کی طرف لپکے، تاجور کو سیف کا دکھ سہنا پڑا۔ حاذق ذکری کی انٹری ہوئی، شاہ زیب انتہائی بیماری میں بھی سر دھڑ کی بازی لگا کر وہاں کے باشندوں کی مسیحائی کے لیے ڈی پیلس پر چڑھائی کے لیے کوشاں، بہت دلچسپ قسط رہی۔ آوارہ گرد پر پہنچے۔ پریل زندہ مل گیا کتوں سے بچتے بچتے لیکن ایک اور حملے میں وہ دلیر بھی جانبر نہ ہو سکا۔ شاہنواز کی حویلی پر حملے کے بجائے تھانے پر حملہ مہنگا پڑا، اول خیر اور کبیل داداتو مل گئے۔ پریل جان سے گیا، اچھی بات یہ ہوئی کہ شہزی محب وطن دوستوں کے ہاتھ لگ گیا، جن کو اس نے مطمئن کر دیا، حویلی پر دوبارہ ریڈ بھی ناکام رہا اور اب دوبارہ وہ حویلی کی بھول بھلیوں میں گم، جانے اب کیسا نکل پاتا وہ شکنجے سے، دوراستے، کبیر عباسی صاحب نے خوب لکھی۔ کئی باتیں سر سے گزر گئیں چونکہ 2040 کا سن تھا اس لیے کیا پتا کہ واقعی اتنی یا اس سے زیادہ ترقی ہو جائے، حالاتِ حاضرہ کو مدِنظر رکھ کر سیاسی اتار چڑھاؤ کو احسن طریقے سے دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ سرورق کی پہلی کہانی اسما قادری کی ظالم مظلوم زبردست اور بہترین تحریر تھی۔ توقیر نے بہن کی زندگی کو سنوارتے سنوارتے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا لیا۔ عورت وفا کی مورتی ہے جو ثابت بھی ہو گیا۔ امجد جاوید بھی جاسوسی میں سرورق کی تحریر کے ساتھ تشریف لائے، بہت خوشی ہوئی‘ مایا دیوی کا کردار افسانوی سا لگا اور نارائن کا کردار بھی زبردست رہا افسوس کہ نارائن سمیتا کو نہ پہچان پایا بہرحال تحریر نے مزہ دیا، بہترین اور مختصر کہانیوں میں بڑا کھلاڑی بائی عمران قریشی اور مہتاب خاں کی فیصلہ پسند آئیں۔“

اسلام آباد سے **انور یوسف زئی** کی تبصرہ نگاری ”جاسوسی اس بار 29 تاریخ کو بذریعہ ڈاک مل گیا تھا۔ اپنے پرانے تبصرے ہی کو شاملِ اشاعت کرنے کا شکریہ۔ اور ادارے کا میری اہلیہ کی وفات پر تعزیت اور دعائے مغفرت کا بھی شکریہ۔ محفل میں اب زیادہ تر نئے لکھنے والے آ گئے ہیں۔ ہمایوں سعید، ماہا ایمان اور وڈے شاہ جی تو اب قصۂ پارینہ بن چکے۔ الف لیلیٰ کی طرز کے طویل تبصرے والی بی بی طاہرہ گلزار اس بار غائب تھیں۔ انہوں نے کسی رسالے میں لکھا تھا کہ تعطیلات گزارنے کو مری میں ہیں گویا فرصت ہی فرصت پھر بھی تبصرہ نہیں؟ ماشاءاللہ محفل کے ساتھی زویا اعجاز اور کبیر عباسی تو اب ترقی کر کے مصنفین کی صف میں آ گئے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ میں اپنی ہم شہری سیدہ ایمانے زارا شاہ سے متفق ہوں کہ تعطیلات میں اسلام آباد ویران ہو جاتا ہے گو کہ آج کل سیاسی ماحول سے خوب گرما گرمی ہے۔ اللہ کے فضل سے بارشیں بھی خوب ہو رہی ہیں۔ اس شمارے کی پہلی کہانی کبیر عباسی کی دوراستے بس ٹھیک ہی تھی کہ یومِ آزادی کی تقریبات پر واحد کہانی تھی۔ ابھی عباسی صاحب کو کہانی لکھنے کے لیے مزید محنت درکار ہے۔

سرورق کی دونوں کہانیاں مظلوم اور خنجر بکف اس ماہ کی بہترین کہانیاں تھیں۔ منظر امام کی کوہ ندا بھی لطف دے گئی۔ بدیسی کہانیوں میں تنویر ریاض کی آتش زن اچھی تھی۔ اس ماہ کارٹون کی بہتات تھی اور بہترین تھے۔ سلسلے وار کہانی انگارے کی اس بار قسط طویل اور مار کٹائی سے بھرپور تھی۔ دیکھیں شاہ زیب، تاجور کو لے کر کب یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ دوسری کہانی آوارہ گرد میں شہزی ڈاکوؤں کے بعد اب رینجرز فورس کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور وہاں سے بھی فرار ہو کر شاہ نواز کی حویلی پہنچ چکا ہے۔"

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی گیلی گیلی باتیں "اس بار ذاکر صاحب نے سرخی مائل ٹائٹل دیا اور باقی رنگوں سے اجتناب کیا۔ سبز حروف خوب بھلے معلوم ہوئے۔ جن قارئین نے تجربے کی ذہانت کو سراہا، ان کا بے حد مشکور ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جاسوسی ڈائجسٹ نے کہانیوں کے سب سے زیادہ متنوع زاویے شائع کیے۔ فیصلہ اور اندھی سازش اس ماہ کی بہترین کہانیاں تھیں۔ فہرست کافی جاذب نظر تھی۔ انگارے اور آوارہ گرد کامیابی کے جھنڈے گاڑتی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ کوہِ ندا کا اختتام خوب تھا۔ دوسرا چہرہ، آتش زن، بڑا کھلاڑی بھی خوب تھیں۔ دوراستے کافی منفرد کاوش ہے۔ آخری دونوں رنگ ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ ہر رات قتل بھیج رکھی ہے، ایک نئی ترجمہ کہانی لمحوں کا کھیل مکمل ہو رہی ہے، جلد ہی روانہ کر دی جائے گی۔" (جی بے حد شکریہ!)

بھکر سے قدیر شاہ کی پہلی دفعہ آمد "ماہ اگست کا جاسوسی ایک دن کی تاخیر کے ساتھ 30 کو ملا۔ یومِ آزادی کے حوالے سے سجا سرورق پسند آیا۔ ہاتھوں میں دبی سگریٹ اور سوچوں میں یلغار لیے آدمی پر نظریں بے ساختہ ٹھہر گئیں، لڑکی البتہ پسند نہیں آئی۔ چینی نکتہ چینی کا مطلب ہے میٹھی میٹھی باتیں مگر یہاں اکثر لوگ لگتا ہے کونین کی گولیاں چبا کر آتے ہیں۔ صوابی کی کوثر اسلام پہلے نمبر پر تھیں، مبارک باد قبول کریں ویسے دوشیزہ ہونے کے باوجود دوشیزاؤں سے الفت نہیں یہ تو کمال ہو گیا۔ سعدیہ قادری کا تفصیلی تبصرہ سراہے جانے کے قابل تھا۔ ایمانے زارا شاہ اور طلعت مسعود نے خوب نکتہ چینی کی۔ انیلہ ظفر کا تیز ترین تبصرہ سر سے گزر گیا۔ نوارگل کا تبصرہ بہت پسند آیا باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں ابتدا انگارے سے کی لیکن معذرت کہانی بور کر رہی ہے۔ تاجور اور شاہ زیب پنڈولم کی طرح گھوم رہے ہیں۔ آوارہ گرد بھی تیزی رفتاری سے جاری ہے، شہزی کے ایکشن پسند آتے ہیں، عابدہ کی رہائی کب ہو گی، نوشانہ اور شہزی کا ٹکراؤ کیا رنگ لائے گا۔ کبیر عباسی جاسوسی کی فہرست میں اچھا اضافہ ہیں۔ دوراستے کہانی کا مضبوط پلاٹ اور الفاظ کا چناؤ بہترین تھا۔ وارث علی و عالیہ جیسے لوگ ہمارے ملک کا فخر ہیں۔ پہلا رنگ اسما قادری کے قلم کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ نائلہ بے وفا ہو کر بھی وفادار بن گئی۔ علی کی موت پر بہت رنج ہوا، امجد جاوید کچھ خاص متاثر نہیں کر پائے۔ چھوٹی کہانیوں میں مہتاب خان کی کہانی اچھی تھی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ پہلی دفعہ خط لکھنے کی جسارت کی ہے، امید ہے جگہ ملے گی۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی اداسی "زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر اور مسافر ایک جگہ رکتا نہیں۔ جاسوسی سے ہمیں بہت محبت ہے اس بات کا آپ کو اندازہ ہو گا۔ 2010ء سے 2017ء تک جاسوسی کا ہمارا ساتھ رہا تو سوچا الوداعی خط تو لکھنا چاہیے۔ 31 جولائی کو مری سے واپسی پر جاسوسی خریدا، حسینہ ہمیں اداس نظروں سے کہہ رہی تھی۔ "ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر" سگریٹ سے مجھے سخت چڑ ہے اس لیے اسد عباس کو میں نے نظر انداز کر دیا۔ کوثر اسلام کا جامع اور عمدہ تبصرہ تھا۔ سعدیہ قادری کی امیدوں کو امید سے دیکھ کر طلعت مسعود کے مشوروں کو دماغ میں بٹھا کر ایمانے زارا کی تنقید کو مثبت انداز میں حلق سے اتار کر شاہد ذوالفقار کے پراٹھوں کی داستان بغور سنی۔ انیلہ ظفر کے تبصرے پر گہری نظر ڈال کر نوارگل، آصف محمود سے سلام دعا کے بعد رانا بشیر احمد کی محبت پر پیار آنے لگا باقی سب کی تجزیہ نگاری خوب رہی۔ انگارے میں حد سے زیادہ ایکشن کہانی کو متاثر کر رہا ہے۔ شاہ زیب کا تاجور کو فلمی انداز میں سیف کی موت کی اطلاع فراہم کرنا بالکل متاثر نہ کر پایا۔ پال کی وفاداری شاہ زیب کو مشکل سے نکالنے میں مدد کر سکتی ہے۔ عبدالرب بھٹی کہانی کو دلچسپی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ نوشابہ کی دشمنی شہزی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ابتدائی صفحات پر مصنف اپنی جگہ خود بنا لیتا ہے۔ سیاست اور ملکی حالات کی خرابی کا حال بیان کرتی کہانی نے متاثر کیا۔ اسما قادری نے نائلہ کو سزا نہیں دی یعنی وہ ظالم تو تھی مظلوم بھی ٹھہری۔ امجد جاوید بھی اچھا لکھتے ہیں۔ کافی عرصے کے بعد ان کی کوئی تحریر پڑھی۔ نارائن پر ترس آیا، خالی ہاتھ رہ گیا۔ بڑا کھلاڑی، اندھی سازش، کوہِ ندا نے کچھ کچھ مزہ دیا۔ جب آپ کو میرا یہ خط ملے گا شاید میں آپ کے شہر کراچی میں ہوں اور مجھے آرمی میں از کلرک جاب مل گئی ہے۔ میں بہت اداس بھی ہوں، خط لکھتے وقت آنسو بھی چھلکے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کو کچھ عرصے کے لیے الوداع کہنا ہے۔" (الوداع کیوں کہنا ہے) امید تو نہیں ہے کوئی یاد رکھے گا پھر بھی درخواست ہے، مجھے آپ سب سے پیار ہے۔ دعا کہ میں کامیاب رہوں اور خط پورا شامل کیجیے گا آخری خط اپنے محبوب ڈائجسٹ کے لیے۔"

درابن کلاں ڈی آئی خان سے شاہد رزاق خان کا آغازِ محبت "ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکا تو ہمیں دسویں جماعت سے لگا تھا جو آج بی اے کے پیپر دینے کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔ ہر ماہ ڈائجسٹ خریدنا اور پھر اگلے ماہ کا بے صبری سے انتظار کرنا اس کا اپنا ہی مزہ ہے۔ مجھے تبصرہ لکھنا تو نہیں آتا مگر کوشش ضرور کر رہا ہوں بقول شاعر...... ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ سو ہم نے بھی کاغذ قلم سنبھال کر تبصرہ لکھنے کی ٹھان لی ہے۔ ٹائٹل مجھے ہمیشہ سے منفرد لگتے ہیں۔ ہر دفعہ الگ اسٹائل البتہ ہر مرتبہ سرورق کی دوشیزہ کا انداز ملتا جلتا ہے، تبصروں کی محفل میں پرانے تبصرہ نگاروں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے جن میں تصویر العین، بلقیس خان، بابر عباس، قاسم رحمان، زویا اعجاز اور بھی بہت سے ہیں ویسے یہ جو زویا اعجاز کہانیاں لکھتی ہیں کہیں وہی تبصرہ نگار تو نہیں ہیں۔ (بالکل، یہ وہی زویا ہیں) میں جاسوسی کی ابتدا اولین کہانی سے ہی کرتا ہوں ترتیب وار چلنا اچھا لگتا ہے۔ دوراستے ایک بہترین اور مکمل گرفت میں جکڑنے والی کہانی۔ ملکی حالات کی بہترین عکاسی اور سب مسائل کا بہترین حل۔ واقعی نظام کی تبدیلی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مصنف کبیر عباسی نیا نام بہتر کام، شاندار کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ تمکین رضا للکار کے ساتھ اچھی رہیں۔ شرمین کی ذہانت پر رشک آیا۔ بے قصور عکس فاطمہ کی کہانی پسند نہیں آئی مجھے۔

جولیس کا کردار پسند آیا۔ تنویر ریاض کے سودا نے تو گھما کے رکھ دیا۔ بوبی تو نہایت بے وقوف نکلا ایک عورت سے دھوکا کھا گیا۔ منظر امام کی کہانیاں بہت دکھی ہوتی ہیں اس لیے نظر بچا کر انگارے کی طرف بڑھے۔ ابراہیم اور زینب کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ انیق بھی غائب تھا۔ کہانی کچھ پھیکی ہوتی جارہی ہے۔ خیر ابھی ستاروں کے جہاں اور بھی ہیں۔ شہزی کوئی چھلاوا ہے بھٹی صاحب! خیر سے اب میڈم زہرہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ شہزی نے آرمی کے چنگل سے بھاگنے کی حماقت ہی کی ہے۔ سندھ کا مخصوص لہجہ اس کہانی میں اچھا لگتا ہے۔ ویسے کیا رائٹر کا تعلق سندھ سے ہے۔ (جی ہاں) اسما قادری مظلوم ظالم کی کہانی بیان کرتی نظر آئیں۔ خدا کے ہاں انصاف ہوتا ہے۔ نائلہ کے پیر دو کشتیوں پر تھے لیکن آخر عقل آ گئی۔ امجد جاوید کا رنگ اچھا نہیں لگا لیکن برا بھی نہیں تھا۔ ایمانے زارا شاہ، رانا بشیر، سعدیہ قادری اور دشتِ دل کے تبصرے اچھے لگے ویسے ایک بات پوچھنی تھی، کیا انجم فاروق ساحلی اور فاروق انجم ایک ہیں۔" (جی نہیں!)

فیصل آباد سے رمشا کی ابتدائی شرکت" میں جاسوسی ڈائجسٹ میں بلکہ کسی بھی ڈائجسٹ میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ (خوش آمدید) میں خواتین کے شمارے پڑھ کر بور ہو چکی تھی تبھی ایک دن بک اسٹال سے سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ لے آئی۔ پڑھ کر احساس ہوا کہ میں اتنے عرصے تک اتنے دلچسپ ڈائجسٹ سے محروم رہی۔ (چلو جی دیر آید درست آید) میں اب باقاعدگی کے ساتھ دونوں ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ اس میں لکھنے کا بھی شوق ہے بٹ موسٹ فیورٹ جاسوسی ڈائجسٹ ہے۔ مما جانی نے مجھے منع کیا کہ یہ مردوں والا ڈائجسٹ ہے لیکن میں اپنی فیورٹ رائٹرز عکس فاطمہ، مریم کے خان، سیریناراض، تمکین رضا اور اسما قادری کی بدولت ڈٹی رہی کہ یہ خواتین بھی تو جاسوسی ڈائجسٹ میں لکھتی ہیں تو میں پڑھ نہیں سکتی، خیر اس سے پہلے کہ آپ بور ہوں، میں آتی ہوں تبصرے کی جانب۔ اگست کا شمارہ ملا۔ سرورق پر فیضان اور نائلہ تھے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف کبیر عباسی کی دوراستے جشنِ آزادی پر اچھا تحفہ تھی۔ تمکین رضا کی للکار اچھی کاوش تھی۔ سراغرساں شرمین کی ذہانت پر دماغ اش اش کر اٹھا، ویسے مزے کی بات ہے کہ شک تو مجھے بھی کارل ہی پر ہوا تھا۔ عکس فاطمہ کی بے قصور بھی کافی اچھی رہی۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے اپنی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ مہتاب خان کی فیصلہ پسند آئی۔ ماں باپ کے کیے کی سزا اولاد کو ہی بھگتنی پڑتی ہے۔ سلیم انور کی قاتلانہ کھیل بھی اچھی رہی۔ عمران قریشی کی بڑا کھلاڑی اچھی لگی۔ سیر کو سوا سیر مل گی۔ جمال دستی کی دوسرا چہرہ بھی بہت پسند آئی۔ امریکا میں اس طرح ہی ہوتا ہے مجھے شروع سے ہی مارکس پر شک تھا۔ محمد یاسر اعوان کی اندھی سازش نے جاسوسی کے صفحات کا حق ادا کر دیا۔ میرے خیال سے اسے آخری صفحات میں جگہ ملنی چاہیے تھی اینڈ تک رائٹر نے سسپنس برقرار رکھا۔ اسما قادری کی مظلوم اچھی کاوش تھی لیکن پوری کہانی میں فیضان اور نائلہ پر شک کروا کے رائٹر نے آخر میں توقیر کو مجرم بنا ڈالا۔ ہمارے معاشرے میں بھائی غیرت کے نام پر بہن کو قتل تو کر سکتا ہے لجا کہ بہن کو اس کے عاشق سے ملوانے کے لیے بہنوئی کو قتل کرنا چاہے۔ بہرحال اچھی کہانی تھی۔ امجد جاوید کی خنجر بکف اچھی کہانی تھی۔ ویسے تو میں انڈین کہانی پڑھتی نہیں ہوں لیکن آخری صفحات پر ہونے کی وجہ سے پڑھ لی۔ نارائن نے سمیتا کو یاد نہیں رکھا، یہ اس کی کیسی محبت تھی اس لیے آخر میں تہی داماں رہ گیا۔ اس دفعہ کا جاسوسی امیزنگ تھا۔"

اسلام آباد سے اقصیٰ مغل کا انداز" اگست کے مہینے میں گرمی عروج پر ہوتی ہے ایسے میں بازار جا کر خریدنا دل گردے کا کام ہے لیکن ہماری جاسوسی سے محبت ہی ایسی ہے کہ نہ پڑھیں تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ ٹائٹل مجھے پسند نہیں اس لیے نو کمنٹ البتہ تبصرے سب کے میں شوق سے پڑھتی ہوں مجھے سید عبادت کاظمی اور مرحا گل کے تبصرے پسند ہیں لیکن آج کل یہ دونوں کہیں کی یاترا پر نکلے ہوئے ہیں۔ اس دفعہ محفل میں کچھ نئے نام نظر آئے کوثر اسلام نے خوب تبصرہ کیا، سعدیہ قادری اچھی رہی۔ طلعت مسعود تھوڑے گھبرائے لگے البتہ ایمانے زارا شاہ نے کوئی کسر نہ چھوڑی، انیلہ ظفر، شاہد صاحب، نوار گل، رانا بشیر بھائی کے تبصروں نے چار چاند چمکائے۔ انگارے نہ ہوتی تو جاسوسی پڑھنے کا مزہ ہی نہ آتا۔ مجھے تاجور اور شاہ زیب پرفیکٹ لگتے ہیں۔ ویسے اب لڑائیاں ختم کر کے شاہ زیب پرانے دشمنوں کی طرف لوٹے جو پاکستان میں تھے۔ آوارہ گرد میں نہیں پڑھتی کیونکہ اس کی اقساط کافی ہو چکی ہیں۔ ابتدائی صفحات پر کبیر عباسی کی کہانی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا اک رنگ خونی رات مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ سیاست کے پیچ داؤ سلجھاتی تحریر ہماری نظر میں معتبر ٹھہری۔ پاکستان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو جان ہتھیلی پر لے کر چلتے ہیں۔ مجھے ان کا انداز تحریر اچھا لگتا ہے اور زویا اعجاز بھی زبردست لکھتی ہیں۔ گرداب کے بعد اسما قادری غائب تھی۔ مظلوم ظالم میں نائلہ بیک وقت ظالم بھی تھی اور مظلوم بھی کہانی اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ امجد جاوید نے بھی اچھا لکھا۔"

کوئٹہ سے سیف خان کی چمن آرائی" ایک عرصے کے بعد ما بدولت دیدہ ور نے محفل نکتہ چینی میں جلوہ افروز ہونے کی سعی کر ہی لی کیونکہ محفل اپنی بے نوری پہ دہاڑیں مارنے ہی والی تھی (بہت دیر کی مہرباں آتے آتے) بوجھل پلکوں اور نم زلفوں والی حسینۂ سرورق کی بے رخی کا داغ سینے پہ لیے جب محفل کا دروازہ کھڑکایا تو کوثر اسلام ریش مبارک میں خلال کرتے ہوئے باہر نکلے۔ انہوں نے دوشیزاؤں کی طرف نظرِ التفات نہ رکھنے پر کیا جھاڑ پلائی ہمارے دل کے مزید ٹوٹے ہونے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے سعدیہ قادری نے آ کر ذرا تشفی دی اور جب یہ بتایا کہ ادارے کو ایم اے راحت، محی الدین نواب اور کاشف زبیر صاحب کے حوالے سے خصوصی نمبر نکالنے چاہئیں تو طبیعت باغ باغ ہونے لگی۔ دبئی والے طلعت سسپنس کی طرز پر جاسوسی میں بھی پرانی مقبول کہانیوں کے دوبارہ اشاعت کی فرمائشیں کر رہے تھے۔ واقعی ایسا ہو جائے تو مزہ آ جائے۔ ٹنڈو الٰہ یار میں بیٹھ کر بی ایمانے نے اسلام آباد کی عید کا خوب احوال سنایا۔ بڑے بڑوں کے تبصروں کے بیچ نوار گل بچے کی انٹری دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ذرا پرے وصلی برادران بھی خوب اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ محفل کی نکڑ پہ دشتِ دل زور شور سے اپنا تازہ باغیانہ کلام سنا رہے تھے۔ غرض ہر طرف مچی ہو ہو کار نے تکدر دور کیا اور ہم دوراستے پہ ہو لیے۔ جاسوسی کے ٹائٹلو پہ دھنک کے کئی رنگ بکھیرنے کے بعد کبیر عباسی ابتدائی صفحات پہ ایک تیز رفتار تحریر کے ساتھ موجود تھے جس کا موضوع ہمارے روایتی سیاسی نظام کی تبدیلی کے گرد گھوم رہا تھا۔ کہانی کا بیانیہ ذرا خشک اور عجلت آمیز سا لگا۔ البتہ تھیم انتہائی جاندار تھا۔ ہمارے فرسودہ سیاسی نظام کو بدلنے کے دعوے تو بہت کیے جاتے ہیں لیکن مصلحت کی سیاست اور دیانت کی کمی ہمیشہ آڑے آ جاتی ہے۔ مستقبل میں کبیر عباسی سے بہت

امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ روایتی انداز سے ہٹ کر لکھ رہے ہیں اور یہی عنصر ان کی تحریروں کو انفرادیت دیتا ہے۔ اس بار تو مغل صاحب نے انگارے ہی چبا دیے۔ شاہ زیب کا متھا آرام سے تاجور کے ساتھ ٹکا دیا جسے پڑھتے سمے ہم جیسے قسطینہ فینز کے سینوں پہ بس مونگ ہی دلتی رہی۔ جاماجی میں تاجور کی انٹری ہمیں ایک آنکھ نہیں بھا رہی۔ باقی کہانی اپنے عروج پہ ہے۔ ایک طویل عرصے بعد جاسوسی کے صفحات پہ امجد جاوید صاحب کو خنجر بکف دیکھ کر ازحد خوشی ہوئی۔ ہندی پس منظر نے کہانی کو یونیک سا ٹچ دیا۔ مایا دیوی کے کردار کو خوب بنا گیا تھا جس سے قاری کی دلچسپی آخری پیراگراف تک ٹکی رہی۔ اسما قادری نے اغوا برائے تاوان کے کیس میں ظالم توقیر کو مظلوم دکھانے کی کوشش کی۔ کہانی کے رواں اور سہل انداز نے سادہ سے کیس میں جان ڈال دی اور آخری پیراگراف تک اغوا کار ہماری پہچان کی گرفت میں نہ آسکے۔ مختصر تحریروں میں تمکین صاحبہ کی للکار میں شرمین کی باریک بینی نے دل چھولیا۔ منظر امام صاحب ایک بار پھر حاتم طائی کو عہدِ حاضر میں لے آئے لیکن کہانی کا اندازِ بیاں بچکانا سا لگا۔ فیصلہ میں اغوا کار مطلوبہ بچے کے بجائے مجرم کا اپنا ہی بچہ اغوا کر لیتے ہیں۔ یہ فارمولا کئی بار پڑھا جاچکا ہے اس لیے بھی تحریر خاص تاثر چھوڑ نہ سکی۔"

دبئی سے طلعت مسعود کی پکار "جولائی کے تپتے ہوئے موسم میں جاسوسی ملا تو خوشگوار سا احساس ہوا۔ یوم آزادی کی مبارک دیتا سرورق بھی اچھا تاثر دے رہا تھا۔ اداریہ میں مدیرِ اعلیٰ ستر سال بعد بھی ہونے والے ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتی نظر آئیں۔ اس نظام کو بدلنے میں ہم سب کو کسی نہ کسی حد تک اپنا حصہ ڈالنا ہوگا ورنہ ہر دو چار سال بعد انہی چہروں نے بدل بدل کر آنا ہے جو اسی نظام کی پیداوار اور اس کو تحفظ دیتے ہیں۔ محفل چینی نکتہ چینی میں کوثر اسلام صاحب پہلی ہی انٹری میں چھلانگ لگا کر پہلی کرسی پر بیٹھے نظر آئے۔ متوازن تبصرہ اچھا لگا۔ ایمانے زارا نے بھی خوب رنگ جمایا ہوا تھا۔ شاہد ذوالفقار صاحب پراٹھے ملنے پر خوش نظر آئے۔ انور یوسف صاحب کی والدہ کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ سعدیہ قادری، انیلا ظفر، وصلی برادرز، نوار گل، محمد اقبال کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے سے شروع کیا گو کہ اس قسط میں کافی ہنگامہ خیز رہی لیکن میرا خیال ہے اب مغل صاحب کو جاماجی سے شاہ زیب اینڈ کمپنی کو نکال لینا چاہیے۔ جاماجی میں کافی وقت ہوگیا ہے اب وطن واپسی کا سوچنا چاہیے۔ ابتدائی صفحات کبیر عباسی براجمان تھے ان کے دیے گئے دو راستوں پر سفر شروع کیا جو ملک کے نظام میں تبدیلی کے راستے پر ختم ہوا۔ کافی عرصے بعد سیاسی موضوع پر کوئی کہانی نظر آئی۔ کہانی میں سائنس کے جدید آلات کا کافی استعمال نظر آیا۔ آخر میں فوج کی مدد تبدیلی کے طریقہ کار سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مجموعی طور پر کہانی پسند آئی۔ رنگوں میں اسما قادری صاحبہ کی ظالم مظلوم ایک روایتی جاسوسی کہانی نظر آئی۔ تیسرے ہی صفحے پر نیلی صاحبہ پر شک ہوگیا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک ملوث ہوں گی جو کچھ حد تک صحیح ثابت ہوا۔ اب پتا نہیں میں زیادہ ذہین ہوگیا ہوں یا دوسروں کو بھی محسوس ہوا۔ اس کے علاوہ بدمعاش مستان صاحب بھی کچھ کم عقل ہی نظر آئے جنہوں نے اغوا جیسا جرم تو کرلیا لیکن اتنا نہیں نہ اندازہ ہوا کہ اسپتال میں لفافہ دیتے ہوئے ان کی تصویر کیمروں میں آسکتی ہے۔ اس دفعہ اسما قادری صاحبہ زیادہ متاثر نہ کرسکیں۔ امجد جاوید صاحب خنجر بکف میں ممبئی کی زیرِ زمین دنیا کے رنگوں کے ساتھ موجود تھے۔ ایکشن، تھرل کے ساتھ یہ کہانی اچھی رہی آخر میں مایا دیوی کو ایک دم بے نقاب بھی کردیا اور نارائن سے دور بھی کردیا بہرحال مجموعی طور پر یہ رنگ اچھا رہا، پسند آیا۔ مختصر کہانیوں میں منظر امام صاحب کی کوہِ ندا متاثر کن رہی۔ آج کے دور میں جمہوریت واقعی کوہ ندا ہی ہے۔ اندھی سازش میں خیال خوانی کا پڑھ کر فرہاد اور دیوتا کی یاد آگئی۔ پُراسرار انداز لیے ہوئے گھر کی سازشوں کو بے نقاب کرتی اچھی تحریر تھی۔ لیکن بلی کے بارے میں ڈاکٹر جمال کے ساتھ ہماری بھی الجھن حل نہ ہوسکی۔ یہ بلی بھی شاید ہمارے سیاستدانوں اور حکمرانوں کی طرح ہی تھی جو جاکر پھر تھوڑے عرصے بعد وہی واپس آجاتے ہیں۔ سلیم انور کی قاتلانہ کھیل بہتر رہی۔ فیصلہ از مہتاب خان بہت ہی پُراثر تحریر۔ مکافاتِ عمل لیے اس تحریر میں ہم سب کے لیے کچھ نہ کچھ سبق موجود تھا۔"

اسلام آباد سے زارا شاہ کی سواری "یہ جو ڈائجسٹ کا ٹائٹل ہوتا ہے یہ مجھے سائیکالوجی کی کلاس یاد کرادیتا ہے جس میں تصویر دیکھ کر رائے بتانی ہوتی تھی اس لیے ہم کوئی ریمارکس نہیں دیتے کیونکہ کلاس میں بھی ہمارے ریمارکس سب سے نرالے ہوتے تھے۔ اداریہ یہ بات کروں تو ستّر سال آزادی کے سن کر بس ہنسی آتی ہے۔ آزادی فقط اک لفظ تو نہیں ہے، دو قوموں سے آزاد ہوگئے مگر سیاستدانوں کی غلامی میں چلے گئے۔

ابھی تک پاؤں سے چمٹی ہیں زنجیریں غلامی کی
دن آجاتا ہے آزای کا آزادی نہیں آتی

نکتہ چینی میں کوثر اسلام کا تبصرہ بہترین تھا آج کل طلعت بھی کافی فارغ لگ رہے ہیں تو خوب تبصرے جھاڑ رہے ہیں۔ سعدیہ کے مشورے قابلِ غور ہیں۔ اپنا تبصرہ پڑھ کر ہمیشہ کی طرح بونگا لگا۔ اف! یہ لکھتے ہوئے کیوں نہیں لگتا خیر اپنا نام دیکھنا اتنا برا نہیں ہے۔ پہلی کہانی دو راستے بھی اداریہ کی مناسبت سے ہی تھی۔ کبیر عباسی نے اس مرتبہ تو سکسکرز لگائے ہیں کہانی میں ایسے کھوئے کہ اردگرد کا ہوش نہ رہا۔ صحافی معلم اور مفتی کی گٹھ جوڑ نے سیاست کا سارا نقشہ تبدیل کر ڈالا۔ مجموعی طور پر کہانی آؤٹ کلاس تھی لیکن دشمن ملک کو دعوت دینے والی بات پلے نہیں پڑی۔ اتنے اچھے تعلقات ہمارے کبھی نہ تھے نہ ہیں نہ ہوسکتے ہیں چاہے فرض ہی کیوں نہ کریں۔ باقی وہ خواب جو ہماری قوم کھلی آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے اس خواب کو لفظوں میں ڈھال دیا لیکن کیا یہ کبھی خواب پورا ہوسکے گا؟ شاید کبھی ہوجائے اچھے کی امید رکھتے ہیں باقی خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں! فیصلہ کے جج صاحب تو قرار واقعی منصف محسوس ہوئے۔ اللہ تعالیٰ تمام منصفوں کو اتنی دلیری دے آمین۔ اندھی سازش زبردست کہانی لگی جاسوسی کے پیٹرن پر پورا اترتے ہوئے کہانی دی اینڈ ہوئی۔ مرکزی مجرم عمران نے کہانی تو ترتیب دے دی مگر حیرت تو اس بات پر ہوئی جو وہ اپنی ماں کا رول خود ہی پلے کررہا تھا وہ بھی اپنی سگی ماں کا جو مرچکی تھی عاقبت نااندیش! مظلوم ظالم نری فلم تھی۔ ایسی فلمیں نہیں چاہئیں ہمیں۔ اتنے بچکانا ڈائیلاگز پڑھ کر کوفت ہورہی تھی بہت مصنوعی سی کہانی تھی۔ خنجر بکف کی کتھا بس ٹھیک تھی، ترجمہ شدہ دیگر کہانیوں سے بہت بہتر۔ بڑا کھلاڑی کو بڑی کھلاڑی کہنا چاہیے فراڈن عورت......!"

شاہد ذوالفقار، ہری پور سے لکھتے ہیں ”اس بار بھی، جاسوسی ڈائجسٹ کا بہت بے چینی سے انتظار تھا، تبصرہ جو بھیجا تھا۔ چوبیس تاریخ سے ہی گروپس میں چینی نکتہ چینی کی تلاش میں چکر لگانے شروع کیے۔ چکر لگا لگا کے میں چکرا چکا تھا کہ اٹھائیس تاریخ کو تبصروں کی لسٹ پر نظر پڑی۔ اپنا نام دیکھ کے انتہائی خوشی ہوئی۔ دوسری بار بھی پراٹھے ہمیں مل گئے۔ امید ہے اس بار پراٹھے ملنے کی ہیٹرک مکمل ہو جائے گی۔ سرورق بہت زبردست لگا۔ تبصروں میں سعدیہ قادری، انیلہ ظفر اور حفصہ طارق کے تبصرے دیکھ کے دل میں کسک پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی ایسا تبصرہ لکھ سکتا۔ چلیں جی اس بار ان بیبیوں سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مظلوم ظالم پڑھی۔ بہت مزے کی کہانی تھی۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ نائلہ نے ہی اپنا بچہ اغوا کرایا ہے اور اپنے شوہر کو کمزور کرنے والی دوایاں پہلے کھلاتی رہی ہے اور بچے کے اعضا بیچ کے اسے مروانا چاہتی ہے مگر آخر میں کہانی نے بہت خوب صورتی سے پلٹا کھایا۔ خنجر بکف کی سمجھ ہی نہیں آسکی۔ شروع میں جو تاؤجی کا کردار دکھایا گیا آگے جا کے اس کا ذکر ہی نہیں آیا۔ اولین صفحات پر کبیر عباسی کی کہانی دوہرے راستے نے دل جیت لیا۔ بہت جذباتی قسم کی کہانی تھی۔ جب انقلابی جماعت پر دشمن حملہ کرتے تو دل دھڑکنے لگتا مگر پھر جب آرمی ان حملوں کو ناکام کرتی بلکہ ان کا حملہ انہی پہ پلٹ دیتی تو مزہ آجاتا۔ اس سے شاندار کہانی شاید ہی میں نے زندگی میں کبھی پڑھی ہو۔ کاش یہ سب حقیقت میں بھی ہو جائے جیسا کہانی میں ہوا۔ مہتاب خان کی فیصلہ کے متعلق فیس بک پر بہت سے لوگ کہتے پائے گئے کہ اس طرح کی کہانی سسپنس کے آخری صفحات پر نواب صاحب لکھ چکے ہیں۔ چشمہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے غلط بچہ گھر چھوڑ دینا، جج کا پوتا اغوا کر کے اسے دھمکانا اور آخر میں جج کے بجائے دشمن کے اپنے بچے کا ہی مر جانا۔ پتا نہیں یہ سب اتفاق تھا یا ابھی اتنا ہی ڈائجسٹ پڑھ سکا ہوں کوشش کروں گا کہ اس بار انگلش کہانیاں بھی پڑھوں مگر وہ پڑھنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔“ (دل کو آمادہ کریں)

تانیہ مہر، لاہور سے ”اٹھائیس کی حبس زدہ شام کو جاسوسی کی گھر میں انٹری ہوئی۔ ٹائٹل پر یومِ آزادی کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ آنکھوں میں آزادی کا رنگ لیے خوب صورت دوشیزہ کہیں اور دیکھنے میں مصروف تھی۔ عورت نما آدمی بے ڈھنگے انداز میں سگریٹ پیتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے تو اس پر کالے جادو کا اثر لگ رہا تھا۔ ٹائٹل سے نظریں ہٹاتے ہوئے اداریے کی طرف متوجہ ہوئی تو دیکھا ادارے والے آزادی کی سترویں سالگرہ منانے کے ساتھ ساتھ ملک کے حالات پر آہیں بھر رہے تھے۔ کہتے ہیں جس قوم پر بُرا وقت آنا ہو اللہ اسے برا حکمران دیتا ہے۔ ملک میں سیاست کی گرما گرمی ہے اور عوام سیاست دانوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔ عوام تو عوام ہمارا آزاد میڈیا بھی اپنے اپنے پسند کے سیاست داں کی چاپلوسی کرتا نظر آرہا ہے۔ ملک کے ان کٹھن حالات کو دیکھ کر ہم بھی ادارے کے ساتھ دعائے خیر میں شامل ہو گئے۔ نکتہ چینی کی محفل میں سعدیہ قادری انیلا ظفر ایمانے، طلعت وصلی برادران دیگر لوگوں کو رنگ جماتے دیکھ کر اچھا لگا۔ کہانیوں کی لسٹ میں سرورق پر کبیر عباسی کی اسٹوری دوراستے نظر آئی۔ ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی اپنی ہمیشہ سے برقرار روایت کو توڑتے ہوئے پہلی کہانی پڑھنی شروع کر دی کہانی بھی ملک کی طرح سیاست سے بھرپور تھی۔ تین نوجوان جو مختلف حالات کے ستائے ہوئے اپنے اندر ایک نیا جذبہ لے کر ملک کے حالات کو بدلنے کی کوشش میں لگ گئے۔ کہتے ہیں، ارادے نیک ہوں تو مشکل سے مشکل رکاوٹیں بھی آپ کو منزل سے دور نہیں رکھ سکتیں۔ کاش حقیقت میں بھی کوئی ایسی انقلابی پارٹی ہمارے پاکستان کے حالت بدلنے کے لیے آئے مگر ایسے عظیم لوگ صرف کہانیوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔ کہانی میں آج سے بیس سال بعد بھی پاکستان جدید ٹیکنالوجی کے لیے دوسرے ملک سے مدد لیتے ہوئے بہت افسوس ہوا۔ کیا ہم اس وقت تک بھی جدید چیزوں سے محروم ہی ہوں گے۔ کہانی کا پلاٹ بہت مضبوط تھا آج کے حالات کے لیے موزوں ترین تھی۔ سلسلے وار میں انگارے کو ہی ابھی پڑھ سکی۔ مغل صاحب خوب ایکشن میں نظر آئے۔ ہیرو کو جاماجی والے نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں اور سمجھتے بھی کیوں ناں، ہیرو ہر مشکل طوفان کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹے رہے برے وقت میں قوم کو ایسے ہی لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بار ہمیشہ کی طرح کہانی کا اینڈ سسپنس بھرا نہیں تھا مگر تھا شاندار۔ چھوٹی کہانیوں میں یاسر اعوان کی اندھی سازش پڑھی، دولت کی ہوس انسان کو حیوان بنا دیتی ہے مگر دولت کا نشہ انسان کو برباد ہی کرتا ہے۔ عمران دولت کی خاطر اپنی ماں اور بھائی کو مار دیتا ہے ایک دن اپنے ہی جال میں پھنس جاتا ہے اور برے انجام کو پہنچتا ہے مگر معذرت کے ساتھ وہ اپنی ماں کا روپ دھار کر اپنی بہن اور بھابی کے سامنے جاتا ہے اور وہ اسے پہچان ہی نہیں پاتیں؟ یہ بات کچھ ہضم نہیں ہوئی اور بلی والا معاملہ میری ننھی عقل سمجھ نہیں پائی۔ مہتاب خان کی فیصلہ جو ایک ایماندار جج پر تھی شاندار لگی۔ جج صاحب نے انصاف کے لیے اپنے پوتے کی جان داؤ پر لگا دی مگر وہ اپنے فرض سے پیچھے نہیں ہٹے تو اللہ نے انہیں اس کی ایمانداری کا میٹھا پھل ایسے دیا وہی ہوا جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ سلمان جس نے دوسرے کے لیے گڑھا کھودا اس میں خود گر گیا برا کرنے کا انجام برا۔ سلیم انور کی قاتلانہ کھیل بہت پسند آئی باقی رنگ اور دوسری کہانیاں، آوارہ گرد ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔“

صوابی سے کوثر اسلام کی آمد ”اس بار جاسوسی دیوتا نے معمول سے ہٹ کر ذرا جلدی اپنے درشن کرائے۔ برسات کے بھیگے موسم میں چائے پیتے ہوئے جاسوسی کا آغاز کیا۔ تبصرے کی اشاعت پر اتنی خوشی ملی گویا ہفتِ اقلیم مل گئی ہو۔ دل سے بے ساختہ ادارے کے لیے دعائیں نکلیں۔ سرورق پر فیضان کی تصویر سے کسی بھی طرح نہیں لگ رہا کہ وہ عامل ہے۔ وہ جو تعویذ دیتا تھا اس پر چاند تارا بنا ہوتا آپ نے اسے پاکستان کا جھنڈا بنا دیا۔ تعویذ کے ساتھ پتلا بھی ہے۔ پتلے جادوگر جادو ٹونے میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ فیضان شاہ عامل تھا جو صرف تعویذ دیا کرتا تھا۔ جادوگر نہیں تھا۔ سب سے پہلے ادارتی نوٹ پڑھا واقعی آزادی کے 70 برس بعد بھی حالات جوں کے توں ہیں۔ غریب کی زندگی بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ اس ملک کا حامی و ناصر ہو۔ دوراستے نے پہلی کہانی کا حق خوب ادا کر دیا۔ حقیقت کی عکاسی کرتی ہوئی لاجواب کہانی تھی۔ اک مدت کے بعد ایسی کہانی پڑھنے کو ملی۔ وارث علی وسیم اور مفتی توصیف نے مسلسل محنت اور ان تھک جدوجہد سے ناممکن کو ممکن بنایا۔ کاش ہماری زندگی میں ملک میں ایسی تبدیلی آجائے، آمین۔ جنرل آزاد کے ساتھ پہلی ملاقات میں وسیم کے ساتھ وارث علی اور مفتی توصیف کیوں نہیں تھے۔ غیر معروف شامیر اور امیر تیمور کے مقابلے میں عالم دین اور قلم

کار اپنا نقطۂ نظر بہتر انداز میں بیان کرتا۔ امریکا، بھارت، افغانستان اور چین کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے اگر فرضی نام استعمال ہوتے تو بہتر ہوتا اور کبیر عباسی کی ہر کہانی ''ڈ'' سے کیوں شروع ہوتی ہے۔ دوراستے، دوسرا کیس، دیر آید کیا اس میں کوئی راز ہے۔ للکار میں پولیس کمشنر ایک آسان سا کیس حل نہیں کر پایا۔ ہم منظر امام کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کوہ ندا کا راز فاش کر دیا۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے کے مصداق فیصلہ ایک زبردست کہانی تھی۔ خدا کے ہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں۔ مانی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسروں کے ہزار گھر اجاڑ کر وہ اپنا ایک گھر آباد نہیں کر سکتا۔ قاتلانہ کھیل کا اختتام کچھ زیادہ متاثر کن نہیں تھا۔ آفیسر گورمین کی نگرانی کے باوجود ایڈیٹ کیسے اس کے گھر میں گھستا تھا۔ آتش زن کچھ زیادہ متاثر کن کہانی نہیں تھی۔ عنوان.... اور کہانی ایک دوسرے سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ سرورق کی پہلی کہانی مظلوم ظالم ایک عمدہ کہانی تھی۔ اسما قادری نے نہایت عمدگی سے جعلی عاملوں کا پردہ فاش کیا۔ ہمارے معاشرے میں کتنے ناکام فیضان ہیں جو سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو لوٹ رہے ہیں۔ مراد نے دوستی کا حق خوب نبھایا۔ مکرم کی مستعدی اور ذہانت لاجواب تھی۔ نیلی نے گھر کی خاطر محبت کو قربان کر دیا۔ ازل سے ہی عورت قربانی دیتی آئی ہے۔ وہ قربانی دیتی ہے اور اسے اس کا بھرپور صلہ نہیں ملتا۔ دوسری کہانی خنجر بکف ایکشن اور سسپنس سے بھرپور کہانی تھی۔ معاشرہ اور حالات نازک اندام سمیتا کو مایا دیوی بنا دیتے ہیں۔ آخر میں سمیتا نے اداس کر دیا۔ کہانی میں سیکس اچھا نہیں لگا۔ اس کے علاوہ اتفاقات کی بھی کثرت تھی۔ اس کے علاوہ بڑا کھلاڑی، سودا اور دوسرا چہرہ بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ مصروفیت کے باعث آوارہ گرد کے ساتھ انگاروں میں ابھی نہیں کودے ہیں۔ یہ دو کہانیاں آخر میں پڑھتا ہوں۔ اللہ ادارے کو مزید کامیابیاں عطا فرما آمین۔'' (بہت شکریہ)

حفصہ طارق، گوجر خان سے فرماتی ہیں ''ہم نے تبصرہ کیا لکھا، آپ نے ڈائجسٹ ہی لیٹ چھپوا دیا۔ پچیس تاریخ سے انتیس تاریخ تک کوئی بھیجا بھانجا بچا نہیں جسے بک شاپ تک نہ دوڑایا ہو مگر ہر کوئی ڈائجسٹ کے بجائے مایوس منہ لے کے ہی واپس آیا۔ آخر کار جاسوسی کی تلاش کا معرکہ جس ہستی نے سر کیا وہ ہماری اپنی ہی ذات تھی۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ٹائٹل، اشتہارات و فہرست کو پھلانگتے ہوئے پہنچے محفل ہاؤ ہو میں، دھڑکتے دل کے ساتھ تبصرے دیکھنا شروع کیے مگر یہ کیا اپنا نام ندارد...... ہم مایوسی کی اتھاہ گہرائی میں گرنے ہی لگے تھے کہ آخری صفحے پر اپنے نام پہ نظر پڑ گئی۔ ہرا......! ہمارے منہ سے بے اختیار نعرہ نکلا جس پہ گھر کے سارے کونے کھدروں سے لوگ ایسے باہر نکل آئے جیسے انہوں نے نعرے کے بجائے دھماکے کی آواز سن لی ہو۔ ہم نے کھسیاہٹ چھپائی اور الشان پہ چڑھ دوڑے۔ اپنا تبصرہ تین بار پڑھا مگر پھر بھی دل نہیں بھرا۔ مدیرِ اعلیٰ کے جوابات پڑھ کے خوشی ہوئی لیکن کیا ہی اچھا ہو صرف جواب طلب باتوں کے بجائے ہر تبصرے پہ جواب ہو جیسے خواتین ڈائجسٹ میں تبصروں پر ہوتا ہے۔ دیگر تبصرے بھی بہت مزے کے لگے۔ کہانیوں میں ابتدا حسبِ معمول انگارے سے کی۔ حسبِ معمول یہ قسط بھی پسند آئی۔ اس سے آگے فیصلے پر نظر پڑی، ہمارا ابھی مزید پڑھنے کا موڈ تھا سو اسے بھی نہیں بخشا۔ اچھی تحریر تھی یہ بھی۔ خدا کی نصرت ہمیشہ حق کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس عقیدے پر یقین رکھنے والے کبھی باطل قوتوں سے گھبرا کے حق کا راستہ نہیں چھوڑتے۔ اس سے آگے قاتلانہ کھیل کی طرف بڑھے مگر اس میں گٹر لائن کا لفظ پڑھ کے متلی سی ہونے لگی، اسے چھوڑا اور عمران قریشی کی بڑے کھلاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ چور کو پڑ گئے مور۔ مزیدار تحریر تھی یہ بھی۔ ہم بھرپور فارم میں تھے کہ آوارہ گرد راستے میں آ گئی۔ اب آوارہ گردوں کے منہ کیا لگنا، ان سے کنی کتراتے ہم آگے نکل گئے۔ آوارہ گرد کے خوف سے ہماری رفتار اتنی تیز تھی کہ سیدھا مظلوم ظالم پر جا کے بریک لگے۔ اوئی ماں، پوری کہانی میں ہم نائلہ پہ شک کرتے رہے مگر اینڈ میں کہانی نے اتنا مزے کا موڑ لیا کہ مزہ آ گیا۔ نائلہ ولن سے یکدم ہیروئن بن گئی۔ مزہ آ گیا۔ خنجر بکف، نام تو بہت خوب صورت تھا مگر تحریر ہمارے ذوق پر پورا اترنے میں ناکام رہی۔ ڈائجسٹ کے اختتام کے بعد ہم پھر سے آغاز کی طرف آ گئے۔ اولین صفحات پر دوراستے ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ہم نے بھی دونوں پہ بیک وقت سفر شروع کر دیا۔ ابتدا میں سادہ نظر آنے والی تحریر وسیع کینوس پر پھیلتی چلی گئی۔ ہمارے سیاسی مسائل کا حل بڑی خوب صورتی سے کہانی میں بتایا گیا۔ کہانی میں تجسس عروج پر تھا۔ ہر پل دل دھڑکتا رہا کہ اب پتا نہیں کیا ہونے والا ہے مگر یہاں پھر خدا کی نصرت حق کے ساتھ رہی اور انقلابی جماعت تمام سازشوں کو خدا کی مدد سے ناکام کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب رہی۔ خوش کن اینڈ ایسے اداس کر گیا جیسے ایک خوب صورت خواب دیکھنے کے بعد یکدم آنکھ کھل جانے پہ افسوس ہونے لگتا ہے کہ اوہ یہ تو خواب تھا۔ اللہ پاک کسی جماعت کو اتنی توفیق دے کہ وہ ہمارے حالات ایسے ہی تبدیل کر دے جیسے انقلابی جماعت نے کہانی میں تبدیل کیے۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں۔ اللہ حافظ۔''

ذیشان، شورکوٹ سے زور و شور سے لکھتے ہیں ''جاسوسی ڈائجسٹ کا عرصہ دراز سے قاری ہوں۔ پہلی بار ڈائجسٹ میں ایک ایسا ناول پڑھنے کو ملا کہ تبصرہ بھیجنے پر مجبور ہو گیا۔ یوں تو جاسوسی کے اولین صفحات پر ایک سے ایک شاہکار قسم کے ناول چھپ چکے ہیں مگر اس بار اولین صفحات پر شائع ہونے والے کبیر عباسی کے ناول دوراستے نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میرے دوست احباب ڈائجسٹ پڑھنے کی میری عادت سے نالاں نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک ڈائجسٹ میں فضول اور رومانوی قسم کی کہانیاں چھپتی ہیں اور ڈائجسٹ پڑھنا دنیا کا فضول ترین کام ہے۔ میں ان کے ان طعنوں تشنوں کو ہنس کے سہہ لیتا تھا مگر اس تحریر نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ میں نے اپنے کچھ دوستوں کو بھی یہ تحریر پڑھنے کو دی اور وہ بھی اپنی رائے پر شرمندہ نظر آئے۔ ہم چند دوست بھی اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارے مسائل کی اصل جڑ نظام ہے۔ جب تک نظام درست نہیں ہوتا ہمارے ملک کے حالات بہتر نہیں ہو سکتے، اور یہ نظام ایک تربیت یافتہ جماعت ہی درست کر سکتی ہے جو نیا نظام چلانے کی پوری طرح اہلیت بھی رکھتی ہو۔ یوں تو ڈائجسٹ میں سبق آموز قسم کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں مگر اس طرح کے کامل نظریے کو کبیر عباسی نے اتنی خوب صورتی سے کہانی میں پرویا کہ میں ان کی مہارت پہ اش اش کر اٹھا۔ خشک سے نظریے کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا کہ آخری صفحے تک گردوپیش کا ہوش ہی نہیں آیا۔ کئی جگہوں پر تو جذبات سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک چھوٹی سی شکایت البتہ مصنف سے ضرور پیدا ہوئی کہ انہوں نے نظریے سے زیادہ ناول کو جاسوسی ٹچ دینے کی کوشش کی۔ اللہ پاک آپ کو ایسی مقصدیت سے بھرپور تحریریں لکھنے کی توفیق دے اور میں ادارۂ جاسوسی ڈائجسٹ سے بھی امید کرتا ہوں کہ وہ ایسی بھرپور تحریریں آئندہ بھی اپنے

شمارے میں شامل کر کے لوگوں میں شعور پیدا کرنے کی سعی کرتے رہیں گے۔ ایسی ہی تحریروں کی ہمارے معاشرے کو ضرورت ہے۔“

راولپنڈی سے تنویر اختر کی التجا ” ڈائجسٹ بروقت مل گیا۔ سرورق پر براجمان خوب صورت دوشیزہ ہم سے نظریں بچائے جانے کس طرف گھور رہی تھی۔ نیچے ٹیک لگائے ایک شخص چرس کے مزے لے رہا تھا۔ اچھا سرورق تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ خلاف توقع اس بار بھی کہانی جزیرے سے نہیں نکل سکی۔ خدا کے لیے اب شاہ زیب کو پاکستان لے آئیں۔ اب تو شہزی بھی آوارہ گردیاں کر کے واپس آ ہی گیا ہے۔ اولین صفحات پر کبیر عباسی کی تحریر دوراستے ایک ناقابلِ فراموش تحریر رہی۔ تین افراد ظلم کا شکار ہوئے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کے جب تک ظلم کا نظام تبدیل نہیں ہوتا سب ظلم کا شکار ہوتے رہیں گے۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کو ساتھ ملا کے ایک جماعت بنائی۔ سیاسی پارٹیوں کے علاوہ انڈیا اور امریکا نے بھی انہیں ناکام کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے آرمی کے ساتھ مل کے سب کو شکست سے دوچار کیا۔ کاش ایسا حقیقت میں بھی ہو جائے۔ سرورق کا پہلا رنگ اسما قادری نے لکھا۔ اس کہانی میں نائلہ ظالم لگ رہی تھی مگر اینڈ میں وہ مظلوم نکلی۔ مزے کی کہانی تھی یہ بھی۔ امجد جاوید کا دوسرا رنگ، آدھی ہی پڑھ سکا۔ مزہ نہیں آ رہا تھا تو ادھوری چھوڑ دی۔ مہتاب خان کی فیصلہ میں جج کا پوتا اغوا کر کے اسے فیصلہ بدلنے پر مجبور کیا گیا مگر اس کے باوجود اس نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ خدا نے بھی اس کی مدد کی اور جج کے بیٹے کے بجائے مانی ڈینجر کا بیٹا ہی مارا گیا۔ بہت اچھی تحریر۔ طلعت مسعود، ایمانے زارا، انیلہ ظفر اور حفصہ طارق کے تبصرے زبردست رہے۔ انکل یہ میرا پہلا تبصرہ ہے پلیز ضرور شائع کرنا۔ اگر یہ تبصرہ شائع ہو گیا تو آئندہ بھی لکھوں گا۔“

ٹھوکر نیاز بیگ سے شمع پری کی پہلی دفعہ حاضری ” جاسوسی کا سرورق ہمیشہ اک الگ کہانی ہی بیان کر رہا ہوتا ہے۔ کبھی دلکش اور کبھی اداس رنگوں سے مزین سرورق بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ اداریہ ہر ماہ ایک نئی سوچ دے جاتا ہے۔ چینی نکتہ چینی میں افتخار حسین اور رانا بشیر اور ان جیسے دوسرے تمام تبصرہ نگاروں کے تبصرے بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ ویسے تو مجھے جاسوسی کی تمام کہانیاں پڑھنے میں مزہ آیا ہمیشہ مگر جن کہانیوں میں رئیل لائف گزارنے کے لیے، مخالف دشمن کی چال کو سمجھنے کے لیے اور مکمل حالات سے نمٹنے کے لیے پوائنٹس تھے وہ زیادہ پسندیدہ رہے۔“

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی واپسی ” جاسوسی اپنے ٹائم پر مل گیا۔ ٹائٹل کی صنف نازک آسمان پر ستاروں کی طرف متوجہ ہے اور کچھ سوچ رہی ہے کہ انکل کو سگریٹ پینے سے...... کیسے منع کروں۔ کونے پر پتلا گرا پڑا ہے یہ کس کی شامت آئی ہے خدا خیر کرے۔ بہرحال یوم آزادی مبارک ہو خدا ہمارے ملک کو حفظ و امان میں رکھے۔ انکل کی باتیں دل کو بھائیں ہمیشہ حقیقت پر مبنی تبصرہ کرتے ہیں۔ ان کی سوچ بے لاگ ہوتی ہے۔ اپنی محفل چینی نکتہ چینی میں داخل ہو چکے ہیں۔ لمبی غیر حاضری کے بعد سب سے ملاقات کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں اس محفل کے تمام قارئین سے شکوہ ہے اگر کوئی تبصرہ نگار محفل سے غائب ہو تو پلٹ کر نہیں پوچھتے کہ مر گئے کہ زندہ ہیں۔ بہرحال یہ اچھی بات نہیں ہے، ہمیں سب سے شکوہ ہے اور دکھ بھی ہے۔ (نہیں بھئی ہم سمیت سب آپ کو مس کر رہے تھے...... طویل غیر حاضری کا سبب تو بتایا نہیں بشریٰ جی نے) کوثر اسلام کا تبصرہ قابلِ تحسین تھا، پسند آیا۔ ہم سعدیہ قاری کے مشورے سے متفق ہیں، ان مرحومین کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ انیلا ظفر کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ سب ساتھیوں کے تبصرے پسند آئے۔ بڑا کھلاڑی ایک پُراثر کہانی تھی اگر یاسر سیر تھا تو وقار کی بیوی سوا سیر نکلی۔ دوسرا چہرہ شیلبائی کے ساتھ تو آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہو گیا' بے چاری۔ اندھی سازش میں رائٹر نے بڑے خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔ سطر سطر سسپنس سے بھرپور اور بلی یعنی ملکہ بجلی۔ اینڈ تک ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہی اور وہی ہر جگہ لے کر جاتی رہی، اس کہانی نے دل کے تاروں کو چھو لیا۔ بلی نے خوب کام دکھایا۔ فیصلہ دوسروں کے لیے نصیحت کا پہلو لیے ہوئے تھا۔ اگر ہمارے ملک میں سیف صاحب جیسے جج ہوں تو ہمارا ملک بھی ان جیسے ڈاکوؤں سے پاک ہو جائے۔ کوہِ ندا بہترین کہانی تھی۔ حاتم نے بڑی خوب صورتی سے کوہِ ندا کو تلاش کر لیا۔ بس سمجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔“

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی انکساری ” سبز آنکھوں والی خوب صورت دوشیزہ کا انداز تو جشنِ آزادی کی تقریبات میں شامل ہونے جیسا ہے لیکن آنکھوں کی ہلکی ہلکی لالی حزن و ملال کی کیفیت بھی ظاہر کر رہی ہے۔ مرد پریشانیوں میں گھرا نشے کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ تعویذ گنڈے اور ٹُٹکے نے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ جانے کب لوگ ایسے سہاروں سے باز آئیں گے۔ اور سچی بات ہے ڈھونگی قسم کے پیروں فقیروں کے تعویذوں سے کسی کی اتفاقیہ تقدیر تو بھلے سنور جائے لیکن وہ اپنے مقدر نہیں سنوار پاتے۔ جیسا پہلے رنگ کے فیضی کے ساتھ ہوا وہ اپنی محبوبہ کے لیے ہمیشہ ترستا رہا اور پیسے کمانے کو آسان ذریعے سے عامل بن بیٹھا۔ نیلی کے بھائی نے دولت حاصل کرنے کو انتہائی غلط اور گھٹیا اختیار کیا سو وہ بھی انجام کو پہنچا۔ منظر امام کی ایسی کہانیاں میں بہت پسند کرتا ہوں۔ شرمین کی ذہانت نے کارل کو مشتبہ پایا اور دھر لیا گیا۔ للکارو وہ بھی پولیس سے۔ طاہر جاوید مغل انکل کی انگارے تو اب ہکا بکا ہی کر رہی ہے۔ پہلے اچانک تاجور کو شاہ زیب کے سیل میں پہنچا دیا اور اچانک رہائی اور اب پھر ڈی پیلس کی طرف یلغار امید ہے اب ملائی عوام کے لیے کچھ کر کے لوٹیں گے بھٹی صاحب کی آوارہ گردی بھی اپنے عروج پر ہے۔ شہزی نے رینجرز اور پولیس حکام کو اپنی سرگزشت سنا کر کسی حد تک رعایت حاصل کر لی ہے۔ دوراستے میں انقلابی جماعت کے احسن اور معاذ نے بڑی قربانی دی خاص کر اس نے جسے گیس بم نے شیشے کے کیبن سے نکلنے کی مہلت نہ دی، باقی مستقبل کی انقلابی جماعت نے اور آرمی نے ٹیکنالوجی کی بدولت اپنے ملک کا دفاع مضبوط کیا۔ کبیر عباسی نے بہترین کہانی لکھی۔ وہ خنجر بکف تھا۔ نارائن عرف تنا کئی لڑکیاں اس کی بیڈ کی زینت بنیں لیکن اپنی محبوبہ سمیتا دیوی کو کبھی نہ پہچان سکا جس نے اُس کے پیار میں اس کے دشمن بھی ختم کر دیے۔ دادا گیر ممبئی سے در آمد امجد جاوید کی کہانی زبردست رہی۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔ ادریس احمد خان، کراچی۔ محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ محمد اقبال، کراچی۔ ذیشان حیدر کاظمی، نارووال۔

www.paksociety.com

رقصِ ابلیس

ڈاکٹر سلیم عادل

ایسے لوگ جن کے پاس کوئی خاص صلاحیت نہیں ہوتی... بڑی آن بان کے ساتھ سر اٹھا کر اکڑ کے چلتے ہیں... جمیکا کی سرزمین پر سیاحت کے لیے آنے والے چند ایسے ہی کرداروں کا ملاپ... واقعات کی اپنی منطق ہوتی ہے... مستی و مسرت کے لمحات میں اچانک ہی ایک ایسا تنوع آیا کہ ہر چیز تلپٹ ہو کے رہ گئی... وہ جو اپنی زندگی کے دنوں کو خوشیوں سے یادگار بنانے آئے تھے... خوف... دہشت اور لہو کے چھینٹوں سے رنگتے چلے گئے۔ دولت کا لالچ... جو انسان کے دل سے ہر جذبے اور ہر احساس کو فنا کر دیتا ہے... زر کے حصول نے اسے بھی پاگل کر دیا تھا... وہ ہر ایک کا دشمن بن چکا تھا... اس کی دہشت و بربریت کی لپیٹ میں وہ عورت بھی آگئی جو زندگی کی پریشانیوں سے فرار حاصل کرنے اس سرزمین پر آئی تھی... زندگی کے دن لمحہ بہ لمحہ ختم ہو رہے تھے... قاتل کی تیز نگاہیں اس کی تلاش میں مسلسل گردش میں تھیں... سنسنی... ایڈونچر... اور تجسس سے بھرپور شاہکار...

دل تھام لینے والی ساعتوں سے لبریز ایک شعلہ و شبنم کہانی کے اتار چڑھاؤ

وہ ایک ماہر تیراک کی طرح تیر رہا تھا۔ اس کے مضبوط بازو دھوپ کی تمازت میں دمک رہے تھے۔ میں عام طور پر مردوں کا اس طرح مشاہدہ نہیں کرتی مگر شاید کچھ بیزاری تھی اور کچھ مشروب کا اثر اور پھر وہاں کچھ دیکھنے کے لائق تھا بھی نہیں۔

میں کنگسٹن جمیکا کے مونٹیگو بے نامی ایک گھٹیا سے ہوٹل کے سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھی تھی۔ ایک ہفتے پر محیط تعطیلات کا یہ تیسرا دن تھا۔ تنہائی اور مایوسی کاٹنے کو آرہی تھی۔ مجھے یہاں اور امریکا میں اپنے شہر نیو آرک میں کچھ خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں وہاں پر ایک پرائیویٹ سراغ رساں کمپنی چلاتی ہوں۔ رہ رہ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش اگر میں نے کچھ اور پیسے پس انداز کر لیے ہوتے تو شاید اپنے تیرہ سالہ بیٹے جمال کو بھی ساتھ لے آتی - اس بات سے آپ کو میرے مالی حالات کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔

اس سفر کے آغاز میں تو سب کچھ ٹھیک ہی تھا۔ یہاں تک آنے کا یک طرفہ ٹکٹ مجھے مفت میں مل گیا تھا۔ چند ماہ قبل میں نے وانٹویٹا گرین نامی اپنی زلف تراش کی چھوٹی بہن کو نیو جرسی کے بے رحم قانونی چنگل سے رہائی دلائی تھی۔ اب اس غریب کے پاس بھی میری فیس ادا کرنے کے لیے پورے پیسے نہیں تھے تو اس نے جزوی معاوضے کے طور پر مجھے کنگسٹن تک کا یہ ٹکٹ دے دیا تھا جو اس نے شاید کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

لاٹری میں جیتا تھا۔ واپسی کا کرایہ اور ہوٹل کا خرچہ چونکہ میرے ذمے تھا اس لیے میں نے سستی ترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ شروع شروع میں تو یہاں کی مسحور کن آب و ہوا جس میں کیلے اور مختلف مسالاجات کے درختوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی بہت ہی بھلی لگی۔ پھر اگلے دن میں نے وہاں کے تمام مشہور مقامات مثلاً ڈیون ہاؤس، باب مارلی میوزیم اور ہوپ گارڈنز کی سیر کر ڈالی۔ کچھ یہاں کی دست کاریوں کے بازار میں دکان دار عورتوں سے بھاؤ تاؤ کرنے میں بھی اچھا وقت گزرا۔

مگر آج صبح میں سو کر اٹھی تو گردن میں شدید اکڑاؤ تھا جس کی وجہ سے میں نے کافی وقت اپنے کمرے میں ہی گزارا۔ کمرے کا ائرکنڈیشنر جواب دے گیا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد ٹیلی وژن بھی۔ میں ہوٹل کے ریستوران میں چلی آئی اور ناشتا منگوایا۔ انڈے کچے تھے، توس ٹھنڈے اور کافی! خیر اس کے بارے میں تو کچھ نہ ہی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ سو میں نے تھوڑا سا چکھنے کے بعد ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں پکڑا اور سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ کر اس ماہر تیراک کو دیکھنے لگی۔

مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کب ایک عورت میرے ساتھ والی دراز کرسی پر آ کر لیٹ گئی اور مجھ سے بات چیت کی کوشش کرنے لگی۔

”اوہ، لگتا ہے آپ نے مجھے دیکھا نہیں۔ دیکھو تو کپڑوں میں ہماری پسند کتنی ملتی جلتی ہے۔“ اس نے اپنے گلابی شیشوں والے چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو اس نے بھی میرے ہی جیسا سرخ رنگ کا مختصر سا تیراکی کا لباس پہن رکھا تھا مگر اس کا وزن مجھ سے لگ بھگ بیس پاؤنڈ کم اور عمر تقریباً پندرہ سال کم تھی۔ وہ کافی خوب صورت تھی اور اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ بال سرخی مائل بھورے تھے جو اس کی جلد سے تقریباً ہم رنگ تھے۔ اس کی آواز بھی بچوں جیسی ہی تھی۔ ایک چھوٹا سا مگر مہنگا کیمرا اس کے سینے کے بیچوں بیچ جھول رہا تھا۔

”آپ بھی اعلیٰ ذوق والی لگتی ہیں۔“ اور پھر وہ میری نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرے شوہر کا دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہمارے کاروباری مراسم ہیں۔“ پھر رکتے رکتے بولی۔ ”ڈیلاویر۔ یہی ہے اس کا نام۔ حالانکہ وہ ہم سب کی طرح جرسی سٹی کا رہنے والا ہے۔ ڈیلاویر براؤن۔ سوچو بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا؟ مگر اسے یہی کہلوانا پسند ہے۔“

میں نے اب تک اس کی باتوں کا صرف سر ہلا کر ہی جواب دیا تھا۔

”کیا تم اس سے ملنا چاہو گی؟“ اس کے سوال نے مجھے حیران کر دیا۔

”نہیں۔“ میں نے قدرے ناگواری سے جواب دیا اور قریب پڑی میز سے رسالہ اٹھا کر الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر جلدی سے بولی۔ ”اوہو! معاف کرنا شاید میں نے آپ کو پریشان کیا۔ میرا شوہر کہتا ہے کہ میں بعض اوقات بہت ہی نامعقول اور بے تکی باتیں کرتی ہوں۔“

یہ بات اس نے اس قدر معصومیت سے کی تھی کہ مجھے لگا کہ شاید وہ میرے اندازے سے بھی زیادہ کم سن اور نادان تھی۔

”نہیں، کوئی بات نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ میں نے تمہاری بات کا برا نہیں منایا۔“ میں نے رسمی خوش خلقی سے کہا۔ یہ سنتے ہی وہ کسی بچے کی طرح کھل اٹھی۔

”چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرا نام لائلہ ہے۔ لائلہ لو۔“ پھر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ ”ویسے میرا اصلی نام تو ڈیلائلہ ہے مگر مجھے لائلہ کہلانا زیادہ پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسٹیج کی کسی بہت مشہور اداکارہ کا نام ہو۔ لائلہ لو۔“ وہ ہوا میں بازو لہرا کر بولی۔ میں پھر رسماً مسکرا دی۔

”اور تم؟“

”تمارا ہیل۔“ میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے یہ تو بہت ہی خوب صورت نام ہے۔ عجیب سی نغمگی ہے تمہارے نام میں۔“ پھر اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تمہاری ایک تصویر کھینچ سکتی ہوں؟“ شاید اسے کوئی اور بات نہ سوجھی تھی۔

”میری تصویر؟“

”ہاں مجھے تمہارا چہرہ بہت ہی اچھا لگا ہے۔ اب اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ دراصل ہم دونوں کی پسند بھی ایک جیسی ہے اور ہم دونوں ویسے بھی اسٹائلش ہیں تو جو لوگ مجھے پسند آتے ہیں میں ان کی تصویر کھینچ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہوں شاید اپنے پچھلے جنم میں، میں کوئی فوٹو گرافر رہی ہوں گی۔“

میں نے ایک لمحے اس کی طرف دیکھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ ”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے

بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

اس نے کھڑے ہو کر میری چند تصویریں کھینچ لیں پھر ایک ویٹر کو قریب آتا دیکھ کر دوبارہ بیٹھ گئی اور اپنے لیے جام کا آرڈر دیا پھر مجھ سے پوچھا تو میں نے معذرت کر لی۔

"کچھ تو پیو۔" اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو مجھے بھی پیاس کا احساس ہونے لگا۔

"چلو پھر میں کلب سوڈا پی لوں گی تھوڑے سے لیمن جوس کے ساتھ۔" میں نے پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم امریکا میں کہاں سے ہو؟" لائلہ نے پھر سلسلۂ کلام چھیڑا۔

"جرسی سے۔"

"جرسی سٹی! ارے دیکھو تو تم بھی ہمارے شہر کی نکلیں۔"

"نہیں میں نیوآرک میں رہتی ہوں۔" میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ نیوآرک۔ میرے ابا نیوآرک سے تھے مگر میری پیدائش کے بعد وہ جرسی سٹی منتقل ہو گئے تھے۔ کیا تمہاری پیدائش بھی وہیں کی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے رسالہ دوبارہ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ شاید اُس کا شوہر ٹھیک ہی کہتا تھا۔

"اچھا میں ابھی آتی ہوں۔" وہ میرے بازو کو ہلکے سے چھو کر بولی۔

میں سوچنے لگی کہ شاید میرے کمرے کا ائرکنڈیشنز اب تک ٹھیک ہو گیا ہو گا مگر قبل اس کے کہ میں اپنے کمرے میں واپس جانے کا سوچتی، وہ ایک آدمی کا ہاتھ تھامے واپس آ گئی۔

"تمارا ہیل! یہ میرے شوہر ہیں سیمی لی لو۔" اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

سیمی لی نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی جیسے وہ کوئی نٹ کھٹ سی بچی ہو وہ اس سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ کافی لمبا چوڑا اور بھاری بھر کم سا۔ اس کی آنکھوں سے عجیب سی بے رحمی جھلکتی تھی۔

"میری بیوی ڈیلا ئلہ بتا رہی تھی کہ آپ بھی ہمارے شہر سے ہیں۔" اس نے اپنی بیوی کا ذکر ایسے کیا جیسے وہ اسے اپنے سے کم تر سمجھتا ہو مگر لائلہ کو اس کی کوئی فکر نہ تھی وہ اسی بے تکے انداز میں ہنستی رہی۔

"میں نیوآرک سے ہوں۔"

"اچھی جگہ ہے۔ تو یہاں تفریح کی غرض سے آئی ہیں؟" شاید اسے بھی کوئی اور بات نہیں سوجھی تھی۔

"ہاں! کہہ سکتے ہیں۔" میں نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

"اچھا وقت گزر رہا ہے؟"

"ہاں! کہہ سکتے ہیں۔"

"کیا کافی دن رہنے کا پروگرام ہے؟"

"نہیں کچھ زیادہ نہیں۔"

"بہت خوب! مجھے کم گو عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ بس اتنی ہی بات کریں جتنی کہ ضرورت ہو۔" اس نے لائلہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کھسیانے انداز میں نیچے دیکھنے لگی پھر وہ تیراک کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ہے! براؤن! کیا پول کو توڑ کر ہی باہر آؤ گے؟ وہ ڈیلاویر براؤن ہے۔ میرا دوست۔"

تیراک اس کی صدا سن کر پول سے باہر آیا اور قریب بڑا تولیا اپنے اردگرد لپیٹ کر ہماری طرف چلنے لگا۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ سڈول کسرتی جسم۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کافی عرصہ باکسنگ رنگ میں بھی گزار چکا ہو۔ اس کی چال سے لگتا تھا جیسے اسے اپنے ڈیل ڈول پر بڑا ناز ہے۔

ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کہا۔

"سیمی بڑی گرمی لگ رہی ہے یار، میں ایک ڈرنک لینے جا رہا ہوں۔"

"چلو لائلہ، میں بھی براؤن کے ساتھ ایک ڈرنک پینا چاہتا ہوں۔" سیمی اپنا آہنی ہاتھ لائلہ کے نازک کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ لائلہ نے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تو وہ اکیلا ہی بار کی طرف چل دیا۔ پھر کچھ سوچ کر لائلہ بھی مڑی اور جاتے جاتے بولی۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی تمارا ہیل۔"

"مجھے بھی۔" میں نے بھی اسی خوش دلی سے جواب دیا۔

اب سوچا جائے تو اس قصے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ کسی بھی ہوش مند اور سمجھ دار عورت کو سیمی لی، لائلہ لو اور براؤن جیسے مشکوک کرداروں سے بچ کر ہی رہنا چاہیے تھا مگر میں تو ہمیشہ سے ہی اپنی حماقتوں کی وجہ سے مصیبت میں پھنسنے کی عادی تھی۔ جب کچھ دیر بعد لائلہ واپس آئی اور پھر بے تکان ہانکنے لگی تو میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"سیمی اور میں سوچ رہے تھے کہ تم نے غالباً کنگسٹن کا وہی حصہ دیکھا ہے جو کہ گائڈ بکس میں چھپتا ہے مگر ہمیں جمیکا آئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ ہمیں "اصلی جمیکا" کا پتا ہے

جو کتابوں میں نہیں پایا جاتا۔ ہم تینوں شام کو کچھ سیر سپاٹے کے لیے نکلیں گے۔ کیا تم ہمارے ساتھ آنا پسند کرو گی؟ براؤن اپنے ہوٹل سے گاڑی لے آئے گا پھر ہم جہاں چاہے گھوم پھر سکیں گے۔ تمہیں ضرور اچھا لگے گا۔ کلبوں میں ساری رات موج مستی کریں گے۔ آج رات تم ہماری مہمان ہوگی اور تمہارا سارا خرچہ ہم اٹھائیں گے۔'' وہ بچوں کی طرح ضد کررہی تھی۔ میں نے جب کوئی جواب نہ دیا تو کہنے لگی۔ ''دیکھو تمارا! کنگسٹن جیسا شہر اکیلے سیاح کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ پھر جب تم ہمارے ساتھ آؤ گی تو مجھے بھی تمہارا ساتھ مل جائے گا۔ چلو نا پلیز۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی لجاجت تھی کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر بیٹھی۔

''ہم کمرا نمبر 314 میں ہیں۔ یا پھر بہتر رہے گا اگر ہم اسی جگہ پر دس بجے ملیں۔'' وہ اپنے تئیں تمام پروگرام طے کرچکی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا مگر میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئی تھیں۔

اس رات جب ہم اسٹیپ اینڈ گو نامی کلب میں داخل ہوئے تو وہاں موجود تین نوجوان ایسے تھے جنہیں دیکھتے ہی مجھے خطرے کی بُو آئی تھی۔ وہ تینوں بار کے پاس بیٹھے تھے۔ اسٹیپ اینڈ گو کلب ایک چھوٹا سا کلب تھا جو شہر کے انتہائی غیر معروف علاقے میں واقع تھا۔ وہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے اور کپڑے بھی ایک ہی طرح کے پہنے ہوئے تھے۔ ہوڈ والی جیکٹس اور ڈھیلی ڈھالی جینز۔ ان کے چہروں پر عجیب سی کرختگی تھی جیسے اتنی کم عمری ہی میں انہوں نے دنیا کی تلخ حقیقتوں سے واقفیت حاصل کرلی ہو۔ غربت کی گود میں پلے یہ نوجوان خواہ نیوآرک کی کسی جیل میں ہوں یا پھر کنگسٹن کے اس گھٹیا سے بار میں، ان کے چہروں پر ایک ہی طرح کی بے خوفی پائی جاتی ہے مگر میں ان پر زیادہ دھیان نہ دے پائی تھی کیونکہ تمام راستے سیمی کی غلیظ گفتگو سن کر میرے کان پک چکے تھے۔ کلب کی تنگ و تاریک راہداری سے گزر کر ہم ایک غار نما کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں چار بڑے بڑے سرخ بلب دھول اور مٹی سے اٹی دیواروں پر عجیب سے لہورنگ ڈیزائن بنارہے تھے۔ ایک کونے سے اونچے میوزک کا شور اٹھ رہا تھا۔ پرانے گھسے پٹے گانے جو شاید میں نے اپنی نوجوانی میں سنے تھے پھر ایک ایسا ہی گانا سنتے ہی مجھے اپنے بھائی جونی کی یاد آگئی جسے اس جہانِ فانی سے گزرے پندرہ برس ہو گئے تھے۔ پچیس سال کی عمر میں ہی جونی نے خودکشی کرلی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے صدمے نے ایک ایک کرکے میرے والدین کی بھی جان لے لی اور میں اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ اس وقت وہ گانا جو جونی کو بہت پسند تھا، سنتے ہی اس کی یاد نے اداس کردیا تھا۔

کلب میں داخل ہوتے ہی وہاں موجود لوگوں نے ہماری جانب مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کچھ تیز میک اپ کیے اور چست اور باریک لباس زیب تن کیے غالباً پیشہ ور عورتیں تھیں جبکہ کچھ مزدور پیشہ مرد بار کے پاس بیٹھے جام پہ جام چڑھا رہے تھے۔ ان عورتوں نے میری اور لائلہ کی طرف زہرآلود نظروں سے گھورا مگر لائلہ ان کے سامنے سے سر کو بے رخی سے جھٹک کر گزر گئی۔ اس رات میں نے سفید رنگ کا ڈریس پہنا ہوا تھا جبکہ لائلہ گہرے سرخ رنگ کی نہایت چست اور مختصر اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس نے اپنے کیمرے پر ایک چھوٹا سا فلیش بھی لگا رکھا تھا۔

سیمی لی نشے میں دھت تھا اور مزید پیتا جارہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی غلیظ سے غلیظ تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کا ایک نشانہ تو لائلہ ہی تھی جسے وہ بری طرح ذلیل کررہا تھا۔ کبھی اس کے لباس پر اعتراض تو کبھی اس کی چال ڈھال پر۔ براؤن خاموش تھا۔ کلب میں داخل ہوتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کسی کو تلاش کررہا ہو۔

ان تین نوجوانوں کے عقب میں وہاں پر دو غیر ملکی بھی موجود تھے جو غالباً سیاح تھے۔ ان میں سے ایک سنہری بالوں والا پستہ قامت گورا تھا جس کی پتلی لمبی ناک اور پتلی مونچھیں تھیں۔ اس کے قدموں کے پاس ہی ایک سیاہ رنگ کا ڈفل بیگ پڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ہوائی جہاز پر میرے ساتھ ہی جمیکا آیا تھا۔ فرسٹ کلاس میں۔ بات چیت سے جرمن لگتا تھا۔

پھر ایک سیاہ فام شخص اس گورے کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی سفید جیکٹ کے ہوڈ کو ماتھے تک کھینچ رکھا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور خوب تگڑا نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں غلافی اور خوابیدہ سی تھیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس جرمن گورے کے دوسری جانب ایک دبلا پتلا لمبا سا سیاہ فام آدمی کھڑا تھا جس کے چہرے پر چیچک کے داغ نمایاں تھے۔ براؤن کا چہرہ اس چیچک زدہ شخص کو دیکھتے ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کھل اٹھا اور وہ اس سے ملنے کے لیے بڑھا۔

”ارے لیسی! کیسے ہو تم یار، مجھے امید تھی کہ آج تم سے یہاں ضرور ملاقات ہو جائے گی۔“

لیسی، براؤن کو دیکھتے ہی غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے ایسے کندھے اچکائے جیسے کہنا چاہتا ہو کہ اب ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ لیسی بولا۔ اس کی آواز قدرے باریک اور تیز سی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ براؤن نے جواب دیا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے جیسے کوئی پرانی یاد اس بات سے جڑی ہو۔

”چلو تم سب جا کر بیٹھو، میں ابھی اپنے دوست سے بات کر کے آتا ہوں۔“ براؤن نے سیمی سے کہا۔ سیمی، لیسی کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہم پہلے کہیں مل چکے ہیں؟“

”نہیں نہیں، شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یا پھر اس کمینے کے ساتھ کنفیوز کر رہے ہو۔“ لیسی نے براؤن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دراصل جب سے ہماری دوستی ہوئی ہے، سب لوگوں کا ہی خیال ہے کہ ہماری شکلیں ایک دوسرے سے بہت ملتی ہیں۔“

”ہاں ہاں، اصل میں ہم بھائی ہیں کیونکہ میرے ابا جان اس کی ماں سے ملنے اس کے گھر جاتے تھے جب اس کا باپ گھر پر نہیں ہوتا تھا۔“ براؤن قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”دیکھو اپنی اس بکواس میں ماں باپ کو بیچ میں مت لاؤ۔“ لیسی نے برا مناتے ہوئے کہا مگر براؤن ہنستا رہا۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ سیمی لی کی نظریں ابھی تک لیسی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ”میں جو چہرہ ایک بار دیکھ لوں کبھی بھولتا نہیں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے کہیں دیکھا ہے، خیر چلو تم دونوں اپنی باتیں کرو اور ہم پھر ملتے ہیں۔“

سیمی کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ تھی جس نے میرے اندر چھپی پولیس والی کو جھنجوڑ دیا تھا۔ اسے لائلہ نے بھی محسوس کیا تھا مگر وہ جھینپتے ہوئے سیمی لی اور براؤن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر یکایک وہ کچھ یاد کر کے بولی۔ ”میں کچھ تصویریں کھینچنا چاہتی ہوں۔“ وہ بچوں کے سے جوش و خروش سے بولی۔ ”چلو براؤن تمہاری اور تمہارے دوست کی کچھ تصویریں ہو جائیں۔“

تینوں آدمیوں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ اپنا کیمرا سیٹ کرتی رہی۔

”ارے رے...... یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ لیسی نے اپنا ہاتھ چھڑا کر دور ہونا چاہا۔

”اس فضول چیز کو دور کرو! یہاں کوئی اپنی تصویریں نہیں اتروانا چاہتا۔ یہ ایسی جگہ ہی نہیں ہے۔“ سیمی غصے سے غراتے ہوئے بولا۔

”میں تو بس اس پل کی یادوں کو محفوظ کرنا چاہتی ہوں۔“ لائلہ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ”سیمی پلیز مجھے تصویریں کھینچنے دو نا۔“ وہ تقریباً روتے ہوئے بولی۔ سیمی لی نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

”ارے اس پھٹیچر جگہ میں ایسی کون سی یادگار چیز ہے؟ بس میں اور لیسی بہت عرصے بعد مل رہے ہیں اور ہمیں بھی اس ”یادگار“ لمحے کی کوئی تصویر نہیں چاہیے۔“ براؤن نے آہستہ سے لائلہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو چھوڑو لائلہ، ضد مت کرو، رہنے دو۔“

مگر لائلہ پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”چلو چلو سب قریب قریب ہو جاؤ مجھے تم سب کو ایک ہی فریم میں لانا ہے۔“

سیمی لی اس سے بے نیاز اپنا جام اٹھائے اس جرمن گورے اور سفید جیکٹ والے کے درمیان پہنچ گیا۔ جام اٹھاتے ہی وہ پھر غرایا۔ ”اس فضول چیز کو دور کرو لائلہ۔“

مگر لائلہ پر تو تصویر کھینچنے کا بھوت سوار تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کیمرے کے ذریعے اپنے شوہر کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہی تھی۔ کھلم کھلا اس کی حکم عدولی کر رہی تھی پھر سیمی لی غصے میں مڑا اور اس جرمن شخص سے ٹکرا گیا۔ اس کا جام اس کے کپڑوں پر گر گیا۔ وہ بھی کچھ غصے میں آ گیا۔

”اوہ بھاڑ میں جاؤ تم سب۔“ وہ غصے سے بڑبڑایا۔ اور پھر لائلہ نے ایسی حالت میں اس کی تصویر کھینچ لی۔ اس نے فوراً اپنے ہاتھ سے چہرے کو ڈھانپنا چاہا مگر دیر ہو چکی تھی۔

”کیا کہا تم نے۔“ سیمی لی اچانک اپنی بیوی کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس آدمی نے سیمی کو اوپر سے نیچے دیکھا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”کچھ نہیں، بس کچھ نہیں، چلو جانے دو۔“

”دیکھا تم نے اس آدمی کے ساتھ کیا کیا؟ باز نہیں

آتی بے وقوف عورت۔" سیمی کا غصہ ایک بار پھر لائلہ پر مرکوز ہو چکا تھا۔

"اچھا چلو میں تم سے پھر بعد میں بات کروں گا۔" براؤن نے کیسی سے کہا۔

"تم ٹھہرے ہوئے کہاں ہو؟ مجھے بتاؤ میں تمہیں فون کروں گا۔" کیسی بولا۔

"میں نیو کنگسٹن میں بیل ایئر نامی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ روم نمبر 207 فون ضرور کرنا۔ روم نمبر 207۔" براؤن نے نمبر دہراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو سیمی اب کہیں جا کر بیٹھتے ہیں۔" براؤن، سیمی لی کا بازو تھام کر قریب ہی ایک ٹیبل کی طرف لے چلا۔ اس کے گرد چار کرسیاں لگی تھیں۔ پھر ہم چاروں ٹیبل کے اردگرد بیٹھ گئے اور سیمی لی نے بہ آواز بلند سب کے لیے شراب کا آرڈر دیا۔

سیمی لی ان لوگوں میں سے تھا جو پی کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کا نشہ بڑھتا ہے ویسے ویسے ان کی بداخلاقی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

"دیکھا تم نے اس شخص کے ساتھ کتنی بری حرکت کی؟ اپنے اس بے ہودہ شوق کی خاطر۔ کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا مگر تم باز ہی نہیں آتیں۔" سیمی لی پھر لائلہ کو ڈانٹنے لگا۔

"چپ بھی کرو سیمی تمہیں تو بس رعب جھاڑنا آتا ہے۔" لائلہ نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھا براؤن! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ کتیا کبھی میرا کہنا نہیں مانتی۔" سیمی لی زور سے لائلہ کی کلائی پکڑتے ہوئے بولا۔ لائلہ کے ہاتھ سے جام گر گیا اور اس کا سرخ لباس بھیگ گیا۔

"ارے جانے بھی دو سیمی۔ آج کس کس کو شراب میں نہلاؤ گے۔" براؤن نے مسکراتے ہوئے لائلہ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ وہ بھی مسکرانے لگی مگر سیمی لی کا غصہ کم نہ ہوا۔

"نہیں براؤن یہ ہمیشہ ایسے ہی کرتی ہے۔ میں تو اس سے تنگ آ چکا ہوں۔"

براؤن نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور خاموشی سے سیمی لی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری نمایاں تھی۔

"ہاں سب میرا ہی قصور ہے۔ میں نے ہی اس آدمی کے اوپر شراب گرائی اور اپنے اوپر بھی۔ تم ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہو۔ تمہاری شراب اور اس سے ہونے والے حادثات کی ذمے دار ہمیشہ میں ہی ہوتی ہوں۔" لائلہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا اور اپنے چھوٹے سے پرس سے رومال نکال کر اپنے لباس کو صاف کرنے لگی۔ میں نے بھی اپنے ہینڈ بیگ سے کچھ ٹشو پیپر نکال کر اس کی مدد کی۔ تبھی مجھے اس کے بازو پر پڑے نیل کے نشان نظر آئے۔ یہ یقیناً سیمی لی کے دیے ہوئے تحفے تھے۔ مجھے اس بے چاری لڑکی سے ہمدردی ہونے لگی۔

"لائلہ تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں محض اس کے لباس پر گری شراب کے بارے میں نہیں پوچھ رہی ہوں۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ پلیز ذرا میری ان چیزوں کو سنبھالنا۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ بھی بھیگ کر خراب ہو جائیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چھوٹا سا پرس اور کیمرا مجھے تھما دیا۔ میں نے دونوں چیزیں اپنے کافی بڑے سائز کے ہینڈ بیگ میں ڈال لیں۔

"تم بہت گھٹیا آدمی ہو۔ اپنی غلطیوں کو ہمیشہ اپنی بیوی پر تھوپتے ہو۔ آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔" براؤن، لائلہ کی حمایت میں بولا مگر سیمی لی پر کچھ اثر نہ ہوا۔

"میں نے اس بے وقوف عورت سے کہا بھی تھا کہ ایسا لباس نہ پہنے۔ خاص طور پر ایسی جگہ پر۔ ہر کوئی اسے بازاری عورت ہی سمجھ رہا ہوگا۔"

"بس بھی کرو سیمی۔ تم سب کے بارے میں غلط ہی کیوں سوچتے ہو۔" لائلہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"میں یہاں کسی کمینے سے نہیں ڈرتا۔" سیمی لی چنگھاڑتے ہوئے بولا۔

میں اس دوران اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سوچ رہی تھی اب اگر میں اس جگہ سے نکلنا چاہوں تو اپنے ہوٹل تک کیسے پہنچوں گی؟ براؤن نے یہاں آتے وقت اتنی تیزی سے گاڑی دوڑائی تھی کہ مجھے کچھ اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ ہم کہاں پہنچ گئے تھے اور اب میں اپنے اوپر لعنت ملامت کر رہی تھی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ آئی ہی کیوں۔

میں لائلہ کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے اور سیمی کے تعلقات مجھے اپنے سابقہ شوہر ڈیوین کرٹس کی یاد دلا رہے تھے۔ اگرچہ ڈیوین نے کبھی مجھ پر ہاتھ تو نہیں اٹھایا تھا مگر سیمی کی طرح اس کی رعب ڈالنے کی عادت تھی۔ اس کے دوسری عورتوں سے تعلقات، بے رخی اور جھوٹ بولنے کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عادت نے میری عزتِ نفس کو بری طرح مجروح کیا تھا۔ اُن دنوں میں بھی لائلہ کی طرح خود کو بے بس اور مجبور محسوس کرتی تھی اور کسی طرح بھی اس گھٹیا آدمی کے چنگل سے نکلنا چاہتی تھی۔

لائلہ نے ڈرنک کے لیے پوچھا تو میں نے معذرت کر لی۔ میں اس کے بازو پر پڑے نیلوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجانے ایسے کتنے اور نشان اس کے بدن پر ہوں گے۔ نہ جانے سیمی لی اس پر کتنا تشدد کرتا ہوگا۔ مجھے اس سے ایک بڑی بہن کی طرح ہمدردی ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ ہوٹل واپس جا کر اس سے اس بارے میں ضرور بات کروں گی مگر اس سے پہلے زیادہ ضروری تھا اس گھٹیا جگہ سے نکلنا!

میں نے سوچا کہ یہاں کے کسی ویٹر سے واپس جانے کا راستہ معلوم کر لوں گی۔

“تمارا تم کرتی کیا ہو؟ شکل سے تو تم اسکول ٹیچر ہی لگتی ہو۔” لائلہ نے اپنی بچوں جیسی آواز میں پوچھا۔

عموماً میں کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی مگر اس دن بتا دیا۔ “میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ پہلے میں کافی عرصے پولیس سے وابستہ رہی ہوں۔”

“تم پولیس والی ہو؟” سیمی زور سے چیخا۔

“تمہارا مطلب ہے کہ ہم اب تک ایک پولیس والی کے ساتھ بیٹھے ڈرنک کر رہے تھے۔” سیمی کو شاید اب تک اس بات کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔

براؤن قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ “سیمی! یار تم بھی پولیس والوں کو ڈھونڈ ہی نکالتے ہو۔”

“سیمی لی کی باتوں کا برا مت منانا۔ اسے ایسے ہی فضول بکواس کرنے کی عادت ہے۔” لائلہ لجاجت سے بولی۔

“اور تم تینوں کیا کام کرتے ہو؟” میں نے پولیس والوں کی طرح تفتیشی انداز میں سوال کیا۔

“براؤن یہاں پر کاروبار کرتا ہے۔ وہ ایک تاجر ہے۔ ڈیلا ئلہ میری بیوی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں کرتی۔ اور میں...... میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہوں۔”

“تو تم اس امپورٹ ایکسپورٹ بزنس کے توسط سے ہی ملے؟”

تینوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

“اور کس چیز کی امپورٹ اور ایکسپورٹ کرتے ہو تم سیمی لی؟ گو کہ یہ سمجھنے کے لیے راکٹ سائنس میں پی ایچ ڈی ہونا ضروری نہیں۔” میری تفتیش جاری تھی۔ اگرچہ میں سمجھ چکی تھی کہ اس کا دھندا کیا تھا۔ کوکین، چرس، افیم اور دیگر منشیات۔ یہ سب جمیکا کی سرزمین میں خوب اُگتی تھیں اور یہاں سے غیر قانونی طور پر باہر ایکسپورٹ کی جاتی تھیں۔ ان کی منزل عام طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکا ہی ہوا کرتی تھی۔

سیمی میرے لہجے میں چھپا طنز محسوس کر چکا تھا۔ “اگر تم اتنی بڑی عمر کی اور تھکی ہوئی نہ ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ کافی کچھ کر سکتا تھا۔” وہ خبیث انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

“اوہ سیمی، تم ہر کسی کے ساتھ ایسی ہتک آمیز گفتگو ہی کیوں کرتے ہو؟” لائلہ شکایتی انداز میں بولی۔

“اگر میں اتنا برا ہوں تو تم اب تک میرے ساتھ کیوں چپکی ہوئی ہو؟ ویسے بھی مجھے سب پتا ہے تمہارے اور اس کے بیچ جو چکر چل رہا ہے۔” سیمی لی نے براؤن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اگرچہ یہ بات اس نے تقریباً مذاق میں کہی تھی مگر لائلہ اور براؤن ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر جھینپ سے گئے۔

“میں تو اب اور زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔” میں نے کھڑے ہو کر اپنے ہینڈ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر کسی نے میری طرف دھیان دیا نہ ہی میری بات پر توجہ دی۔

“سیمی لی تم مجھے اور براؤن کو جانتے ہو۔ تم نے ایسی بات سوچی بھی کیسے۔” لائلہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ سیمی یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور نہایت سرعت کے ساتھ دو تھپڑ لائلہ کے منہ پر جڑ دیے۔ لگتا تھا اسے اس کام میں کافی مہارت حاصل تھی۔ لائلہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔

“چلو لائلہ میرے ساتھ ہوٹل واپس چلو۔” میں نے اس کو ڈھارس دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ “تم جیسی معصوم اور پیاری لڑکی کو یہ سب کچھ برداشت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔”

سیمی واپس بیٹھ کر گھناؤنے انداز میں ہنسنے لگا پھر براؤن کی طرف دیکھ کر بولا۔ “تم سمجھتے تھے کہ تم اس طرح میری بیوی سے ملتے رہو گے اور مجھے خبر تک نہ ہوگی۔ میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سب جانتا ہوں تم دونوں کے بیچ جو معاشقہ چل رہا ہے اور سوچو کہ میں تمہیں اپنا دوست مانتا تھا۔ تم تو آستین کے سانپ نکلے کمینے......!'' وہ ابھی اپنی بات مکمل نہ کرنے پایا تھا کہ گولیاں چلنے لگیں۔ تڑتڑتڑتڑ...... پھر کچھ گولیاں اوپر لگے بلبوں پر لگیں اور پورا کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ گولیاں کہیں قریب ہی سے چل رہی تھیں۔ میں فوراً اپنے آپ کو بچانے کی خاطر ٹیبل کے نیچے چھپ گئی۔

میں سانس روکے بیٹھی رہی اور پسینے سے میرا لباس تربتر ہو گیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد گولیاں دوبارہ چلنی شروع ہو گئیں۔ یہ انہی تین نوجوان لڑکوں کا کام لگتا تھا۔ اگرچہ میں انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ یہ وہی تھے جو اپنی جوانی کے جوش میں ایسی واہیات حرکات کو ہی مردانگی کا ثبوت سمجھتے تھے۔ خواہ اس کی زد میں آکر کوئی زخمی ہو یا جان سے جائے۔

میرا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر ٹیبل بھی لرزنے لگی۔ جیسے کوئی بھاری چیز اس سے ٹکرائی ہو۔ میں کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہاں پر بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی اور وہ سب نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ پھر اچانک گولیوں کی آواز بند ہو گئی اور خاموشی چھا گئی پھر کسی نے چیخ ماری۔ میں کمرے میں پھیلے خوف کو سونگھ سکتی تھی۔ ''لائلہ...... لائلہ......!'' میں نے اسے پکارا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔

پھر مجھے خون کی بُو آئی۔ تازہ خون کی بُو۔ میں نے اندھیرے میں یہاں وہاں ٹٹولنا شروع کیا۔ کیا مجھے گولی لگ گئی تھی؟ مگر مجھے کوئی ایسی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں نے باہری دروازے سے آتی مدھم سی روشنی میں دیکھا کہ خون میرے اوپر کی ٹیبل سے ٹپک رہا تھا پھر مجھے اس کا جوتا نظر آیا۔ اس کا بے جان ہاتھ ذرا اوپر لٹک رہا تھا۔ موٹی بھدی انگلیاں اور ان میں پھنسی تین انگوٹھیاں۔ میں نے اس کا پیر پرے کیا اور آہستہ سے میز کے نیچے سے باہر آئی۔ اس کے سینے میں ایک بڑا سا گھاؤ تھا جس سے خون بہہ رہا تھا پھر میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ سیمی لی، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھلی تھیں مگر ساکت اور بے جان۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی بیوی اور دوست وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سیمی لی کسی گولی کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ اسے چاقو کے وار سے قتل کیا گیا تھا۔

''سیمی لی۔'' میں نے آہستہ سے پکارا جیسے اب بھی امید ہو کہ وہ جواب میں اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس کا خون بہہ کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ کمرا ابھی تک تاریکی میں تھا بس باہری دروازے سے تھوڑی سی روشنی آ رہی تھی۔ سب لوگ اسی راستے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ارے کوئی ہے! مجھے یہاں پر مدد کی ضرورت ہے۔'' مجھے اپنی آواز سن کر خود ہی تعجب ہو رہا تھا۔ میں نے پولیس والوں جیسے بارعب آواز میں صدا دی۔ ''یہاں ایک آدمی شدید زخمی ہے۔ مدد چاہیے۔'' مگر حیرت انگیز طور پر میری آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ نجانے کتنے لوگ زخمی ہوئے تھے؟ نہ جانے کسی نے پولیس یا ایمبولینس کو فون بھی کیا تھا یا نہیں؟

ایک عورت نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے جلدی باہر بھاگو! تمہاری بہتری اسی میں ہے۔'' میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی عورت تھی جسے میں نے اندر داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ ''اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ادھر ایک گورا آدمی بھی خون تھوک رہا ہے۔ یہاں رکو گی تو پھنس جاؤ گی۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اب یہاں سے بھاگو۔'' اس نے خود بھی تقریباً بھاگتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ مجھے سیمی کی لاش سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں نے براؤن اور لائلہ کو ڈھونڈنے کی ایک بار پھر کوشش کی مگر ان کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ شاید سیمی لی جیسے گھٹیا آدمی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کس بے رحمی کے ساتھ اس نے لائلہ کو تھپڑ مارے تھے۔ کسی نے میرے ساتھ ایسا کیا ہوتا تو میں اس کا خون کر دیتی تو کیا لائلہ نے ہی سیمی لی کا قتل کیا تھا؟ کیا وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی وہ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں۔ کیا وہ کسی کی جان لے سکتی تھی؟

پھر میں نے سوچا کہ میں اس کے بارے میں جانتی ہی کیا تھی۔ بس وہی جو اس نے مجھ سے کہا یا پھر مجھے دکھایا۔ شاید میں اسے ضرورت سے زیادہ ہی معصوم اور مظلوم سمجھ رہی تھی۔

ایک موقع سامنے آیا اور انہی دونوں میں سے کسی ایک نے اس سے فائدہ اٹھا لیا تھا یا پھر وہ دونوں ہی آپس میں ملے ہوئے تھے۔ میں نے اس ٹیبل کی جانب دیکھا جس کے اطراف ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ براؤن مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے لیے سیمی لی کو دھکا دے کر گرانا اور پھر چاقو اس کے سینے میں اتار دینا کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔

جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔

میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی جس نے مجھے بتایا کہ

وہ عورت بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ ”یہاں سے بھاگو۔“ میں نے سوچا کہ وقت آنے پر اس تمام واقعے سے متعلق جو معلومات میرے پاس تھیں وہ میں ایک گمنام فون کال کے ذریعے جمیکا کے پولیس ڈپارٹمنٹ کو فراہم کرسکتی تھی۔ یہ کام تو میں امریکا اپنے گھر واپس پہنچ کر بھی کرسکتی تھی یا پھر اپنے وکیل دوست جیک کی مدد بھی حاصل کرسکتی تھی۔ وہ پہلے بھی کئی بار بغیر فیس لیے مجھے اپنی خدمات فراہم کرچکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جیک کے ذریعے ہی یہ کہلا بھیجوں گی کہ میں تو ایک بے ضرر سی امریکی سیاح تھی جو اُن لوگوں کو پہلے سے جانتی بھی نہیں تھی بس سیر و تفریح کی خاطر ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس تمام واقعے سے میرا کچھ اور لینا دینا نہیں تھا بلکہ میں نے تو قتل ہوتے دیکھا بھی نہیں تھا۔

مگر اس وقت تو اصل مسئلہ ہوٹل واپس پہنچنے کا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں پہلی فلائٹ پکڑ کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا چاہتی تھی۔ ہوٹل میں کچھ اضافی دنوں کی بکنگ کے پیسے ہیں وہ ضرور ضائع ہو جائیں گے۔ تو چلو کوئی بات نہیں زندگی میں ایسے چھوٹے موٹے نقصانات تو ہوتے ہی رہتے ہیں پھر مجھے فکر لاحق ہوئی کہ ہوٹل سے نکلتے وقت کسی نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ نہ دیکھ لیا ہو مگر پھر سوچا کہ اگر ایسا ہوا بھی تو جو بھی استقبالیہ پر اس وقت موجود ہوگا، وہ اگلے دن شام کے وقت ہی اپنی شفٹ پر دوبارہ آئے گا اور اس وقت تک تو میں امریکا میں بیٹھی ہوں گی۔

میں سیمی لی کی لاش کے آس پاس ٹیبل کے اوپر نیچے اپنا ہینڈ بیگ تلاش کرنے لگی۔ یہاں سے نکلنے اور کچھ بھی کرنے کے لیے مجھے اپنے پاسپورٹ اور پیسوں کی ضرورت تھی جو دونوں ہی اس بیگ میں تھے۔ میں نے میز اور کرسیوں کے آس پاس اوپر نیچے ہر جگہ ٹٹولا۔ نیچے فرش پر ایک سخت اور نکیلی چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی۔ یہ ایک چاقو تھا۔ انتہائی تیز دھار جو استرا نما ہوتا ہے اور درمیان سے دہرا کیا جاسکتا ہے۔ اسے جیکٹ یا پتلون کی جیب میں آسانی سے چھپایا جاسکتا ہے۔ یقیناً اسی سے سیمی کو قتل کیا گیا تھا۔ میں نے کراہیت کے ساتھ اسے پرے کیا۔ مگر میرا ہینڈ بیگ بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی نہ ملا۔ اس بیگ میں میرا سب کچھ تھا یعنی پاسپورٹ، پیسے، کریڈٹ کارڈ یہاں تک کہ ہوٹل کے کمرے کی چابی تک اسی بیگ میں تھی۔ مجھے اپنے ہینڈ بیگ کے بغیر اپنا آپ عجیب بے لباس سا محسوس ہو رہا تھا۔ اب میں جمیکا سے باہر کیسے جاؤں گی۔ میرا ہینڈ بیگ کہیں لائلہ نے تو نہیں اٹھالیا؟

یقیناً یہ اسی کا کام ہوسکتا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ اس کا پرس میرے ہینڈ بیگ میں تھا۔ شاید بھاگتے ہوئے اس نے جلدی میں اپنا پرس نکالنے کی زحمت کیے بغیر میرا ہینڈ بیگ ہی اٹھا لیا ہو۔ ”اس نے میرا ہینڈ بیگ چوری کرلیا۔“ میں نے تقریباً بہ آواز بلند کہا۔ ”خدا تمہیں غارت کرے کمینی، بے ایمان، چور لڑکی۔“ میں نے دل ہی دل میں لائلہ کو ڈھیروں گالیاں دے ڈالیں۔

پھر مجھے سیمی کی وہ بات یاد آئی جس میں اس نے لائلہ اور براؤن کے چکر کا ذکر کیا تھا اور وہ دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔ ویسے بھی اگر براؤن نے ہی سیمی لی کا خون کیا تھا تو لازمی طور پر لائلہ نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اگر وہ چپ چاپ اپنے شوہر کا قتل ہوتے دیکھ سکتی تھی تو یقیناً میرا ہینڈ بیگ بھی چرا سکتی تھی۔

پولیس سائرن کی آواز دنیا بھر میں ایک جیسی ہی ہوتی ہے اور اب مجھے یہ سائرن کافی قریب آتے سنائی دے رہے تھے۔ ”اوہ میرے خدا! اب میں کیا کروں۔“ گھبرا کر میں نے دل ہی دل میں دعائیں مانگنی شروع کردیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں ایک گندے سے فرش پر ایک لاش کے قریب بیٹھی تھی اور شاید اب تو آلۂ قتل پر میری انگلیوں کے نشان بھی آگئے تھے۔ مقتول کے خون کے دھبے میرے سفید ڈریس پر لگ گئے تھے۔ میرے پاس اپنی شناخت کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کوئی ثبوت کہ میں یہاں پر سیمی کے ہمراہ نہیں آئی تھی۔ میری جان پہچان کے جو دو افراد تھے وہ یہاں سے غائب ہوچکے تھے۔ میں بری طرح پھنسنے والی تھی۔

میں سوچنے لگی کہ کون میری بات کا یقین کرے گا کہ قتل میں نے نہیں کیا۔ اگر میں پولیس میں ہوتی تو ایسے شواہد کی موجودگی میں شاید میں بھی نہ کرتی۔ کوئی بھلا مانس پولیس شیرف مجھے شک کا فائدہ دے بھی دیتا مگر اس کے لیے بھی مجھے اپنی شناخت کا کوئی ثبوت تو فراہم کرنا پڑتا اور یہ ثبوت اب حاصل کرنے میں کافی وقت لگ سکتا تھا۔

میں حسرت و یاس کی تصویر بنی فرش پر بیٹھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”تمارا...!“

میں حیرت سے اچھل پڑی۔ یہ آواز تو کافی جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔

”تمارا میرے ساتھ چلو۔“

اور کچھ سوچے بغیر میں نے اپنی طرف بڑھا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ کلب سے باہر نکل آئی۔ میرے ذہن پر خوف کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت تو اگر شیطان بھی مجھے اپنا ہاتھ تھامنے کو کہتا تو میں اس جگہ سے نکلنے کی خاطر تیار ہو جاتی۔

مگر وہ شیطان نہ تھا۔ وہ بازل ڈیوپری تھا۔

☆☆☆

”میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا مگر پہلے ہمیں وہاں پہنچنے دو جہاں میں تمہیں لے جانا چاہ رہا ہوں۔“

بازل میرے پوچھنے سے پہلے ہی میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب دے دے گا، یہ میں جانتی تھی۔ جس دن سے میں اس سے ملی تھی، وہ میری زندگی میں آکر سب کچھ اتھل پتھل کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن سے ملتے ہی آپ ان کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں اور ان کا خیال آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ خواہ آپ کہیں بھی ہوں اور کیسے ہی حالات میں کیوں نہ ہوں۔

اس کی رنگت بھلے گہرے سانولی تھی مگر اس کے باوجود وہ انتہائی پُرکشش شخصیت کا حامل انسان تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کچھ ایسی نرمی تھی کہ میں ان میں اکثر کھو سی جاتی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی فطرت میں ایک بے خوفی اور دلیری بھی بدرجہ اتم موجود رہتی تھی۔

اگرچہ ہم کبھی بھی رومانوی طور پر ملوث نہیں ہوئے تھے مگر نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ اس کے لیے میرے جذبات اور احساسات یک طرفہ نہ تھے۔ میں جب پہلی مرتبہ اس سے ملی تو اس وقت میں اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ ہی تھی۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں کبھی کبھار ہی ہوتیں۔ بسا اوقات تو سالوں کے وقفے کے بعد۔

اس دن بھی میں اس کے ساتھ چل تو دی مگر مجھے رہ رہ کر اس ہولناک واقعے کا خیال آتا رہا مگر ساتھ ہی بازل سے ملنے کی خوشی بھی تھی۔ ہم بھاگتے ہوئے کچھ تنگ و تاریک گلیوں سے گزر کر اس کی ہیوی موٹر سائیکل تک پہنچ گئے۔ اس نے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر مجھے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں لپک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ بازل کے کک لگاتے ہی موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

کچھ دیر تک تو میں دم سادھے خاموشی کے ساتھ اس کے ساتھ سفر کرتی رہی پھر میں نے آنکھیں کھولیں اور اردگرد نظر دوڑائی تو رات کی تاریکی میں دور تک بل کھاتی سڑک کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ تازہ ہوا میں سانس لینے سے میرے اوسان کافی حد تک بحال ہو چکے تھے۔ ہم شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور سمندر کے قریب کہیں جا رہے تھے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے موٹر سائیکل کے شور میں تقریباً چلاّتے ہوئے پوچھا۔

”کنگسٹن سے دور مورانٹ بے کے قریب۔“ اس نے بھی اسی طرح چلاّتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے سوچا کہ یہ مورانٹ بے اب خدا جانے کس جگہ کا نام ہے۔

”فکر نہ کرو۔ اب تم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔“ اس نے کاندھے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

ہر گزرتے میل کے ساتھ نیمی لی کی موت کا خوفناک منظر میری آنکھوں سے دور ہوتا جا رہا تھا مگر میرے حواس ابھی تک پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔

”کیا وقت ہو گیا ہوگا؟“ میں نے پھر چلاّ کر سوال کیا۔

”غالباً تین یا چار بجے ہوں گے۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔“ وہ جواب میں چلاّیا۔

میں اس کی کمر کے گرد بانہیں ڈالے اس کے چوڑے شانے پر سر ٹکائے بیٹھی رہی پھر یکایک مجھے خیال آیا کہ آخر بازل وہاں پر کیا کر رہا تھا؟

”میرے خیال میں ہمیں کہیں رک کر بات کرنی چاہیے۔“ میں نے اپنے شک کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

”بس ذرا انتظار کرو۔ ہمیں تھوڑی دور اور جانا ہے۔“

”میں اپنے ہوٹل واپس جانا چاہتی ہوں۔“

”کون سے ہوٹل؟ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟“

”مونٹیگو بے ہوٹل۔“

”اچھا اچھا مونٹیگو بے۔ وہاں تو میری ایک دور کی کزن کام کرتی ہے اس کا نام میوس ہے۔“

”ہم وہاں سے کتنی دور ہیں؟“

”بہت دور۔“

”مگر میں واپس جانا چاہتی ہوں، ابھی اسی وقت۔“

بازل نے موٹر سائیکل آہستہ کر کے سڑک کے ایک طرف کھڑی کر دی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوا کہ میں نے کوئی غلط بات کر دی ہے پھر میں سوچنے لگی کہ کیا یوں بازل کے

ساتھ چلے آنا میری غلطی تو نہ تھی۔ کیا میں نے فرائی پین سے نکل کر سیدھے آگ میں تو چھلانگ نہیں لگا دی تھی؟

”میں تمہیں یہاں صرف اس لیے لایا ہوں تاکہ تمہارے لیے موقعِ واردات سے عدم موجودگی کا کوئی عذر پیدا کیا جا سکے۔ جیسا کہ وہاں پر موجود ہر شخص کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو پولیس تم سے اس بارے میں ضرور سوال کرے گی۔ بہتر ہوگا اگر تم یہی کہو کہ تم میرے ساتھ تھیں۔ اگر وہ مزید پوچھ تاچھ کریں تو تم سب کچھ سچ ویسے ہی بتا سکتی ہو جیسا کہ تم نے وہاں دیکھا۔ آدھا جھوٹ بولنا پورے جھوٹ سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔“

میری آنکھوں میں ابھی تک شک کے گہرے سائے موجود تھے۔

”کیا تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتیں؟ اتنے عرصے بعد بھی۔ تمہیں ابھی تک مجھ پر شک ہے؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا بازل۔“ میں نے آہستہ سے کہا مگر دراصل اس نے میرے دل کی بات جان لی تھی۔ مجھے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ میں اس وقت مکمل طور پر بازل کے رحم و کرم پر تھی۔ میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر اپنا لباس درست کیا اور سوچنے لگی کہ آخر بازل کے دل و دماغ میں اس وقت کیا چل رہا تھا مگر ہمیشہ کی طرح بازل کے خیالات میرے فہم و ادراک سے باہر تھے۔

”میں نے تو ہمیشہ تمہارا بھلا ہی چاہا ہے تمارا۔ اتنے سالوں سے ہماری واقفیت ہے اور اس دوران میں نے کبھی کچھ ایسا کیا کہ جس کی وجہ سے تم مجھ پر شک کرتیں؟ شاید تم ایسا اس لیے سوچ رہی ہو کیونکہ تمہیں اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ تمہیں لوگوں کی نہیں بلکہ اپنے دل کی آواز سننی چاہیے۔“

”میں نے تو تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

درحقیقت میرے سابقہ شوہر سے لے کر میری دوست ایمی تک بازل کے بارے میں عدم اعتماد کا شکار رہے تھے۔ اب سچ کیا تھا، یہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں نے تو یہ بھی سن رکھا تھا کہ بازل نے جمیکا میں غیرت کے نام پر ایک شخص کا قتل کر دیا تھا اپنے باپ کے خون کا حساب چکانے کے لیے۔ مگر اس وقت تو اسے دیکھ کر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ قانون سے بھاگا ہوا کوئی مجرم ہو۔

میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ بازل بہت ہی ذہین اور محنتی انسان تھا۔ اس نے خود اپنے بل بوتے پر تعلیم حاصل کی تھی اور پھر کاروبار شروع کیا۔ میرے سابق شوہر کے بازل کے ساتھ کچھ کاروباری مراسم تھے۔ اس کے خیال میں بازل ایک چور اور ٹھگ سے زیادہ کچھ نہ تھا مگر میرا سابق شوہر ڈیوین خود کون سا دودھ کا دھلا ہوا تھا جس قدر جھوٹ وہ بولتا تھا اس حساب سے تو اگر وہ کسی کے بارے میں برا کہتا تو اس انسان کا نہایت نیک اور پارسا ہونا لازمی تھا۔

مجھے اتنا تو معلوم تھا کہ بازل کی دنیا جھوٹ اور مکاری سے بھری ہوئی تھی مگر اس نے ایک مرتبہ خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس دنیا کا سایہ بھی کبھی مجھ پر پڑنے نہیں دے گا اب یہ بات جھوٹ تھی یا سچ۔ اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا مگر اس نے جائے وقوعہ سے عذر عدم موجودگی سے متعلق جو بات کہی تھی اس میں بہرحال دم تھا۔ مجھے ایسا کوئی عذر تو پولیس کو مہیا کرنا ہی تھا مگر میں کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

”آج وہاں کلب میں جو فائرنگ ہوئی تھی، اس کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ وہ لڑکے کون تھے اور تم یہاں کنگسٹن میں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”آخر ہو نا پولیس والی۔ تفتیش کی عادت نہیں گئی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں یہیں کا رہنے والا ہوں تمارا۔ میرا سارا خاندان یہیں پر ہے خیر اب جو بھی کچھ باقی بچا ہے، یہیں پر ہے۔ میری جڑیں اسی مٹی میں گڑی ہیں۔“

”مگر تم اس جگہ پر کیسے چلے آئے؟“

”تمارا میں جانتا ہوں کہ تم نے میرے بارے میں بہت کچھ الٹا سیدھا سن رکھا ہے مگر یقین مانو اس میں سب سچ نہیں ہے شاید کچھ تھوڑا سا سچ بھی ہو مگر مکمل طور پر نہیں۔ میں تم سے کچھ اور ضروری باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے سڑک کا یہ کنارہ کچھ مناسب جگہ نہیں ہے۔“ اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

”چلو میں تمہیں وہیں لے چلتا ہوں جہاں تم جانا چاہتی ہو مگر میرا خیال ہے کہ ابھی جانا ٹھیک نہیں ہے، کچھ دیر انتظار کر لو۔ کم از کم صبح ہونے تک۔“

میں نے بھی سوچا کہ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ویسے بھی میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ میں اس کی ہیوی موٹر سائیکل پر سوار ہوئی اور ہم سمندر کے کنارے بل کھاتی سڑک پر رواں دواں ہو گئے۔

مورانٹ بے پہنچتے ہی ہم مین سڑک سے اتر کر ایک چھوٹی سڑک پر رکے۔ یہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کے نیچے کچھ خودرو پودے اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پورے چاند کی چاندنی کے سوا یہاں کوئی اور روشنی نہ تھی۔ پیروں کے نیچے گیلی ریت اور سمندر سے آتی ہوا تازگی اور ٹھنڈک کا احساس دلا رہی تھی۔ بازل نے بالآخر میرے سوال کا جواب دے ہی دیا۔

"میں اسٹیمپ اینڈ گو کلب کے قریب ہی رہتا تھا۔ میں نے وہاں تمہیں اپنے دوستوں کے ہمراہ کار سے اترتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہاں میں قریب ہی کچھ لوگوں سے ملنے گیا تھا ایک شخص کے بارے میں معلوم کرنے جس کے میری بہن کے ساتھ تعلقات ہیں۔ وہ دراصل میرے دوست نوئل کا ہی نالائق چھوٹا بھائی ہے۔ بچپن ہی سے وہ کچھ الگ شیطانی مزاج رکھتا ہے۔ ہم لوگ اسے اسکریچ کہہ کر بلاتے تھے۔ تم جانتی ہو نا کہ شیطان کے بہت سے ناموں میں سے ایک اسکریچ بھی ہے۔ گزشتہ رات جب وہ لڑکے فائرنگ کر کے بھاگ رہے تھے تو ان کے ساتھ ہی تمہارے وہ دو دوست بھی باہر بھاگے تھے۔ تمہیں ان کے ساتھ نہ پا کر میرا ماتھا ٹھنکا اسی لیے میں تمہیں دیکھنے اندر چلا گیا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بڑی غلط جگہ ہے۔"

"کیا تم ان لڑکوں کو جانتے ہو؟" میں نے دوبارہ تفتیش شروع کی۔

"نہیں زیادہ اچھی طرح سے تو نہیں بس یہی کہ وہ کچھ زیادہ ہی جوشیلے نوجوان ہیں جنہیں ہم بدمعاش پارٹی کہا کرتے تھے۔ یہ لڑکے بے حد غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کو غالباً کسی شخص نے پیسوں کے عوض یہ کام کرنے کے لیے کہا ہوگا جو شاید کسی اور گھناؤنے مقصد کی خاطر ہوگا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کوئی اور شیطانی کھیل کھیلنا ہوگا۔ تمہارے دوست وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"وہ میرے دوست نہیں تھے۔" میں نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو انہیں ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں تھی۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ ان میں سے ایک نے شاید دوسرے کا خون کر دیا ہے۔ قتل ہونے والے شخص کا نام سیمی لی ہے۔"

"اچھا اور یہ تمہارے لباس پر اسی کے خون کے دھبے ہیں؟"

بازل کے یاد دلانے پر مجھے یاد آیا کہ میں اس قتل کی گواہ ہی نہیں تھی بلکہ اس قتل کے الزام میں ملوث بھی کی جا سکتی تھی۔ اپنے خون آلود کپڑوں کی وجہ سے۔

"کسی نے اس کے سینے میں چاقو گھونپ دیا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اور وہ سرخ منی اسکرٹ والی خوب صورت لڑکی؟ میں نے اسے ایک باکسر ٹائپ ہٹے کٹے آدمی کے ساتھ بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ تمہیں لگتا ہے کہ یہ ان دونوں کی ملی بھگت تھی؟"

"ہاں مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔"

"اوہ تو وہ کافر حسینہ ہی اس اُلو کے پٹھے کے قتل کی وجہ بنی۔" بازل نے پھر میرے دل کی بات کہہ دی تو میں ہنس پڑی مگر پھر ایک دم میرے اندر کی پولیس والی بیدار ہو گئی۔

"کسی کی موت پر ہنسنا کوئی اچھی بات نہیں۔ آخر انسانی قتل کوئی معمولی چیز تو نہیں۔"

"تم ہمیشہ پولیس والی ہی رہو گی۔ میں تو صرف کڑی سے کڑی جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر تمارا تم ان لوگوں کے ساتھ اس گھٹیا جگہ پر کیا کر رہی تھیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بس بیکاری اور بیزاری...... کچھ مفت کی ڈرنک کا لالچ۔" میں نے بہت ایمان داری سے جواب دیا۔ پھر میں نے اسے اپنے جمیکا آنے، ان لوگوں سے ملنے اور کلب جانے کی پوری رُوداد سنائی جس کے دوران میں وہ سرزنش کرنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا۔

"اصلی جمیکا؟" وہ چونکا۔ "اس کے لیے تو تمہیں کسی اصلی جمیکن کی خدمات حاصل کرنی چاہیے تھیں۔"

"ہاں مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم آج کل یہاں پائے جاتے ہو۔" میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم جمیکا کب اور کیوں آئے؟"

"میں اپنی ماں کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ بہت بیمار تھیں۔ گزشتہ ہفتے ان کا انتقال ہو گیا تین روز قبل ہی تدفین ہوئی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے بازل کے خاندان کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں تھیں۔ میں بس اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ مغربی کنگسٹن کے ایک کافی غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا پھر ایک روز اس نے بتایا تھا کہ اس کی بہن بیٹینا مر گئی۔

"اوہ مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔ کیا بیماری تھی ان کو؟"

"بس ان کے کام کرنے کی لگن نے ہی ان کی جان

لے لی۔ ایک بہت امیر کبیر گھرانے میں کام کرتی تھیں۔ صبح سے لے کر شام تک کسی غلام کی طرح۔” اس کی آواز میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ “جب وہ بیمار ہوئیں اور کام کرنے کے قابل نہ رہیں تو انہوں نے نکال باہر کیا۔ برسوں کی محنت کا یہ صلہ دیا کہ پھر پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔ بس ایک ماہ بیمار رہیں اور پھر اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں۔”

“اور تم ان کی تیمارداری کر رہے تھے، ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح۔ بہت اچھے آدمی ہو تم۔”

“پتا نہیں کتنا اچھا ہوں مگر چلو میں تمہیں واپس لے چلتا ہوں۔ آج تم بہت مشکل حالات سے گزری ہو۔”

“ہاں وہ تو ہے مگر اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ تمہاری بہنیں؟ وہ کہاں ہیں؟ کیا کوئی اور عورت بھی ہے تمہاری زندگی میں؟” میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

“میں عموماً عورتوں کے آگے اپنے دکھڑے نہیں روتا۔ تمہارے امریکی مردوں کی طرح۔” اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ “میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میری تین بہنیں ہیں جن میں سے دو تو اپنے اپنے گھروں میں بال بچوں کے ساتھ مگن ہیں مگر تیسری! ہاں میری تیسری بہن بیٹینا الگ ہی مزاج کی ہے۔ بہت خودغرض اور مطلبی لڑکی ہے۔ بس صرف اپنے بارے میں ہی سوچتی ہے اور کسی دوسرے کی اسے کوئی پروا نہیں۔”

اس ایک بات کے ساتھ ہی ہمارے بیچ سب کچھ جیسے بدل سا گیا۔ میں اپنے سابق شوہر کے منہ سے سفید جھوٹ سن سن کر ایسی بیزار ہوگئی تھی کہ اب مجھے جھوٹ اور جھوٹ بولنے والوں سے شدید نفرت تھی۔ میں کچھ بھی معاف کرسکتی تھی مگر جھوٹ نہیں۔ ڈیوین کرٹس نے تو جیسے میری جھوٹ برداشت کرنے کی ساری قوت کو ختم ہی کر دیا تھا۔ اب میں لوگوں پر کم ہی بھروسا کرتی تھی اور وہ بھی بڑی مشکل ہے اور بازل نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ایک مرتبہ اس نے میرے گھر پر مجھے بتایا تھا کہ اس کی بہن بیٹینا مر چکی ہے۔ میرے سابق شوہر نے اسے نشے کی لت لگائی اور پھر اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ یہ بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ اس دن مجھے اس کے ساتھ بہت ہمدردی اور اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

آخر اس نے اپنی بہن کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا تھا؟ کیا صرف میرے قریب آنے کے لیے میں ہمیشہ ہی ایسے جھوٹے فریبیوں کا شکار ہو جاتی ہوں۔ خواہ وہ ڈیوین کرٹس ہو، لائلہ ہو یا پھر اب بازل۔

میں خاموشی سے اس سے دور سمندر کی جانب چل دی۔ پھر میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی۔ میں نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ “مجھے تو بہت اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے کہا تھا کہ بیٹینا مر چکی ہے۔ یاد آیا۔ جرسی میں تم نے ہی مجھے بتایا تھا۔” پھر میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔ “میری سمجھ نہیں آتا کہ تم نے آخر اس بارے میں مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ اپنی جیتی جاگتی بہن کو مردہ قرار دے دیا۔”

“اوہ بیٹینا!” اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ “میں مانتا ہوں کہ مجھے تم سے حقیقت چھپانی چاہیے تھی مگر میں اس وقت بے حد ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ دراصل میرے والد کی وفات کے بعد میں نے بیٹینا کی پرورش اپنی چھوٹی بہن نہیں بلکہ بیٹی کی طرح کی تھی مگر پھر امریکا میں تمہارے سابقہ شوہر ڈیوین کے اس کے ساتھ تعلقات قائم ہوگئے اور اس نے بیٹینا کو نشے کا عادی بنا دیا۔ وہ اس کی عزت سے کھیلتا رہا اور پھر جب دل بھر گیا تو اسے سڑک پر پھینک دیا۔ بیٹینا نے جسم فروشی شروع کر دی۔ پہلے پہل تو منشیات کی طلب کو پورا کرنے کے لیے اور بعد میں صرف پیسوں کے لیے عادتاً۔” یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے نظریں جھکالیں پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

“تم نہیں جانتیں کہ مجھے بیٹینا سے کتنی محبت تھی۔ میں اس سے بہت امیدیں رکھتا تھا مگر اس کے ایسے چال چلن کی وجہ سے ان سب پر پانی پھر گیا تھا۔ اس کے جسم فروشی کے دھندے نے اسے میری نظروں سے گرا دیا تھا۔ وہ میرے لیے مر ہی گئی تھی۔ میں اسے کسی طور بھی معاف نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی نہیں...... تم شاید اس بات کو نہ سمجھ پاؤ لیکن میری غیرت اسے بہن ماننے کو تیار نہیں تھی۔”

“اور اب وہ دوبارہ زندہ ہوگئی ہے؟” میرے لہجے میں اب بھی تلخی تھی۔

“تم کچھ بھی کہو مگر جو سچ تھا، میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔” اس نے آہستہ سے کہا۔ “دنیا میں سب کچھ صرف سیاہ اور سفید نہیں ہوا کرتا۔ درمیان میں سرمئی اور سلیٹی رنگ کے ہزاروں شیڈ ہوتے ہیں۔ چلو اب صبح ہونے کو ہے اور سورج نکلنے والا ہے۔ میں تمہیں تمہارے ہوٹل چھوڑ آتا ہوں۔”

“چلو۔” میں نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ میں ابھی تک اس کی باتوں پر مکمل یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔

شاید وہ میرے اعتماد کے قابل تھا ہی نہیں۔

کوئی اور بات کیے بغیر ہم موٹر سائیکل تک واپس آئے اور اسی خاموشی کی چادر اوڑھے کنگسٹن کی جانب روانہ ہوگئے۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے تک سورج پوری آب وتاب سے چمکنے لگا تھا اور ساتھ ہی موسم کی حدت بھی بڑھنے لگی تھی۔ میرے ذہن پر یہی فکر سوار تھی کہ مونٹیگو بے پہنچ کر مجھے کیا کیا اقدامات اٹھانے تھے۔ امریکن ایمبیسی فون کرنا تھا اور انہیں اپنے پاسپورٹ کے گم ہو جانے کی اطلاع دینی تھی پھر اپنی دوست اینی کو فون کرنا تھا اور اس سے کچھ رقم ادھار مانگنی تھی اور پھر واپس گھر جانا تھا۔

ہوٹل واپس پہنچنے پر میں نے بازل کا رسماً شکریہ ادا کیا اور تیزی سے مڑ کر ہوٹل کی جانب چلنے لگی۔ اچانک مجھے ہوٹل کے کمرے کی چابی کا خیال آیا تو میں چلتے چلتے رک گئی۔ ”اوہ میرے خدا!“ میں نے بے اختیار کہا۔

”کیا ہوا؟“ بازل ابھی تک وہیں موجود تھا۔

”میرے کمرے کی چابی! وہ میرے ہینڈ بیگ میں تھی جو......“

”چلو میں تمہیں اپنی کزن میوس سے ملواتا ہوں۔ شاید وہ تمہاری مشکل حل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔“

پھر ہم مونٹیگو بے ہوٹل کے ایک چھوٹے داخلی راستے کی جانب چل دیے۔ یہ شاید وہاں کے ملازمین اور عملے کے لیے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک دبلی پتلی سی لڑکی ہمارے ساتھ تھی۔ بازل نے میرا تعارف کرایا اور پھر اسے میری مشکل کے بارے میں بتایا۔ میوس نے میری طرف دیکھا اور میرے لباس پر لگے خون کے دھبوں کی طرف میرا دھیان دلایا۔ ”سامنے کی طرف سے جانا مناسب نہیں ہو گا...... چلیے میں آپ کو ایک دوسرے راستے سے آپ کے کمرے تک پہنچا دیتی ہوں۔“ اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم خواہ میرے بارے میں کچھ بھی سوچو مگر پھر بھی یہ میرا فون نمبر ہے۔ اگر کبھی بھی ضرورت پڑے تو کال کر لینا۔“ یہ کہتے ہوئے بازل نے ہوٹل کے کارڈ پر اپنا فون نمبر لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔

”مجھے یقین ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ ہمارے درمیان خوامخواہ ایسی بدگمانی پیدا ہوگئی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مرنے سے پہلے میری ماں نے......“

ابھی وہ اپنی بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی تمہاری ماں فوت ہو چکی ہے یا پھر کسی دن وہ بھی زندہ نکل آئے گی۔“ یہ کہتے ہی مجھے احساس ہوا کہ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی تلخ بات کہہ دی تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بازل یہ سنتے ہی مڑا اور پھر بغیر کچھ اور کہے سنے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

میوس بھی میری بات سن کر گنگ سی ہوگئی۔ وہ خاموشی سے مجھے میرے کمرے تک چھوڑنے آئی اور دروازہ اپنی چابی سے کھول کر چلی گئی۔

اپنے کمرے میں داخل ہونے کے فوراً بعد ہی میں نے اپنا خون آلود لباس تبدیل کیا۔ ساری رات کے واقعات ایک فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے پر چلنے لگے اور پھر آخر میں بازل سے کہے الفاظ میرے ضمیر پر کچوکے لگانے لگے۔ آخر اس نے میری اتنی مدد کی تھی، مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا جوڑ جوڑ تھکن سے چور تھا۔ میں نے اپنے بیٹے جمال کے بارے میں سوچا اور پھر انہی خیالوں میں کھوئی میں خوابوں کی وادیوں میں پہنچ گئی پھر اچانک میرے خوابوں میں گولیاں چلنی شروع ہوگئیں۔ ٹھاہ! ٹھاہ! میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ میرے کمرے کا ائرکنڈیشن چلنا بند ہوگیا تھا۔ جلد ہی مجھے ان ”گولیوں“ کی حقیقت کا بھی اندازہ ہوگیا جب میرے دروازے پر پھر کسی نے زور سے دستک دی۔ میں نے ایک لمحے کو اپنے حواس کو مجتمع کیا اور سوچا کہ یہ یقینا پولیس والے ہوں گے۔ مجھے زمین پر پڑے اپنے خون آلود لباس کا خیال آیا اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

میں نے بازل کی بتائی ہوئی جگہ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر بدحواسی میں کچھ یاد نہ آیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اپنا ڈریس فرش سے اٹھایا اور قریب پڑی لانڈری کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ تبھی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”تمارا!“ اس نے تقریبا سرگوشی میں کہا۔

”تمارا! میں ہوں لائلہ۔ دروازہ کھولو۔“

”لائلہ؟“

”ہاں، تمہیں پتا ہے سیمی لی مر چکا ہے۔“

”ہاں جانتی ہوں۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔ آخر اب وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟

”براؤن نے اس کا قتل کر دیا ہے۔ اُس نے میرے شوہر کا خون کر دیا ہے۔“ لائلہ ہذیانی انداز میں بولی۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف	ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ	ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ کا ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ	ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow
All Done

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com
http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں نے دروازے کے قریب جا کر محتاط انداز میں کہا۔ ”لائلہ تم ٹھیک تو ہو؟“

میں نے سوچا کہ اگر اپنے شوہر کے قتل میں اس کا ہاتھ ہوتا تو اب اس وقت اسے یہاں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ لائلہ کی دوبارہ آواز سنائی دی۔

”ہاں، ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

اب اس کی آواز نارمل لگ رہی تھی۔

”میرا ہینڈ بیگ کہاں ہے؟“

”تمہیں بس اپنے ہینڈ بیگ ہی کی فکر ہے۔ وہ وہاں ہے۔ براؤن کے ہوٹل کے کمرے میں۔“

”تم نے ایک شخص کو اپنے شوہر کا قتل کرتے دیکھا اور پھر تم نے میرا ہینڈ بیگ چوری کر لیا۔ خبیث لڑکی!“ میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”چپ کرو اور میری بات غور سے سنو۔“ لائلہ آہستہ سے بولی۔

”تمارا! مجھے تم سے براؤن کے متعلق بات کرنی ہے۔ پلیز دروازہ کھولو۔“

اس کا نام سنتے ہی میرے اندر ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ کیا وہ ابھی اکیلی تھی یا براؤن اس کے ساتھ ہی پیچھے چھپا کھڑا تھا تاکہ میرے دروازہ کھولتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑے آخر میں بھی اس قتل کی ایک گواہ تھی۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ میرا تعلق پولیس سے رہ چکا ہے تو کیا اب ان دونوں کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا تھا؟

میں نے دروازے کی سیفٹی زنجیر کو ذرا سا ڈھیلا کر کے باہر جھانکنے کی کوشش کی، باہر صرف لائلہ دکھائی دی۔ اس نے وہی رات والا سرخ لباس پہنا ہوا تھا مگر وہ شکن آلود ہو چکا تھا جیسے وہ اسے پہنے ہی سو گئی ہو۔ اس کے بال پھولے ہوئے تھے۔ میک اَپ چہرے پر پھیلا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے کہ وہ روتی رہی ہو۔

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز دروازہ کھولو اور مجھے اندر آنے دو۔“ وہ پھر سے گڑگڑائی۔

”میرا ہینڈ بیگ دروازے کے پاس رکھ دو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔“ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں حکم دیا۔

”تمارا ہوش کی بات کرو۔ پولیس کی ضرورت اس وقت تمہیں ہے اور نہ ہی مجھے۔ تمہارا ہینڈ بیگ میرے پاس نہیں ہے۔ وہ براؤن کے کمرے میں ہے۔ میری بات سنو تمارا! مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔ تم نے دیکھا تھا نا اس نے یمی کے ساتھ کیا کیا۔ تم بھی تو وہیں تھیں۔“ یہ کہتے کہتے وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

”کیا تم اس وقت اکیلی ہو؟“

”تم دروازے سے جھانک کر دیکھ سکتی ہو کہ میں بالکل اکیلی ہوں۔“

میں نے دوبارہ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ صرف وہی دکھائی دی۔

”پلیز میری مدد کرو۔“ وہ پھر گڑگڑائی۔

”میں بہت خطرناک پولیس والی ہوں اور میرے پاس گن بھی ہے اس لیے کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نے یا تمہارے دوست نے کوئی بھی حرکت کرنے کی غلطی کی تو میں تم دونوں کی کھوپڑیاں اُڑا دوں گی۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر ہچکچائی پھر یک دم بولی۔ ”تمہارے پاس گن ہے! خدا کا شکر ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار ہے تمارا۔ تم بہت ہی اچھی اور سمجھ دار خاتون ہو۔ تمہیں پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔“ وہ پھر بے تکی ہانکنے لگی۔

”اب مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہو تم؟“ میں نے پھر بیزاری سے پوچھا۔

”وہ تمہیں معلوم ہے نا رات جو کچھ ہوا تھا تو بس میں تمہاری چیز تمہیں واپس کرنا چاہتی ہوں اور کچھ ایسا ہے جسے میرے پاس ہونا چاہیے سو وہ میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

میں نے اس بات کا یقین کرنے کے بعد کہ وہ اکیلی ہی تھی آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

وہ تیزی سے کمرے کے اندر داخل ہوئی اور اردگرد نظر دوڑا کر بولی۔ ”تمہاری گن کہاں ہے؟“

”وہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میرے پاس کوئی گن شن نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہو...... تمارا تمہیں اس طرح جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ میں تو ایسے ہی خوش ہو گئی تھی کہ شکر ہے تم مسلح ہو۔ اب ہم کیا کریں گے؟“

”اب ہم کچھ نہیں کریں گے۔ پہلے ہی تمہاری بات مان کر تمہارے ساتھ جانے کی غلطی کر چکی ہوں اور ابھی تک اس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔“ میں نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔

”ایک اور بات بتا دوں تمہیں کہ تم اپنے شوہر کے قتل کی چشم دید گواہ ہی نہیں ہو بلکہ تم پر بھی اس قتل کا شک کیا جا

سکتا ہے۔“

”میں! ارے نہیں نہیں اس قتل سے میرا کچھ لینا دینا نہیں...... تمارا کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میں خود اپنے شوہر کے قتل کا منصوبہ بناؤں گی، کیا میں تمہیں ایسی لڑکی لگتی ہوں؟“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ براؤن ایسے سیمی کا خون کر دے گا اور یہ بھی کہ اس کے پاس چاقو ہے۔“

”لائلہ بکواس بند کرو اور مجھے ساری بات سچ سچ بتاؤ۔ تم اس وقت کہاں سے آرہی ہو؟“

”وہ...... میں...... میں براؤن کے ہوٹل سے آرہی ہوں۔“ اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔ یکایک اس کا لاابالی پن لوٹ آیا۔ ”دیکھو تمارا مجھے بھی ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ سیمی کا قتل ہوچکا ہے۔ میرے شوہر کا قتل۔ وہ بھی میری آنکھوں کے سامنے۔“ وہ پھر جھوٹ موٹ رونے کا ناٹک کرنے لگی۔ ”مجھے براؤن سے ڈر لگنے لگا ہے۔“

”تم براؤن کے پاس کیا کرنے گئی تھیں؟“ مجھ پر اب اس کے ناٹک کا کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا مگر اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا اور ناٹک جاری رکھا۔

”کیا واقعی تمہارا اور براؤن کا معاشقہ چل رہا تھا؟ اور پھر جب سیمی لی کو اس بات کا پتا چل گیا تو تم دونوں نے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا؟“ میں نے بازل کا تجزیہ دہرایا۔

”نہیں، نہیں ہمارا ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔“ لائلہ یک دم چلائی پھر ذرا ٹھہر کر بولی۔ ”میں مانتی ہوں کہ کچھ دنوں سے براؤن اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے مگر وہ اس طرح سیمی کا خون کردے گا، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا مگر وہ بھی تو دیکھو کس طرح کی الٹی سیدھی باتیں کررہا تھا۔ تم نے خود ہی دیکھا تو تھا۔“ پھر وہ اپنے بازوؤں پر پڑے نیل کے نشان دکھانے لگی۔ ”ایسے کئی اور نشان بھی ہیں میرے جسم پر۔ چاہو تو تم خود دیکھ سکتی ہو تمارا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ زور زور سے کانپنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور پانی پلایا۔

”مگر اب وہ مرچکا ہے لائلہ۔ اب وہ تم پر کبھی تشدد نہیں کرپائے گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہیں اب اپنے بارے میں بہتر فیصلے کرنے ہوں گے لائلہ۔ ذرا سوچو کہ تم ابھی اپنے شوہر کے قاتل کے ساتھ رات بسر کرکے آرہی ہو۔ ایک قاتل کے ساتھ۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ وہ تم سے سیمی لی سے بہتر سلوک کرے گا؟ تم بری لڑکی نہیں ہو مگر اب تمہیں اپنے بارے میں سوچنا ہوگا۔ سیمی لی اور براؤن جیسے آدمیوں سے تمہیں کوئی خوشی حاصل نہ ہوگی۔“ میں نے ایک بڑی بہن کی طرح اسے ناصحانہ انداز میں لیکچر دے ڈالا۔

”تم جاننا چاہتی ہو کہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دراصل میرا تعلق ایک بہت ہی غریب خاندان سے ہے۔ مگر میں ایک اچھی اور پُرآسائش زندگی گزارنا چاہتی تھی، اپنی ماں کی طرح مزدوروں والی زندگی نہیں۔ میں اچھی شکل صورت کی تھی اور سیمی لی میرے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ اس وقت اس کے پاس کافی پیسا تھا، بڑی گاڑی تھی اور وہ میرا بہت خیال بھی رکھتا تھا۔ سو میں نے بڑی عمر کے باوجود اس سے شادی کرلی۔ مگر پھر وہ جوئے میں اپنا پیسا ہارتا چلا گیا۔ اس نے اسی وجہ سے شراب بھی زیادہ پینی شروع کردی اور مجھ پر ہاتھ بھی اٹھانا شروع کردیا۔ پھر تو جیسے اسے اس میں مزہ آنے لگا۔ تبھی براؤن سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں سیمی لی کے توسط سے ہی ملے تھے مگر براؤن اس سے بہت مختلف تھا۔ میری ناسمجھی کہہ سکتی ہو کہ بس براؤن نے ہمدردی کے دو بول کیا کہے میں خود ہی اس کی باہوں میں آگئی۔ وہ مجھے اپنا نجات دھندا نظر آنے لگا مگر مجھے یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے سیمی لی کی جان لے لے گا۔ اُس کا ایسے قتل کرڈالے گا، میں تو بس یونہی اس سارے جھمیلے میں پھنس گئی۔“

”اس سارے جھمیلے میں تم نہیں بلکہ میں پھنس گئی ہوں لائلہ۔“ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں مگر دراصل یہ سیمی لی کا ہی پلان تھا۔ وہی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر تم بھی بڑی کائیاں نکلیں۔ فٹ پہچان گئیں کہ معاملہ کیا ہے۔“

”اور اصل معاملہ منشیات کا دھندا ہی تھا، ہے نا! چرس اور کوکین، بہت چھوٹے پیمانے پر؟“ میں نے پھر تفتیشی انداز میں پوچھا۔

”ہاں عنقریب ہی یہ بہت بڑے پیمانے پر پھیلنے والا تھا۔ سیمی کہتا تھا کہ ہمارے دن بدلنے والے ہیں۔ اس نے دو روز سے تم پر نظر رکھی ہوئی تھی جب سے تم اس ہوٹل میں آکر ٹھہری تھیں۔ تبھی سیمی نے تمہیں دیکھ کر کہا تھا کہ ہمیں تمہارے جیسی ہی شریف اور معزز نظر آنے والی عورت کی ضرورت پڑے گی۔“

”میری ضرورت؟ وہ کس لیے؟“ میں نے حیرت

سے پوچھا۔

"تاکہ تمہارے ذریعے وہ اپنا سامان امریکا پہنچا سکے۔ میں نے بتایا نا کہ ہمارا کاروبار کافی وسیع ہونے والا تھا۔" وہ اسی معصومیت سے بولی۔

"جب اس نے تمہیں براؤن کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تبھی اس نے مجھ سے کہا کہ تم سے راہ و رسم پیدا کروں۔ تمہارے جیسا تیراکی کا لباس بھی مجھے اسی نے لا کر دیا تھا۔"

"اور میں بے وقوفوں کی طرح تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں میں آ گئی۔" اب مجھے رہ رہ کر اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔

"مگر جب تم نے بتایا کہ تم پولیس والی ہو تو ہمارا سارا پلان چوپٹ ہو گیا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"تو پھر سیمی لی کو قتل کرنے کے بعد براؤن نے کیا کیا؟"

"بس اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی اس کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میرا پرس تمہارے ہینڈ بیگ میں ہے تو جلدی میں، میں نے تمہارا بیگ ہی اٹھا لیا۔ تم اس وقت کہاں تھیں؟"

"ٹیبل کے نیچے۔" میں نے کچھ خفت کے ساتھ جواب دیا۔

"پھر ہم اس کے ہوٹل پہنچ گئے۔ سارا راستہ وہ بڑبڑاتا رہا۔ میں نے تو بس اپنا منہ بند ہی رکھا۔ دراصل مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں اسے ایسا پُرتشدد آدمی نہیں سمجھتی تھی۔ قریباً آدھی رات کو وہاں ایک اور آدمی آیا۔ براؤن اور وہ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر وہ آدمی چلا گیا۔ اس کے بعد براؤن کا مزاج بگڑ گیا اور وہ بہت غصے میں آ گیا۔ اور اول فول بکنے لگا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر بچا کر اس کے والٹ سے کچھ رقم نکالی اور ٹیکسی پکڑ کر سیدھی یہاں آ گئی۔" اس نے مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی بات مکمل کی۔

"وہاں کون آیا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو بیڈ روم میں تھی۔ وہ آدمی براؤن کے ساتھ سٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ پتا ہے براؤن کا ہوٹل بہت ہی شاندار ہے۔ کمرے بھی بہت بڑے بڑے ہیں۔ ساتھ میں سٹنگ روم بھی ہیں۔ اس موٹیلو بے ہوٹل سے تو ہزار گنا بہتر ہے۔"

"تو تم نے اس آدمی کو دیکھا ہی نہیں؟"

"تمارا مجھ پر شک کرنا بند کرو۔ تمہیں اپنا ہینڈ بیگ چاہیے نا۔ تو کیا تم میرے ساتھ براؤن کے ہوٹل تک چلو گی۔ مجھے وہ پیسا بھی چاہیے وہاں سے۔"

"پیسا؟ کیسا پیسا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ پیسا جو براؤن نے اپنے کمرے میں چھپایا ہوا ہے۔ اس پر میرا بھی حق ہے۔ میرا بھی حصہ بنتا ہے اس سارے پیسے میں۔ تم نے کہا تھا نا کہ تم پرائیویٹ سراغ رساں ہو؟"

"ہاں ہوں تو سہی۔"

"تو پھر تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا چاہیے تاکہ جب تک میں رقم ڈھونڈوں، تم اتنی دیر دروازے پر نظر رکھے رہو۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ براؤن نے وہ سارا مال کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ میں تو بس تھوڑی ہی دیر میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔" وہ پھر بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

"میں اس قسم کا کام نہیں کرتی۔" میں نے دامن چھڑانے کی کوشش کی۔

"دیکھو تمارا میں کوئی منشیات کی اسمگلر نہیں ہوں۔ اسمگلنگ کا دھندا وہ دونوں کیا کرتے تھے، میں نہیں پھر تم بھی تو یہاں سے نکلنا چاہتی ہو پولیس کی نظروں میں آئے بغیر۔ دیکھو تمارا میں بھی یہی چاہتی ہوں اس لیے ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ ہم دونوں اگر ساتھ میں ہوں گے تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ چلو نا میرے ساتھ پلیز......"

"کتنی رقم ہو گی وہاں اس کے کمرے میں؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"کم از کم دس لاکھ ڈالر۔" لائلہ کی بات نے میرے ہوش اُڑا دیے۔

"کیا تمہیں یقین ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں میرے خیال میں اتنے تو ضرور ہونے چاہئیں۔ شاید کچھ زیادہ ہی ہوں مگر مجھے پوری رقم تھوڑی لینی ہے۔ میں تو بس اپنے حصے کی رقم نکالوں گی اور بس۔ آخر میں سیمی لی کی بیوی تھی۔ اس کی کمائی ہوئی رقم پر میرا حق بنتا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چلو گی تو میں اس کے لیے تمہیں پچاس ہزار ڈالر دے سکتی ہوں۔" لائلہ نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔

"اس پیسے سے میری زندگی بدل جائے گی تمارا اور

شاید تمہاری بھی۔ ذرا سوچو بس ایک دو گھنٹے کا کام ہے اور پھر عیش ہی عیش۔ میں تو رقم ہاتھ آتے ہی یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں گی۔ خوب سیر سپاٹا کروں گی۔ پلیز میرے ساتھ چلونا۔'' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی کاروباری پیشکش پر غور کیا۔ اگر واقعی وہاں پر اتنا مال موجود تھا اور بات صرف ایک دو گھنٹوں کی تھی تو اس میں حرج ہی کیا تھا۔ پچاس ہزار ڈالر میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتے تھے۔ اس سے کم از کم ایک سال تو میں آرام سے گزار سکتی تھی اور شاید کچھ رقم اپنے بیٹے کے کالج کے اخراجات کے لیے بھی بچا کر رکھ سکتی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں مگر ایک بات پہلے ہی بتائے دیتی ہوں کہ مجھے کوئی لفڑا نہیں چاہیے لائلہ۔'' میں نے بالآخر اس کے ساتھ چلنے کے لیے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

''ارے فکر ہی نہ کرو۔ براؤن ہمیں پریشان نہیں کرے گا ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ اب تک تو وہ باہر جا چکا ہوگا میں تو بس تمہیں اپنے ساتھ اپنی حفاظت اور نگرانی کے لیے لے جانا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں۔'' وہ پھر مسلسل بول رہی تھی۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور پھر ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

ٹیکسی کے ذریعے ہم براؤن کے ہوٹل تک پہنچے۔ لائلہ نے دوسری منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''براؤن کا کمرا اوپر ہے۔''

میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا تو اس کمرے کی بالکونی میں لگا شیشے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اندر ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ شاید وہ ابھی یہیں موجود ہوگا۔'' میں نے احتیاطاً پوچھا مگر لائلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس پردوں کی جانب دیکھتی رہی۔ جیسے دل ہی دل میں کوئی منصوبہ بنا رہی ہو۔ پھر وہ ہوٹل کے سامنے والے داخلی راستے کی طرف چل پڑی۔ وہاں پر کالج کے کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوش گپیاں کرتے جا رہے تھے۔ لائلہ اور میں بھی ان کے ساتھ ہی ہو لیے جیسے ہم اسی گروپ کا حصہ ہوں پھر انہوں نے دروازہ کھولا اور لفٹ کی طرف بڑھے۔ ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں نے بڑا سا ہیٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر بڑے بڑے گاگلز لگائے ہوئے تھے جن سے میرا چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا۔ وہ گروپ تو لفٹ میں سوار

کریڈٹ کارڈ

کریڈٹ کارڈ کمپنی سے فون آیا۔ ''کیا آپ ٹام بول رہے ہیں؟''

''جی ہاں، فرمائیے؟''

''میں کریڈٹ کارڈ کمپنی سے بول رہا ہوں۔ دراصل آپ کے کارڈ پر روزانہ دو تین سو ڈالر کی خریداری ہو رہی ہے میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اس میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو رہی؟''

ٹام نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''میرا کارڈ تو ایک ہفتے سے گم ہے!''

''لیکن سر! آپ نے اس کی رپورٹ تو نہیں کی۔''

''ضرورت ہی نہیں تھی!''

''سر! آپ کی رقم مسلسل ضائع ہو رہی ہے!'' حیرت سے کہا گیا۔

''ہونے دو...... وہ جو کوئی بھی ہے، بہت کم خرچ کر رہا ہے۔ میری بیوی میرا کریڈٹ کارڈ لے کر جب بھی بازار جاتی ہے، میرا دیوالیا نکال دیتی ہے......''

ترکیب

''کمال ہے، تمہارا اسٹاف ہمیشہ وقت پر بلکہ وقت سے پہلے دفتر آ جاتا ہے!''

''اس کی ایک ٹرک ہے۔'' مورگن نے فخر سے کہا۔ ''دفتر میں دس کا اسٹاف ہے، سب کے پاس اپنی گاڑیاں ہیں۔ میں نے نو گاڑیوں کی فری پارکنگ رکھی ہے۔ دیر سے آنے والے کو پبلک پارکنگ کا رخ کرنا پڑتا ہے جس کی یومیہ فیس دس ڈالر ہے...... روزانہ کے دس ڈالر کے خرچ سے بچنے کے لیے ان سب میں پہلے پہنچنے کی دوڑ لگی رہتی ہے۔'' اپنی ٹرک بتاتے ہوئے مالک کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

امریکا سے جاوید کاظمی کا تعاون

ہوگیا مگر ہم سیڑھیوں کی طرف مڑ گئے۔ اوپر روم سروس والی ملازمہ ایک بڑی سی ٹرالی کو دھکیل رہی تھی۔ ٹرالی میں جھاڑو اور برش وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ لائلہ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ''اوہو! دیکھو تو ذرا میری بے وقوفی۔ میں ابھی ابھی یہ دروازہ کھلا چھوڑ کر گئی تھی اور اب یہ بند ہے۔'' وہ براؤن کے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کررہی تھی۔

''اب میرے پاس چابی بھی نہیں ہے۔ اب کیا کروں؟''

''اچھا! مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بوائے فرینڈ باہر جاتے وقت دروازہ بند کر گیا ہوگا۔'' روم سروس والی نے خوش خلقی سے جواب دیا اور ایک دوسرے کمرے کی جانب مڑ گئی۔ اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ جیسے اس نے لائلہ کو پہلے بھی وہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔

لائلہ نے اپنے بلاؤز کے اندر سے بیس بیس ڈالر کے دو نوٹ نکالے اور رازدارانہ انداز میں روم سروس والی سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اگلے ہی لمحے اس نے براؤن کے کمرے کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔ اس کی مٹھی میں لائلہ کے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ لائلہ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں داخل ہوگئی۔

''تمہیں پورا یقین ہے کہ براؤن اس بارے میں کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔'' مجھے ابھی تک اس سارے پلان کے بارے میں کافی شکوک وشبہات تھے۔

''ارے نہیں، اس بات کی بالکل فکر نہ کرو۔ اسے جب تک پتا چلے گا کہ کچھ رقم غائب ہے تو اس وقت تک ہم اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔'' لائلہ نے پھر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ''ویسے بھی میں کون سا ساری رقم ہضم کرنے جارہی ہوں۔ بس اپنے حصے کی رقم ہی نکالوں گی جن پر کہ میں جانتی ہوں کہ میرا حق بنتا ہے۔ تم اس بارے میں فکرمند نہ ہو۔ ویسے بھی اگر براؤن نے کچھ کہا بھی تو اس سے میں خود بات کرلوں گی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو؟''

پھر آہستہ سے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''چلو جلدی کرو۔ اس سے پہلے کہ براؤن یا کوئی اور یہاں آجائے۔''

کمرا واقعی کافی کشادہ تھا۔ یہ ایک سوئٹ تھا جس میں بیڈروم اور باتھ روم کے ساتھ ایک سٹنگ روم بھی تھا جیسا کہ لائلہ نے بتایا تھا۔ فرنیچر تھوڑا پرانا معلوم ہوتا تھا۔ بیڈروم اور سٹنگ روم کے درمیان شیشے کا سلائڈنگ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ کمرے کا سامان بے ترتیب اور بکھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا ابھی کمرے کی ..... صفائی نہیں ہوئی تھی۔

ایک سائڈ ٹیبل پر گاڑی کی چابیاں پڑی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ براؤن باہر جاتے وقت گاڑی کی چابیاں ساتھ لے کر کیوں نہیں گیا۔ سارے کمرے میں عجیب سی بُو رچی ہوئی تھی پھر مجھے براؤن کے جوتے بھی صوفے کے پاس پڑے دکھائی دیے۔

''شاید وہ ابھی یہیں ہو اور اندر بیڈروم میں سو رہا ہو؟'' مجھے پھر شک ہوا۔

''ششش...... چپ کرو...... وہ یہاں نہیں ہے۔'' وہ بیڈروم میں جھانک کر بولی۔

''بہتر ہوگا اگر ہم الگ الگ تلاش کریں۔ تم اس طرف بیڈروم کی طرف جاؤ اور میں یہاں سٹنگ روم میں دیکھتی ہوں۔'' وہ اس طرح بولی جیسے اسے اس کام کا کافی تجربہ ہو۔

''آخر وہ رقم ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اسے ساری رقم ایک بڑے سے خاکی لفافے میں ڈالتے دیکھا تھا۔ اب اس نے وہ رکھا کس جگہ ہے، یہ میں نہیں جانتی مگر وہ ہے یہیں کہیں۔''

''لائلہ مجھے تو اپنا ہینڈ بیگ بھی یہاں کہیں نظر نہیں آرہا۔ رقم چھوڑو، مجھے تو بس اپنا بیگ واپس مل جائے تو میرے لیے یہی کافی ہوگا۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی مگر تم بہت پچھتاؤ گی جب تم وہ سارا مال دیکھو گی۔'' لائلہ نے سٹنگ روم سے آواز لگائی۔

بیڈروم میں داخل ہوکر میں نے ایک ایک جگہ کو اچھی طرح تلاشی کے انداز میں دیکھنا شروع کیا۔ ڈریسنگ ٹیبل، اس کے ساتھ درازیں، بیڈ، سائڈ ٹیبل اور تقریباً ہر اس جگہ جہاں پر ایک خاکی لفافے کو رکھا جاسکتا تھا۔ بیڈ کی حالت بتا رہی تھی کہ ابھی اسے ٹھیک نہیں کیا گیا۔ چادریں اوپر نیچے بے ترتیب تھیں۔ میں نے اوپر نیچے ہر جگہ دیکھا مگر رقم کا لفافہ کہیں نہیں ملا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے لائلہ کے ساتھ آکر بڑی غلطی کی۔ اِس جھلی کی بات مان کر میں پہلے بھی کافی خوار ہوچکی تھی۔ میں نے سوچا کہ کوئی بھی ذی ہوش انسان آخر اتنی بڑی رقم دراز میں یا بیڈ کے گدے تلے تھوڑی رکھے گا۔ براؤن نے رقم ضرور کسی سیف ڈپازٹ باکس میں رکھی ہوگی۔ بیڈ کے پاس رکھی ٹیبل کی دراز میں کچھ رقم ضرور پڑی ہوئی تھی مگر یہ وہ خزانہ ہرگز نہیں تھا جس

کی تلاش میں ہم یہاں آئے تھے پھر براؤن کا والٹ بھی وہیں پڑا نظر آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ بھلا کوئی باہر جاتے وقت اپنا والٹ ہوٹل کے کمرے میں کیوں چھوڑ کر جائے گا اور اس کی گاڑی کی چابیاں بھی وہیں پڑی تھیں۔ یہ بات مجھے کچھ پریشان کررہی تھی۔ کمرے میں مجھے ایک کالے رنگ کا بیگ بھی ملا۔ یہ خالی تھا۔ ہر چیز اچھی طرح چیک کر لینے کے بعد میں نے لائلہ کو آواز دی۔ ''لائلہ یہاں پر تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر میں بیڈروم سے متصل باتھ روم کی طرف متوجہ ہوئی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ کیا معلوم وہ باتھ روم میں ہی موجود ہو؟ یہ خیال آتے ہی میرے پسینے چھوٹنے لگے مگر میں نے ہمت کرکے دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ پاکر میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا' دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں آہستہ سے اندر داخل ہوئی۔

باتھ روم کے اندر کا منظر میرے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہاں براؤن برہنہ حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سر کے ایک جانب سے کھوپڑی ٹوٹ کر اندر دھنس چکی تھی اور اس کے سر سے بہت مقدار میں خون بہہ چکا تھا۔ غسل خانہ اس کے خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ٹائلٹ اور دروازے کے درمیان جس طرح پڑا ہوا تھا اس سے لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ غسل کرکے نکلا ہوگا اور تبھی کسی نے اس کے سر پر وار کردیا...... ضرب اتنی کاری تھی کہ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا تھا۔ اس کی ساکت و جامد آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق تک باقی نہ بچی تھی۔ وہ یقیناً مر چکا تھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ کیونکہ اس کا بدن نیلا پڑنا شروع ہوچکا تھا۔ میں نے ٹائلٹ سیٹ پر بیٹھ کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ''اوہ خدایا! یہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔''

براؤن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کے سر کے دائیں جانب سے یا پیچھے سے کسی نے کسی کند آلے سے وار کیا تھا جو اس قدر زوردار تھا کہ وہ یقیناً ضرب لگتے ہی ہلاک ہوگیا ہوگا۔ میں نے ٹائلٹ سیٹ سے اتر کر اس کے بازو کو آہستہ سے چھوا۔ وہ بالکل اکڑ چکا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی موت چار یا پانچ گھنٹے قبل ہوئی ہوگی۔

''اوہ لائلہ! تجھ پر خدا کی مار! یہ تو نے کیا کیا؟'' میں زیرِ لب بڑبڑائی۔ یہ اسی کا کام لگتا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے اسے آواز دی تھی تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس لیے کیونکہ وہ براؤن کی موت کے بارے میں جانتی تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ جلد ہی مجھے بھی اس بات کا پتا چلنے والا ہے مگر وہ تھی کہاں؟ کیا وہ ابھی تک یہیں موجود تھی؟ کیا وہ اب مجھے نشانہ بنانے کے لیے گھات لگائے بیٹھی تھی؟ شاید رقم کا لالچ دے کر وہ مجھے یہاں اسی مقصد کے لیے لائی تھی کیونکہ ایک میں ہی تھی جسے اس کے ان دو مقتولین کے ساتھ تعلقات کا علم تھا اور شاید وہ اپنے جرم کا کوئی ثبوت اور گواہ باقی نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں ٹائلٹ سیٹ پر دوبارہ بیٹھ گئی اور اپنے ممکنہ دفاع کے بارے میں سوچنے لگی۔ نجانے میں وہاں کتنی دیر بیٹھی رہی۔ پانچ منٹ یا شاید دس منٹ۔ مگر پھر ایک باریک اور اونچی سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آگیا۔

''روم سروس! میں آپ کے کمرے کی صفائی کے لیے آئی ہوں۔''

وہ ہوٹل کی ملازمہ تھی جو اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔ اب میں کیا کروں؟ اسے اندر آنے کا کہوں یا خاموش رہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

پھر میں اپنے اوسان مجتمع کرتے ہوئے اٹھی اور بالکل خاموشی کے ساتھ باتھ ٹب کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی اور شاور کا پردہ آہستہ سے آگے کھینچ لیا۔

ملازمہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد خود ہی اندر آگئی تھی۔ مجھے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اب وہ اپنے دھیان میں کام کررہی تھی۔ اس کے گانوں کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی پھر اس نے ویکیوم کلینر مشین چلائی اور شاید قالین صاف کرنا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ کمرا صاف کرنے کے بعد وہ باتھ روم کی طرف آئے گی اور پھر اور پھر...... میں اس سے آگے نہ سوچ سکی۔

میں کسی طور بھی لاش کے قریب نہیں رہ سکتی تھی مگر جاتی تو کہاں جاتی؟ مجھے جلد ہی یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب لڑانی تھی مگر کیا؟ میں سوچ سوچ کر نڈھال ہورہی تھی۔ ملازمہ کسی بھی وقت باتھ روم میں داخل ہوسکتی تھی۔ وقت کی ریت میرے ہاتھوں سے پھسلتی جارہی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئے گی اور یہاں کا منظر دیکھے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ وہ یقیناً چلائے گی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور براؤن کی لاش کو دیکھتے ہی زور زور سے چلانے لگی پھر اسی طرح ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے وہ کمرے سے

باہر بھاگ گئی۔ میرے لیے یہاں سے نکلنے کا یہی موقع تھا۔ میں نے بیس تک گنتی گنی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ کمرے سے باہر جا چکی ہے تو میں آہستہ سے باتھ روم سے باہر نکل آئی۔

سائڈ ٹیبل پر سے براؤن کی کار کی چابیاں غائب تھیں اور بالکونی کا دروازہ پہلے سے کچھ زیادہ کھلا ہوا تھا۔ شاید لائلہ نے باہر جانے کے لیے اسی راستے کا انتخاب کیا تھا۔ بالکونی کے باہر ایک چھجا تھا اور اس کے تقریباً آٹھ دس فٹ نیچے نرم زمین تھی۔ لائلہ اتنی اونچائی سے بہ آسانی کود سکتی تھی اور شاید اس نے ایسا ہی کیا تھا اور اب میرے فرار کا بھی یہی راستہ تھا۔

میری جینز کی جیب میں تقریباً دو ڈالر کی ریزگاری تھی جس کی مدد سے میں نے مونٹیگو بے واپس جانے کا بس کا ٹکٹ خریدا۔ میرے ہیٹ اور گاگلز کی وجہ سے میں کسی کی توجہ کا مرکز نہ بن پائی تھی اور شاید کسی نے میرا چہرہ بھی ٹھیک سے نہ دیکھا ہوگا۔

☆☆☆

مونٹیگو بے میں اپنے کمرے میں واپس پہنچتے ہی میں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ میں لائلہ، سیمی لی اور براؤن کی تمام یادوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ میرے کمرے کا ائرکنڈیشنر پھر بند ہو گیا تھا۔ تھکان اور گرمی سے میرے سر میں شدید درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سر درد کی دو گولیاں کھائیں اور ایک اچھے سے تسکین بخش غسل کے لیے باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ باتھ ٹب میں لیٹے ہوئے ببل باتھ کے نرم نرم جھاگ سے میری طبیعت کافی حد تک بحال ہوئی۔

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ دو آدمیوں کا قتل ہو چکا تھا اور ان دونوں کے بیچ میں ایک ہی مشترکہ کڑی تھی اور وہ تھی لائلہ لو۔

کیا سیمی لی کا قتل کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا یا کہ قاتل نے اسی وقت موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا کام تمام کر دیا تھا؟ کسی حد تک تو یہ سوچا سمجھا قتل ہی تھا کیونکہ قاتل آلۂ قتل یعنی وہ چاقو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ پھر یہ بھی بات قابلِ غور تھی کہ سیمی لی جیسے بھاری بھرکم شخص کو چاقو کے ایک ہی وار سے ختم کر دینا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے قاتل کا کافی طاقت ور ہونا ضروری تھا۔ یہ لائلہ جیسی دھان پان لڑکی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ لائلہ کا کہنا تھا کہ سیمی لی کو براؤن نے قتل کیا تھا۔ ہاں وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ شاید گولیاں چلنے کے فوراً بعد ہی اس نے مجھے ٹیبل کے نیچے چھپتے دیکھ لیا ہو اور لائلہ کو تو وہ جانتا ہی تھا کہ وہ اس کے ایسا کرنے پر نہ کوئی مزاحمت کرے گی اور نہ ہی شور مچائے گی۔ شاید لائلہ نے ہی اسے ایسا کرنے پر اکسایا ہو۔ اب اس بات کی تو میں بھی قائل ہو چکی تھی کہ جب لائلہ کسی سے کوئی بات منوانا چاہتی تو منوا کر ہی دم لیتی تھی مگر پھر براؤن کا قتل کس نے کیا؟

میں نے باتھ ٹب میں لیٹے لیٹے تمام ممکنہ زاویوں سے صورتِ حال کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ کیا لائلہ کی کہی ہوئی تمام باتیں سچ تھیں؟ اور اگر نہیں تو ان میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ۔ وہ براؤن کو اپنا نجات دہندہ مانتی تھی مگر جب اس نے اس کے شوہر کو قتل کیا تو اس سے وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ خوف زدہ ہو گئی تھی مگر کیا وہ سب اس کا ناٹک تو نہیں تھا؟ لائلہ نے بتایا تھا کہ براؤن کے کمرے میں اس رات کوئی ملنے آیا تھا جس کے بعد اس کا مزاج بگڑ گیا تھا۔ آخر اس سے کون ملنے آیا تھا اور وہ بھی اتنی رات گئے؟ پھر اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ براؤن کے والٹ سے پیسے نکال کر بھاگ گئی تھی۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جس نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟ اگر اسی نے براؤن کا خون کیا تھا تو پھر اسے میرے ساتھ دوبارہ وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ براؤن کا کام تمام کر کے اطمینان سے پیسے ڈھونڈ سکتی تھی اور پھر وہیں سے رفو چکر ہو جاتی۔ ہاں یہ بات ٹھیک لگتی تھی۔ لائلہ وہاں کسی چیز سے بہت ہی زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی جس نے اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو لائلہ جیسی دبلی پتلی لڑکی براؤن جیسے ڈیل ڈول والے آدمی کو کیسے مار سکتی تھی؟

مجھے یاد آیا کہ اپنی رام کہانی سناتے وقت لائلہ نے کچھ ہی دیر بعد مجھ سے آنکھیں چرانی شروع کر دی تھیں مگر وہ کیا بات تھی جو مجھ سے چھپانا چاہ رہی تھی۔ اگر وہ اس شخص کو جو براؤن سے ملنے آیا تھا، پہلے سے جانتی تھی اور اس بات کو مجھ سے چھپا رہی تھی تو پھر اس کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر اس بات کے پیچھے کیا راز چھپا تھا؟

اب مجھے وہ لائلہ جس سے میری پہلی مرتبہ سوئمنگ پول کے کنارے ملاقات ہوئی تھی اور جو مجھے بے تکی باتیں کرنے والی جھلی سی لڑکی لگی تھی اور وہ لائلہ جس کے ساتھ میں چند گھنٹے قبل براؤن کے ہوٹل کے کمرے میں گئی تھی جو مجھے اب معصوم شکل والی ایک تیز وطرار عورت لگ رہی تھی، ان

دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا تھا مگر اس کا اصلی چہرہ کون سا تھا؟ اور اس سے بھی زیادہ قابلِ غور بات یہ تھی کہ اب اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا میری جان کو اب بھی خطرہ تھا؟

اوہ میرے خدا! میری مدد کر۔ یہ میں کس جنجال میں پھنس گئی ہوں۔ میں نے باتھ ٹب میں لیٹے ہی دعا مانگنی شروع کی۔ جلدی جلدی میں نے غسل کیا اور ٹب سے نکل کر کپڑے تبدیل کیے تو ساتھ ہی میری نظر لانڈری کی باسکٹ میں پڑے اپنے خون آلود ڈریس پر پڑی۔ میں نے فوراً اسے وہاں سے نکال کر ایک پرانے اخبار کے کاغذ میں لپیٹا اور سوچا کہ میں یہاں سے باہر جاتے ہی اسے کسی کوڑے دان میں پھینک دوں گی۔ مجھے اس کو ہوٹل سے کافی دور جا کر پھینکنا تھا اور اس کے لیے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ مجھے یاد تھا کہ ہوٹل میں کہیں نہ کہیں میں نے دس ڈالر رکھے تھے جو تھوڑی سی تلاش کے بعد ہی مجھے مل گئے۔ چلو بس کا کرایہ تو ہو گیا مگر جہاز کے کرائے کا کیا ہوگا؟ اگر پاسپورٹ کا بندوبست ہو بھی جاتا تب بھی جہاز کا یک طرفہ کرایہ تو مجھی کو ادا کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی دوست اینی کو فون کر کے اس سے کچھ پیسے ادھار مانگ لوں گی۔ میرا بیٹا جمال بھی ان دنوں اینی کے پاس ہی رہ رہا تھا تو اسی بہانے اس سے بھی بات ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر ہی میرے چہرے پر مسکان کھیلنے لگی۔

اپنے خون آلود کپڑوں کو ٹھکانے لگا کر جب میں ہوٹل واپس پہنچی تو شام ہو چکی تھی۔ رات کو تقریباً نو بجے میں نے اینی کو فون کیا۔ وہ میری قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ میں جمیکا میں مزے کر رہی تھی اور اس کو روز صبح سویرے اٹھ کر کام پر جانا پڑتا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں کی بیماری بھی بڑھ گئی تھی اور کام سے واپس آکر اسے اپنی ماں کی تیمارداری بھی کرنی پڑتی تھی۔ میں نے کچھ جھجکتے ہوئے اس سے پانچ سو ڈالر بھیجنے کی درخواست کی۔ میرا خیال تھا کہ یہ رقم میرے جہاز کے یک طرفہ کرائے اور دیگر چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے کافی ہوگی۔ ہوٹل کے بل کی مجھے فکر نہ تھی، کیونکہ میرے کریڈٹ کارڈ کا نقش چیک اِن کرتے وقت ہی ہوٹل والوں نے لے لیا تھا اور بل چکانے کے لیے اس کا استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اینی سے پیسے مانگتے ہوئے مجھے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ میں اس کے مالی حالات جانتی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اتنی رقم کا انتظام کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا مگر میں مجبور تھی۔ میں نے فون پر اس کو ساری بات بتانا مناسب نہیں سمجھا بس یہی کہا کہ میرا ہینڈ بیگ کہیں گم ہو گیا ہے اس لیے مجھے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں اس کی آواز سن کر ہی اندازہ کر سکتی تھی کہ یہ سنتے ہی وہ کافی پریشان ہو گئی تھی۔

”تمارا! تم ٹھیک تو ہو؟ آخر اتنے پیسوں کی تمہیں کیوں ضرورت پڑ گئی؟ کیا تم کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی ہو؟“ اینی نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے تھے جن کو نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا اور یہی کہا کہ اگر ہو سکے تو وہ یہ رقم مجھے جلد از جلد بھیج دے اور میرے بارے میں فکرمند نہ ہو۔

پھر جمال سے بات ہوئی۔ وہ تو جیسے میری آواز سنتے ہی جان گیا کہ میں کسی بڑی مشکل سے دوچار ہوں۔ میں نے اسے بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں ٹھیک ہوں اور جلد ہی گھر واپس آجاؤں گی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میری بات سے کتنا قائل ہوا تھا۔ اس کے سوال ابھی جاری تھے مگر میں نے جلد ہی بات ختم کر کے خدا حافظ کہہ دیا۔

اینی اور جمال سے بات کر کے میرے دل کو کافی سکون ملا اور پھر میں انہی کے بارے میں سوچتے ہوئے سو گئی۔

صبح میں کافی دیر تک سوتی رہی۔ جب اٹھی تو فون بج بج کر بند ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی تو میں نے لپک کر اٹھایا۔ دوسری طرف اینی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس کی ماں کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہو گئی تھی اور اسے اسپتال لے جانا پڑ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا کافی خرچہ بھی ہو گیا اور پھر اس نے آہستہ سے کہا کہ اسے پیسے بھیجنے میں کچھ تاخیر ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر مجھے مایوسی تو ہوئی مگر میں کر ہی کیا سکتی تھی سو میں نے کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں جب سہولت ہو تو پیسے بھجوا دے۔

میں نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا اور پھر محسوس ہوا کہ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک اور سوال بھی گردش کر رہا تھا اور وہ یہ کہ پہلی دفعہ جب فون کی گھنٹی بجی تو کیا اس وقت بھی دوسری طرف اینی ہی تھی یا کوئی اور؟ یہ جاننے کے لیے میں نے فرنٹ ڈیسک سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہی بتایا کہ فون کال کہیں ہوٹل کے باہر سے آئی تھی۔ کنگسٹن میں تو صرف لائلہ اور بازل ہی میری جان پہچان کے تھے۔ بازل تو اب شاید دوبارہ کبھی مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرے۔ تو رہ گئی لائلہ..... مگر اب وہ مجھے کیوں فون کر رہی تھی؟ خیر میں نے یہ سب سوال ذہن میں

پسِ پشت ڈالتے ہوئے امریکن ایمبیسی فون کیا۔ وہاں کافی انتظار کے بعد مطلوبہ افسر سے میری بات ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ اس کے لیے مجھے خود ایمبیسی آنا ہوگا۔ وہاں وہ میرے سوشل سیکیورٹی نمبر سے میرے نام اور شہریت کی تصدیق کریں گے اور اس کے بعد میرے لیے ایک عارضی سفری اجازت نامہ جاری کردیں گے جس کی بدولت میں امریکا تک سفر کرنے کے قابل ہوجاؤں گی۔

اس اہم کام سے فارغ ہوئی تو بھوک نے پھر ستانا شروع کیا۔ میرے پاس کُل پانچ ڈالر اور کچھ ریزگاری تھی۔ میں نے سوچا کہ ابھی ایک کپ سوپ پی لیتی ہوں پھر جب شام تک اینی پیسے بھیج دے گی تو ڈٹ کر کھانا کھاؤں گی۔

یہی سوچتے ہوئے میں نے کپڑے تبدیل کیے اور باہر جانے کے لیے تیار ہوئی۔ میں ہوٹل کے چھوٹے سے ریستوران میں داخل ہوئی اور ایک کپ سوپ منگوایا۔ سوپ بہت لذیذ تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد میں نے قریب پڑے اخبار کو اٹھایا اور الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اچانک دوسرے صفحے پر چھپی ایک خبر پر میری نظر پڑی۔

”دہرے قتل کی تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔“

ویسٹ کنگسٹن میں واقع اسٹیمپ اینڈ گو کلب میں ہوئے دہرے قتل کی واردات میں آخری خبریں آنے تک کوئی پیش رفت نہ ہونے پائی ہے۔ اس بدنام زمانہ کلب میں گزشتہ شب دو نامعلوم افراد کا قتل ہوگیا تھا۔ ابھی تک قتل کے محرکات کا پتا نہیں چل سکا۔ پولیس اس بارے میں چھان بین کررہی ہے۔ بارسوخ ذرائع کے مطابق قتل ہونے والے اشخاص میں سے ایک یا دونوں کا تعلق ریاست ہائے امریکا سے ہوسکتا ہے۔ پولیس ابھی تک اس سلسلے میں کوئی تفصیل بتانے سے گریزاں ہے مگر گمان غالب ہے کہ یہ افراد منشیات کی خرید و فروخت میں ملوث ہوسکتے ہیں۔

میں نے خبر پڑھی اور اخبار دہرا کرکے رکھ دیا۔ ایک مقتول کے متعلق تو میں جانتی تھی مگر وہ دوسرا شخص کون تھا جس کا اسی دوران خون ہوا؟ کیا ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق تھا اگر تھا تو کیا تھا؟ میں انہی سوچوں میں غلطاں تھی۔

”آج کل تو یہاں کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں رہی ہے۔“ میرے قریب بیٹھی عورت نے مجھ سے مخاطب ہوکر جب یہ کہا تو میں اپنی کرسی سے اچھل پڑی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی گوری عورت تھی۔ میرے ایسے چونک جانے پر وہ معذرت طلب انداز میں بولی۔ ”اوہ معاف کرنا میں سمجھی تھی کہ شاید تم امریکن ہو۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بہت خوب، میں بھی امریکا سے ہوں۔ میرا نام ہانا گرافٹ ہے اور میں وہاں برج پورٹ کینیٹی کٹ میں رہتی ہوں۔ میں نے بھی ان دو سیاحوں کے قتل کے متعلق پڑھا ہے۔ اس کے بعد اب مجھے یہاں اپنا آپ بہت غیر محفوظ محسوس ہورہا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے ایک جرمن تھا اور دوسرا امریکی۔“

”جرمن؟“ میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ وہی سنہری بالوں والا گورا ہوگا جسے میں نے کلب میں سیاہ ڈفل بیگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا اس تمام قصے سے کیا تعلق تھا؟

”ہم نے یہاں گھومنے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لی تھی۔ اس کا ڈرائیور بتا رہا تھا کہ ان دونوں مقتولین میں سے ایک سیاہ فام امریکی تھا اور دوسرا جرمن گورا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان میں سے اس جرمن کا قتل بہت ہی پُرتشدد اور بہیمانہ طریقے سے ہوا تھا۔ کسی نے اس کے چہرے پر اتنی زور سے ضرب لگائی تھی کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ کر پیچھے اس کے بھیجے میں دھنس گئی تھی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ سوچو اس بے چارے کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اخبارات میں یہ تفصیل اس لیے نہیں دی جاتی کہ اس سے یہاں آنے والے سیاح خوف زدہ نہ ہوجائیں اور یہاں آنا چھوڑ نہ دیں۔ کیونکہ سیاحت یہاں پر ایک صنعت کا درجہ رکھتی ہے اور ملک کے لیے زرمبادلہ کمانے کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے۔

”ویسے یہ سب ایک نہایت گھٹیا کلب میں وقوع پذیر ہوا جو شہر کے انتہائی غیر معروف علاقے میں واقع ہے۔ ہم جیسے سیاح تو ایسی جگہوں کا کم ہی رخ کرتے ہیں اس لیے تمہیں اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اور وہ دوسرا شخص؟ اس کا قتل کیسے ہوا؟“ میں نے کُریدتے ہوئے پوچھا حالانکہ میں خوب جانتی تھی کہ سیمی لی کا قتل کس طرح ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اس کے بارے میں ہمارے ڈرائیور نے بتایا تھا کہ وہ ایک بھاری بھرکم سیاہ فام امریکی تھا جسے چاقو کے وار سے قتل کیا گیا۔ سینے میں دل کے بیچوں بیچ۔ وہ بھی موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید

یہ کسی دہشت گرد گروہ کا کام ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اتنے خوب صورت ملک میں اس قسم کے خطرناک لوگ کہاں سے آجاتے ہیں۔'' پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''اوہ کیا تم ٹھیک ہو؟ لگتا ہے میں نے اپنی باتوں سے تمہیں پریشان کر دیا۔ بس تم خیال رکھنا اور انہی جگہوں پر سیر کرنے جانا جن کا ذکر ٹورسٹ گائڈ بکس میں ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم اکیلی ہو تو کسی ایسی ویسی غیر محفوظ جگہ جانے سے گریز کرنا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ وہ دیکھو میرے شوہر بالآخر اپنے کمرے سے باہر آ ہی گئے ہیں۔ وہ باتھ روم میں بہت وقت لگاتے ہیں اور بدنام ہم عورتیں ہیں۔ میں تو تیار ہو کر ذرا پہلے ہی باہر آ گئی تھی۔ تم اپنا خیال رکھنا۔''

یہ کہہ کر وہ لفٹ میں سے باہر آتے ایک عمر رسیدہ شخص کی طرف چل دی۔ میں کچھ دیر ان دونوں کو ہوٹل سے باہر جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کاش اس طرح کا نیک مشورہ اگر مجھے دو روز پہلے مل جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا مگر اب پچھتاوے کیا ہوت؟

سوچ بچار کرتے ہوئے میں ریستوران سے نکل آئی اور فرنٹ ڈیسک سے اپنے لیے آنے والی کسی کال کے بارے میں پوچھا تو وہاں موجود لڑکی نے نفی میں جواب دیا۔

یہ وہی لڑکی تھی جو اس رات بھی فرنٹ ڈیسک پر موجود تھی جب میں سیمی لی اور لائلہ کے ساتھ گھومنے نکلی تھی۔ وہ مجھ سے نظریں کیوں چرا رہی تھی؟ کیا اسے میرا اور میرے ساتھ جانے والے لوگوں کے چہرے یاد تھے؟ مجھ پر پھر خوف کا دورہ پڑنے لگا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نارمل رہنے کی کوشش کی۔ میں لفٹ کی جانب بڑھی تو وہاں دو آدمی پہلے سے کھڑے لفٹ کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے سوٹ، ان کی تیز تیز سرگوشیوں میں گفتگو اور ہر آنے جانے والے شخص کا بغور مطالعہ کرنا اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ خفیہ پولیس والے تھے۔ ان میں سے ایک قدرے جوان تھا اور دوسرا جو غالباً اس کا باس تھا ذرا بڑی عمر کا تھا، مجھے دیکھ کر انہوں نے مؤدبانہ طریقے سے راستہ دیا اور ہم لفٹ میں سوار ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے تیسرے فلور کا بٹن دبایا تو میری جان میں جان آئی۔ وہ میرے فلور پر نہیں جا رہے تھے مگر لائلہ تو تیسرے فلور پر ہی مقیم تھی۔ کمرا نمبر 314 میں۔ اوہ تو یہاں کی پولیس آخرکار سیمی لی کی شناخت کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی مگر کیا لائلہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی ہو گی؟ اگر ایسا ہوا تو مجھے پوری امید تھی کہ وہ کمینی اپنی جان بچانے کی خاطر سارا ملبا میرے اوپر ڈال کر مجھے پھنسا دے گی۔

لفٹ تیسرے فلور پر رکی تو میں بھی خاموشی سے سر جھکائے ان پولیس والوں کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ وہاں وردی میں ملبوس ایک پولیس والا پہلے سے موجود تھا پھر وہ تینوں لائلہ کے کمرے کے سامنے جا کر رک گئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جوان پولیس افسر نے اچانک مڑ کر میرا راستہ روکنے کی کوشش کی جیسے وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کمرے کے اندر جھانکوں مگر دروازہ کھلا ہونے کے باعث مجھے کمرے کے اندر کا رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

پردے کھڑکیوں سے نوچ لیے گئے تھے اور دھجیوں کی شکل میں فرش پر پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹے ہوئے تھے اور کانچ فرش پر جابجا بکھرا ہوا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ ٹوٹ کر ایک مکڑی کے جالے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ لائلہ کے کپڑے اور دیگر سامان فرش پر یہاں وہاں بکھرا پڑا تھا۔ سامنے کی دیوار پر گہرے سرخ رنگ سے، جو یقینا خون تھا، گالیاں اور حرام زادی، کتیا دیگر مغلظات بڑے بڑے حروف میں لکھی ہوئی تھیں۔ لائلہ کا سرخ لباس جو اس نے گزشتہ رات پہن رکھا تھا، فرش پر ایک گٹھڑی کی شکل میں پڑا تھا۔

''خون! اس کا خون ہو گیا۔'' غیر ارادی طور پر میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میری آواز سن کر جوان پولیس افسر اپنے ساتھی کے ہمراہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر دیا۔

مجھے وہ منظر دیکھتے ہی ریتھال بروم یاد آ گیا۔ وہ بھی شیطانی ذہن رکھنے والا ایک انسان تھا جس نے ایک چھوٹے سے ریستوران میں گھس کر وہاں موجود تمام لوگوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ شکر ہے کہ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں گاہکوں کا زیادہ رش نہیں تھا مگر پھر بھی بیالیس افراد کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، آن کی آن میں قتل کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں ان دنوں پولیس میں تھی۔ جب میں اور میرا پارٹنر مک ڈرمٹ جائے وقوعہ پر پہنچے تو اس وقت ریتھال بروم اپنی کلاشنکوف کو ایک ہاتھ میں تھامے اطمینان سے کھڑا کافی پی رہا تھا۔ اس نے بھی وہاں کی دیواروں پر کسی مقتول کے خون سے انجیل مقدس کے کچھ اقتباسات لکھ ڈالے تھے۔

لائلہ کے کمرے میں جھانکتے ہی میری نظروں کے سامنے کئی برس پہلے کا وہ ہیبت ناک منظر گھوم گیا۔ یقینا یہ بھی

کسی شیطان صفت انسان کا کام ہی لگتا تھا اور مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آگئی کہ اس نے لائلہ کا کیا حشر کیا ہوگا۔ ساتھ ہی مجھ پر یہ بھید بھی کھل گیا کہ لائلہ جب میرے کمرے میں آئی تھی تو اس قدر خوف زدہ کیوں تھی اور براؤن کے کمرے تک اکیلی کیوں جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد میں نجانے کتنی دیر تک لائلہ ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ حالانکہ میری اس کے ساتھ بہت تھوڑی دیر کی جان پہچان تھی اور اس میں بھی ہر دفعہ اس نے میرا استعمال کیا تھا مگر پھر بھی اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے بار بار آجاتا تھا۔ شاید مجھے اس کے نوجوان اور معصوم چہرے میں کہیں اپنی نوجوانی کے دنوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ کافی دیر تک میں ایسے ہی گم صم بیٹھی رہی۔

میں نے جب گھڑی کی طرف نظر دوڑائی تو احساس ہوا کہ ایمبیسی جانے کا وقت نکل چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب تو یہ کام کل ہی ہو پائے گا۔

ایک طرف تو مجھے لائلہ کے اس طرح قتل ہوجانے کا افسوس تھا مگر ساتھ ہی خودغرضی پر مبنی ایک طرح کا اطمینان بھی تھا کہ اس کی موت کے ساتھ مجھے یمی لی اور براؤن کے قتل سے جوڑنے والی واحد کڑی ٹوٹ چکی تھی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میرے لیے اینی کا کوئی پیغام آیا ہو تو میں نے فرنٹ ڈیسک سے رابطہ کیا۔ میرے لیے دو پیغامات آئے تو تھے مگر وہ اینی کی طرف سے نہیں تھے۔ ایک پیام ہوٹل کے مینجر کی طرف سے تھا۔ جو میرے کریڈٹ کارڈ کی کچھ مزید تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔ شاید اسے پولیس یا پھر فرنٹ ڈیسک پر موجود لڑکی کے ذریعے میرے لائلہ سے تعلق کی خبر مل گئی تھی اور اسی کی مزید تحقیقات کا یہ بہانہ ڈھونڈا گیا تھا۔

دوسرا پیغام ایک انجام فون نمبر سے آیا تھا اور کالر نے کہا تھا کہ میں جلد از جلد اس سے رابطہ کروں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس انجان فون نمبر پر کال کروں یا نہیں کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے ایک مردانہ آواز آئی۔ آواز کچھ شناسا سی تو معلوم ہوتی تھی مگر میں اسے پہچان نہ پائی۔

”تمارا۔“

”جی میں بول رہی ہوں۔“

”کیا تم اس وقت اکیلی ہو؟“

”آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”میں تم سے اسٹیمپ اینڈ گو کلب میں ملا تھا۔ اسی رات جس رات تمہارے دوست کا قتل ہوا تھا۔“

”کون ہو تم؟“ میں تنک کر بولی۔

”لیسی، یاد آیا۔ ڈیلا براؤن کا دوست۔“

اب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی دبلا پتلا سا چیچک زدہ شخص تھا جس کے ساتھ براؤن بڑے پُرتپاک انداز میں ملا تھا۔ کیا اس کا بھی اس شیطانی گورکھ دھندے سے کچھ تعلق تھا؟ مگر میں اس میں کیوں خوامخواہ الجھتی جا رہی تھی؟

”میں تمہیں نہیں جانتی اور نہ ہی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں۔“ میں نے اسی تنک مزاجی سے جواب دیا۔

”تم نے دیکھا تھا نا براؤن کے ساتھ کیا ہوا؟ میرے دوست کے ساتھ کیا ہوا اور پھر بھی تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟“

”تم اس بارے میں کس طرح جانتے ہو؟“

یہ کہتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کیونکہ یہ کہہ کر میں نے خود ہی اس بات کا اعتراف کرلیا تھا کہ میں جائے وقوعہ پر موجود تھی۔ مجھے اپنا منہ بند ہی رکھنا چاہیے تھا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ منہ سے نکلی بات اور کمان سے نکلا تیر کبھی واپس نہیں آتے۔

”تو تم بھی وہاں موجود تھیں۔ تھیں نا، اب میرے ساتھ کوئی بکواس مت کرنا۔ تم جانتی نہیں کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔

”میں نہیں جانتی تم کیا بات کررہے ہو؟“

”میں اپنی رقم واپس چاہتا ہوں۔ وہی رقم جو تم نے اور اس چھوٹی کمینی نے مل کر براؤن کے کمرے سے چرائی ہے وہ میری رقم ہے گھٹیا عورت! میں نے ہی براؤن کے پاس رکھوائی تھی۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی، مجھے تو......“

”تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں گھٹیا عورت! رقم تم دونوں میں سے کسی ایک کے پاس ہے۔ کہاں چھپایا ہے تم نے میرا سرمایہ؟“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

مجھے یاد آیا کہ براؤن نے اسے اس رات اپنے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بتایا تھا۔ تو کیا یہی آدمی اس کا قاتل تھا؟

”بتاؤ اس کُتیا نے رقم کہاں چھپائی ہے؟ میں جانتا

ہوں کہ تم دونوں کیا کھیل، کھیل رہی ہو۔“

”تم نے لائلہ کے ساتھ کیا کیا؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس سارے کھیل کا چوتھا کھلاڑی یہی ہوسکتا تھا۔ اسی نے موت کا یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ اس جرمن گورے اور براؤن کو غالباً اسی نے قتل کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ براؤن کہاں ٹھہرا ہوا تھا اور شاید لائلہ کے بارے میں بھی۔ شاید براؤن نے ہی شیخی بگھارتے ہوئے اسے لائلہ کے متعلق بتادیا ہو گا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ لائلہ کو پہلے سے ہی جانتا ہو۔ یہ ساری اسکیم اس کی اور لائلہ کی بھی تو ہوسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ پھر اسی نے لائلہ کو بھی ڈبل کراس کر کے ماردیا ہو؟

”ظالم درندے تم نے صرف رقم کی خاطر اس کا قتل کردیا۔ اس لڑکی کو اس بے رحمی سے ماردیا تم نے۔“ میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”تو کیا بکواس کر رہی ہے گشتی! مجھے تو بس میری رقم چاہیے۔ مجھے بتا! کہاں چھپایا ہے میرا مال؟“

”تمہاری رقم میرے پاس نہیں ہے حرام زادے۔“ میں نے بھی دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

”تم مجھے بے وقوف نہیں بناسکتی تمارا ہیل! اب تم مجھ سے بچ نہیں پاؤ گی۔“

”تم میرا پورا نام کیسے جانتے ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم کہاں ہو۔ میں کسی بھی وقت آکر تمہاری گردن مروڑ سکتا ہوں۔ مجھے میری رقم چاہیے بس! اگر اپنی جان پیاری ہے تو جب میں آؤں تو شرافت سے رقم میرے حوالے کردینا ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہاری اپنی ماں بھی تمہارا چہرہ نہیں پہچان پائے گی......“

اس کی ہذیانی بکواس ابھی جاری تھی مگر میں نے غصے سے فون پٹخ کر بند کردیا۔

تو یہ سب اس رقم کا چکر تھا۔ ہمیشہ دولت کا لالچ ہی انسان کو گناہ کے راستے پر ڈالتا ہے۔ لائلہ کو بھی اسی لالچ نے اکسایا اور اس کی جان چلی گئی اور میں بھی رقم کے لالچ میں آکر اس سارے گورکھ دھندے میں پھنس گئی۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ لیسی جس رقم کی بات کر رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ رقم میرے پاس ہے اس کی تو میں نے جھلک تک بھی نہیں دیکھی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کا ایسا سوچنا بھی ٹھیک تھا کیونکہ باقی تمام لوگ تو مارے جاچکے تھے۔ اب رقم اگر میرے پاس بھی نہیں تھی تو تھی کہاں اور کس کے پاس؟

غور طلب بات تو یہ بھی تھی کہ وہ میرا پورا نام کیسے جانتا تھا کیونکہ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی تھی، اس کے سامنے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ شاید ان تینوں میں سے کسی ایک نے اسے بتادیا ہوگا یا شاید یہ کہ کرشیخی بگھاری ہو کہ میں ان کے ساتھ کام کر رہی تھی، ان کے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں۔

اس نے لازماً لائلہ کے کمرے کی تلاشی لی ہوگی اور جب رقم وہاں پر نہیں ملی ہوگی تب ہی اسے میرا خیال آیا ہو گا۔ رقم پانے کے لیے اس نے ضرور لائلہ پر تشدد کیا ہوگا۔ مگر رقم اگر لائلہ کے پاس تھی تو اس نے لیسی کے حوالے کیوں نہیں کردی؟ یا ہوسکتا ہے کہ اس نے رقم کسی ایسی جگہ چھپا دی ہو جہاں تک پہنچنا خود اس کے لیے بھی مشکل ہو؟

مگر اب تو وہ رقم حاصل کرنے میری طرف آرہا تھا۔ کیا وہ سوچ رہا تھا کہ میں اتنی بے وقوف ہوں کہ چپ چاپ اس کے آنے کا انتظار کروں گی یا دوبارہ اس سے بات بھی کروں گی؟ اس نے مجھے کسی اور وجہ سے فون کیا تھا مگر وہ وجہ کیا ہوسکتی تھی اور وہ رقم آخر تھی کہاں؟

میں نے کمرے میں اپنا دفاع کرنے کے لیے کوئی چیز تلاش کرنی شروع کی مگر ایسی چیز تو پہلے تھی نہ اب۔ مجھے ایک گن کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی تاکہ وہ خبیث اگر میرے پاس آنے کی غلطی کرے تو میں اسے مزہ چکھا دوں۔

میں ابھی اسی اُدھیڑبُن میں مصروف تھی کہ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔

میں نے اسے بجنے دیا مگر وہ مسلسل بجے جارہی تھی۔ آخر تنگ آکر میں نے فون اٹھا ہی لیا۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ میں نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

”تمارا؟“

یہ آواز تو بہت جانی پہچانی تھی اور اس وقت اس نے میرے دل کے تاروں کو چھولیا تھا۔ ”تمارا! میں بازل بول رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ پچھلی بار ہمارے بیچ جو تلخی پیدا ہوگئی تھی، اسے ختم کیا جائے۔ اس کے لیے کیا تم میرے ساتھ ایک ڈرنک پینا پسند کروگی؟“ اس نے بڑے مہذب انداز میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

”تمارا تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

''تم جانتے ہو کہ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جنہیں اپنی حفاظت کے لیے مردوں کی ضرورت پڑتی ہے۔'' میں نے اپنی گردن اکڑاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا اہمل! انہی باتوں کی وجہ سے ایک دن تم بہت برا پھنسنے والی ہو۔'' بازل نے سرزنش کے انداز میں کہا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ''میں نے تو تمہاری آواز سنتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ تم کسی مشکل میں ہو پھر جب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہاری آنکھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ تم چاہے جھوٹ بول بھی لو مگر تمہاری آنکھیں ہمیشہ سچ بولتی ہیں۔''

ہم نیو کنگسٹن میں واقع ایک چھوٹے سے مگر عمدہ ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور وہ ڈرنک بھی پی جس کا بازل نے فون پر ذکر کیا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہر شے نکھر کر صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اسے اب تک کے تمام واقعات کی تفصیل بتائی۔ وہ بڑے انہماک سے سب کچھ سنتا رہا اور پھر بولا۔ ''تو تمہارا خیال ہے کہ لیسی نے ہی لائلہ کا قتل کیا ہے اور اب وہ تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے؟''

''مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔''

''کیا وہ جمیکن ہے؟''

''نہیں وہ امریکن ہے۔''

''وہ بہت بزدل انسان ہے جو عورتوں کو دھمکاتا ہے اور ان پر تشدد کرتا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''کیا وہ کنگسٹن میں رہتا ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی مگر مسٹر بازل ڈیوپری! تم تو اس سارے چکر سے باہر ہی رہو تو بہتر ہوگا۔'' میں نے جواب دیا مگر میں جانتی تھی کہ وہ جس قسم کا جذباتی اور غیرت مند شخص تھا ایسے خطرناک حالات میں وہ کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

''تو پھر بات وہیں سے شروع کریں جہاں سے پچھلی دفعہ ہمارے بیچ کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔'' اس نے رکتے رکتے کہا۔

''ہاں مجھے افسوس ہے کہ میرے منہ سے اس دن بہت ہی غلط بات نکل گئی تھی مگر پلیز سمجھنے کی کوشش کرو کہ مجھے اس وقت بہت صدمہ پہنچا تھا جب تم نے اپنی بہن بیٹینا کے بارے میں بتایا تھا۔''

''تم شاید نہیں سمجھ سکو گی مگر بعض اوقات جھوٹ کسی کو دھوکا دینے کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے بھی بولا جاتا ہے کیونکہ سچائی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اگر تم بھی غربت کی چکی سے پس کر نکلی ہوتیں تو شاید اس بارے میں تمہارا نظریہ کچھ مختلف ہوتا۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''اب اس ملک کو ہی دیکھ لو۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں پر سب کچھ ٹھیک نہیں ہے، بہت سے غلط کام ہوتے ہیں۔ سیاست دانوں اور منشیات کے اسمگلروں نے اسے جرائم کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ سب دیکھنا اور برداشت کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں مگر پھر اس مٹی کی یاد ستاتی ہے تو پھر یہاں لوٹ آتا ہوں جیسے کسی محبوبہ سے کچھ دیر کے لیے ناراضی ہو جائے اور پھر کچھ دنوں بعد ہی صلح ہو جائے۔''

''تمہاری بہن اب کہاں ہے؟''

''یہیں جمیکا میں ہے۔ نیوآرک میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ لندن چلی گئی تھی۔ وہاں پر اس کی ملاقات اسکریچ نامی ایک لڑکے سے ہوئی۔ غالباً میں نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میری ماں کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہی جمیکا آئی تھی۔''

''تو کیا وہ ابھی تک تمہارے آبائی گھر میں ہے؟''

''نہیں وہ...... وہاں اُن پہاڑوں پر۔'' اس نے نیلگوں پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب صورت جگہ ہے۔ بالکل جنت کی طرح۔ وہاں پر میرے دوست نوئل کا گھر ہے۔ میں اپنی والدہ کو بھی وہاں لے گیا تھا تاکہ تازہ آب و ہوا میں شاید ان کی طبیعت بہتر ہو جائے۔ میں جب بھی جمیکا آتا ہوں تو وہیں ٹھہرتا ہوں۔ نوئل بالکل میرے بھائیوں جیسا ہے۔ اس نے یہاں کی لوک موسیقی کو نئے انداز میں سی ڈیز پر پیش کرنے کا کاروبار شروع کیا تھا جس میں اسے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اب تو وہ بہت امیر کبیر ہو چکا ہے اور زیادہ تر وقت لندن میں ہی گزارتا ہے۔ مگر یہاں پر بھی اس نے یہ گھر خرید رکھا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی ذمّے داری اس نے مجھ خاکسار پر ڈال رکھی ہے۔ حالانکہ اسکریچ اس کا سگا بھائی ہے مگر نوئل کی ہدایات کے مطابق وہ اس گھر کے آس پاس پھٹک بھی نہیں سکتا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اسکریچ کی عادات بچپن ہی سے کچھ بگڑی ہوئی ہیں۔''

''اس دن اسٹیمپ اینڈ گو کلب میں بھی تم اسی سے ملنے گئے تھے نا؟'' میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں اس لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔''

''کہیں ایسی بات تو نہیں کہ تمہاری چھوٹی بہن اور نوئل کا چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کی بے جا سختی کی وجہ سے اس طرح کے باغیانہ طرزِعمل پر مائل ہو گئے ہوں۔ پہلے تمہیں تنگ کرنے کے لیے اور بعد میں شاید انہیں وہ سب کچھ اچھا لگنے لگا ہو؟'' میں نے ان دونوں کی وکالت کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔

''کیا میں اُس سے مل سکتی ہوں؟''

اس نے جواب میں اس طرح کندھے اچکائے جیسے کہنا چاہتا ہو کہ تمہاری مرضی۔

''چلو پھر سہی۔ اگلی دفعہ یہاں آئی یا وہ امریکا آئی تو میں اس سے مل لوں گی۔'' میں نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''تو کیا تمہارا یہاں سے جلد ہی کُوچ کرنے کا ارادہ ہے؟''

''ہاں۔''

''تمہارا ہینڈ بیگ مل گیا؟''

''نہیں ابھی تک تو نہیں۔''

''تو پھر گزارہ کیسے چل رہا ہے؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''بس چل ہی رہا ہے۔ میری ایک دوست جلد ہی مجھے کچھ رقم بھیج دے گی۔ شاید کل تک۔''

''تو پھر آج رات کا کیا ارادہ ہے؟''

''بس کسی طرح چھپ چھپا کر ہوٹل مونٹیگو بے واپس پہنچوں گی۔''

''چھپ چھپا کر کیوں؟'' بازل نے حیرت سے پوچھا۔

''بس کچھ ہوٹل کے بل کا مسئلہ ہو گیا ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

اس نے پھر سرزنش کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کتنا بڑا مسئلہ ہے؟''

''پتا نہیں، میں نے یہاں آتے ہی اپنے کریڈٹ کارڈ کا نقش تو ہوٹل والوں کو دیا تھا۔ اب پھر نجانے کیوں انہیں مزید تصدیق کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ یہاں کی پولیس کو کچھ سن گن مل گئی ہے کہ اس تمام معاملے سے تمہارا کچھ تعلق ہے مگر ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ کسی امریکن سیاح کی اس طرح تضحیک نہیں کر سکتے اسی وجہ سے وہ تمہاری پوری طرح سے چھان بین اور تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا تم واقعی وہی ہو جو تم کہہ رہی ہو یا نہیں اور یہ بھی کہ تم اپنا بل ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں تو بس انہی.... پیسوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ تصدیق امریکن ایمبیسی سے ہو جائے گی اور پھر میں گھر واپس جانے کے قابل ہو جاؤں گی۔ شاید کل اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہو جائے۔''

''مگر وہ شخص؟...... لیسی...... جس نے تمہیں فون کیا تھا؟''

میں کچھ دیر خاموشی کے بعد بولی۔ ''اس کا کیا؟ اس کو میں دیکھ لوں گی۔''

وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مجھے کچھ ایسی باتیں پتا چلی ہیں جن سے میں تھوڑا پریشان ہو گیا ہوں۔ وہ لڑکا جس نے اس رات کلب میں فائرنگ کی تھی، میں اس کے خاندان کو جانتا ہوں۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنی ماں کے کنٹرول سے باہر ہے۔ وہ برا لڑکا نہیں ہے۔ بس غلط صحبت کا شکار ہے۔ اس کی ماں کی زبانی مجھے پتا چلا کہ وہ گزشتہ شب جب گھر واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ اس کے پاس ڈھیر سارے امریکی ڈالر تھے جو شاید اسے کسی نے کلب میں فائرنگ کرنے کے لیے دیے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ فائرنگ کسی کو قتل کرنے کے لیے نہیں بلکہ دراصل قتل سے دھیان ہٹانے کے لیے کی گئی تھی کیونکہ قتل فائرنگ کی وجہ سے نہیں ہوئے تھے۔''

''اگر یہ بات تھی تو پھر قاتل کا اصل نشانہ کون تھا؟ یسی لی یا پھر وہ جرمن؟''

''پتا نہیں۔ شاید دونوں ہی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''مگر ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''شاید کچھ نہیں یا شاید وہ دونوں ہی کچھ ایسے کام میں ملوث تھے جس کی وجہ سے تعلق بنتا ہو مگر یہ گتھی ابھی ہم پر کھل نہیں پائی ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلی آتیں؟ وہاں پہاڑوں پر جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ صبح مجھے کچھ کام کے سلسلے میں اپنی بہن کے ساتھ جانا ہو گا بس ایک یا دو گھنٹوں کے لیے۔ تم وہاں آرام کرنا اور پھر میں تمہیں واپس چھوڑ آؤں گا۔ چلو تمہیں بہت اچھا لگے گا۔''

میں سوچ میں ڈوبی رہی کہ اب کیا جواب دوں؟

بازل نے بل ادا کیا اور میری بانہوں میں بانہیں ڈال کر بولا۔ ''اتنا زیادہ سوچنا صحت کے لیے اچھا نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہوتا۔ چلو ویسے بھی میں تمہیں آج رات اس ہوٹل میں اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

☆☆☆

نیلگوں پہاڑوں تک کا سفر بہت خوشگوار تھا۔ سڑک کے کنارے اُگے جنگلی پیڑ پودوں کی خوشبو سے سارا ماحول مہک رہا تھا۔ کہیں کہیں سے سڑک کچھ خراب تھی مگر بازل مہارت سے اپنی ہیوی موٹر بائیک چلاتا رہا۔ پھر ایک حویلی نما گھر کے سامنے اس نے موٹر بائیک روکی۔ یہ بہت بڑا گھر تھا جس کی تعمیر وکٹورین طرز کی تھی۔ تمام اطراف سے خوشنما پیڑ پودوں سے سجا یہ گھر گو پرانا دکھائی دیتا تھا مگر لگتا تھا کہ اس کے مالک نے اس کی تزئین و آرائش پر بہت وقت صرف کیا ہے۔ میں بازل کے پیچھے پیچھے اندرونی راستوں سے ہوتی ہوئی گھر کے اوپر ٹیرس پر پہنچ گئی۔ یہاں سے پورے کنگسٹن شہر کی روشنیاں ایک ستاروں بھری کہکشاں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اس سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم اندر چلے آئے اور لاؤنج میں بیٹھ کر میوزک سننے لگے۔ بازل کا دوست نوئل کیونکہ میوزک ہی کے بزنس سے وابستہ تھا اس لیے اس نے گھر میں دنیا جہان کی میوزک سی ڈیز جمع کر رکھی تھیں۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”بیٹینا کہاں ہے؟ تم نے کہا تھا کہ آج کل وہ یہیں ٹھہری ہوئی ہے؟“

”پتا نہیں، وہ اپنی مرضی سے آتی جاتی ہے۔ مجھے اس کے معمولات کے بارے میں علم نہیں۔ شاید اسکریچ سے ملنے گئی ہو۔ مجھے اس لڑکے سے اس کا میل جول بالکل پسند نہیں۔“ اس نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔

”تمہیں پتا ہے کہ اسکریچ بھی یہاں جسم فروشی کا دھندا کرتا ہے۔ یہاں پر کافی امیر کبیر عورتیں سیاحت کی غرض سے آتی ہیں جو کچھ دیر عیاشی کے لیے اچھے خاصے پیسے دینے کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ اسکریچ ان کی 'ضروریات' پوری کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کافی غلط کاموں میں ملوث ہے جن میں چوری اور منشیات کی خرید و فروخت شامل ہے۔ بیٹینا کو نہیں معلوم کہ وہ کتنے غلط آدمی سے تعلقات بنا کر رہ رہی ہے۔“

”کیا اسی لیے اس کے بھائی نے اس کا یہاں داخلہ بند کر رکھا ہے؟“

”ہاں۔“

”کیا وہ اسے معاف نہیں کرسکتا جیسے تم نے بھی تو بیٹینا کو معاف کر دیا ہے۔“

”بیٹینا کا معاملہ اور ہے مگر اسکریچ۔ وہ تو ازلی طور پر خراب ہے۔ کچھ عرصہ پہلے وہ نوئل سے لندن میں ملا تھا تبھی نجانے ان دونوں کے بیچ کیا ہوا کہ نوئل نے اس سے تمام مراسم توڑ لیے۔ میں جانتا ہوں کہ نوئل نے بڑی محنت اور لگن سے اپنی عزت اور دولت کمائی ہے۔ وہ کسی بھی قسم کے غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہے۔ شاید اسی لیے وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بھائی کی وجہ سے لوگ اس پر بھی انگلیاں اٹھائیں۔“

پھر ہم نے تھوڑی سی ڈرنک کی اور وہیں لاؤنج میں ڈانس کرنے لگے۔

میں کافی تھک چکی تھی اور میرے سر میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگا تھا۔ میں نے بازل سے سردرد کی گولی طلب کی اور سونے کی اجازت مانگی۔ اس نے مجھے بیڈ روم تک چھوڑا اور بتایا کہ گولیاں بیڈ کے قریب پڑی ٹیبل کی دراز میں ہیں۔

میں نے سائڈ ٹیبل کی اوپری دراز کھولی تو یہ دیکھ کر کافی حیرانی ہوئی کہ وہاں پر ایک سیاہ رنگ کی چھوٹی سی گن پڑی ہوئی تھی۔ یہ لوڈ بھی کی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسی سنسان جگہ پر اپنی حفاظت کے لیے ایسا ہتھیار رکھنا شاید ضروری بھی تھا۔ میں نے دوسری دراز کھولی تو سردرد کی گولیاں مل گئیں جو میں نے دو گھونٹ پانی کے ساتھ نگل لیں اور پھر نرم و گداز بستر پر آرام سے سو گئی۔

صبح جب میں سو کر اٹھی تو باہر سے ایک عورت اور ایک آدمی کے اونچی آواز میں لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر گفتگو کافی حد تک وہاں کی علاقائی زبان میں تھی اس لیے کچھ پلّے نہ پڑا۔ میں نے اٹھ کر غسل کیا اور اپنے گزشتہ رات والے کپڑے ہی پہن لیے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہیں تھا۔

میں تیار ہو کر کمرے سے نکل رہی تھی تو بازل کو باہر ہی کھڑا پایا۔

”تو تم نے ہمیں جھگڑتے ہوئے سن ہی لیا۔“ وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہمارا جھگڑا اسکریچ کو لے کر ہی ہو رہا تھا۔ یقین مانو بیٹینا پہلے ایسی نہیں تھی مگر اب وہ بہت بدل گئی ہے۔ مجھے تو یہ سب اس اسکریچ کی صحبت کا ہی اثر لگتا ہے۔ اب وہ میری کوئی بات سننے اور ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتی۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟ بہرحال ہمیں کچھ دیر کے لیے کنگسٹن جانا ہوگا۔ دراصل وہاں پر ہماری والدہ کی تھوڑی سی پراپرٹی اور کچھ بینک میں جمع شدہ پونجی ہے جس کے لیے مجھے اور بیٹینا کو ایک ساتھ متعلقہ بینک اور دیگر دفاتر میں جانا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ اثاثہ اپنی تینوں بہنوں کے بیچ

مساوی طور پر بانٹ دوں جبکہ بیٹینا سب کچھ اکیلے ہی ہڑپنا چاہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ باقی بہنیں تو اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں اس لیے انہیں اس ترکے میں سے کچھ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر یہ تو ناانصافی کی بات ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"یہ تو مگر بیٹینا کو کون سمجھائے۔ خیر آج وہاں جانا تو پڑے گا ہی کیونکہ بیٹینا کل یہاں سے چلی جائے گی۔ ہم ایک یا دو گھنٹوں تک واپس آجائیں گے۔ تم فکر نہ کرنا۔"

پھر میرے گال پر ہلکا سا بوسہ دے کر بولا۔ "یہاں گھر کے عقب میں ایک تالاب ہے اور ایک باغیچہ بھی ہے۔ بہت خوب صورت اور پُرسکون جگہ ہے۔ تم وہاں جا کر آرام کرنا ساری تھکن دور ہو جائے گی۔"

"بس زیادہ دیر مت لگانا کیونکہ مجھے امریکن ایمبیسی جا کر اپنے سفری پاسپورٹ کا انتظام بھی کرنا ہے اور اس کے بعد یہاں سے جانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ ہاں تم تو یہاں سے رفو چکر ہونے کا سوچ رہی ہو جبکہ میرا خیال تھا کہ تمہیں ایک دو روز اور یہاں رکنے کے لیے منالوں۔"

"اچھا چلو اس بارے میں بھی سوچوں گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں آ کر تم نے تو پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ بھئی کچھ دیر میرے ساتھ بھی گھوم پھر لینا۔ میں کنگسٹن سے واپسی پر ایک گاڑی کرائے پر لے آؤں گا پھر اس میں تمہارے ہوٹل چلے جائیں گے۔ تم وہاں سے اپنا سامان اٹھا لینا اور پھر ہم ایک دو روز کے لیے پورٹ اینٹونیو چلے جائیں گے۔ سمندر کے کنارے بہت ہی خوب صورت جگہ ہے۔ میرا ایک دوست وہاں کے ایک اچھے ہوٹل میں منیجر ہے۔ کچھ دیر وہاں سیر سپاٹا کریں گے۔ پھر مونٹیگو بے اصلی والے بھی جا سکتے ہیں جہاں سب امیر کبیر لوگ چھٹیاں منانے اور سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ میں تمہیں اپنا ملک دکھانا چاہتا ہوں تمارا۔ تم ایمبیسی والوں سے کہہ دینا کہ تمہیں کچھ پرانے دوست احباب مل گئے ہیں اور تم ان کے ساتھ مونٹیگو بے جا رہی ہو وہ تمہارا پاسپورٹ وہیں پہنچا دیں گے۔ پھر تم وہیں سے فلائٹ پکڑ کر واپس جا سکتی ہو۔ ویسے بھی میرے خیال میں تمہیں کنگسٹن میں اور زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے۔"

وہ جس جوش و خروش سے پلان بنا رہا تھا، اسے دیکھ کر میرا بھی دل بے ایمان ہونے لگا کیونکہ سننے میں یہ سب، بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"یقین مانو تمہیں پیسوں کی کوئی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"مگر مجھے تم پر اتنا بوجھ ڈالنا اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا تو پھر اسے ایک قرض ہی سمجھ لینا۔ جب بھی تمہارے پاس اتنے پیسے ہوں تو لوٹا دینا۔ ویسے میرے لیے یہ کوئی بوجھ نہیں ہوگا بلکہ مجھے ایسا کرنے میں خوشی محسوس ہوگی۔"

میں نے سوچا کہ اگر زندگی نے جمیکا آنے کا ایک موقع دے ہی دیا ہے تو پھر یہاں گھومنے پھرنے اور کچھ سیرو تفریح میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اینی کو بھی فون کر کے منع کر دوں گی کہ پیسے نہ بھیجے کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس کے لیے ایسا کرنا کافی مشکل کام تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ شاید تم ٹھیک ہی سوچ رہے ہو۔" میں نے رکتے رکتے جواب دیا۔

پھر مجھے ٹیرس پر ایک نوجوان لڑکی کھڑی نظر آئی جس کے سیاہ گھنگریالے بال چھوٹی چھوٹی مینڈھیوں میں بڑی نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ اس کی بازل سے کافی مشابہت تھی مگر ساتھ ہی اس کے چہرے پر عجیب سی کرختگی تھی۔

میں اپنا کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

"گڈ مارننگ۔" میں نے فضائی میزبانوں جیسی شائستگی اور خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا تم امریکن ہو؟ میرے بھائی سے ملنے آئی ہو؟" اس نے انتہائی روکھے انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"مگر میں نے تمہارے بارے میں اس کے منہ سے کبھی کچھ نہیں سنا۔ لگتا ہے کہ تم اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہوگی۔" اس کا لہجہ کافی کرخت تھا۔

"اور تمہارا تو وہ ذکر کرتے نہیں تھکتا۔" میں نے بھی اپنے لہجے میں کرختگی لاتے ہوئے کہا تو وہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئی مگر جلد ہی اس کی کرختگی لوٹ آئی۔

"میں تو یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی۔ کتنی گندی اور غلیظ جگہ ہے۔" وہ ناک سکیڑ کر بولی۔

"مگر یہ تمہارا ملک بھی تو ہے۔ تم یہیں پلی بڑھ کر

جوان ہوئی ہو اور اب تمہیں یہ جگہ گندی اور غلیظ لگنے لگی ہے۔“

”اوہ! اور تم کون ہوتی ہو مجھے حب الوطنی پر لیکچر دینے والی۔ میرے بھائی کی امریکن رکھیل!“ ایک لمحے کو تو میں سن سی ہوگئی مگر پھر جلد ہی میری آواز لوٹ آئی۔

”میرا تمہارے بھائی سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے اور تمہیں اپنے بڑے بھائی کے مہمانوں کے ساتھ تمیز سے پیش آنا چاہیے۔“

”مجھے تمیز مت سکھاؤ امریکن کُتیا! میں جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں اپنے بھائی کے مہمانوں کو خاص طور پر تم جیسی عورتوں کو!“

وہ واقعی بہت بدتمیز اور منہ پھٹ لڑکی تھی۔

”بیٹینا چلو! ہمیں دیر ہورہی ہے۔“ بازل کی آواز آئی تو بیٹینا پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔

بیٹینا کی تلخ باتوں سے میرا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ بازل اس کے بارے میں سچ ہی کہتا تھا۔ واقعی وہ لڑکی بہت بگڑی ہوئی تھی۔ کتنا فرق تھا دونوں بہن بھائی کے بیچ میں۔

میں نے خود کو سمجھایا کہ بازل اور اس کی بہن کے مابین جو کدورتیں تھیں، ان سے میرا کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے مجھے اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے گھر کے مختلف کمروں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لاؤنج، ڈرائنگ اور پھر ڈائننگ روم سے ہوتے ہوئے میں کچن میں آگئی۔ کچن کا ایک دروازہ باہر ایک کچے پکے راستے کی طرف کھلتا تھا۔ یہ راستے آگے سیڑھیوں تک جاتا تھا جن سے چند قدم اوپر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں پر کافی خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ یہاں پر ایک سفید سنگ مرمر کی بینچ بھی تھی جو تالاب کے کنارے لگی تھی۔ اس تالاب کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کافی عرصے سے اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ اس میں کائی جمی ہوئی تھی اور پانی کا رنگ سیاہی مائل سبز ہو چکا تھا۔ وہاں پر مچھروں کی بھی کافی بہتات تھی۔ کافی گرمی ہونے کے باوجود اس تالاب میں نہانے یا تیرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بینچ کے پچھلی جانب کافی درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ پھر ایک چھپکلی میرے پیر کے اوپر سے گزری جس سے میں اچھل پڑی اور جلدی سے واپس گھر کے اندر چلی آئی۔ وہاں میں نے وقت گزارنے کے لیے ٹی وی یا ریڈیو کی تلاش شروع کی مگر بے سود۔ میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس کی بھی لائن ڈیڈ تھی۔ یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا مگر میں نے خوف کو اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا۔ خالی اور ویران گھر میں مجھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تو میں کچن میں واپس چلی آئی اور کچھ کھانے کے لیے تلاش کرنا شروع کیا کیونکہ صبح سے میں نے صرف کافی کا ایک کپ ہی پیا تھا۔ ناشتا تو بیٹینا کی جلی کٹی باتوں کی نذر ہوگیا تھا۔

فریج میں کچھ چکن پیٹیز پڑے ملے جن کو میں نے منٹوں میں چٹ کر دیا۔ ساتھ میں جوس پیا اور یوں اپنے لیے ناشتے اور لنچ کا بندوبست کرلیا۔ نجانے وہ کس کا کھانا تھا مگر اب تو میرے پیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ ’موج کرو تمارا‘ میں

ایک یاد

منظر امام مرنجان مرنج طبیعت کے آدمی ہیں۔ بہت کم باتوں کا بُرا مانتے ہیں۔ کئی برس پہلے رفیقۂ حیات کا انتقال ہو چکا ہے۔ چند روز قبل دفتر میں بیٹھے تھے۔ نعیم اختر نے خیریت دریافت کرتے ہوئے ان کے بچوں کا احوال پوچھا جو بلوغت سے آگے نکل چکے تھے۔ منظر امام نے فرمایا کہ بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ نعیم اختر نے بیٹے کے بارے میں سوال کیا تو بولے کہ اس کی بھی شادی ہوئے کئی برس ہو گئے۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر حسرت سے کہا۔ ”سب کی شادیاں ہو گئی ہیں، بس میں رہ گیا ہوں!“

نعیم بولے۔ ”اس عمر میں شادی؟“

”ہاں، تو کیا ہوا......“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میری صحت اور توانائی آج بھی ویسی ہی ہے جیسی تیس سال کی عمر میں تھی۔“

”یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ نعیم اختر کی جرح جاری تھی۔

منظر امام نے حسبِ معمول ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”میرے گھر کے قریب ایک پارک ہے۔ اس میں ایک بڑی سی چٹان ہے۔ میں جوانی میں اس پر طبع آزمائی کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں!“

”کیا آپ وہ چٹان اٹھا لیتے ہیں؟“ حیرت سے پوچھا گیا۔

”جوانی میں اٹھا سکتا تھا، نہ اب اٹھا سکتا ہوں...... صحت اور توانائی جوں کی توں ہے۔“

نے اپنے آپ سے کہا اور پھر یکا یک میری نظر کچن کی کھڑکی کی جانب گئی تو وہاں ایک آدمی کو کھڑے دیکھ کر میں چونک گئی۔ میں نے فوراً کچن کے باہری دروازے کی طرف دیکھا جس کا لاک کھلا تھا پھر جیسے اس نے میری سوچ پڑھ لی ہو، اور اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی جسے آگے ماتھے تک کھینچ رکھا تھا مگر میں اس کی آنکھیں دیکھ سکتی تھی۔ غلافی اور خوابیدہ سی جن میں کسی شکاری جانور جیسی سرد مہری تھی۔ وہ کافی اونچا لمبا اور تنومند تھا۔ اس نے جیسے میرے خوف کو محسوس کر لیا تھا۔

''کون ہو تم؟ اور یہاں میرے بھائی کے گھر میں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کافی بھاری اور گرجدار آواز میں پوچھا۔

اوہ تو یہ اسکریچ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ بیٹینا شاید اسی لیے میرے یہاں رہنے پر اس قدر برہم تھی۔ اسی نے یقیناً اسکریچ کو یہاں بلایا ہوگا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔'' وہ پھر گرجا۔

''اوہ!...... معاف کرنا دراصل تم ایسے اچانک آ گئے کہ میں کچھ ڈر سی گئی تھی۔ میں...... میں بیٹینا کی دوست ہوں۔'' میں نے کچھ سوچ کر بازل کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔

''میں...... میں امریکا سے آئی ہوں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

یہ کہتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اسکریچ بھی شاید مجھے بیٹینا کی طرح دھندے والی ہی سمجھے گا اور پھر اس کی نگاہیں جس طرح میرے جسم کے زیر و بم کا جائزہ لے رہی تھیں، مجھے اس بات کا یقین ہو گیا۔

''بیٹینا کی دوست؟ امریکا سے؟ کب آئی ہو؟'' اس نے پولیس والوں کی طرح تفتیشی انداز میں پوچھا۔

''آج صبح ہی آئی ہوں۔''

''مگر آج صبح تو امریکا سے کوئی پرواز نہیں آئی۔''

''وہ...... وہ میرا مطلب تھا کہ میں یہاں آج صبح پہنچی ہوں۔''

اُس کو میری بات کا یقین نہ ہوا تھا۔

''تم امریکا میں اسے کہاں ملی تھیں؟'' اس کی تفتیش جاری تھی۔

''نیو آرک میں۔''

''تمہارا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔''

''شاید بیٹینا کے ساتھ ہی کہیں دیکھا ہوگا۔''

''نہیں، نہیں...... میں نے تمہیں کہیں اور دیکھا ہے۔'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

مجھے بھی اب اس کا چہرہ پہلے کہیں دیکھا ہوا لگ رہا تھا۔ خاص طور پر اس کی خوابیدہ آنکھیں۔

''کیا بیٹینا میرے لیے کچھ چھوڑ کر گئی ہے؟''

''نہیں...... نہیں تو۔ وہ تو بس یہی کہہ رہی تھی کہ تم شاید یہاں آؤ گے۔ اب تم بیٹینا کو تو جانتے ہی ہو کہ وہ کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرتی۔'' میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ...... وہ اس کی ماں مر گئی تھی نا! بس اسی سلسلے میں کچھ کام سے گئی ہے۔''

''اکیلی؟''

''نہیں کسی بڑے جمیکن آدمی کے ساتھ۔ کہہ رہی تھی کہ وہ اس کا بھائی ہے۔''

''اوہ! وہ کمینہ۔''

''بھئی میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو بس تھوڑی دیر پہلے آئی ہوں۔''

اس نے فریج کا دروازہ کھول کر بیئر کی بوتل نکالی اور پھر اپنے جیکٹ کی جیب سے ایک جیک نائف کی طرز کا چاقو نکالا۔ یہ ایک بہت بڑا اور تیز دھار چاقو تھا جیسا کہ اکثر شکاری لوگ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ شکار کیے ہوئے جانور کو کاٹنے اور صاف کرنے کے لیے۔ اس نے چاقو سے بیئر کی بوتل کو کاٹا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''اچھا تو تم بیٹینا کے ساتھ ہو۔''

''ہاں، ہاں! ابھی بتایا نا میں نے۔'' میں منمنائی۔

وہ ہنسنے لگا جیسے جان گیا ہو کہ میں برابر جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ بیئر کی بوتل ایک ہی سانس میں ڈکارنے کے بعد اس نے خالی بوتل کو کچن سنک میں پھینک کر چکنا چور کر دیا۔ اس کے اس وحشیانہ عمل سے میں مزید خوف زدہ ہو گئی۔

''وہ...... وہ میں شاید باہر کچھ بھول آئی ہوں۔'' میں نے وہاں سے باہر نکلنے کا بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''دیکھنا کوئی سانپ، بچھو نہ کاٹ لے وہاں۔'' وہ ایسے مسکرایا جیسے مجھے خوف زدہ دیکھ کر اسے بہت لطف آ رہا ہو۔

میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے باہر نکل آئی اور پھر کچن کے باہر باغیچے میں رکھے سنگ مرمر کی بینچ پر جا کر ڈھیر ہو گئی۔ وہ کچن کی کھڑکی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھتی رہی کیونکہ میری دادی کہا کرتی

تھی کہ پاگل کُتّے سے کبھی نظر ہٹانی نہیں چاہیے۔ شاید یہی وجہ تھی میرا دھیان اسکریچ پر ہی رہا اور بینچ کے پیچھے جھاڑیوں میں ہوتی سرسراہٹ کی مجھے خبر نہ ہوئی۔

پھر اچانک میرے پیچھے کوئی آن کھڑا ہوا اُس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر میرا سر پیچھے کی طرف کھینچا۔ اس کے بدن سے پسینے کی بُو آرہی تھی۔ اس نے مجھے بالکل اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔ میری چیخ بھی جیسے میرے حلق میں ہی کہیں پھنس گئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرا آخری وقت آگیا ہو پھر اس کی باریک اور اونچی سی آواز سنائی دی جسے میں نے فوراً پہچان لیا۔

‘‘دیکھا کمینی میں تیری گردن مروڑنے آہی گیا۔’’ لیسی چلایا۔ ‘‘تو چاہتی ہے کہ میں تیری گردن توڑ دوں؟ اگر نہیں تو بتا کہ میری رقم کہاں ہے؟ کتنا پریشان کیا ہے تو نے مجھے! مگر اب تو تو میرے قابو میں آچکی ہے۔ اب بتا کہاں چھپائی ہے میری رقم؟’’

وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ پھر اس نے میرے اوپر گرفت تھوڑی ڈھیلی کی تو مجھے سانس آیا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا کہ جیسے میں نے بازل کے موٹر سائیکل کی آواز سنی ہو مگر پھر وہ آواز مدھم ہو کر دب سی گئی۔ میں سوچنے لگی کہ شاید اس نے موٹر سائیکل کھڑی کر دی ہوگی اور گھر کے اندر چلا گیا ہوگا یا شاید یہ صرف میرا وہم تھا مگر میں اتنا جانتی تھی کہ اگر بازل واپس آیا تو مجھے ڈھونڈنے ضرور آئے گا۔

مگر وہاں کوئی بھی نہ آیا۔ اسکریچ بھی نہیں۔ میں نے کچن کی کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسکریچ اب وہاں پر موجود نہیں تھا۔ میرے بال اب تک لیسی کی گرفت میں تھے۔ وہ اپنی گرفت پھر سے سخت کرتے ہوئے بولا۔ ‘‘دیکھو میں تم پر تشدد نہیں کرنا چاہتا مگر میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا اگر تم نے مجھے رقم کے بارے میں نہیں بتایا۔ بس میری رقم میرے حوالے کر دو پھر میں اپنی راہ لگوں گا اور تم اپنی راہ لگنا۔ مجھے ویسے بھی خوب صورت عورتوں پر تشدد کرنا اچھا نہیں لگتا۔’’

پھر وہ میرے بالوں کو کھینچ کر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ‘‘تم نے سنا نہیں میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں ذلیل عورت! دیکھو اس رقم پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ بس تم مجھے اس کا پتا بتا دو میں وعدہ کرتا ہوں میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تمہیں چھوڑ دوں گا۔’’

‘‘تمہیں یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟’’ میں نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

‘‘مجھے سب پتا چل جاتا ہے۔’’ وہ ہذیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

‘‘یہاں کا پتا اس کالے رنگ کے بیگ میں تھا جسے تمہاری دوست نے میرے ساتھ دیکھا تھا وہاں براؤن کے کمرے میں۔’’ اس نے خود ہی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

‘‘وہ سیاہ رنگ کا ڈفل بیگ؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘تم جانتی ہو کہ میں کس بیگ کی بات کر رہا ہوں۔’’ وہ غرایا۔

وہ بیگ جو لائلہ کے پاس تھا۔ وہ جو اس کے پاس براؤن کے کمرے میں تھا؟ میں نے کڑی سے کڑی جوڑنے کی کوشش کی۔

‘‘ہاں وہی بیگ جو اب تمہارے پاس ہے۔ ہینز 57 نے اس جگہ کا پتا ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر اس بیگ میں رکھا تھا۔ پھر وہ حرام زادہ اس کے بارے میں بھول گیا شاید۔ اس رات جب میں براؤن کے کمرے میں پہنچا اور ہم نے اس بیگ کو کھولا تو یہ ٹکڑا مجھے ملا۔ میں نے اسے اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ اس پر کوئی نام نہیں تھا بس ایک پتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ایڈریس میرے کسی کام ضرور آئے گا۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اسی ایڈریس کی مدد سے تمہیں تلاش کر پاؤں گا۔ میرے پاس بس وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ میں اس پتے پر پہنچ گیا تو ضرور اپنی رقم تک بھی پہنچ جاؤں گا۔ اسی لیے میں چھپ چھپا کر پیچھے کے راستے سے گھر میں داخل ہوا۔’’ وہ اب شیخی بگھارنا شروع ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی ساری قوت مجتمع کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کے ناخن اس کی کلائیوں میں زور سے چبھو دیے۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا مگر جلد ہی اس نے اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے میرے بالوں پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ میری گردن اور سر کی کھال بری طرح دکھ رہی تھی۔ پھر اس نے میری گردن کو ایک زوردار جھٹکا دیا تو ایک بار تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا مگر میں جلد ہی ہوش میں آگئی۔ وہ ابھی تک میرے بالوں کو پکڑے میری گردن کو پیچھے کی طرف جھٹکا رہا تھا۔

‘‘تم نے سنا نہیں؟ تم نے سنا نہیں میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ مجھے رقم کا پتا بتا دو۔ دیکھو، اب تم خود ہی مجھے تشدد کرنے پر مجبور کر رہی ہو۔’’

‘‘اچھا اچھا! بتاتی ہوں۔’’ میں نے درد سے کراہتے

ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں مگر پہلے مجھے چھوڑ دو پلیز، مجھے چھوڑ دو۔“

اس نے ایک لمحے کو رک کر سوچا اور پھر میرے بالوں کو چھوڑ دیا اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میرا دل تو اس کے منہ پر تھوکنے کو چاہ رہا تھا مگر میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چیچک زدہ چہرہ پسینے، دھول اور مٹی سے اٹا ہوا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کی۔

”ویسے تمہارا اس سارے معاملے سے کیا تعلق ہے؟ تمہیں دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ تم جیسی عورت اس قسم کے کام میں ملوث ہو گی۔ تم جیسی نرم و نازک اور خوب صورت عورت کو تو ایسے جھمیلوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ اب دیکھو تم میرے سامنے کیسی بے بس کھڑی ہو۔“ وہ ایسے بولا جیسے اسے میرے ساتھ بہت ہمدردی ہو۔

میں نے سر کو ایسے ہلانا شروع کیا جیسے میں بے ہوش ہونے لگی ہوں۔

”اوہو اب تم بے ہوش مت ہو جانا۔ پہلے مجھے رقم کا پتا بتا دو پھر جو چاہو کرنا۔ ہوش میں رہنا خواہ بے ہوش ہو جانا۔“

پھر میں گرنے لگی۔ وہ مجھے سہارا دینے کے لیے بڑھا۔ میں نے رک کر ایسی شکل بنانی شروع کی جیسے میں الٹی کرنے لگی ہوں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ارے رے یہ کیا ہو گیا تمہیں؟“

وہ تالاب کی جانب پیچھے ہٹ گیا تھا اور اس کے ہاتھ نیچے تھے۔ مجھے اسی موقع کی تلاش تھی۔ میں نے دہرے ہوتے ہوئے اس کے پیٹ پر اپنے سر سے ایک زوردار ٹکر ماری اور پھر ایک زوردار لات اس کی ٹانگوں کے درمیان نازک حصے پر۔ درد کی شدت سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے اس پر مکوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ وہ تالاب میں گرنے والا تھا مگر اچانک کمالِ پھرتی سے اس نے اپنا توازن بحال کیا پھر میری ایک لات نے اسے تالاب کے کنارے چاروں خانے چت کر دیا۔ میں لپک کر اس کی پشت پر سوار ہو گئی۔ میرا ایک گھٹنا اس کی کمر پر اور دوسرا اس کے دونوں شانوں کے بیچ ٹکا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میرے ذرا سے گھٹنے پر زور دینے سے اس کی ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ وہ مکمل طور پر میرے قابو میں آ چکا تھا۔ میرے اندر چھپی پولیس والی پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ اب تشدد کرنے کی باری میری تھی۔

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ تالاب کے گندے پانی کے نیچے دھکیل دیا۔ جب تھوڑی دیر بعد اس کا سر باہر نکالا تو وہ چیخا۔ ”کمینی عورت! تو ایسا کیوں کر رہی ہے؟“

وہ اپنا سر کسی بھیگے کُتّے کی طرح دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ اس کے منہ سے گندہ پانی اور رال بہہ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کا سر پانی کے نیچے دھکیلا جب باہر نکالا تو وہ چیخنے چلّانے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

”اوہ تو اب جناب کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور جو میرے بالوں کا حشر کیا تم نے حرام زادے۔“ یہ کہتے ہی میں نے اسے تالاب کے گندے پانی میں ایک اور غوطہ دیا۔

”یہ مجھے فون پر ڈرانے دھمکانے کے لیے۔ میرا اس تمام معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو بس ہوٹل میں ان لوگوں سے ملی تھی اور ان کے اصرار پر ان کے ساتھ گھومنے چلی گئی مگر پھر وہ ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے۔ میرے پاس تمہاری رقم نہیں ہے نہ مجھے اس رقم کو حاصل کرنے کی خواہش ہے اور نہ ہی میں اس کے متعلق کچھ جانتی ہوں۔ میں نے تو اس رقم کی جھلک تک بھی نہیں دیکھی۔“ میں نے اس کے سر کو پانی کی سطح سے ذرا بلند کرتے ہوئے کہا پھر ایک اور غوطہ دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے لائلہ کے ساتھ جو کچھ کیا، یہ اس کے لیے ہے۔“

”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہہ رہا ہوں کہ مجھے لائلہ نام کی کسی کُتیا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔“ وہ پانی تھوکتے ہوئے بولا۔

وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ تالاب کا گندہ پانی اس کے ناک اور منہ سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کا سر تالاب کے کنارے دے مارا۔ اب اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ تاکہ میں انہیں دیکھ سکوں۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”پلیز مجھے چھوڑ دو۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

”اچھا اب مجھے کمینی اور حرام زادی کے القابات سے نہیں بلاؤ گے کمینے!“ میں نے اس کے بالوں پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا چلو اب مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔" میں نے گرجتے ہوئے حکم دیا۔

"کیا؟ کیا جاننا چاہتی ہو تم؟"

"سب کچھ! یہ ہینز 57 کون ہے اور یہ پیسوں کا چکر آخر ہے کیا؟"

"ہینز 57 نے ہی اس کالے ڈفل بیگ میں وہ پیسے رکھے تھے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"اور یہ ہینز 57 کون ہے؟"

"تھا۔ اب وہ مر چکا ہے۔ اس کا یہی نام تھا۔ کم از کم اس نے مجھے تو اپنا یہی نام بتایا تھا۔"

"مگر وہ کون تھا؟" میری تفتیش جاری تھی۔

"وہ وہی جرمن گورا تھا جسے تم نے اس رات کلب میں دیکھا ہوگا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا تھا جب تم براؤن اور ان دوسرے لوگوں کے ساتھ کلب میں آئی تھیں۔"

میں نے اس رات ہونے والے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی، یہ وہی سنہری بالوں والا نوجوان ہوسکتا تھا جو لیسی اور اس سفید ہڈ والی جیکٹ والے کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک سیاہ ڈفل بیگ پڑا تھا۔ اس وقت بھی مجھے اس کلب میں اس سیاہ بیگ کی موجودگی کچھ عجیب سی لگی تھی۔ جیسے اس کا مالک جلد ہی کہیں دور جانے والا تھا۔

"تم اس ہینز 57 کو کیسے جانتے تھے؟"

"ہم نے کچھ عرصہ قبل ساتھ ہی کچھ کاروبار کیا تھا۔ ابھی ایک ہفتے پہلے وہ مجھے نیگرل میں ملا تھا۔ اسے میری مدد درکار تھی۔ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک کام کے سلسلے میں امریکا جا رہا ہے اور پھر اسی ہفتے اس کو جمیکا واپس آنا تھا۔ وہ کوئی ضروری چیز کنگسٹن میں کسی کو دینے جا رہا تھا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا تاکہ تمام معاملہ آسانی سے نمٹ جائے۔ اس کے لیے وہ مجھے دو ہزار ڈالر دینے کو تیار تھا۔ میں مان گیا۔ بس اسی وجہ سے ہم اس رات وہاں کلب میں گئے تھے۔"

"وہاں تم کس سے ملنے گئے تھے؟"

"مجھے کیا معلوم کس سے ملنا تھا اُسے۔"

"سیمی لی کہہ رہا تھا کہ وہ تم سے پہلے ملا ہوا تھا۔ کیا تم اُسے جانتے تھے؟"

"ہاں میں اسے کافی پہلے سے جانتا تھا۔ ان دنوں ہم اسے صرف 'لی' کہا کرتے تھے پھر میرے ساتھ کام کرنے والے ایک لڑکے نے بے ایمانی سے سیمی لی کا کچھ مال اُڑا لیا۔ اس ڈر سے کہ سیمی لی سارا الزام میرے سر نہ دھر دے میں بھی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد میرا اُس سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ اس رات جب اس نے مجھے پہچاننے کی کوشش کی تو میں جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ میری گرفت اس پر بہت مضبوط تھی۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ دیکھو اگر میں تمہیں مارنا چاہتا تو اسی وقت تمہاری گردن توڑ سکتا تھا مگر میں خوب صورت عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔"

"ہاں بس ان کے بال نوچتے ہو۔ چلو اب یہ رقم کا قصہ بتاؤ۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"کیا جاننا چاہتی ہو تم؟ اگر تمہیں رقم کے بارے میں کچھ نہیں پتا تو یہ سب جاننا تمہارے لیے کیوں اتنا اہم ہے؟"

"کیونکہ دو آدمیوں اور ایک عورت کا قتل ہو چکا ہے اس رقم کی وجہ سے۔"

بازل ٹھیک ہی کہتا تھا کہ میں اپنے اندر کی پولیس والی سے کبھی اپنا دامن نہیں چھڑا پاؤں گی۔ صحیح، غلط، جرم، سزا اور انصاف کا حصول یہ سب میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

"وہ رقم کس کام کے لیے تھی؟"

"مجھے کیا پتا، کوکین، چرس یا پھر کوئی اور منشیات۔ اسی کام کے لیے ہوگی۔ آج کل میکسیکو اور کولمبیا کو چھوڑ کر زیادہ تر لوگ جمیکا کا ہی رخ کرنے لگے ہیں ان تمام اشیا کے لیے۔"

"اور ہینز کس سے ملنے جا رہا تھا؟"

"میں نے بتایا نا کہ وہ امریکا سے آیا تھا اور کسی شخص سے اسے وہاں کلب میں ملنا تھا مگر تبھی وہاں پر فائرنگ شروع ہوگئی اور پھر کچھ کا کچھ ہوگیا۔"

"تم اس جرمن ہینز کو کافی عرصے سے جانتے تھے؟"

"تم تو بالکل پولیس والوں کی طرح سوال جواب کرنے لگی ہو۔ تمہیں بتایا نا کہ میں ہینز 57 کو کچھ عرصے سے جانتا تھا۔ انٹیگا میں چند سال قبل ملاقات ہوئی تھی مگر یہاں پر زیادہ لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہینز نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ میں ایسے ہی ایکٹنگ کروں جیسے ہم دونوں اجنبی ہوں۔ اس کے خیال میں یہی بہتر تھا۔ وہ اس رات اس شخص سے صرف بات چیت کرنے کے لیے گیا تھا اور مجھے ساتھ میں اپنی حفاظت کے لیے لے گیا تھا۔ اب یہاں پر کسی کی کہی ہوئی بات پر مکمل

یقین تو نہیں کیا جا سکتا مگر میرے ساتھ اس کی یہی بات ہوئی تھی۔ پھر وہاں پر براؤن اور تم سب لوگ آگئے اور پھر اس چھوٹی حرافہ نے تصویریں کھینچنی شروع کر دیں۔ میں وہاں کسی تصویر میں ہینز کے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا پھر جیسے ہی وہاں پر گولیاں چلنی شروع ہوئیں اور اندھیرا ہو گیا تو میں نے وہ پیسوں والا کالا ڈفل بیگ اٹھایا اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔“

اس کی کہی ہوئی باتوں میں کافی سقم موجود تھا مگر مجھے پھر بھی لگا کہ وہ کافی حد تک سچ ہی بول رہا ہے۔

”تو تم نے اس جرمن گورے کو قتل کیا اور پھر اس کا پیسوں سے بھرا بیگ لے کر بھاگ گئے۔“ میں نے کرختگی سے پوچھا۔ حالانکہ لیسی کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ اس جرمن کا یا کسی کا بھی قتل کر سکتا تھا۔

”نہیں نہیں میں نے کسی کا قتل نہیں کیا۔ وہ تو جب گولیاں چلنی شروع ہوئیں تو اس کے چند لمحے بعد ہی میں نے ہینز کو گرتے ہوئے دیکھا۔ دروازے سے آتی مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ہینز کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ اس کے نیچے گرنے سے وہ بیگ پھسل کر میرے پیروں کے قریب آگیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر وہاں سے بھاگ گیا پھر میں براؤن کے ہوٹل گیا اور وہ بیگ اس کے پاس رکھوا آیا۔“

”ٹھہرو ٹھہرو! تمہارا مطلب ہے کہ اس رات تم ہی براؤن سے ملنے گئے تھے اور وہ رقم سے بھرا تھیلا اس کے پاس رکھوا آئے تھے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔“

”کتنی رقم تھی اس بیگ میں؟“

”کافی زیادہ۔ میں نے تو اپنی ساری زندگی میں اتنی رقم نہیں دیکھی تھی۔ صرف نقدی نہیں تھی بلکہ کچھ بیرر بانڈ بھی تھے جو کہ کافی زیادہ مالیت کے تھے۔“

”تم وہ بیگ براؤن کے پاس کیوں چھوڑ آئے؟“

”کیونکہ شہر کے جس علاقے میں، میں رہتا ہوں وہاں اتنی رقم اپنے ساتھ لے کر گھومنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ اس جرمن گورے کو بھی حفاظت کے لیے میری ضرورت پڑی تھی۔ میری حفاظت کے لیے کون تھا؟ براؤن کو میں بہت پہلے سے جانتا تھا، وہ میرے بھائیوں کے جیسا تھا۔ میں اس پر اعتبار کر سکتا تھا۔ میں نے وہ بیگ براؤن کے پاس صرف رات بھر کے لیے رکھوایا تھا۔ میرے سامنے اس نے وہ بیگ ایک الماری میں رکھ دیا تھا۔ میں صبح جب اُس سے وہ بیگ واپس لینے پہنچا تو میرا خیال تھا کہ اس میں سے کافی رقم میں براؤن کو دے دوں گا مگر جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ کسی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کام یقیناً تم لوگوں میں سے کسی کا تھا۔ وہ لڑکی لائلہ! جو تصویریں کھینچ رہی تھی وہ بھی تو وہاں موجود تھی جب میں اور براؤن بات کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ہو نہ ہو رقم اسی کے پاس ہو گی۔ میں اس کے ہوٹل پہنچا اور اس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ اس کے کمرے میں پولیس آئی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس نے وہ رقم والا بیگ تمہارے پاس رکھوا دیا ہو گا کیونکہ تم بھی تو اس کے ساتھ تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ شاید اس کام میں تم بھی اس کے ساتھ شریک ہو۔ تمہارے بارے میں اسی نے مجھے بتایا تھا۔“

”تو کیا لائلہ وہیں موجود تھی جب تم نے براؤن کو وہ بیگ دیا اور اس پیسے کے متعلق بتایا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا مگر میں جان چکی تھی کہ یقیناً لائلہ وہیں موجود تھی، اس نے وہیں پر اس بیگ اور اس میں رکھی رقم کو دیکھا تھا۔ مجھے اسی وقت اس کی باتوں میں جھوٹ کی کھنک سنائی دی تھی جب اس نے مجھ سے آنکھیں چرائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ براؤن نے رقم کہاں رکھی تھی کیونکہ جس شخص نے بھی براؤن کا قتل کیا تھا، وہ رقم اسے نہیں ملی تھی۔ اسی لیے لائلہ پہلے تو ڈر کر وہاں سے بھاگ کر آگئی تھی مگر رقم کی کشش نے اسے براؤن کے کمرے میں دوبارہ جانے پر مجبور کیا اور اس کے لیے اس نے میرا سہارا لیا۔ حیرت کی بات تو یہ بھی تھی کہ اس رقم پر نہ تو براؤن کا کوئی حق تھا، نہ لائلہ کا اور نہ ہی پولیس کا۔ مگر لائلہ اور براؤن کی موت کی وجہ وہی رقم بنی تھی۔

”مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آرہی کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس بھی وہ رقم نہیں ہے تو پھر آخر اتنی رقم گئی کہاں؟ اور کس کے پاس؟“ لیسی چیخا۔

”کسی نہ کسی کے پاس تو ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”شاید گھوم گھام کر واپس اسی شخص کے پاس جس سے ملنے ہینز جا رہا تھا۔ جس کی رقم وہ تھی۔ وہی شخص جس نے ایک غریب لڑکے کو پیسے دے کر اس رات وہاں کلب میں فائرنگ کروائی تھی تاکہ وہ ایک ایسے مہرے کا کام تمام کر سکے جس کی اب اسے کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تم ہی وہ بیگ لے کر بھاگے تھے اور شاید اسے براؤن کے ٹھکانے کا بھی پتا چل گیا تھا کیونکہ اس وقت وہ

وہیں موجود تھا جب براؤن نے اپنے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر تمہیں بتایا تھا پھر وہ اپنی رقم تلاش کرتے براؤن کے کمرے میں جا پہنچا اور اس کا قتل کر دیا۔ شاید وہیں سے اسے لائلہ کا ٹھکانا بھی معلوم ہو گیا ہو گا اور پھر اس نے اسے بھی قتل کر دیا۔"

میں جب اپنا ماہرانہ تجزیہ لیسی کے گوش گزار کر رہی تھی تو اس وقت اسکریچ کچن سے باہر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں لیسی کی پشت پر سے اتر آئی اور وہ بھی لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب کھڑا ہو گیا اور اسکریچ کو ہمارے پاس آتا دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور اس کی غلافی خوابیدہ آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ کسی خون آشام درندے کی طرح۔

اس کی وہ خوابیدہ شیطانی آنکھیں دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ اس رات اسٹیمپ اینڈ گو کلب میں یہی تھا جسے دیکھ کر میں ٹھٹک گئی تھی پھر مجھے اس کے سارے کارنامے یاد آئے اور میں چپ سادھے اسے اپنی طرف آتے دیکھتی رہی۔ جیسے اس نے مجھ پر کوئی سحر پھونک دیا ہو۔ وہ اپنے ایک ہاتھ کو اپنی ٹانگ پر ہلکے ہلکے ایسے مار رہا تھا جیسے کسی پسندیدہ دھن کو یاد کر کے طبلہ بجا رہا ہو۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چاقو تھا جس کا پھل دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس پر خون بھی لگا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور پسینے کے قطرے میرے ماتھے سے پھسل کر میری آنکھوں کو دھندلانے لگے۔ اسکریچ کی جنونی آنکھوں میں شیطانیت رقصاں تھی اور موت کے سائے لہرا رہے تھے۔ مجھے ہانا گرانٹ کی بات یاد آئی کہ اس نے اس جرمن ہینز کا قتل کس بہیمانہ طریقے سے کیا تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ کر اس کے بھیجے میں دھنس گئی تھی۔ مجھے براؤن اور لائلہ کا بھی خیال آیا اور رر۔تھال بردم کا بھی۔

اسکریچ ہمارے بالکل قریب آ چکا تھا۔ لیسی کی سانس بھی تیز تیز چلنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کی ناک سے بدستور خون بہہ رہا تھا۔ اس نے خون کو اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے کی کوشش کی تو غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ میرے بازو سے ٹکرا گیا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ شاید وہ بھی اس بات کا اندازہ کر چکا تھا کہ اس کا دبلا پتلا وجود اسکریچ جیسے دیو قامت انسان سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ اپنے سارے گناہوں کا ملبا میرے اوپر ڈال کر اپنی جان بچانے کی کوشش ضرور کرے گا۔

"تم جانتے ہو کہ میں کس لیے آیا ہوں۔" اسکریچ نے آرام سے کہا۔

"تمہیں تمہاری رقم تو مل ہی چکی ہے تو اب ہم سے تمہیں کیا چاہیے؟ ہمیں جانے دو۔" لیسی نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

اسکریچ نے لیسی کی جانب ایسے دیکھا جیسے اسے اس کی آواز سنائی نہ دی ہو۔

"کیا کہا تم نے؟ میرے پاس وہ رقم نہیں ہے۔"

اب وہ ہمارے بالکل پاس آ چکا تھا مگر وہ چالاک تھا اس لیے تالاب کے سامنے نہیں کھڑا ہوا تاکہ ہم میں سے کوئی اسے وہاں دھکا نہ دے دے۔

"میں اپنی رقم لینے آیا ہوں۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے تمہاری رقم کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔" لیسی گڑگڑایا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں کسی طرح پیچھے والی جھاڑیوں تک پہنچ جاؤں تو شاید وہاں سے بھاگ کر گھر سے پیچھے اور پھر باہر جا سکتی تھی مگر اسکریچ کی آنکھیں کسی شکاری کی طرح ہم دونوں پر جمی ہوئی تھیں جو بھی پہلے حرکت کرتا اس کی موت یقینی تھی۔

میں نے اسکریچ کے بارے میں کچھ اور بھی اندازہ لگایا۔ ایک تو یہ کہ اسے لوگوں کو خوف زدہ کرنے میں لطف آتا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسا شکاری تھا جو کسی بلی کی طرح پہلے اپنے شکار سے کھیلتا تھا اور پھر اسے ادھ موا کر کے آرام سے شکار کرتا تھا شاید ایسا کرنے میں بھی اسے لطف آتا تھا۔

"مجھے بتاؤ میری رقم کہاں ہے؟" اسکریچ جذبات سے عاری آواز میں بولا۔

"تمہیں بتایا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" لیسی پھر گڑگڑایا۔

"تم وہی ہو نا جو اس رات کلب میں ہینز کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔" اسکریچ لیسی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اوہ تو وہ تم تھے جسے ہینز اس رات ملنے گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم وہی ہو مگر......" پھر لیسی نے اپنا سر جھکا کر ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ "ہینز رقم تمہی کو دینے جا رہا تھا، ہے نا؟ معاف کرنا ہینز کے مرنے کے بعد میں نے وہ ڈفل بیگ وہاں سے اٹھا لیا تھا مگر اب وہ رقم میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو......مگر وہ رقم اب تو تمہارے پاس ہی ہونا چاہیے۔" پھر

میری طرف اشارہ کر کے لیسی بولا۔

’’رقم جس کی تھی اُس کے پاس پہنچ چکی ہے مگر تمہارے پاس بھی اگر رقم نہیں ہے تو پھر...... مگر میری بات کا یقین کرو رقم اب میرے پاس نہیں ہے، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔‘‘

لیسی اب اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا پھر وہ اپنے گھٹنوں پر گر گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں یہاں وہاں گھوم رہی تھیں۔

میری نظر اسکریچ کے بنیان کے اوپر لگے خون کے دھبوں پر پڑی۔ مجھے بازل کا خیال آیا۔ اگر وہ واپس آیا ہوگا تو ضرور مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اب تک تو اسے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کہیں یہ دھبے بازل کے خون کے تو نہیں تھے؟ یہ سوچ کر ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ اسکریچ کچن کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا مگر پھر وہ وہاں سے غائب ہوگیا تھا۔ کیا اس نے بھی بازل کے آنے کی آہٹ سن لی تھی اور پھر...... اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکی۔ کیا واقعی اسکریچ نے بازل کا خون کردیا تھا؟

مجھے اپنا آپ بے بس اور مجبور سا لگنے لگا تھا مگر پھر بھی میں نے اسکریچ پر اپنے خوف کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور شاید یہ نفرت ہی مجھے اس کا سامنا کرنے کی جرأتِ رندانہ بھی عطا کررہی تھی۔

میں نے سوچا کہ اگر اس کمینے نے بازل کو قتل کردیا ہے تو اب میں اس کا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے تو اب اپنی ساری قوت اپنا دفاع کرنے اور اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرنی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ میرے بھائی جونی نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اپنا خوف اور کمزوری کبھی اپنے حریف پر ظاہر نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ طاقت کی ہی طاقت تعظیم کرتی ہے۔ دورِ غلامی میں بھی جو غلام طاقتور اور مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے تھے ان کو عام طور پر اتنا نہیں مارا پیٹا جاتا تھا جتنا کہ کمزور اور جلد خوف زدہ ہوجانے والے غلاموں کو۔ وہ غلام جن میں کوڑوں کا خوف ان کی عزتِ نفس پر حاوی ہوجاتا تھا۔ وہ تو کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی ہار چکے ہوتے تھے۔

میں نے جونی کی کہی بات یاد آتے ہی اسکریچ کی طرف بے خوفی اور جرأتِ رندانہ کے ساتھ گھورنا شروع کیا۔

’’میرے پاس اب تمہاری کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ پلیز مجھے معاف کردو۔‘‘ لیسی مسلسل رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اسکریچ کے ہاتھ میں پکڑے چاقو پر جمی ہوئی تھیں۔ اسکریچ نے چاقو لیسی کی ناک کے نیچے رکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔

’’میری بات کا یقین کرو اگر رقم میرے پاس ہوتی تو اب تک میں تمہیں دے چکا ہوتا۔ وہ مجھ سے کسی نے چرا لی۔‘‘ لیسی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

’’کس نے چرائی؟ کہاں ہے میری رقم؟‘‘

’’یہ اس نے! اس کُتیا سے پوچھو کہ رقم کہاں ہے۔‘‘ لیسی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہی کُتیا اس رات ان سب کے ساتھ تھی۔ اس نے خود ابھی مجھے سب کچھ بتایا ہے کہ رقم کہاں اور کس کے پاس ہے۔ میرے بھائی یقین کرو کہ تمہاری رقم میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ رقم تمہاری ہے۔ وہ تو جب ان لڑکوں نے فائرنگ کر کے اس رات کلب میں بلب توڑ دیے تھے اسی وقت میں نے دیکھا کہ ہینز کی لاش میرے قدموں میں پڑی تھی، میں اسے جانتا تھا۔ وہ میرا دوست تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس بیگ میں کافی رقم موجود تھی۔ تو بس میں نے وہ بیگ اٹھالیا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ رقم تمہاری ہے تو کبھی اس بیگ کو ہاتھ تک نہ لگاتا۔ مجھ سے بڑی بھول ہوگئی مگر یہ سب نادانی میں ہوا۔ پلیز خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔‘‘

لیسی ہذیانی انداز میں گڑگڑا رہا تھا اور اپنی جان بخشی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

’’یہ...... یہ کُتیا جانتی ہے کہ رقم کہاں ہے۔ میں بھی اس سے یہی پوچھ رہا تھا مگر یہ مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ تم جانتے ہونا کہ یہ کمین زادیاں کیسے ناٹک کرتی ہیں مردوں کو بے وقوف بنانے کے لیے...... تم اسی سے پوچھ لو نا کہ رقم کہاں ہے...... یہ سب جانتی ہے۔‘‘

پھر یک دم وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا جیسے اس نے اسکریچ کی آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا ہو۔ کچھ ایسا جو میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اسکریچ کی دنیا میں کمزور اور غدار قسم کے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ خواہ وہ غداری کسی دشمن کے ساتھ ہی کیوں نہ کی جائے۔ یہ ان لوگوں کا اصول تھا جو کسی اور اصول اور قاعدے کو نہیں مانتے اور لیسی میرے ساتھ غداری کررہا تھا۔

لیسی کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس کی آنکھیں ابھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

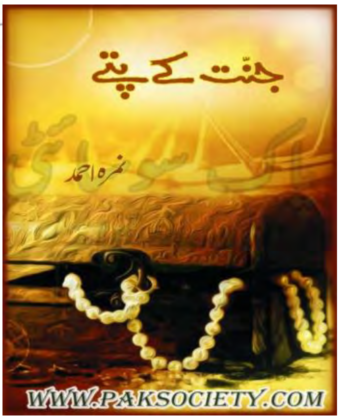
جنّت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

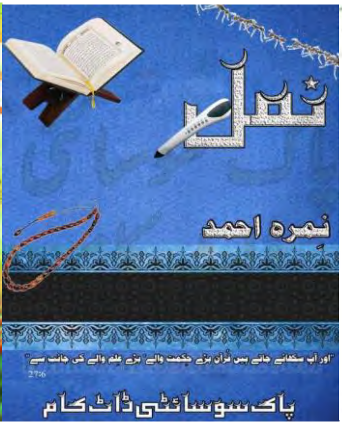
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق

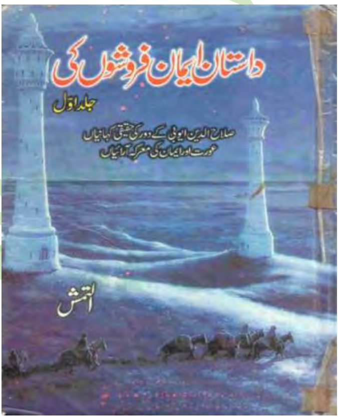
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

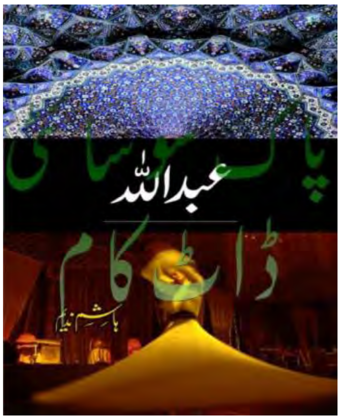
عبداللہ
ہاشم ندیم

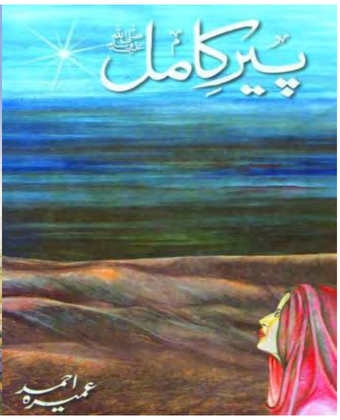
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

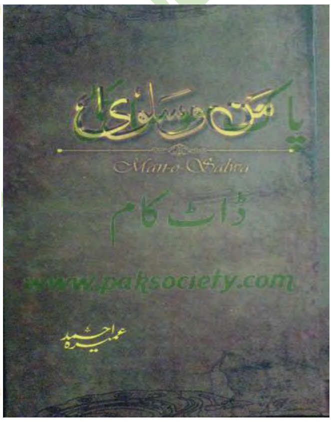
منّ و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

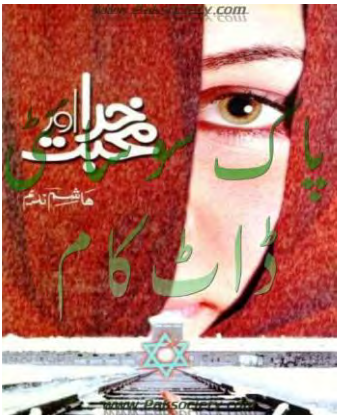
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

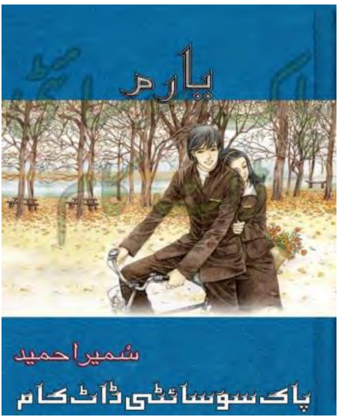
یارم
سمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

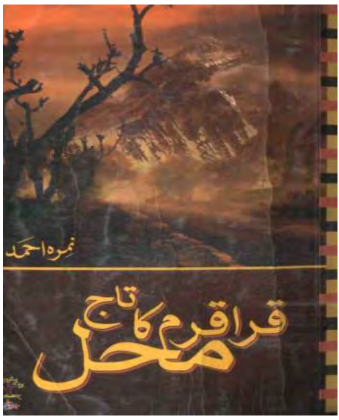
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

تک اسکریچ کے ہاتھ میں تھامے چاقو پر ٹکی ہوئی تھیں مگر اسکریچ نے اس کا استعمال نہ کیا۔

کوئی پیشگی وارننگ دیے بغیر اسکریچ نے ایک ہی جھٹکے میں لیسی کی گردن موڑ کر اس کی گردن کا منکا توڑ دیا۔ کسی ماہر جنگجو یا سنگ دل جلاد کی طرح۔ بس ایک ہی وار میں کام تمام۔ لیسی کی آنکھیں اب بھی ویسے ہی پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں خوف کے سائے چھائے ہوئے تھے مگر ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی تھی۔ وہ کسی ایسی پتلی کی طرح میرے پیروں کے پاس آگرا جس کی ڈوریاں کاٹ دی گئی ہوں۔

میرے ذہن کی ہر سوچ جیسے جم سی گئی۔ ہر سمت خاموشی تھی۔ ہر طرف موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ اسکریچ نے میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ تفاخر تھا۔ اس کی آنکھیں سانپ کے جیسی تھیں۔ بھاری پپوٹے اور برف کی طرح سرد۔ شاید اس آدمی کی آنکھوں سے بھی زیادہ سرد جس کا ابھی ابھی اس نے قتل کیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کب مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ میں جانتی تھی کہ اس وقت ذرا سی بھی حرکت میرے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اسے ایسے ہی گھورتی رہی جیسے آپ کسی پھن پھیلائے ہوئے ناگ کو دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کب آپ پر حملہ آور ہوگا اور ڈس لے گا۔

اسکریچ نے لیسی کی طرف دیکھا اور جھک کر اس کے بے جان چہرے کو چھوا اور پھر اس کی گردن کو جسے کچھ ہی لمحے پہلے اس نے توڑ کر زندگی سے اس کا ناتا بھی توڑ دیا تھا۔

میں نے وہ موقع غنیمت جانتے ہوئے دوڑنا شروع کیا اور بھاگتے ہوئے کچن تک پہنچ گئی۔ دروازہ لاک نہیں تھا اور میں تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ اسکریچ میرے پیچھے بڑے آرام سے چلتا ہوا آ رہا تھا جیسے وہ اس بلی چوہے کے کھیل سے بہت لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس کے چہرے پر پھیلی شیطانی مسکراہٹ اسی بات کی غمازی کر رہی تھی۔

میں نے کچن میں اپنے دفاع کے لیے کوئی شے ڈھونڈنی شروع کی مگر بدحواسی میں کوئی چھری یا چاقو نہ ملا۔ وہاں پر کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں چھپ کر میں اپنی جان بچا پاتی پھر میری نظر کچن سنک میں پڑی بیئر کی بوتل کے کانچ کے ٹکڑوں پر پڑی جسے اسکریچ نے وہاں پھینک کر توڑ دیا تھا۔ اُن ٹکڑوں میں بھی کوئی اس قابل نہیں تھا جسے بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا۔ میں نے فریج سے بیئر کی ایک اور بوتل نکالی اور اسے کچن سنک کے کنارے پر پٹخ کر اس طرح توڑا کہ اس کا ایک بڑا ٹکڑا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ کافی تیز دھار کا تھا اور بوقتِ ضرورت چاقو کی طرح استعمال کیا جا سکتا تھا۔

اسکریچ کچن کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے دروازہ لاک تو کر دیا تھا مگر وہ لکڑی کا پرانا دروازہ اسکریچ کی دو تین لاتوں کی مار سے زیادہ نہ تھا۔

کچن کا دروازہ اسکریچ کی تیسری یا چوتھی کک پر چرچراہٹ کے ساتھ ٹوٹ گیا اور اسکریچ بڑے اطمینان کے ساتھ کچن میں داخل ہو گیا۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”اچھا تو تم میرا مقابلہ اِس سے کرو گی؟“ اس نے میرے ہاتھ میں پکڑے کانچ کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے تمہارے دوست کا کیا حشر کیا؟ کیا تم واقعی یہ سوچتی ہو کہ تم میرا مقابلہ اس چھوٹے سے کانچ کے ٹکڑے سے کر سکتی ہو؟ کان کھول کر سن لو کہ میں یہاں اپنی رقم حاصل کرنے آیا ہوں اور اسے حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔ تمہارے عاشق سے بھی میں نے یہی کہا تھا۔“

وہ کس دوست اور عاشق کی بات کر رہا تھا؟ کیا اس سے اسکریچ کی مراد بازل تھا؟

”تم اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو بس یہاں پر گرے خون کی لکیر کی سیدھ میں چلتی جاؤ۔ تم اس تک پہنچ جاؤ گی۔“

میں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا۔ بازل ضرور واپس آ گیا ہوگا اور اس نے میرے بارے میں دریافت کیا ہوگا۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ اسکریچ اور بازل کا ضرور آمنا سامنا ہوا ہوگا۔ اسکریچ کے ہاتھ میں پکڑے خون آلود چاقو کو دیکھ کر میرے دل میں ایک بار پھر وسوسوں نے جنم لینا شروع کیا۔ میں رونا چاہ رہی تھی مگر میں نہیں چاہتی تھی کہ اسکریچ میرے آنسوؤں کو دیکھے۔ میں جی کڑا کر کے ایک بار پھر اسکریچ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے نہایت سرد مہری سے گھورتی رہی۔

”تم مجھ سے لڑنا چاہتی ہو؟ تو چلو لڑ لو مگر پھر جب لڑائی ختم ہو گی تو تمہیں میری بات ماننی پڑے گی اور جو مجھے چاہیے وہ دینا پڑے گا۔“

پھر یک دم مجھے سمجھ آ گیا کہ میں اس عفریت پر کیسے قابو پا سکتی تھی، کیسے اس پر سبقت حاصل کر سکتی تھی جس طرح میں نے لیسی کی کمزوری کا اندازہ لگا کر اسے زیر کر لیا تھا

بالکل اسی طرح مجھے اسکریچ کو مات دینے کا طریقہ بھی سمجھ آگیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی۔

ساتھ ہی ساتھ میں نے بِنا مزاحمت کیے اسکریچ کو اپنے قریب آنے دیا جیسے کہ میں اس کی مردانگی سے بہت متاثر اور مرعوب ہوگئی تھی۔ اس نے قریب آکر میرے جسم پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ میں نے ہلکی سی مزاحمت کے بعد اس کے آگے ہتھیار ڈالنے کا ناٹک کیا۔ اس نے کانچ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اگرچہ اندرونی طور پر مجھے اس کے اس طرح چھونے سے بہت گھن آرہی تھی مگر میں اس پر یہ ظاہر کیے بغیر ایسے ہی ناٹک کرتی رہی جیسے مجھے اجنبی مردوں سے اس طرح جسمانی تعلقات بنانے میں کافی تجربہ حاصل تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اسکریچ نے پہلی ملاقات میں مجھے دھندا کرنے والی جسم فروش عورت ہی سمجھا تھا۔ اب میں اس کے آگے ایسے ہی پیش آرہی تھی جیسے کوئی پیشہ ور فاحشہ ہو۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا پھر میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ’’وہ میرے پاس ہے۔ سارا مال تمام وقت میرے پاس ہی تھا۔‘‘

’’تم تو بڑی کھلاڑی نکلیں۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔

’’بس میں نے کبھی غرور ہی نہیں کیا۔‘‘ میں نے بھی ادائے دلربائی کے ساتھ فقرہ چست کیا۔

’’ویسے تمہارے پاس بھی نہ ہوا تو پھر کہاں ہوگا؟‘‘

’’میں جانتی تھی کہ تم جیسے ذہین کھلاڑی کو اس منطقی نتیجے پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔‘‘

’’تم اس کالے کُتّے بازل کو کیسے جانتی ہو؟‘‘

’’بس یونہی ایک آدھ مرتبہ بیٹینا کے ساتھ ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میری دوست ہے نا۔‘‘ میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح کہا جیسے اب مجھے جھوٹ بول کر کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔

’’وہ بے وقوف ایسے ہی تمہارے لیے اپنی جان کی بازی لگانے پر تلا ہوا تھا؟‘‘

’’مرد تو سارے ہوتے ہی بے وقوف ہیں۔‘‘ میں پھر اندازِ دلربائی سے مسکرائی۔

’’اوہ تو ایسا سمجھتی ہو تم؟‘‘

’’ہاں! اور نہیں تو کیا؟ اب دیکھ لو وہ لیسی بھی تو کتنا بے وقوف تھا، ہے نا۔‘‘ میں نے اپنے بالوں کو ہالیووڈ کی کسی بی گریڈ فلم کی قانون شکن بدمعاش لڑکی کی طرح جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

’’میں تو شروع سے ہی جانتی تھی مگر وہ بے وقوف خوامخواہ اوروں کو بیچ میں لے آیا مگر میں جانتی تھی کہ جیت بالآخر میری ہی ہوگی۔ مجھے ہمیشہ جیتنے کی عادت جو ہے۔‘‘ میرا بی گریڈ ہالی ووڈ میلو ڈراما جاری تھا۔ مجھے کڑی سے کڑی جوڑ کر کافی حد تک تو ساری کہانی کا پتا چل چکا تھا۔ اب بس ضرورت اس بات کی تھی کہ میری بتائی ہوئی کہانی پر اسکریچ کو یقین آجاتا اور میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی مگر ساتھ ہی ساتھ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ میری ذرا سی بھی چوک جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ مجھے رہ رہ کر بازل کا بھی خیال آرہا تھا۔ کیا واقعی اِس نے بازل کا خون کر دیا تھا یا صرف اسے زخمی کیا تھا؟

اسکریچ نے اپنی جذبات سے عاری خوابیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسی انداز میں اپنا میلو ڈراما جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کچھ ناز نخرے بھی دکھائے جیسے میں نے اکثر نوجوان جسم فروش عورتوں کو کرتے دیکھا تھا۔

’’اس بے وقوف کے پاس رقم تھی مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ اس چھوکری کے پاس بھی نہیں۔‘‘

اب اتنا تو میں جان ہی چکی تھی کہ اس سنگ دل آدمی نے لائلہ کو قتل کرنے سے پہلے اس سے اپنی رقم کے بارے میں جاننے کی ضرور کوشش کی ہوگی اور براؤن کا حشر دیکھنے کے بعد لائلہ نے اسے سب کچھ سچ بتا دیا ہوگا۔ لائلہ لالچی ضرور تھی مگر احمق ہرگز نہیں تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتی ہوگی کہ جان سے پیاری چیز اور کوئی نہیں ہوتی۔ مجھے اب فکر صرف ایک ہی بات کی تھی اور یہ کہ وہ رقم آخر تھی کہاں؟

’’وہ لڑکی؟‘‘ اسکریچ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

’’ہاں تبھی تو وہ تمہیں اس بارے میں کچھ بتا نہیں پائی۔‘‘ میں فوراً بولی کیونکہ میں جانتی تھی کہ اتنا سا تو ضرور سچ تھا ہی۔

اسکریچ کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگے۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں کا بدلتا انداز دیکھتے ہی مجھے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ میں نے شاید کوئی غلط بات کہہ دی تھی۔ میں نے ایک دم پینترا بدلا۔ ’’اسی لیے تو وہ تمہیں ابھی تک ملی نہیں۔ تمہیں وہ اس لڑکی کے پاس ملتی بھی کیسے سارا وقت وہ میرے پاس جو تھی۔‘‘

’’تو اب وہ کہاں ہے؟‘‘ وہ چنگھاڑا۔ اس کی آنکھوں میں وہی درندگی لوٹ آئی تھی جیسی لیسی کو قتل کرنے

سے پہلے تھی۔

''میں نے اسے بڑی حفاظت سے چھپا کر رکھا ہے۔ ہوٹل میں۔ مونٹیگو بے ہوٹل میں۔'' میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ! کہاں پر؟''

''تم اسے میرے بغیر نہیں حاصل کر سکتے۔''

''تو پھر چلو۔'' وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میری کار باہر پہاڑ کے نیچے کھڑی ہے۔''

''مگر مجھے چابی درکار ہوگی۔''

''چابی؟ وہ کس لیے؟''

''ہاں چابی! کیا تم مجھے بھی لیسی سمجھتے ہو؟ میں اس جیسی احمق نہیں ہوں کہ اتنی بڑی رقم کو یونہی کسی ایسی جگہ چھوڑ دوں جہاں سے کوئی بھی الو کا پٹھا آکر اسے لے اڑے۔ میں نے وہ رقم ایک سیف ڈپازٹ باکس میں رکھی ہوئی ہے۔'' میں نے پھر اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔''

''وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔'' اسکریچ مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ دراصل چابی اوپر رکھی ہے۔'' میں نے معصوم سی شکل بناتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے اوپر اپنے بیڈروم میں ہی چھوڑ آئی تھی۔''

اسکریچ کے چہرے پر پھر شک کے سائے لہرانے لگے۔ وہ بھلے بہت سفاک درندہ تھا مگر کسی جانور ہی کی طرح اس کے ذہن میں ابھرتے شکوک و شبہات کو اس کے چہرے کے تاثرات میں پڑھا جا سکتا تھا۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ میں نے بھی پوری کوشش کی کہ وہ میرے چہرے سے میرے جھوٹ کو نہ پکڑ پائے۔ اس نے میرے بازو کو پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایسا صرف اپنی مردانگی جتانے کے لیے کر رہا تھا اس لیے میں نے بھی اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کے بعد بالوں کو باغیانہ انداز میں جھٹکا۔

''جب تم اسے حاصل کرلو گے تو میرے ساتھ پھر کیا کرو گے؟''

میں اس سوال کا جواب جانتی تھی مگر مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ مجھ سے اسی قسم کے سوال کی توقع رکھتا تھا اگر میں یہ سوال نہ کرتی تو اسے کچھ شک ہو سکتا تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟''

''میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو تم نے ہینز اور براؤن کے ساتھ کیا اور جو کچھ تم نے لائلہ کے ساتھ کیا۔''

اس کے چہرے کے تاثرات میں پھر شک کے سائے گہرے ہونے لگے۔ شاید مجھ سے پھر کوئی غلطی ہوگئی تھی مگر کیا؟

''اس بات کا انحصار تو تم پر ہے۔ ویسے مجھے بے باک اور بے خوف عورتیں پسند ہیں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''تم بھی بہت طاقت ور ہو اور مجھے طاقت ور مرد پسند ہیں۔'' میں نے پھر بی گریڈ فلمی ہیروئن والے ڈائیلاگ بولے اور اس کے بازو کو آہستہ سے چھوا۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے آگے دھکیلا اور خود میرے پیچھے چلنا شروع کیا۔

میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گئی۔ تبھی مجھے اپنے بیٹے جمال کا خیال آیا اور یہ بھی کہ شاید اب میں بھی اسے دیکھ نہ پاؤں گی۔ یہ سوچتے ہی میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے جن پر میں نے بڑی مشکل سے قابو پایا۔

''کب سے یہ کام کر رہی ہو؟'' شاید بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس کے ذہن میں کچھ اور خیالات بھی ابھرنے لگے تھے۔

''کافی وقت سے۔'' میں نے تیزی سے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اسکریچ نے مجھے اپنی جانب کھینچا تو میں نے غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس خبیث درندے کی سب خواہشات کو پورا کرنا تھا۔ میں نے مزاحمت کرنی چھوڑ دی اور اس کے ہاتھ میرے جسم پر یہاں وہاں پھرنے لگے۔ مجھے اس سے سخت کراہیت محسوس ہو رہی تھی مگر کیا کرتی؟ مجبوری تھی۔ اس کو روکنا ٹوکنا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ اس کے ہاتھ بھی اس کی آنکھوں اور دل کی طرح سخت اور سرد تھے۔

''تمہیں یہ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟''

''اس کا انحصار تو اس بات پر ہوتا ہے کہ میں کس کے ساتھ یہ کام کر رہی ہوں۔'' میں نے اٹھلاتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرا ہی لیا۔

''تم بیٹینا کو کب سے جانتے ہو؟'' میں نے اس کا دھیان بٹانے کی خاطر کہا۔

“کافی دیر سے۔” اس نے کچھ سوچ کر اپنے ہاتھ خود ہی دور کر لیے۔

“چلو چابی نکالو۔” وہ آہستہ سے غرایا۔

میں بیڈ کے قریب پڑی سائڈ ٹیبل پر جھکی۔ وہ بالکل میرے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

“کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا۔ تم جانتی ہو کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔”

“اوہ تم اس بات کی کوئی فکر نہ کرو جانِ من۔ مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے۔” میں نے پھر اٹھلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی تو وہ بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ دراز کے اندر اس کی اوپری طرف ایسے پھیرنا شروع کیا جیسے میں وہاں پر کوئی ٹیپ سے چپکائی ہوئی شے ڈھونڈ رہی ہوں۔

“میں نے اسے یہیں دراز کے اوپر ٹیپ سے چپکایا تھا۔” میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

گن اب میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ یہ ایک چھوٹا مگر کافی وزنی 22 ریوالور تھا۔ اس کے چھوٹے سائز کی وجہ سے پہلے اسے لوگ زنانہ پستول بھی کہا کرتے تھے۔ قریب سے فائر کرنے سے یہ کافی مہلک ثابت ہو سکتا تھا مگر بعض اوقات تو لوگ اس کی دو گولیاں کھانے کے بعد بھی اٹھ کر اپنے حریف کی گردن دبوچ لیا کرتے تھے مگر مجھے تو اب بس اسی چھوٹے سے ہتھیار کا آسرا تھا۔

اسکر یچ میری طرف بڑھا۔ میں نے اسی وقت پھرتی سے مڑ کر اس کے اور اپنے درمیان کچھ فاصلہ قائم کیا۔ میری گن کی نال اس پر تنی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ میں گن دیکھتے ہی اسکریچ نے مجھے زور سے دھکا دے کر دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ میری کہنی سائڈ ٹیبل کے ساتھ ٹکرائی اور درد کی ایک شدید لہر میرے بازو میں دوڑ گئی مگر میں نے پھر بھی گولی چلا دی۔ گولی اسکریچ کے بازو پر لگی۔ اس نے حیرت سے اپنے بازو سے نکلتے خون کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف شعلہ بار آنکھوں سے گھورا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اگر اب میں نے اس خبیث کا خاتمہ نہ کیا تو میری موت یقینی تھی۔ میں نے اپنا توازن درست کرتے ہی اس پر دوبارہ فائر کیا۔ میرا نشانہ اس کے دل پر تھا مگر گولی اس کے کندھے میں لگی۔ وہ زہر خند انداز میں ایسے مسکرایا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ اب تیری خیر نہیں۔

میں نے ایک بار پھر فائر کیا اور پھر ایک دفعہ اور جب تک وہ زمین پر ڈھیر نہ ہو گیا۔ میں نے آہستہ سے اس کے نزدیک جا کر دیکھا کہ کیا وہ واقعی مر گیا تھا؟ اس کا جسم بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کسی کی جان لینا میرے لیے کبھی بھی آسان نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی اپنے دفاع کے لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ وہ مر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب اسے سچ بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ کسی مرتے ہوئے آدمی سے سچ چھپا کر رکھنے کی ویسے بھی کوئی تک نہ تھی۔

“معاف کرنا اسکریچ مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا کیونکہ دوسری صورت میں تم یقیناً میری جان لے لیتے۔ مگر سچ یہی ہے کہ میرے پاس کبھی تمہاری رقم تھی ہی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی اور اب کس کے پاس ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی خاطر تمہاری اور ان دوسرے لوگوں کی جان چلی گئی۔ اگر تم اب بھی کچھ کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو۔”

اس نے اپنی خوابیدہ آنکھیں آخری بار کھول کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

“تو وہ سارا وقت اسی کے پاس تھا۔”

پھر اس نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔

میرا ذہن سن سا ہو رہا تھا مگر میں پھر بھی بازل کے خون کے دھبے جہاں نظر آئے ان کے پیچھے چلنے لگی۔ خون کی ایک لکیر ایک اندرونی کمرے میں جا کر ختم ہو گئی۔ بازل وہیں پڑا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر بری طرح گھائل تھا۔ اس کے سینے کے دائیں جانب ایک بڑا سا زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

“کیا تم نے اس کُتّے کو مار دیا؟”

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

“اچھا کیا، میں ایسا نہ کر پایا۔” اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

“میں تمہارے لیے ایمبولینس بلاتی ہوں۔” میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

“نہیں، نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس سے بڑے بڑے گھاؤ جھیلے ہیں۔ اس زخم سے میرا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ میری بات غور سے سنو۔” اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

“مگر میں......”

“میری بات سنو۔” اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

“تم وہ گن جس سے تم نے اس کو مارا ہے، میرے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

حوالے کردو۔ پولیس آئی تو میں یہی کہوں گا کہ وہ بلا اجازت میرے گھر میں گھس آیا تھا۔ یہاں ایک شخص کا قتل کیا اور میرے اوپر حملہ آور ہو کر مجھے زخمی کر دیا۔ میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنی گن سے اس کو قتل کر دیا۔“

”مگر میں تو......“

”تمارا بحث مت کرو۔ گن مجھے دے دو۔ تمہارا ہینڈ بیگ اس کی گاڑی میں ہے ڈکی میں۔ تم میرا موٹر سائیکل لے کر چلی جاؤ۔ اپنے ہوٹل جا کر اپنا سامان اٹھاؤ اور پھر اس ملک سے نکل جاؤ۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا جیسے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہو۔

”میری بات مانو تمارا! اس کی گاڑی وہاں پہاڑی کے نیچے کھڑی ہے۔ بیٹینا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسکریچ یہاں ضرور آئے گا اور میں اس کی موجودگی میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔“ وہ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ اپنی ساری قوت مجتمع کر کے اس نے پھر اصرار کیا۔ ”تمہارا پاسپورٹ اور دیگر اشیا تمہارے ہینڈ بیگ سمیت اس کی گاڑی میں ہیں۔ اب تمہیں سفر کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ میری بائیک لو اور جاؤ۔“

”مگر میں تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی بازل۔“ میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

”تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس آئے گی اور نو سو سوال پوچھے گی۔ پھر وہ تمہیں ان دوسرے مقتولین کے ساتھ بھی جوڑ سکتے ہیں۔ تمہارا گھر واپس جانا ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ یہاں سے کچھ دور جا کر تم کسی بھی پے فون سے پولیس کو ایک گمنام فون کال کر دینا۔ بس یہی کہنا کہ وہاں پہاڑ کے اوپر والے بنگلے میں دو آدمیوں کا قتل ہو گیا ہے جبکہ ایک گھائل ہے۔ باقی کا وہ خود ہی کر لیں گے۔ اب اور وقت ضائع مت کرو اور جاؤ۔“

”مجھے ایسے تمہیں چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا۔“

”میری فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ تم سے ابھی مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“ اس کی بڑی بڑی گہری آنکھوں میں محبت کا پیغام تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چوما اور پھر اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنا ہینڈ بیگ اسکریچ کی گاڑی سے نکالا۔ بازل کی موٹر سائیکل لے کر قریبی پیٹرول پمپ تک گئی اور وہیں سے پولیس کو فون کر دیا۔ اس کے بعد میں ہوٹل مونٹیگو بے پہنچی اور اپنا سامان سمیٹا پھر اپنی واپسی کا ٹکٹ خریدا تاکہ پہلی ہی فلائٹ سے واپس اپنے بیٹے کے پاس گھر جا سکوں۔

☆☆☆

”تو سارا وقت وہ اسی حرام زادی کے پاس تھا۔“

یہ ایک مرتے ہوئے آدمی کے آخری الفاظ تھے اس لیے مجھے یہ بھلانے مشکل تھے۔ ان الفاظ کی بازگشت میرے کانوں میں بار بار سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ہوٹل مونٹیگو بے میں بازل کی بائیک کی چابی میوس کے حوالے کی۔ اپنا سامان پیک کیا اور ہوٹل کا بل ادا کیا۔

”تو سارا وقت وہ اسی حرام زادی کے پاس تھا۔“

کیا اس بات سے اس کی مراد میں تھی؟ کیا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس کی موت کے وقت بھی اس سے جھوٹ بول رہی تھی؟ یا پھر اس نے بھی وہی اندازہ لگایا تھا جس منطقی انجام تک میں بہت پہلے ہی پہنچ چکی تھی یعنی لائلہ نے وہ رقم کسی ایسی جگہ چھپائی تھی جہاں تک وہ نہ پہنچ پایا تھا۔ شاید براؤن کی کرائے کی گاڑی میں۔ اس بات کا تو مجھے یقین تھا کہ لائلہ، براؤن کی گاڑی میں ہی ہوٹل مونٹیگو بے تک پہنچی تھی۔ شاید اس نے رقم گاڑی کی ڈکی میں یا پھر سیٹوں کے نیچے کہیں چھپا دی ہو جو شاید اب تک کسی پارکنگ والے یا ڈرائیور کے ہاتھ لگ چکی ہوگی اور اس کی قسمت بدل چکی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ چلو اس سارے خون خرابے کے بعد کسی ایک غریب آدمی کا تو بھلا ہو ہی گیا ہوگا۔ وہ رقم اب جہاں بھی تھی مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دنیا میں بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب انسان کو کبھی نہیں مل پاتا اور شاید یہ بھی انہی سوالوں میں سے ایک تھا۔

”تو سارا وقت وہ اسی حرام زادی کے پاس تھا۔“

شاید ان الفاظ کا مطلب کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

میں نے اینی کو فون کر کے بتایا کہ میرا ہینڈ بیگ مل گیا ہے اور اگر اس نے ابھی تک پیسے نہیں بھیجے تو کوئی بات نہیں۔ مجھے اب ان پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے اسی رات واپسی کا ٹکٹ مل گیا۔ ڈائریکٹ پرواز نہیں تھی جہاز نے ایک جگہ دو گھنٹے رکنا تھا مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں جلد از جلد جمیکا سے نکلنا چاہتی تھی۔

مجھے رہ رہ کر بازل کا بھی خیال آ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اس کی صحت یابی اور تندرستی کی دعا مانگتی رہی۔ اس نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ نہ ملتا تو میں نجانے کہاں اور کس حال میں ہوتی۔

ٹیکسی کے ذریعے ائرپورٹ پہنچی اور اپنی پرانی ٹکٹ دے کر نئی بک کی ہوئی ٹکٹ حاصل کی۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا مگر میں ہی جانتی تھی کہ گزشتہ چند دن کتنے 'ٹھیک' گزرے تھے۔

جہاز کو اڑان بھرنے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ میرا واپس جا کر کچھ اور 'سیاحت' کا ارادہ تو نہ تھا اس لیے میں وہیں پر موجود دکانوں کی جانب چلی گئی کیونکہ مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ میں نے کسی کے لیے بھی یہاں کی کوئی سوغات یا تحفہ نہیں خریدا تھا۔ کم از کم مجھے جمال، اینی، جیک اور ایک دو اور دوستوں کے لیے تو کچھ نہ کچھ خریدنا ہی تھا۔

پھر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ آپ اسے 440 وولٹ یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ کا کہہ سکتے ہیں۔

''تم نے سوچا ہوگا کہ میں مرگئی۔''

میں منجمد سی ہوگئی۔

''تم نے میرا وہ سرخ ڈریس زمین پر پڑے دیکھا، وہی جو سیمی لی کو اس قدر ناپسند تھا اور تم نے سوچا کہ میں مرگئی ہوں۔''

اس نے بچوں کی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں پکڑی ٹی شرٹس زمین پر گر چکی تھیں۔ میری آنکھیں پھٹی ہوئی اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

اس نے وہی گلابی شیشوں والا چشمہ لگا رکھا تھا جو اس دن پہنا ہوا تھا جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے سرخی مائل بھورے بال ایک بڑے سے ہیٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ اگر میں نے اس کی آواز نہ سنی ہوتی تو شاید اس حلیے میں کبھی اسے پہچان نہ پاتی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اس کو گلے لگاؤں یا پھر ایک تھپڑ رسید کروں۔

''تمارا میں نے تمہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔'' اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم تھیں کہاں الو کی پٹھی؟''

''میں نے تمہارے کمرے میں کئی بار فون کیا۔ میں مانتی ہوں کہ اس دن مجھے تمہیں اس طرح وہاں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا......''

''مگر تم غائب کہاں ہوگئی تھیں؟'' مجھے ابھی تک اس کے زندہ ہونے کا یقین نہیں آرہا تھا۔

''وہ میں جزائر کیمن چلی گئی تھی۔ ابھی واپس آئی ہوں۔''

''جزائر کیمن؟ وہاں کیا کرنے گئی تھیں خبیث لڑکی؟''

''میری بات تو سنو تمارا......''

''نہیں نہیں، اب مجھے تمہاری کوئی بکواس نہیں سننی۔ خدا کے لیے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

''پانچ آدمیوں کا قتل ہو چکا ہے اور ایک بہت اچھا آدمی بری طرح گھائل ہے۔ ان میں سے دو سے تعلقات بھی رہ چکے ہیں۔ لائلہ تم کس قسم کی عورت ہو؟ جاؤ اور پھر کبھی میرے قریب بھی پھٹکنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے اب تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ جن لوگوں کے مرنے یا زخمی ہونے کا تم ذکر کر رہی ہو، ان میں سے کسی کو بھی میں نے تو نہیں مارا نا؟ میں سیمی لی اور براؤن کے ساتھ ضرور رہی ہوں مگر ان دونوں کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں اور وہ دوسرے لوگ۔ ان کو تو میں جانتی تک نہیں۔ تم مجھ سے اتنی ناراض کیوں ہو۔ میری بات تو سنو۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''تمارا تمہیں پتا ہے وہ ساری رقم میرے پاس ہے۔ ہاں وہ ساری کی ساری اب میری ہے اور کچھ پر تو تمہارا بھی حق بنتا ہے۔''

''تو سارا وقت وہ اسی کے پاس تھا!''

اسکریچ کے آخری الفاظ کا مطلب اب مجھ پر واضح ہوا تھا۔

''تمارا پلیز میری بات سنو۔ تم بھلے نہ مانو مگر میں تو تمہیں اپنی دوست ہی سمجھتی ہوں۔ بہت عرصے بعد مجھے تم جیسی اچھی دوست ملی ہے۔ پلیز پلیز میری بات تو سنو۔'' وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی۔

''کیا ہے؟ اب یہ تمہاری کوئی نئی چال تو نہیں؟'' میں نے اپنے شکوک کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی میں تمہیں ساری بات تفصیل سے بتاتی ہوں۔''

''رہنے دو۔ مجھے اب تم سے کوئی بات کرنی ہی نہیں ہے۔ تم پلیز میرا پیچھا چھوڑو اور اب مجھے چین سے اپنے گھر واپس جانے دو۔ دیکھو اگر تم نہ ہٹیں تو میں اس پولیس والے کو بلا لوں گی۔''

''تمارا مجھے پتا ہے کہ تمہاری فلائٹ جانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ تو چلو کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

"کیا...... کیا تم بھی اسی فلائٹ سے امریکا جا رہی ہو؟"

"نہیں میں ابھی امریکا نہیں بلکہ ابھی تو میں کچھ سیر سپاٹے کے لیے جا رہی ہوں۔"

پھر میرا بازو پکڑ کر وہ بولی۔ "میں جزائر کیمن سے کل ہی یہاں پہنچی ہوں اور میں برابر چیک کر رہی ہوں کہ تم سے تمہاری واپسی سے پہلے ملاقات ہو جائے۔ اگر تم مجھے یہاں نہ ملتیں تو شاید تمہیں ڈھونڈنے کے لیے مجھے کسی سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنی پڑتیں مگر قسمت کی خوبی دیکھو کہ تم مجھے یہیں مل گئیں۔"

"ہاں تمہاری قسمت کی خوبی کہ تم وہاں جزائر کیمن میں سمندر کے کنارے موج مستی کرتی رہیں اور یہاں میری جان پر بنی رہی۔" میں نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

"ارے میری جان تمارا! غصہ تھوک دو اور میری بات غور سے سنو۔ دیکھو اب یہاں کھڑے کھڑے تو ساری باتیں نہیں ہو سکتیں تو کیوں نا ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں اور میں ساری بات سچ سچ بتاتی ہوں۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تمارا میں بھی کافی مشکل وقت سے گزری ہوں مگر دیکھ لو ہم دونوں ہی زندہ سلامت ہیں اور ہمارے دشمن ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر پائے۔ اپنی ہمت اور حوصلے سے ہم نے سب کو مات دے دی۔ تم مانو نہ مانو مگر ہم دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے بنا ہے۔ پلیز چلو نا!"

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ جہاز کے جانے میں ابھی دو گھنٹے سے کچھ اوپر وقت رہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ ہم فرسٹ کلاس کے ویٹنگ لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئے۔

"تمہیں پتا ہے کہ اب میں ریوڈی جنیرو جا رہی ہوں۔ ہمیشہ سے ہی مجھے وہاں جانے کا شوق تھا۔ سنا ہے بڑی ہی خوب صورت جگہ ہے۔ میرے جہاز کے جانے میں تقریباً چار گھنٹے باقی ہیں۔ میں بھی کنگسٹن سے جلد از جلد نکلنا چاہتی ہوں۔"

"ریو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ریو۔ فرسٹ کلاس میں۔ پتا ہے انسان کے پاس پیسا آتے ہی ایسے ان ساری آسائشوں کی عادت پڑ جاتی ہے کہ پوچھو نا۔"

پھر ایک قریب آتے ویٹر کو دیکھ کر لائلہ نے ہمارے لیے مشروبات کا آرڈر دیا۔

"میرے خیال میں تم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی ہو گی کہ میں اس خونی درندے کے ہاتھوں بچ کیسے نکلی جو سب کا خون کرتا پھر رہا تھا۔"

"ہاں چلو وہیں سے شروع کر دو۔" میں بھی اب کچھ متجسس ہو چکی تھی۔

"چلو میں وہاں سے کہانی شروع کرتی ہوں جب میں نے تمہیں براؤن کے کمرے میں چھوڑا...... یا پھر اس سے ایک رات قبل سے جب یہ......"

"جہاں سے شروع کرو لائلہ مگر ذرا اختصار سے بتاؤ۔ تمہارے پاس بھلے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے مگر مجھے تو اکانومی کلاس میں ہی دھکے کھانے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری داستان سنتے سنتے میری فلائٹ مس ہو جائے۔"

"اوہ! تو تمہارا ہینڈ بیگ مل ہی گیا۔" وہ میرے ہینڈ بیگ کو ایسے تھپتھپاتے ہوئے بولی جیسے وہ کوئی زندہ شے ہو۔ "تمہارا تو پاسپورٹ، پیسے اور سب کچھ اسی میں تھا نا! اوہ مجھے معلوم تھا کہ تم جیسی ہوشیار اور عقلمند عورت کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی نکالے گی۔ تم نے کیا اسے اسی آدمی کے پاس سے حاصل کیا جس نے اسے براؤن کے کمرے سے اٹھایا تھا؟ وہی آدمی جس نے براؤن کو قتل کیا۔ اسے میرے ہوٹل کے کمرے کی چابی بھی اسی کے اندر پڑے میرے پرس میں سے ملی ہوگی۔ تم نے دیکھا تھا اس نے میرے کمرے کا کیا حشر کیا تھا؟ دیواروں پر کیسی گندی گندی گالیاں لکھی تھیں۔ تم نے دیکھا تھا نا؟"

"تم اپنی کہانی سناؤ لائلہ، میرا قصہ رہنے دو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

لائلہ نے اپنے ہاتھ میں تھامے جام کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ آدمی جو براؤن کو اس رات کلب میں ملا تھا نا، وہی اس رات اسے کمرے میں ملنے آیا تھا۔ وہ...... وہی جو دبلا پتلا سا تھا اور جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔"

"ولیسی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں، تمہیں اس کا نام کیسے پتا چلا؟"

"میری یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"ہاں تو اس رات وہ براؤن کے کمرے میں آیا تھا، ایک کالے رنگ کا ڈفل بیگ لے کر۔ میں اس وقت بیڈروم میں تھی۔ پھر مجھے ان کے زور زور سے قہقہے لگانے کی آواز

آئی تو میں نے آ کر دیکھنا چاہا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ جب میں سٹنگ روم میں آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں اس بیگ کو کھول کر بیٹھے تھے۔ اس بیگ میں بہت سارا پیسا تھا۔ نوٹ ہی نوٹ! اور ساتھ میں بہت سارے بیئرر بانڈ بھی تھے۔ دس دس ہزار ڈالر کی مالیت کے۔ وہ دونوں اسی رقم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ لیسی وہ رقم رات بھر کے لیے براؤن کے پاس رکھوانے آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صبح آ کر وہ اسے لے جائے گا۔ اس کام کے لیے وہ براؤن کو کافی رقم دینے کو تیار تھا مگر سچ پوچھو تو میرے خیال میں یہ اس کا ایک بہت ہی احمقانہ منصوبہ تھا۔ درحقیقت وہ دونوں ہی احمق تھے۔''

''احمق؟ مگر میرا تو خیال تھا کہ تم براؤن سے محبت کرتی تھیں؟''

''محبت؟ اوہ میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا تھا کہ میں براؤن سے محبت کرتی تھی۔ ہاں میرا اس کے ساتھ چکر ضرور چل رہا تھا۔ وہ میرا کافی خیال رکھتا تھا۔ کم از کم اس کُتّے کے بچے سیمی لی سے تو بہت زیادہ۔ تو بس اس کے ساتھ کچھ اچھا وقت ضرور گزرا مگر مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔''

''اچھا چلو آگے بڑھاؤ اپنی کہانی۔'' میں نے آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

''مگر میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا ایسا انجام ہو۔ دراصل براؤن عجیب اضطراری مزاج کا انسان تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اس رات سیمی لی کو قتل کر دیا تھا۔ خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ تو اس رات براؤن اور لیسی نے پھر وہ رقم دوبارہ اس بیگ میں ڈالی اور اسے الماری میں رکھ دیا۔ اس کے بعد لیسی وہاں سے چلا گیا۔ براؤن نے اس کے جانے کے بعد وہ بیگ الماری سے نکالا اور رقم دوبارہ گنی۔ اس کے دل میں لالچ آ گیا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ اس رقم سے ہمارے سارے سپنے پورے ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ رقم ہماری تو نہیں تو وہ ہنسنے لگا اور بولا کہ اس رقم سے ہم دنیا میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ پھر اس نے ایک پلان بنایا۔ اس نے کہا کہ ہم علی الصبح ہی اس ہوٹل سے رفو چکر ہو جائیں گے۔ لیسی کے لیے کچھ رقم ضرور چھوڑ جائیں گے مگر زیادہ تر ہم اپنے ساتھ لے کر جزائر کیمن چلے جائیں گے اور وہاں کے کسی بینک میں وہ رقم ڈپازٹ کر دیں گے۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں لیسی رات کو ہی واپس آ گیا تو؟ یہ خیال آتے ہی اس نے کچھ ردی اخبار اس ڈفل بیگ میں نیچے بچھا دیے اور اوپر کچھ اصلی نوٹ بھی رکھ دیے تاکہ بیگ کا وزن اتنا ہی رہے۔ اس نے بیگ کو بند کر کے ایک طرف سے زپ اس طرح پھنسا دی کہ بیگ کو پورا کھولنے میں دقت ہو۔ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ جب لیسی بیگ کھولے تو بظاہر اسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی لگے مگر وہ مکمل اطمینان کرنے کے لیے بیگ کو پورا نہ کھول پائے۔ براؤن نے کہا کہ یہ بیگ ہم جاتے وقت ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک پر رکھوا جائیں گے کہ لیسی جب وہاں آئے تو اسے یہ کہہ کر دے دیا جائے کہ ہمیں کسی ضروری کام کے سبب جلدی جانا پڑ گیا۔ لیسی جب وہاں آئے گا تو وہ بیگ کی زپ کھول کر چیک کرنا چاہے گا مگر اڑی ہوئی زپ کے کارن ایسا کر نہیں پائے گا۔ ویسے بھی وہ رقم وہیں بیٹھ کر تو گننا نہیں شروع کر دے گا۔ جب تک وہ کسی محفوظ مقام پر پہنچے گا اور بیگ کو پورا کھول کر رقم گنے گا، اس وقت تک ہم اس کی پہنچ سے بہت دور جا چکے ہوں گے پھر اس نے سٹنگ روم کے صوفے کے دو بڑے کشن لیے اور انہیں کھول کر ایک بلیڈ کی مدد سے ان کے بیچ سے کچھ فوم کاٹ کر نکال دیا اور وہ رقم وہاں چھپا دی۔ اوپر سے دوبارہ کچھ فوم رکھ دیا اور غلاف چڑھا کر بند کر دیا۔ پھر ہم سو گئے لیکن اس رات مجھے بالکل نیند نہ آئی، رہ رہ کر مجھے سیمی لی کے قتل کا منظر یاد آتا رہا۔ مانا کہ براؤن نے اس کا قتل اس کے میرے ساتھ ناروا سلوک کی بِنا پر کیا تھا مگر وہ اس کا دوست بھی تو تھا۔ کوئی اپنے دوست کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ براؤن اب لیسی کے ساتھ بھی دھوکا کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں، میں اس سے اپنے ساتھ وفا کرنے کی کیا امید رکھ سکتی تھی؟ اور جبھی پھر وہ سب کچھ ہو گیا۔''

''کیا ہو گیا؟'' میں نے اور متجسس ہوتے ہوئے پوچھا۔

لائلہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ ان پر بڑی مشکل سے قابو پا کر بولی۔

''تمارا تم شاید میرے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتیں۔ تمہارے خیال میں ایک آوارہ مزاج، بدچلن، اور جھوٹی لڑکی ہوں مگر میں نے دو آدمیوں کو جن کے ساتھ میرے بہت قربت کے تعلقات تھے، اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دینے کے بعد پوچھا۔ ''تو کیا وہاں کوئی اندر گھس آیا تھا؟''

”میرا خیال تھا کہ شاید براؤن نے ٹیرس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی تو میں نے براؤن کو جگا دیا۔ اس نے جا کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا کہ اب اٹھ ہی گیا ہے تو وہ نہا دھو کر تیار ہو جائے کیونکہ ہمیں وہاں سے صبح سویرے ہی نکلنا تھا۔ سو وہ نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اس کے چلاّنے کی آواز آئی اور پھر دھم دھم کی آواز آئی جیسے کوئی زور زور سے کوئی چیز مار رہا ہو۔ مجھے وہاں پر کسی کے چلنے پھرنے کی بھی آواز آئی جو کہ براؤن نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ ننگے پیر تھا۔ میں چپکے سے بیڈ کے پیچھے جا کر چھپ گئی۔ مجھے وہاں سے کسی کے الماریاں کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اور پھر یک دم خاموشی چھا گئی جیسے جو بھی وہاں آیا تھا، وہ واپس جا چکا ہو۔ میں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہاں سے نکل کر باتھ روم کی طرف گئی تو براؤن زمین پر پڑا تھا اور اس کے سر سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو وہ مر چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ مجھے خیال آیا کہ جس نے بھی اسے قتل کیا تھا شاید وہ اب بھی وہیں کہیں گھات لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسی لیے میں سٹنگ روم میں جائے بغیر ہی براؤن کے والٹ سے کچھ رقم نکال کر بالکونی کے راستے باہر کود گئی۔“

”اور اس کے بعد تم میرے پاس چلی آئیں؟“

”ہاں کیونکہ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا مگر جب میں وہاں سے آئی تھی تو میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلا تھا۔ کسی نے بعد میں آ کر اسے بند کیا تھا۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تھے تو ہمیں دروازہ بند ملا تھا۔ نجانے دروازہ کس نے بند کیا ہو گا؟“

”لیسی نے۔ جب وہ وہاں پہنچا ہو گا اپنی رقم واپس لینے۔“

”تو کیا لیسی ہی نے براؤن کا قتل کیا تھا؟ کیا تمہارا ہینڈ بیگ بھی اسی نے اٹھایا تھا؟“

”نہیں یہ کام لیسی کا نہیں تھا بلکہ ایک اور کمینے کا تھا۔“

”تمہارے خیال میں وہ اس وقت کہاں ہو گا؟“ لائلہ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”جہنم میں! کیونکہ وہ مر چکا ہے۔“

”کیا؟“

”ہاں۔“

”کیا واقعی؟“ لائلہ نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

”ہاں۔ لیسی اور وہ دونوں ہی مر چکے ہیں۔“

”اچھا مگر میرے کمرے میں پھر وہ کون آیا تھا؟“

”یہ سب بعد میں پوچھنا، پہلے تم اپنی کہانی تو مکمل کر لو۔ پھر جب تم مجھے اپنے ساتھ لے کر بیل ائر ہوٹل گئی تھیں تو پھر کیا ہوا؟“

”ہاں وہاں میں سٹنگ روم میں ہی رہی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ جو بھی وہاں آیا تھا، وہ اس بیگ کو ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ جب وہ اسے مل گیا تو وہ اسے ساتھ لے کر چلا گیا ہو گا۔ وہ رقم وہیں کمرے میں ہی موجود تھی۔ میں نے کشن کھول کر ساری رقم نکالی اور پھر بالکونی کے راستے باہر کود گئی۔“

”مجھے براؤن کی لاش کے ساتھ چھوڑ کر تاکہ جب پولیس آئے تو سارا الزام میرے سر پر تھوپ دے۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب پولیس تمہیں لاش کے پاس پائے گی تو وہ اتنا تو ضرور سوچیں گے کہ تم جیسی عورت براؤن جیسے ہٹے کٹے آدمی کا خون کیسے کر سکتی ہے؟ جس کسی نے بھی براؤن کا قتل کیا تھا، وہ کافی مضبوط اور طاقتور تھا۔“ لائلہ صفائی دیتے ہوئے بولی۔

”بہرحال جو بھی وہ بیگ لے کر گیا تھا، وہ ساتھ میں تمہارا ہینڈ بیگ بھی لے گیا ہو گا کیونکہ وہ اس بیگ کے اوپر ہی پڑا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب ہم لیسی کے لیے وہ بیگ فرنٹ ڈیسک پر چھوڑنے جائیں گے تو ساتھ میں میں تمہارا بیگ بھی فرنٹ ڈیسک پر رکھوا دوں گی کہ یہ تم تک پہنچا دیا جائے مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ وہ دونوں ہی بیگ اٹھا کر لے گیا۔ جلدی میں مجھے اپنا پرس تمہارے بیگ سے نکالنا یاد نہ رہا اور شاید قاتل اسی کی مدد سے میرے ہوٹل کے کمرے تک پہنچا ہو گا۔“

”تمہارے کمرے میں؟“

”ہاں میرا خیال ہے کہ جب ہم براؤن کے کمرے تک گئے ہوئے تھے تبھی وہ وہاں میرے کمرے میں آیا ہو گا کیونکہ جب اس نے وہ ڈفل بیگ کھول کر دیکھا ہو گا اور اوپر کے چند نوٹ ہٹانے کے بعد اسے وہ کاغذ ملے ہوں گے تو وہ بہت سیخ پا ہوا ہو گا۔ میرے پرس سے اُسے میری تصویریں اور ہوٹل کی چابی مل گئی ہو گی اور وہ میری تلاش میں نکل پڑا ہو گا۔

”ذرا سوچو تمارا! اگر تم میرے ساتھ براؤن کے

کمرے تک جانے کے لیے راضی نہ ہوئی ہوتیں، میں اسے اپنے کمرے میں ہی ملتی اور پھر وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ جب میں پیسے لے کر مونٹیگو بے ہوٹل واپس پہنچی تو وہ میرے کمرے سے جا چکا تھا۔ میں کمرے کا وہ حال دیکھ کر بہت ڈر گئی۔ بس میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور اپنا پاسپورٹ لے کر وہاں سے بھاگ گئی۔ براؤن کی کار میں ہی میں کنگسٹن کی حدود سے باہر نکل آئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ قاتل پاگلوں کی طرح میری تلاش میں ہوگا اور سوچو کہ یہ سب تباہی صرف اس وجہ سے آئی کہ براؤن کا دوست ہمیں اس رات کلب میں مل گیا تھا۔“

”مگر تمہیں اس بات کا کوئی خیال نہ آیا کہ وہ تمہارے ساتھ ساتھ میری تلاش میں بھی نکل پڑے گا؟“ میں نے قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں ایک دوسرے ہوٹل سے فون کیا تھا مگر تم نے فون اٹھایا ہی نہیں۔ میں تم سے بس یہی کہنا چاہتی تھی کہ اس ہوٹل سے یا پھر ہو سکے تو اس ملک سے ہی نکل جاؤ۔ میں نے ہی ہوٹل کے منیجر کو فون کر کے کہا تھا کہ کسی نے ہوٹل کے کمرا نمبر 314 میں بہت توڑ پھوڑ کی ہے اور یہ کہ شاید وہاں پر کوئی زخمی بھی ہے۔ میں نے فون کرتے وقت اپنی آواز بدل لی تھی کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ہوٹل والے پولیس کو ضرور فون کریں گے۔ میں یہ سب کچھ تمہارے لیے ہی تو کر رہی تھی کہ اگر پولیس وہاں موجود ہوگی تو تم بھی محفوظ رہو گی۔“

”اچھا تو پھر جب تم مجھے تلاش کرتے کرتے تھک گئیں تو پھر تم نے کیا کیا؟“ میں نے طنزاً پوچھا۔

”پھر میں نے پیسے لیے اور فلائیٹ پکڑ کر سیدھی جزائر کیمن چلی گئی۔ اب وہ ساری رقم میری تھی۔“ لائلہ نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں لائلہ اب وہ ساری رقم تمہاری ہے۔“ میں نے سرد مہری سے جواب دیا۔

میں جانتی تھی کہ لائلہ شاید اب بھی پورا سچ نہیں بتا رہی تھی اور شاید اس کی کہانی میں اب بھی سقم موجود تھے مگر مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے اب سارے معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

”تمارا تمہیں معلوم ہے کہ اس سیاہ ڈفل بیگ میں کتنی رقم موجود تھی؟ وہاں جزائر کیمن کے بینک میں جمع کرواتے وقت وہ سارا پیسا گنا گیا تھا بارہ لاکھ پچاس ہزار ڈالر! وہاں میں نے تمہارے نام پر بھی ایک اکاؤنٹ کھلوا دیا ہے۔“

”میرے نام پر؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں کیونکہ میری جان میں پیسے دھیلے کے معاملے میں اپنی بات کی بہت پکی ہوں۔ جب ہم براؤن کے کمرے میں گئے تھے تو میں نے..... کہا تھا کہ میں تمہیں پچاس ہزار ڈالر دوں گی۔ میں نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے تمہارے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروا دیے ہیں اور کیونکہ تمہیں میری وجہ سے بہت پریشانی اٹھانی پڑی ہے اس لیے میں نے کچھ زیادہ ہی رقم جمع کرائی ہے۔ تمہارے نام اور پاس ورڈ کے سوا کوئی اور ان پیسوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا یہ لو! یہ پاس ورڈ سنبھال کر رکھنا کہیں گم نہ کر دینا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ کر میرے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد ہم نے اپنی ڈرنک ختم کی۔

”لائلہ تمہاری باتوں میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ؟“ میں نے آخرکار پوچھ ہی لیا۔

”سب کا سب سچ ہے تمارا۔ ویسے بھی اب سچ بتانے کے لیے باقی بچا ہی کون ہے؟“ پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا خیال ہے کہ ہم جرسی واپس جا کر اپنی دوستی کو جاری رکھ سکیں گے؟ گھومیں گے۔ پھریں گے۔ ڈھیر ساری شاپنگ کریں گے۔ اچھے اچھے لوگوں سے ملیں گے۔ کہو کیا خیال ہے تمہارا؟“

”کم از کم اس جنم میں تو نہیں لائلہ لو۔“ میں نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”اپنی باقی باتوں میں وہ جتنی بھی ناقابلِ اعتبار سہی مگر پیسوں کے معاملے میں لائلہ اپنے قول کی پکی نکلی۔ تمارا ہیل کے نام پر جزائر کیمن کے بینک میں واقعی ایک اکاؤنٹ موجود تھا اور جب میں نے اپنا پاس ورڈ ”دی مونٹیگو بے“ جو لائلہ اپنے پیپر نیپکن پر لکھ کر میرے بیگ میں ڈال گئی تھی۔ دے کر چیک کیا تو اس اکاؤنٹ میں اسّی ہزار ڈالر موجود تھے۔

مجھے اس دن ایک اور خوش خبری ملی ایک خوب صورت پھولوں کے بڑے سے گلدستے کی صورت میں۔ یہ بازل کی طرف سے تھا۔ اس کے ساتھ ایک کارڈ تھا جس پر مختصر سا پیغام تھا۔

”خاتون کی خدمت میں سلام اپن کا۔
بہت جلد امریکا آ رہا ہوں۔ بازل۔“

www.paksociety.com

دور کی آواز

تمکین رضا

ایسے شخص کی کتھا جسے اچانک ہی نفسیاتی مرض لاحق ہو گیا... ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ایسے مریض کبھی اپنے مرض سے چھٹکارا پانا نہیں چاہتے... وہ اپنی خوابوں بھری دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں مگر پھر ایسا ہوا کہ مریض نے اپنے مرض سے نجات پالی... ڈاکٹر اور اس کی طب حیران و پریشان تھے...

ڈاکٹر اور مریض کی ملاقاتوں کا پریشان کن احوال......

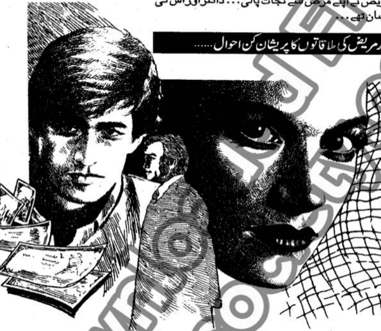

جس وقت وہ بتا رہا تھا اس وقت اس کی آنکھوں میں چراغ سے جلنے لگے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”کیا بتاؤں، کیا خوب صورت آواز ہے اس کی۔ جیسے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس آواز نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس اسی کو سنتا رہوں۔ اپنا ہوش ہی نہیں رہتا۔ پاگل سا ہو جاتا ہوں۔“

”کیا تم صرف اس کی آواز ہی سنتے ہو۔ یا اس سے باتیں بھی ہوتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

Download Urdu Books from www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

''نہیں، صرف آواز۔'' اس نے بتایا۔ ''اگرچہ میں اسے مخاطب بھی کرتا ہوں۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ میری بات کا جواب نہیں دیتی۔ صرف اپنی بات کرتی ہے۔''

''اور وہ کہتی کیا ہے؟''

''میرے پاس چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

''کہاں چلے آؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو اس نے نہیں بتایا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

میں ایک سائیکاٹرسٹ ہوں۔ ایک ماہرِ نفسیات۔ میرے پاس دن بھر ایسے ہی مریض آتے رہتے۔ جو کسی فوبیا یا مانیا میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا ذہنی خلل ان کے چہروں سے واضح ہوا کرتا ہے۔ ان کی آنکھیں ایک خاص کیفیت کا پتا دیتی ہیں۔ ان کے چہروں پر وحشت سی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہت پُرسکون تھا۔ ٹھہرا ہوا لہجہ۔ ٹھہری ہوئی گفتگو۔ ہاں، عام طور پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو نفسیاتی مریض ہوتے ہیں، ان کے گھر والے انہیں لایا کرتے ہیں۔ وہ اپنا علاج وغیرہ نہیں کرانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں جبکہ یہ شخص خود ہی میرے پاس آیا تھا۔ اکیلا۔ اسی لیے میں نے اسے دوسرے مریضوں سے مختلف سمجھا تھا۔

وہ ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ماسٹر کر رکھا ہے اور وہ بھی انگلش لٹریچر میں۔ یقیناً اس کا ویژن بھی وسیع ہوگا۔ وہ شخص ایک ایسا مسئلہ لے کر میرے پاس آیا تھا کہ ابھی تک جس کا جواز میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔

اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک بینک کا منیجر ہے۔ بہت ذمّے داری کی پوسٹ تھی اس کی۔ ایسا آدمی جب اس قسم کے کسی مرض میں گرفتار ہو جائے تو پھر بہت پرابلم ہو جاتی ہے۔ وہ چونکہ ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اسی لیے وہ ایک ماہرِ نفسیات کے پاس پہنچا تھا۔ ورنہ یہاں تو بابا آن کی لائن لگی رہتی ہے۔ دھونی دی جاتی ہے۔ زنجیروں سے باندھ کر اس پر تشدد کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس پر کوئی جن یا بھوت آگیا ہے جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔

اس قسم کے امراض schizophrenia کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ذہنی خلل ہے۔ اس میں مبتلا شخص کو غیبی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کوئی اس کو بُلا رہا ہے۔ اس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کو کوئی راز بتانا چاہتا ہے، وغیرہ۔ یہ ایک ناکارہ کردینے والی ذہنی کیفیت ہوتی ہے۔ مریض کو ناموجود سنائی یا دکھائی دینے لگتا ہے۔ مریض کے لیے حقیقی یا خیالی دنیا میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ناموجود آوازیں اسے ہنساتی ہیں، رلاتی ہیں۔ خوف زدہ کرتی ہیں۔ ترغیب دیتی ہیں اور وہ ان سے باقاعدہ باتیں کرتا ہے۔ اس کو اپنی صحت وغیرہ سے دلچسپی نہیں رہتی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آتا ہے کہ لوگ اسے پاگل سمجھنے لگتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ ایک مرض ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں یہ یا تو پاگل پن ہے یا کسی جن یا بھوت کی کارستانی ہے۔

''ڈاکٹر صاحب، اگر میں پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔۔۔ تو شاید میں بھی خود کو پاگل سمجھنے لگتا۔ یا یہ سمجھتا کہ میں نفسیاتی مریض ہو گیا ہوں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے، وہ آواز ایک حقیقت ہے۔''

''جی ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' میں نے کہا۔ یہ بھی ایک ٹریٹمنٹ ہے کہ مریض کو انکار نہ کیا جائے بلکہ اس کی ہاں میں ہاں ملائی جائے اور غیر محسوس طور پر اس کا علاج شروع کر دیا جائے۔ میں نے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ''یہ بتائیں۔ آپ کن لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے گھر والے۔''

''جی ہاں۔ میں شادی شدہ ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''تین سال پہلے میری شادی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بیوی مجھے پاگل سمجھنے لگے۔''

میں ہنس پڑا۔ اس نے ایک دلچسپ بات کہہ دی تھی۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو آپ بتائیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے میں یہ بتا دوں کہ یہ سب کچھ ایک حقیقت ہے۔ میرا گمان نہیں ہے۔''

''پھر تو آپ کو کسی بابا کے پاس جانا چاہیے تھا۔''

''یہی تو الجھن ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں۔ اس قسم کی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

''دیکھیں مسٹر جنید۔ میں آپ کا علاج کروں گا لیکن میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔''

''جی فرمائیں۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

‘‘میں آپ کو کچھ مسکن دوائیں دوں گا۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘اس کے علاوہ آپ کو پوری نیند لینی ہوگی اور صحت مند خوراک کھانی ہوگی۔ خود کو پریشان نہیں کرنا ہوگا۔’’

‘‘خیر، میں اس کا وعدہ تو نہیں کر سکتا لیکن بقیہ دونوں شرائط پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔’’

‘‘ایک ہفتہ دوا استعمال کر کے مجھے بتائیں۔ اس کے بعد ضرورت سمجھی تو پھر باقاعدہ علاج ہوگا۔’’

میں نے اسے دوائیں لکھ کر دیں۔ ہدایات دیں، وہ چلا گیا۔

میں نے یہ بتایا ہے کہ اس قسم کا معاملہ میرے لیے نیا نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے مریض اسی قسم کے آیا کرتے ہیں۔ اس مصروف زندگی نے ہم میں سے ہر ایک کو نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔

ڈپریشن، ٹینشن، الجھنیں۔ سیاسی اور ملکی حالت۔ پورے ملک پر چھائی ہوئی خوف کی کیفیت۔ ان سبھوں نے ہمیں ذہنی مفلوج کر دیا ہے۔ ہم خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں رہنے لگے ہیں۔ یہ جنید بھی انہی میں سے ایک تھا۔ یہ اور بات ہے کہ پڑھا لکھا تھا۔ اسی لیے اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے میرے پاس آگیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد اس کا اپائنٹمنٹ تھا۔ مجھے اس کا انتظار تھا کہ اس کی کیفیت معلوم ہو سکے کہ میری تجویز کردہ دواؤں نے اس پر کتنا اثر کیا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد وہ آگیا۔ اس بار وہ کچھ نڈھال سا تھا۔ پچھلی بار جب وہ آیا تھا تو فریش دکھائی دے رہا تھا لیکن اس بار وہ مرجھایا ہوا تھا۔

‘‘تشریف لائیں جنید صاحب۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘بتائیں کیسے ہیں؟’’

‘‘بہت پریشان۔’’ اس نے بتایا۔ ‘‘کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ آواز میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ بلکہ اب تو اس کا دورانیہ بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ میں نے شاید بتایا نہیں تھا کہ پہلے وہ صرف رات کے وقت سنائی دیتی تھی جب میں اپنے کمرے میں ہوتا تھا۔ دفتر میں اس کی آواز کبھی سنائی نہیں دی۔ لیکن اب...... اب تو......’’ وہ خاموش ہو گیا تھا۔

‘‘ہاں بتائیں، خاموش کیوں ہو گئے؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘وہ الٹی سیدھی فرمائشیں کرنے لگی ہے۔’’ اس نے بتایا۔

اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہیں سے اس مرض کے خطرناک مرحلے شروع ہوتے ہیں۔ جب وہ اس مرض کے تحت کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے۔ ایک طرح سے ٹرانس کی کیفیت میں آجاتے ہیں۔

‘‘جنید صاحب، اس نے آپ سے کیا فرمائش کی تھی؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘اس نے کہا تھا کہ میں اسی وقت تمہارے سامنے آؤں گی جب تم اپنی بیوی کو تھپڑ مارو گے۔’’ اس نے بتایا۔ اس کی آواز میں شرمندگی تھی۔

‘‘تو کیا آپ نے اس سے ملنے کی فرمائش کی تھی؟’’

‘‘جی ہاں۔ میں اس کی آوازیں سنتے سنتے تنگ آچکا تھا۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا کہ تم کبھی میرے سامنے تو آؤ۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اسی وقت سامنے آئے گی جب میں اپنی بیوی کو تھپڑ ماروں گا۔’’

معاملہ خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ ‘‘اور آپ نے تھپڑ مار دیا؟’’

‘‘جی ہاں۔’’ اس نے گردن جھکا لی۔ ‘‘کیا کرتا؟’’

‘‘کیا اس کے بعد وہ سامنے آئی؟’’

‘‘نہیں، اس نے کہا کہ مجھے ابھی دو تین امتحان اور بھی دینے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ظاہر ہوگی۔’’

‘‘کیا آپ اپنی مسز کو یہاں لا سکتے ہیں؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘وہ کیوں؟’’ اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

‘‘کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ چونکہ ایک الجھا ہوا معاملہ ہے... اسی لیے میں انہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘یوں سمجھ لیں چند احتیاطی تدابیر بتانی ہیں۔’’

‘‘ٹھیک ہے۔’’ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ‘‘لے آؤں گا لیکن آپ مجھے اطمینان دلا دیں کہ میں پاگل تو نہیں ہوں۔ وہ آواز واقعی ایک حقیقت ہے۔ کوئی انجانی سی شے ہے۔ اس دنیا میں بے شمار بھید ہیں اور وہ بھی ان بھیدوں میں سے ایک ہے۔’’

‘‘جی ہاں۔’’ میں نے اسے یقین دلایا۔ ‘‘ایسا ہی ہے۔ میں نے کچھ روحانی عالموں سے، کچھ اسکالرز سے رجوع کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہی بتایا ہے۔’’

‘‘تو پھر کیا کروں میں یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی۔’’

‘‘آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘ہر پرابلم کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ اس کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بھی نکل آئے گا۔ آپ کل مسز کو لیتے آئیں۔“

دوسرے دن وہ اپنی بیوی کو لے آیا تھا۔ وہ ایک کم عمر کی خوب صورت سی لڑکی تھی۔ بہت الجھی ہوئی بہت پریشان۔ اس کا نام غزالہ تھا۔

”جنید صاحب! آپ کمرے سے جائیں۔ مجھے ان کو کچھ سمجھانا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ضرور۔“ وہ باہر چلا گیا۔

”میرے شوہر کو ہوا کیا ہے؟“ اس کی بیوی پھٹ پڑی۔ ”کیا یہ پاگل ہو گئے ہیں؟ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ کل......کل تو انتہا ہو گئی۔ بات کچھ بھی نہیں تھی اور......“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بات کچھ بھی نہیں تھی۔ ان کی قمیص ایک طرف گری ہوئی تھی۔ بس اسی بات پر مجھے ایک تھپڑ مار دیا۔ کیا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے، تم کیا جانو اس کائنات کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ اب بتائیں کیا ایسی باتیں کی جاتی ہیں؟“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ایک مرض ہے۔ وہ نفسیاتی مریض ہو گئے ہیں۔“

”ایسا کون سا مرض ہو گیا ہے؟“

”اس کو شیزوفرینیا کہتے ہیں۔“ پھر میں نے اسے تفصیل سے اس مرض کے بارے میں بتا دیا۔

وہ بے چاری یہ سب سن کر حیران رہ گئی تھی۔

”میرے خدا!“ وہ رونے لگی تھی۔ ”اب کیا ہوگا؟“

”آپ ہی ان کو ٹھیک کر سکتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ آپ ان کے قریب ہیں۔ آپ ان کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے مریض ایسی غیر متوقع حرکت بھی کر سکتے ہیں جو آپ کو حیران کر دے۔ لیکن ان کی کسی بات پر آپ ریئش نہ ہوں۔ وہ جو کہیں، وہ سنتی رہیں۔ ہاں میں ہاں ملاتی رہیں۔“

”تو کیا اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟“

”میں علاج ہی کر رہا ہوں۔ ان کی کونسلنگ کرنی ہو گی۔ وہ بھی کئی بار۔ تب جا کر وہ ٹھیک ہوں گے۔ آپ میرا کارڈ رکھ لیں ...... جب کوئی غیر معمولی صورت ہو تو مجھے فون کریں۔ میں دوائیں تجویز کر دوں گا۔“

”کیا ابھی کوئی میڈیسن نہیں دیں گے؟“

”میں نے ابتدائی میڈیسن لکھ دی ہیں۔ وہ استعمال کروائیں لیکن پابندی کے ساتھ۔“

دونوں چلے گئے۔ مجھے عام طور پر مریضوں کے ساتھ ان معنوں میں کمرشل ہونا پڑتا ہے کہ دن بھر کئی لوگ آتے ہیں۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ لیکن ہر ایک کو ڈیل کرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کو سننا پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کہانی ہوتی ہے۔ الجھے ہوئے ذہن کی الجھی ہوئی کہانی۔

شاید ایک ہفتے کے بعد جنید کی بیوی نے فون کیا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب، میں فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ معاملہ سیریس ہو گیا ہے۔“

”اور جنید کہاں ہیں؟“

”وہ آفس میں ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اگر ایمرجنسی ہے تو آ جائیں۔“ میں نے کہا۔

وہ آدھے گھنٹے کے اندر ہی پہنچ گئی تھی۔ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب! اب میں اس پاگل کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے میری ساری جیولری لے جا کر سمندر میں پھینک دی ہے۔“

”جیولری سمندر میں پھینک دی؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں، وہ کہہ رہا تھا کہ اس دیوی نے سونے کی قربانی مانگی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ سونا سمندر میں بہا دو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ وہ میرے سامنے زبردستی جیولری باکس لے کر گاڑی پر سمندر کی طرف نکل گیا۔ میں چیختی چلاتی اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اتفاق سے مجھے ایک ٹیکسی وقت پر مل گئی تھی۔ میں نے اس کے ذریعے تعاقب کیا۔ اس کو نیٹی جیٹی پر جا کر پکڑا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً ہی باکس کو سمندر میں اچھال دیا۔ کہانی ختم ہو گئی۔ وہاں ایک ٹھیلے والا ہے جو مچھلیوں کے چارے وغیرہ بیچتا ہے۔ اس نے میری مدد کی۔ اس نے غوطہ خوروں سے ریکویسٹ کی۔ انہوں نے بھی سمندر میں جا کر چھان بین کی لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اس دوران کیماڑی پولیس اسٹیشن سے پولیس والے بھی آ گئے، انہیں بھی یہ سچویشن معلوم ہوئی تو انہوں نے بھی مدد کی لیکن جانے والی چیز تھی چلی گئی۔“

”اور اس دوران وہ کیا کرتے رہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ان پر تو کوئی اثر ہی نہیں تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ ہنس رہے تھے۔ اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ دیوی نے ان کی قربانی قبول کر لی ہے۔ ورنہ باکس مل جاتا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر کیا ہونا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے انہیں واپس

لائی ہوں۔“

”دیکھیں، مجھے کچھ اسی قسم کا اندیشہ تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس قسم کے مریضوں کو ہوش کہاں رہتا ہے کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ بہرحال اب میں فوری طور پر ان کو ہائی ڈوز دے رہا ہوں لیکن یہ وقتی علاج ہوگا۔ اس کے بعد ان کو مستقل کونسلنگ کرانی ہوگی۔“

”اب تو مجھے اس بات کا ڈر ہوگیا ہے کہ وہ کہیں خود کو یا مجھے کوئی نقصان نہ پہنچادیں۔“ اس نے کہا۔

”اس کے لیے آپ کو احتیاط کرنی ہوگی۔“

اس کے بعد کئی دن ہو گئے۔ ایک دن جنید خود میرے پاس آگیا۔ وہ اس دن پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں اس آواز کا کیا کروں۔ اب تو وہ مجھے الٹے سیدھے کام بتانے لگی ہے۔“

”پریشان نہ ہوں۔ اس سے آپ کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔“

”ڈاکٹر صاحب! جب وہ آواز ہی نہیں رہے گی تو میری زندگی سے ایک حسین رنگ کا خاتمہ ہوجائے گا۔“ اس نے کہا۔

اس نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ ایسے مریض اپنے واہموں سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ وہ خوابوں کی دنیا میں کھوکر رہ جاتے ہیں۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔

میں نے اسے کچھ اور دوائیں تجویز کردیں۔ وہ چلا گیا۔

پھر بہت دن ہو گئے، اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں دوسرے مریضوں میں الجھ گیا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس کی بیوی کا فون آیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! کیا آپ جانتے ہیں۔ جنید پولیس کی تحویل میں ہے؟“

”وہ کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”انہوں نے اپنے بینک سے پانچ کروڑ نکلوا کر سمندر میں پھینک دیے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کیا؟“ میں یہ سُن کر حیران رہ گیا تھا۔

”جی ہاں، پولیس نے سمندر سے دو تھیلے تو نکال لیے ہیں۔ ایک کروڑ کی رقم واپس مل گئی ہے۔ لیکن چار کروڑ کے تھیلوں کا پتا نہیں چل رہا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں ایسا کروں۔“

”مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ ایک دن کوئی بڑا نقصان کر بیٹھیں گے۔“

”ڈاکٹر صاحب! پولیس آپ کے پاس بھی پہنچے گی۔“ وہ رو رہی تھی۔ ”پلیز ان کو جنید کی بیماری کا بتادیجیے گا۔“

”یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے مسز جنید۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تو بے قصور ہیں۔“

دو دن کے بعد پولیس میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ وہی کہانی لے کر آئی تھی جو جنید کی بیوی مجھے بتا چکی تھی۔ پولیس والوں نے مجھ سے دو تین سوالات کیے۔ جنید کے مرض کی ہسٹری معلوم کی۔ پھر واپس چلی گئی۔ مختصر یہ کہ مجھے ایک بار عدالت میں بھی جاکر گواہی دینی پڑی تھی۔ میرے علاوہ وہ لوگ بھی اس بات کے گواہ تھے جن کے سامنے جنید نے اپنی بیوی کے زیورات سمندر میں پھینک دیے تھے۔ خاص طور پر مچھلیوں کا چارا بیچنے والا۔

جنید کو سزا تو کچھ نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی جاب چلی گئی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں بہت دنوں تک کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ چھ مہینے کے بعد میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی گیا تھا۔ وہ کانفرنس نفسیات ہی کے موضوع پر تھی۔

دن بھر کانفرنس میں مقالے سنتے ہوئے تھکان سی ہونے لگی تھی۔ شام کے وقت میں یونہی قریبی شاپنگ سینٹر میں کچھ شاپنگ کے لیے چلا گیا اور وہاں میں نے جنید کو دیکھ لیا۔ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں کسی اور طرف متوجہ تھے لیکن میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

”مسٹر جنید۔“ میں نے آواز دی۔

اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ”ارے ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں......؟“

”میں یہاں ایک سیمینار میں آیا ہوا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

اس دوران اس کی بیوی بھی میری طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ وہ بھی بہت حیران اور خوش ہورہی تھی۔

”آئیں نا ڈاکٹر صاحب۔“ جنید نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”سامنے فکارو ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ فرنچ ریستوران ہے۔ کافی بہت اچھی ملتی ہے۔“

میں اس وقت فری ہی تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ دونوں یہاں کیا کررہے ہیں اور اس کے مرض کا کیا حال ہے۔ ہم سب فکارو میں آکر بیٹھ گئے۔ جنید نے کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔

”ہاں بھائی، اب بتائیں یہاں کیا ہورہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کئی مہینے ہوگئے کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ ایک دو بار میں نے فون بھی کیا تھا لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔“

”ڈاکٹر صاحب! ہمیں یہاں آئے تقریباً دس مہینے ہو

چکے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم نے یہاں کی شہریت لے لی ہے۔ یہاں سیٹ ہو گئے ہیں۔ پارٹنرشپ میں ایک بزنس بھی شروع کر دیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''اور کراچی میں جو کچھ تھا، اس کا کیا ہوا؟''

''وہاں تھا ہی کیا۔'' اس بار اس کی بیوی بول پڑی۔ ''ہمارا مکان کرائے کا تھا۔ ایک گاڑی تھی وہ بیچ دی تھی۔ فرنیچر بھی اسی طرح نکلوا دیا تھا۔ اور پیسے ٹرانسفر کر کے......''

وہ اس طرح خاموش ہو گئی جیسے غلطی سے بول گئی ہو۔ اس وقت جنید نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ہمارے پاس تھوڑے بہت پیسے تھے۔'' جنید نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''وہی ہم نے ٹرانسفر کروا دیے تھے۔''

نہ جانے کیوں مجھے ان کی باتوں سے کچھ گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر بھی میں نے ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ پھر ایک خیال ذہن میں آیا جو میں نے پوچھ ہی لیا تھا۔ ''جنید صاحب! آپ لوگوں کو یہاں کی شہریت کس بنیاد پر مل گئی۔ قوانین تو بہت سخت ہوتے جا رہے ہیں؟''

''ڈاکٹر صاحب! آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ پوری دنیا میں ایک قانون ہے کہ اگر آپ ان کے مطلوبہ اکاؤنٹ شو کر دیں تو وہ بزنس کے لیے ویزے دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہریت بھی دے دیتے ہیں۔''

''ہاں، اتنا تو معلوم ہے لیکن وہ رقم کروڑوں میں ہوتی ہے۔''

جنید خاموش ہو گیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اس بات کا کیا جواب دیا جائے۔ پھر اس نے کہہ ہی دیا۔ ''جی ہاں ڈاکٹر صاحب، ہم نے تین کروڑ دیے ہیں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس سوچتا رہ گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد خود جنید نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو سب کچھ بتا ہی دوں۔ ایک بوجھ سا ہے۔ اس کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔''

میں صرف اس کو دیکھتا رہا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے شاید میں جانتا ہوں۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ سب میری پلاننگ تھی۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''جنید نے صرف ایکٹ کیا تھا۔''

''میں سمجھ گیا اور تم دونوں نے انتہائی ہوشیاری سے اس پلاننگ پر عمل کیا اور مجھے اس لیے انوالو کیا تا کہ عدالت کو ایک مستند ڈاکٹر کی گواہی مل سکے کہ یہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔ یہ جو بھی کر رہا ہے، بے خودی کے عالم میں کر رہا ہے۔ اس نے بیوی کے زیورات سمندر میں پھینک دیے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ امیٹیشن ہوں۔ تا کہ اس کے بعد دوسرے مرحلے میں یہ اپنے بینک سے رقم نکال کر دو تھیلیاں سمندر میں پھینک دے اور باقی گھر میں چھپا لے۔ کیوں ایسا ہی کیا ہے نا تم نے؟'' میں نے جنید کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔'' اس کی آواز میں شرمندگی تھی۔ ''مجھے افسوس ہے۔''

''افسوس تو مجھے اپنے آپ پر ہو رہا ہے کہ میری علمی حیثیت نے قانون کو دھوکا دیا اور میں تمہاری ناپاک سازشوں میں تمہارا شریک بن گیا۔''

''ڈاکٹر صاحب! ہم دونوں آپ سے شرمندہ ہیں۔'' اس کی بیوی نے کہا۔

''کیا فائدہ ایسی شرمندگی کا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا تم دونوں خود کو پولیس کے حوالے کر دو گے؟ کیا تم بتاؤ گے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے جرائم کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ ڈاکو تو ریوالور لے کر بینک میں داخل ہو کر رقم لوٹ کر بھاگ جاتے ہیں اور بعد میں پکڑے جاتے ہیں۔ لیکن تم نے اپنی معلومات کا سہارا لے کر ایسا منصوبہ بنایا کہ اگر پکڑے بھی جاؤ تو بھی کوئی آنچ نہ آئے۔ یہی سمجھا جائے کہ تم شیزوفرینیا کے مریض ہو۔ دنیا بھر کے ڈاکٹرز تمہارے حق میں گواہی دینے کو تیار ہو جائیں گے اور تم قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے صاف ہو کر رہائی پا لو گے۔ افسوس، میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی کامیابی کی کوئی مدت ہوتی ہے۔ نہیں، یہ صرف زندگی تک ہے اور یہ زندگی کب تک ہے۔ بہر حال تم دونوں خوش رہو اگر رہ سکتے ہو۔''

وہ دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے اور میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کے امراض سے بالا قسم کے لوگوں کا فائدہ ہو جاتا ہے اور کبھی خود مریض فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن ایسے کیس بہت کم ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہانی اس لیے لکھی ہے کہ اگر کوئی مریض کسی ڈاکٹر کے پاس آئے تو خدا کے لیے اسے مریض ہی سمجھیں۔ جنید اور اس کی بیوی جیسا سازشی نہ سمجھیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

قصۂ جدید

منظر امام

انارکلی ایک پرانی داستان... پرانی کہانی ہے جس پر انداز بدل بدل کر نہ جانے کتنے قلم کاروں نے طبع آزمائی کی ہے... آج کے تناظر میں یہ کہانی کیا اور کیسی ہوتی... اس کا لطف پڑھنے میں ہی آئے گا... سیاست اور سیاسی محبت کے زاویوں کو عیاں کرتی ایک شگفتہ تحریر...

قارئین کے لیے منفرد ذائقے کی ایک یادگار کہانی

دربار سجا ہوا تھا۔ مسندِ شاہی کے دونوں طرف اور سامنے کرسیاں لگی ہوئی تھیں جو سب خالی تھیں۔ اسٹیج پر تان سین اپنا گٹار سنبھالے کسی سوچ میں گم تھا کہ انارکلی دربار میں داخل ہوئی۔ اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا پھر تان سین سے مخاطب ہوکر بولی۔ ”تان سین! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”بادشاہ سلامت نے مجھے یہاں بیک گراؤنڈ میوزک کے لیے رکھا ہے انارکلی۔“ تان سین نے ادب سے جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

”اس وقت جاؤ یہاں سے۔ شہزادہ سلیم آنے والے ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں کا ٹائم دیا تھا۔“

”انارکلی! آپ دونوں تو پارک میں ملا کرتے ہیں۔ آج دربار میں کیسے آگئے؟“

”پارک میں بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں تان سین! کھیل کے میدانوں پر تو قبضہ مافیا کا راج ہے۔“

یہ گفتگو جاری تھی کہ شہزادہ سلیم شاہانہ وقار کے ساتھ دربار میں داخل ہوا اور تان سین پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ”تان سین، ہم تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔“

”ذرہ نوازی ہے شہزادے کی۔“ تان سین نے سر کو خم دے کر کہا۔

”تان سین! ہم آج انارکلی سے اپنے دل کی بات کہنے والے ہیں۔ تم کوئی اچھا سا نغمہ چھیڑ دو۔“

”ابھی لیں شہزادے۔ جب تک آپ موڈ بنا لیں۔“ تان سین بولا۔

شہزادہ سلیم مڑ کر انارکلی کے قریب پہنچا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ”انارکلی تم نہیں جانتیں کہ ہمیں تم سے کتنی محبت ہے۔“

اچانک تان سین نے ایک کلاسیکی راگ الاپنا شروع کر دیا جسے سنتے ہی شہزادہ سلیم تقریباً چیخ کر بولا۔ ”بند کرو، خدا کے لیے بند کرو۔ یہ کیا شروع کر دیا تم نے؟“

”یہ راگ بھیم پلاسی ہے شہزادے۔“

”وہاٹ نان سینس۔ تم ماحول کے موڈ کو بھی نہیں سمجھتے۔ اس وقت ہم رومینٹک موڈ میں ہیں اور تم ہمیں راگ بھیم پلاسی سنا رہے ہو۔ کچھ اور سناؤ تان سین۔ تم سے اچھا تو وہ اپنا ڈی جے ہے، وہ ماحول کو سمجھ کر گانے سناتا ہے۔“

”ڈی جے کو تو بھول جائیں شہزادے۔ وہ تو عمران خان کے جلسوں میں پرماننٹ ہو گیا ہے۔“

انارکلی بولی۔ ”چلو تو پھر تم ہی کچھ اور سناؤ۔ کیوں ٹائم ضائع کر رہے ہو۔ مجھے گھر جا کر چائنیز بھی بنانا ہے۔“

تان سین نے پہلو بدلا اور ایک پاپ دھن چھیڑ دی جسے سنتے ہی انارکلی نے والہانہ رقص شروع کر دیا۔ یہ محفل شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ملازم دربار میں داخل ہوا اور فرشی سلام کر کے بولا۔ ”شہزادے، شہزادے! بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔“

یہ سنتے ہی شہزادہ سلیم نے کہا۔ ”انارکلی، تم اس راستے سے نکل جاؤ۔ جلدی، میں ابھی جہاں پناہ کو فیس کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

انارکلی اٹھلا کے بولی۔ ”شہزادے! میں تو روزانہ بادشاہ سلامت کو فیس کرتی ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”فیس بک پر...... بادشاہ سلامت ڈیلی مجھ سے چیٹنگ کیا کرتے ہیں۔“

شہزادہ سلیم نے بوکھلا کر پوچھا۔ ”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا ابا حضور کو معلوم ہے کہ تم کہاں رہتی ہو؟ اور کیا نام ہے تمہارا؟“

”نہیں شہزادے! میں نے انہیں اپنا نام رخسانہ خاتون بتا رکھا ہے اور یہ لکھتی ہوں کہ میں ٹنڈو آدم میں رہتی ہوں۔“

”چلو، پھر تو صحیح ہے۔ اس قسم کے معاملات میں بندے کی صحیح لوکیشن کا پتا ہی نہیں چلتا۔“

تان سین نے کھنکھار کر کہا۔ ”آپ دونوں کیسی باتوں میں لگ گئے۔ بادشاہ سلامت کسی بھی لمحے آنے والے ہیں۔“

”انارکلی! تم تو نکل لو۔ تان سین، ماحول کو سمجھو۔“ شہزادہ جلدی سے بولا۔

”سمجھ گیا ہوں شہزادے! فکر ہی نہ کریں۔“ تان سین گٹار سنبھال کر سیدھا ہو گیا۔

انارکلی لپک کر مسندِ شاہی کے پیچھے چھپ گئی۔ تان سین نے اپنی کرسی کے نیچے چھپایا ہوا ڈیک آن کر کے قوالی لگا دی۔ تکرار ہو رہی تھی۔ ”مدینے چلیں...... آؤ مدینے چلیں......“ شہزادہ سلیم پر یکایک وجد طاری ہو گیا اور وہ جھومنے لگا۔

اسی اثنا میں بادشاہ سلامت دربار میں داخل ہوئے۔ اس روح پرور منظر کو دیکھ کر تالی بجائی۔ تان سین نے جھک کر پھرتی سے ڈیک آف کر دیا۔ تان سین کے ساتھ شہزادہ سلیم نے بھی جھک کر بادشاہ سلامت کو آداب کیا۔ بادشاہ نے اشارے سے تعظیم قبول کی اور شہزادے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”شہزادے! ہم تمہیں سیدھے راستے پر دیکھ کر خوش ہوئے۔“

”جی، ابا حضور! اب تو صرف ہم ہیں اور خدا سے لو لگائی ہوئی ہے۔“

”پھر تو تم کارِ سلطنت کے قابل نہیں رہے۔ ہم کاروبارِ سلطنت تمہارے کسی بھائی کے حوالے کر دیں گے۔“

”ارے نہیں ابا حضور، ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ ہم نے اب اتنی بھی لو نہیں لگائی ہے کہ تاج و تخت سے بے نیاز ہو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جائیں۔“

”چلو اس موضوع پر بعد میں بات ہوگی۔“ شہزادے کی بات ٹال کر بادشاہ نے تان سین کو آواز دی۔

”جی عالم پناہ!“ تان سین نے سر جھکا کر کہا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ آج کل پورے ملک میں بجلی کی شارٹیج ہے۔ لوگ لوڈشیڈنگ سے پریشان ہیں۔“

”جی ہاں عالم پناہ!“ تان سین نے اقرار کیا۔

بادشاہ نے نرمی سے کہا۔ ”تم دیپک راگ کی پریکٹس کرلو۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس ملک کے کسی بھی گھر میں اندھیرا ہو۔ شام ہوتے ہی تمہیں دیپک راگ گا کر ہر گھر میں روشنی کرنی ہے۔ سمجھ گئے؟ آج ہم آرڈیننس بھی جاری کردیں گے۔“

فرمان سنا کر بادشاہ دربار سے چلا گیا اور شہزادہ سلیم نے بے اختیار ہنسنا شروع کردیا۔ انارکلی بھی مسند کے پیچھے سے نکل آئی اور شہزادے کی ہنسی میں شریک ہوگئی۔

”آپ ہنس رہے ہیں شہزادے، میں تو مر گیا نا۔“ تان سین بےبسی سے بولا۔

”موسیقار بنے پھرتے ہو تو اب بھگتو دیپک راگ اور لوڈشیڈنگ کو۔“ شہزادے نے قہقہہ مار کر کہا۔

اگلے دن دربار سجا۔ بادشاہ سمیت ہر ایک اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھا لیکن بیربل کی جگہ خالی تھی۔ بادشاہ نے اس کو نوٹ کیا اور کسی سے مخاطب ہوئے بغیر بولا۔

”بیربل کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آرہا۔“

اسی لمحے بیربل دربار میں داخل ہوا۔

”بیربل! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی دیر سے آئے ہو؟“ بادشاہ نے تلخی سے سوال کیا۔

”مہابلی! آپ نے فرمایا تھا کہ مہارانی جودھا بائی کے تخت کی چولیں ہل رہی ہیں۔ کسی ماہر کارپینٹر کو لے آؤ۔ اب میں کیا کرتا مہابلی۔ وہ کارپینٹر ہی دیر سے آیا۔ بس اس کو لے کر سیدھا چلا آرہا ہوں۔“

”اس کارپینٹر کی یہ مجال کہ شاہی کام میں دیر کرے، بلایا جائے اس کو۔“

شاہی بلکہ نادر شاہی حکم تھا۔ ذرا سی دیر میں شاہی کارندے کارپینٹر کو پکڑ لائے۔ ”کارپینٹر حاضر ہے بادشاہ سلامت!“ ایک ملازم نے اطلاع دی۔ کارپینٹر نے دربار میں داخل ہوکر بادشاہ کے سامنے سر خم کردیا۔

”کارپینٹر! بتاؤ تم اتنی دیر سے بیربل کے پاس کیوں پہنچے؟“

بقیہ

”جہاں پناہ! مجھے شہزادہ عالم کی وجہ سے دیر ہوگئی۔“ کارپینٹر نے منمناتی ہوئی آواز میں بتایا۔

”اس بات کی وضاحت کی جائے۔“ بادشاہ نے حکم دیا۔

”شہزادہ عالم کی سواری گزر رہی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ پروٹوکول کیا ہوتا ہے۔ کئی گھنٹوں سے دونوں طرف کی سڑکیں بند کردی گئی تھیں۔ میں نے خود شمار کیا ہے۔ پوری چالیس گاڑیاں تھیں۔ ایک درجن تو پولیس موبائل تھیں بادشاہ سلامت!“

”اوہ ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ ایک شہزادے کی سواری گزرے اور اس کے ساتھ چالیس چالیس گاڑیاں ہوں اور ہماری رعایا پریشان ہوتی رہے۔“ بادشاہ نے پہلو بدل کر کہا پھر آواز دی۔ ”خان خاناں۔“

”حاضر ہوں ظلِ الٰہی۔“ مخاطب کا فوری جواب آگیا۔

”شہزادے کے اسکواڈ میں سے پانچ گاڑیاں کم کردی جائیں۔ پینتیس یعنی تھرٹی فائیو گاڑیاں بہت ہیں۔“ بادشاہ نے کہا پھر کارپینٹر سے مخاطب ہوگیا۔ ”اب تو خوش ہونا۔“

”جو حکم عالی جاہ۔“ خانِ خاناں نے ادب سے کہا۔

”بیربل! تم اس کارپینٹر کو زنان خانے میں بھیج دو۔“ بادشاہ نے اگلا حکم صادر کیا۔

”کچھ ایڈوانس مل جائے گا ظلِ الٰہی۔“ کارپینٹر نے دھیرے سے پوچھا۔

”حدِ ادب، گستاخ۔ کیا تجھے بادشاہ پر اتنا بھی بھروسا نہیں ہے۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ تیری مزدوری مار جائیں گے؟“ قلی خان نے طیش میں آکر کارپینٹر پر آنکھیں نکالیں۔

”تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ قسم کے لوگ مزدوری وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتے۔“ خان خاناں نے بھی اس موقع پر کارپینٹر کی سرزنش ضروری سمجھی۔

”گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، سرکار!“ کارپینٹر ان پے درپے حملوں سے بوکھلا گیا۔

”لے جاؤ اس کو۔“ بادشاہ نے ملازموں سے کہا۔

”خانِ خاناں! ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ابھی تم نے کارپینٹر سے جو بات کی تھی وہ ہماری تعریف میں تھی یا ہم پر طنز کررہے تھے؟“

”تعریف تھی جہاں پناہ۔ طنز کا کوئی فائدہ ہو تب ہی

بندہ طنز کرے۔"

"جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔" وقفہ آتے ہی ایک ملازم نے اجازت چاہی۔

"یہ اس پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ نیوز کیا لائے ہو؟" بادشاہ نے بے نیازی سے کہا۔

"جہاں پناہ! شاہی محل کے سپاہی ایک استاد کو پکڑ لائے ہیں۔ وہ کچھ باغی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔"

"حاضر کیا جائے۔"

استاد کو دربار میں لایا گیا تو وہ مؤدب اور شائستہ نظر آرہا تھا۔

"مابدولت نے سنا ہے کہ تو نے بچوں کو تعلیم دینی شروع کردی ہے؟" بادشاہ نے سوال کیا۔

"شہنشاہ! بچوں کو نہیں بڑوں کو تعلیم دے رہا ہوں، تعلیمِ بالغان۔" اس نے بتایا۔

"اتنا بڑا جرم، اتنی بڑی جرأت۔ کیوں کررہا ہے ایسا؟" بادشاہ کو یکایک غصہ آگیا۔

"بادشاہ سلامت! میں لوگوں کو باشعور بنانے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"ہم نے دس دفعہ یہ شاہی فرمان جاری کیا ہے کہ لوگوں کو ڈگری یافتہ بنایا جائے تعلیم یافتہ نہ بنایا جائے اگر وہ باشعور ہوگئے تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم اسی لیے تو حکمراں ہیں کہ لوگوں کے پاس شعور نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ ہوتے ہی وہ ہمارے پورے سسٹم سے بغاوت کرنے لگیں گے اور بخدا ہم یہ نہیں چاہتے...... لے جاؤ اس استاد کو۔ اور اسے کال کوٹھڑی میں ڈال دو۔" بادشاہ نے فیصلہ سنا دیا۔

خادم استاد کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے تو بیربل نے دھیرے سے کہا۔ "جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔"

"بادشاہ سلامت۔ ہم اگر اسی طرح تعلیم سے منہ موڑتے رہے تو ترقی کیسے کریں گے؟"

"عام آدمی کو ترقی نہیں، صرف دو وقت کی روٹی چاہیے۔ سمجھ گئے؟ عجیب باتیں ہورہی ہیں۔ صبح سے موڈ خراب ہوتا جارہا ہے۔" بادشاہ نے منہ بنا کر کہا۔

"بادشاہ سلامت! اگر اجازت ہو تو دل آرام کو حاضر کروں۔" قلی خان نے جھٹ موقع سے فائدہ اٹھایا۔

"کون ہے یہ دل آرام؟" بادشاہ نے تجسس سے پوچھا۔

"شاہی محل کی ایک ڈانسر ہے بادشاہ سلامت! اسے اس بات کا دکھ ہے کہ ابھی تک اس کو اپنی پرفارمنس دکھانے کا چانس نہیں ملا۔"

"کیوں نہیں ملا چانس؟"

"جب بھرتیاں رشتے داروں کی ہوں، تو اس کو کہاں سے چانس ملے گا۔"

"بہت تشویش کی بات ہے کہ ہمارے رشتے داروں میں بھی ڈانسرز ہیں۔"

"بادشاہ سلامت! آپ کے رشتے داروں نے سوائے ٹھمکے لگانے کے اور کام ہی کیا کیا ہے۔"

"بخدا یہ سب سن کر دل پر بوجھ ہوگیا ہے۔ اس بوجھ کو اتارنے کے لیے اس رقاصہ کو حاضر کیا جائے۔ کیا نام بتایا تھا اس کا...... دل آرام۔"

"حکم کی تعمیل ہوگی بادشاہ سلامت!" قلی خان نے سر جھکا کر کہا۔

"تو پھر حاضر کیا جائے دل آرام کو۔"

قلی خان کے اشارے پر ایک خادم دل آرام کو بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ اس نے آتے ہی دل موہ لینے والے انداز میں کہا۔ "کنیز آداب کرتی ہے۔ شہنشاہ!"

"دل آرام! ہم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یہ لو تمہارا انعام۔" یہ کہتے ہوئے بادشاہ نے اپنے گلے سے ہار اتار کر دل آرام کی طرف اچھال دیا اور بات جاری رکھی۔

"فی الحال تو یہ امیٹیشن ہے۔ اگر تمہاری پرفارمنس اچھی رہی تو سونے کا ہار بھی مل جائے گا۔"

اس موقع پر تان سین نے اٹھ کر کہا۔ "شہنشاہ! اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"شہنشاہ عالم! آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار میرے ڈانسنگ اسکول کی ایک ڈانسر کو آپ نے چیک دیا تھا۔ وہ ابھی تک کیش نہیں ہوسکا ہے۔ کئی بار باؤنس ہوچکا ہے۔" تان سین نے شکوہ کیا۔

"تان سین! کیا تمہیں ہمارا اصول نہیں معلوم۔ ہمارے وعدے اور چیک کیش ہونے کے لیے نہیں ہوتے۔ میڈیا کی کوریج کے لیے ہوتے ہیں، سمجھے؟" بادشاہ کا لہجہ سخت ہوگیا۔

"سمجھ گیا عالم پناہ!"

"اگر آئندہ ایسی شکایت کی تو ہم شاہی موسیقار کے طور پر کسی اور کو اپائنٹ کرلیں گے۔ چلو دل آرام کے لیے

کوئی راگ چھیڑو۔'' بادشاہ نے اسے تادیب کرتے ہوئے حکم دیا۔

''بادشاہ سلامت! اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟'' اس بار دل آرام نے اجازت چاہی۔ ''میں آج کل گروپ ڈانس کی ریہرسل کر رہی ہوں۔ اگر اجازت ہو تو وہی پیش کروں۔''

''اجازت ہے۔''

اور پھر وہاں ہر طرف سے رقاصائیں نکل آئیں۔ قلی خان نے شاید پہلے سے ان کا انتظام کیا ہوا تھا۔ دربار میں رقص کی ایک سحر آفریں محفل کا آغاز ہو گیا۔ رات گئے اس محفل کا اختتام ہوا تو سب مخمور اور تھکن سے چور تھے۔ نتیجہ نکلا کہ اگلے دن دربار بالکل خالی تھا۔ سلیم اور انارکلی کو موقع مل گیا۔

مسندِ شاہی کے قریب پہنچ کر سلیم نے کہا۔ ''انارکلی! کی تم جانتی ہو کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب ہم ہندوستان کے شہنشاہ ہوں گے اور تم ملکۂ عالیہ کہلاؤ گی۔''

''شہزادے! اس کنیز کو یہ صرف ایک خواب دکھائی دے رہا ہے۔ بادشاہ سلامت مرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم از کم چالیس پچاس سال اور کھینچ لیں گے۔'' انارکلی نے مایوسی سے کہا۔

''انارکلی! یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ اتنے دنوں کے بعد تو ہم بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔''

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی انتظار میں آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔''

''انارکلی! کوئی مشورہ دو ہمیں۔ بخدا تم جو کہتی ہو، وہ سچ ہو جاتا ہے۔ بہت کالی زبان ہے تمہاری۔ مشورہ دو!'' سلیم تڑپ کر بولا۔

''بغاوت کر دیں شہزادے...... بغاوت۔'' انارکلی نے رسانیت سے مشورہ دیا۔

''خاموش! تم ایک بیٹے کو باپ کے خلاف بھڑکا رہی ہو۔'' سلیم کا پارا چڑھ گیا۔ ''بخدا ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے رکا جیسے کچھ سوچ رہا ہو پھر پُرخیال انداز میں بولا۔ ''ویسے بغاوت کے لیے بندے کہاں سے آئیں گے؟''

وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن تھے کہ اسی اثنا میں بیربل دربار میں داخل ہوا اور ان پر نظر پڑتے ہی ایک کونے میں چھپ گیا۔

انارکلی خاموش رہی تو سلیم نے اصرار کیا۔ ''بتاؤ انارکلی! بغاوت کے لیے بندے کہاں سے آئیں گے؟''

''شہزادے! آپ اس کی فکر ہی نہ کریں۔ میرا پھوپی زاد بھائی اسی قسم کے کام کرتا ہے۔ وہ کرائے کے بندے لے آئے گا۔ بس اس کو پیسے چاہئیں اور ٹرانسپورٹ کی ضرورت ہو گی اور کوئی اچھا سا موبائل دلوا دیجیے گا تاکہ وہ واٹس ایپ پر لوگوں سے کانٹیکٹ کر سکے۔''

''انارکلی یہ جو ہمارے یہاں بڑے بڑے جلسوں میں جو لوگ آتے ہیں وہ اسی طرح آتے ہیں؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''اور کیا شہزادے! آپ ذرا ان کی ویڈیو تو غور سے دیکھیں۔ ہر جلسے میں ایک ہی جیسی صورت کے لوگ دکھائی دیں گے۔''

''تم نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں انارکلی۔''

''بس شہزادے! کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ بننے کے بعد آپ اس کنیز کو بھول جائیں۔''

''بخدا ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ہمارے خون میں بے وفائی شامل نہیں ہے پیاری انارکلی۔''

''لیکن شہزادے آپ ہی کے آباؤ اجداد تو اپنے خونی رشتوں کے گلے کاٹتے آئے ہیں۔''

''بخدا یہ ہم پہ تہمت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنے رشتے داروں کا جھٹکا کیا ہے لیکن بے وفائی کبھی نہیں کی۔

نیک نیتی

''اگر تمہیں کہیں سے سو کا نوٹ پڑا مل جائے تو کیا تم رکھ لو گے بیٹا؟''

''جی نہیں مولوی صاحب۔''

''شاباش اسے کہتے ہیں نیک نیتی اور ایمان داری۔ مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ اچھا بتاؤ بیٹا تم اِس نوٹ کا کیا کرو گے؟''

''میں اسے فوراً خرچ کر دوں گا۔''

☆☆☆

عورت اور مرد کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟''

''غالباً ایک گھومنے والے دروازے پر...... جبھی سے دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

کراچی سے تسنیم یونس کا تعاون

ہم جو کرتے ہیں اعلانیہ کرتے ہیں۔ اگر ہم نے کبھی تم کو بھی چھوڑا تو اعلانیہ چھوڑیں گے۔ باقاعدہ پریس کانفرنس کر کے!"

"شہزادے! آپ کیا مجھے چھوڑنے کی پلاننگ کر رہے ہیں؟"

"سوچ پر پابندی مت لگاؤ انارکلی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جو قومیں سوچ نہیں سکتیں، وہ ترقی بھی نہیں کر سکتیں۔ چلو اب کہیں ایسا نہ ہو کہ ابا حضور ٹپک پڑیں۔"

ان کے جاتے ہی بیربل اپنی کمین گاہ سے نکلتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اب دیکھتا ہوں شہزادے! تم کس طرح انارکلی سے شادی کرتے ہو۔"

اسی شام قلی خان اور خانِ خاناں دربار میں باتیں کر رہے تھے۔ قلی خان نے رازدارانہ لہجے میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "خانِ خاناں! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے شہزادے ایک کنیز کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں؟"

"جانتا ہوں میں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"تباہی، ایسے عشق کا انجام یہی ہوتا ہے۔"

"کیا تم عشق کے خلاف ہو؟"

"عشق کے خلاف نہیں ہوں۔ اس رویے کے خلاف ہوں کہ ہمارے حکمران عشق کے چکر میں پڑ کر اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں اور دشمن ہمیں برباد کر دیتا ہے۔" خانِ خاناں نے کہا۔

ان دونوں کی باتیں ادھوری رہ گئیں کیونکہ بادشاہ ٹہلتا ہوا دربار میں آ گیا تھا۔ اس نے مسند نشین ہوتے ہی ان سے پوچھا۔ "تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جہاں پناہ! ہم مغلیہ سلطنت کے مستقبل کی فکر کر رہے تھے۔" قلی خان بولا۔

"بے وقوف، جب تک سوئٹزر لینڈ کا بینک سسٹم موجود ہے، ہمارا مستقبل محفوظ ہے۔" بادشاہ نے بے پروائی سے کہا۔

"بادشاہ سلامت! مستقبل تو بادشاہوں کا محفوظ ہوا نا۔ ہم تو عوام کی فکر کر رہے تھے۔" خانِ خاناں بولا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا ہمارے عوام کو خود اپنی فکر ہے؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"نہیں جنابِ عالی، عوام کو تو کوئی فکر نہیں ہے۔ اسی لیے تو بار بار ایک جیسے بندوں کو ووٹ دے کر دربار میں بھیج دیتے ہیں۔"

"تو پھر رہنے دو۔ جب خود عوام کو اپنی فکر نہیں ہے تو تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟" بادشاہ نے کہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

تان سین خالی دربار میں مسندِ شاہی سے لگا بیٹھا تھا کہ سلیم اور انارکلی اس گوشۂ عافیت میں آ گئے۔ سلیم نے چونک کر کہا۔ "تان سین؟"

"شہزادہ عالم! غلام حاضر ہے۔" تان سین نے فوراً جواب دیا۔

"تم ہر وقت یہاں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟"

"شہزادۂ عالم! نگرانی کے لیے۔"

"کس بات کی نگرانی؟" سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"شہزادے! بادشاہ کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی ان کا تخت ان سے چھین نہ لے۔ انہیں کہیں سے پتا چل گیا ہے کہ آپ ان کی جگہ لینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔" تان سین نے بتایا۔

"تان سین! کس نے یہ خبر لیک کی ہے؟"

"شہزادے! ہمارے چینل والوں کا یہی کام رہ گیا ہے۔ اپنے ٹاک شوز میں اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔"

"ٹاک شوز پر پابندی لگوا دو۔"

"ایسا نہ کریں شہزادے، اگر ایسا ہو گیا تو ہمارے عوام انٹرٹینمنٹ سے محروم ہو جائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ہم اگر اپنے عوام کو اور کچھ نہیں دے سکتے تو کم از کم ٹاک شوز تو دے ہی سکتے ہیں۔"

"تان سین! کیا ہماری خبریں بھی ٹاک شوز میں آ رہی ہیں؟" انارکلی نے پوچھا۔

"انارکلی!" تان سین نے کچھ کہنا چاہا مگر سلیم نے اسے ڈانٹ دیا۔ "حدِ ادب! تان سین، یہ ہندوستان کی ہونے والی ملکہ ہیں۔ تم ان کو انارکلی نہیں کہہ سکتے۔"

"گستاخی معاف شہزادے! جب یہ بات ڈیکلیئر ہو جائے تو پھر اس وقت آپ جو چاہیں، وہ کہوں گا۔ ابھی تو ان کا کیس پینڈنگ میں ہے۔"

"اچھا، اچھا، اب تخلیہ۔ ہمیں انارکلی کی سولو پرفارمنس دیکھنی ہے۔ انارکلی! آج اس طرح رقص کرو کہ اس محل کے در و دیوار بھی تالیاں بجانے لگیں۔"

"میں حاضر ہوں شہزادے۔"

"تم کیوں کھڑے ہو، کھسکو یہاں سے۔" سلیم نے تان سین سے کہا۔

’’شہزادے! میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر دیکھوں گا۔‘‘ اس نے التجا کی۔

’’میرے لیے کیا حکم ہے شہزادے؟ میں اسٹارٹ لوں یا رک جاؤں۔‘‘ انارکلی نے پوچھا۔

’’انارکلی! تم اپنا کام جاری رکھو۔ ہم نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی۔ ہم اگر پروا کرتے تو آدھی دنیا اس وقت ہمارے پاس ہوتی۔‘‘

’’جو حکم شہزادے!‘‘

ابھی انارکلی اسٹارٹ بھی نہیں لینے پائی تھی کہ باہر سے آواز لگی۔ ’’ہوشیار خبردار، مہارانی جودھا بائی تشریف لا رہی ہیں۔‘‘

’’یہ لو والدہ محترمہ کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ چلو نکلو یہاں سے۔‘‘ سلیم نے بیزاری سے کہا اور انارکلی کا ہاتھ پکڑ کر دربار سے نکل گیا۔

شام کو بادشاہ خالی دربار میں اپنی مسند پر بیٹھا ایک اشتہار کے بول گنگنا رہا تھا کہ بیربل اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا ہوا اس کے پاس آپہنچا اور جھک کر بولا۔ ’’مہابلی! اس غلام کو آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔‘‘

’’ہاں کہو، اجازت ہے۔‘‘ بادشاہ نے اپنی مصروفیت ترک کر کے سر ہلایا۔

’’لیکن اس کے لیے تخلیے کی ضرورت ہوگی مہابلی!‘‘

بادشاہ نے تالی بجائی اور کونوں کھدروں میں بادشاہ کے اشاروں کے انتظار میں دبکے ہوئے سارے خدام تیزی سے رفوچکر ہوگئے۔

’’اب کہو۔‘‘ بادشاہ نے بیربل سے کہا۔

’’مہابلی! شہزادے ایک کنیز انارکلی کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ سے بغاوت کے منصوبے بنا رہے ہیں۔‘‘ بیربل نے دھماکا کیا۔

’’تم سچ کہہ رہے ہو بیربل؟‘‘ بادشاہ نے بے یقینی سے پوچھا۔

’’جی ہاں مہابلی! میں صرف اسی وقت جھوٹ بولتا ہوں جب مجھے ٹی وی پر انٹرویو دینا ہوتا ہے۔‘‘

’’بیربل! کل دربار میں پہلا کیس انارکلی اور شہزادے کا ہوگا۔ ان دونوں کو پیش کیا جائے۔‘‘ بادشاہ نے فیصلہ سنا دیا۔

’’حکم کی تعمیل ہوگی مہابلی!‘‘ بیربل نے فرش تک جھک کر کہا۔

اگلے دن دربار سجا تو سارے درباری اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ سلیم اور انارکلی مسندِ شاہی کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اپنے لختِ جگر سے مخاطب ہو کر سوال کیا۔ ’’شیخو! ہم نے سنا ہے کہ تم اس کنیز انارکلی سے محبت کرتے ہو؟‘‘

’’جی ہاں، بادشاہ سلامت! ہم نے اگلے سال شادی کا پروگرام بھی بنا لیا ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم سوئٹزرلینڈ چلے جائیں گے۔‘‘ سلیم نے متانت سے اقرار کیا۔

’’اس کے اخراجات کون برداشت کرے گا؟‘‘ بادشاہ نے پوچھا۔

’’ابا حضور! سب کچھ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ہوگا۔ بعد میں آپ بھگتتے رہیں۔‘‘

’’انارکلی! تم میں اتنی ہمت کہاں سے ہوئی کہ تم شہزادے سے محبت کرو۔‘‘ اب بادشاہ انارکلی کی طرف متوجہ ہوا۔

’’بادشاہ سلامت! اس ناچیز کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا۔‘‘ انارکلی بولی۔

’’فرض کرو اگر ہم شہزادے کو تخت و تاج سے محروم کر دیں تو؟‘‘

’’تو پھر یہ کنیز کسی اور کو تلاش کرلے گی۔‘‘

’’سن لیا تم نے بے وقوف شہزادے، یہ ہے تمہاری محبت۔‘‘ اب بادشاہ نے سلیم کو جتایا۔

’’انارکلی! کہہ دو کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ بادشاہ کے خوف سے کہا ہے۔‘‘ سلیم جذباتی ہوگیا۔

’’ہاں سلیم! یہ بادشاہ کا خوف ہے۔ ورنہ میں تو آپ سے محبت کرتی ہوں۔‘‘ انارکلی نے قلابازی کھائی۔

’’گستاخ کنیز، ابھی تو کیا کہہ رہی تھی؟‘‘ بادشاہ غرایا۔

’’بادشاہ سلامت! میرا ضمیر اچانک جاگ گیا ہے۔ جس طرح اور بہت سے لوگوں کا جاگا ہے۔‘‘

’’کیا اپنے ضمیر کو اور کچھ دیر سلائے نہیں رکھ سکتی تھی؟‘‘

’’نہیں شہنشاہ! اس کی نیند پوری ہوچکی ہے۔‘‘

’’کیا تم جانتی ہو کہ تم شہنشاہِ ہند کے سامنے زبان چلا رہی ہو؟‘‘ بادشاہ کا پارا چڑھنے لگا۔

’’جانتی ہوں بادشاہ سلامت! لیکن بادشاہوں کو بھی کسی کے پرائیویٹ معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور جہاں تک محبت کا سوال ہے تو وہ میں کرتی رہوں گی۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔‘‘

’’پورا گیت سناؤ کنیز۔‘‘ کنیز کے آخری فقرے نے

بادشاہ کے دل پر گہرا اثر کیا۔

''نہیں جہاں پناہ! انڈین گیتوں پر آج کل پابندی لگی ہوئی ہے۔ جتنا سنا دیا، وہی کافی ہے۔''

''کنیز.... تو تمہیں اقرار ہے کہ تم نے شہزادے سے محبت کی ہے؟''

''جی ہاں ظلِ الٰہی۔''

''خانِ خاناں!'' بادشاہ نے آواز لگائی۔

''غلام حاضر ہے بادشاہ سلامت!''

''جاؤ اس انار کلی کو دیوار میں چنوا دو۔''

''ایسا ظلم نہ کریں ابا حضور، اگر آپ نے ایسا کیا تو تاریخ کیا کہے گی؟'' سلیم اپنے باپ کے سامنے گڑگڑایا۔

''کہنے دو تاریخ کو۔ اور ویسے بھی آج کل تاریخ پڑھتا کون ہے۔ یہ زمانہ فزکس، کیمسٹری کا ہے۔ تاریخ سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ خانِ خاناں! لے جاؤ انار کلی کو۔''

''سلیم اپنا خیال رکھنا اور اپنی دوائیں وقت پر لیتے رہنا۔ کولیسٹرول پر کنٹرول کے لیے واک کرتے رہنا۔'' انار کلی نے شہزادے سے مخاطب ہو کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''تو یہ سب بول کر ہماری ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکتی انار کلی! ہاں، تیری کوئی آخری خواہش ہے تو بتا دے۔'' بادشاہ نے کہا۔

''جہاں پناہ! میں اپنے سلیم کے سامنے آخری پرفارمنس دینا چاہتی ہوں۔'' انار کلی بولی۔

''بخدا ہم اتنے ظالم بھی نہیں ہیں انار کلی کہ اس قسم کی اجازت نہ دیں۔ اجازت ہے۔''

تان سین نے ڈیک آن کر دیا۔ گانا چلا۔ ''ہم پہ الزام تو ایسے بھی ہے، ویسے بھی سہی۔'' رقص تھما تو انار کلی کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

''ہم تجھ سے بہت خوش ہوئے انار کلی! بخدا ہم اپنے اصولوں سے مجبور ہیں۔ خانِ خاناں! جاؤ، اس کو دیوار میں چنوا دو، لے جاؤ۔'' بادشاہ سلامت نے انار کلی کی دل جوئی کرنے کے باوجود اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔

''الوداع سلیم، الوداع!'' انار کلی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''الوداع!'' سلیم کی آواز سپاٹ تھی۔

''سلیم تم اتنے ٹھنڈے ہو کر الوداع کیوں کہہ رہے ہو؟'' انار کلی نے پوچھا۔

''تو کیا کروں۔ والدہ محترمہ نے میرے لیے ایک دوسری لڑکی تلاش کر لی ہے۔ گوالیار کے راجا کی بیٹی ہے۔ بیوٹی کانٹیسٹ میں دوسرے نمبر پر آ چکی ہے۔'' سلیم نے بتایا۔

''بے وفا، سنگ دل، میں قیامت تک تمہیں معاف نہیں کروں گی، نہیں کروں گی معاف۔'' انار کلی فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر تقریباً چیخ پڑی۔

''لے جاؤ اس کو!'' بادشاہ نے اونچی آواز میں حکم دہرایا اور سپاہی اسے دربار سے گھسیٹ کر لے گئے۔

''سلیم! ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم ایک کنیز سے محبت کا جرم کرو گے۔'' انار کلی کو لے جائے جانے کے بعد بادشاہ نے اپنے سپوت سے کہا۔

''ابا حضور! یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پیار کی غلطی کی تھی لیکن اس کی اتنی بڑی سزا انار کلی کو نہیں دینی تھی۔'' سلیم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے دل کی بات کہہ ڈالی۔

''بالکل ٹھیک کیا ہے ہم نے۔ بادشاہوں کے دل پتھر سے زیادہ سخت اور بے رحم ہوتے ہیں۔ بادشاہ اگر نرم دل ہو جائیں تو سب من مانی کرنے لگتے ہیں، دو کوڑی کے عوام بادشاہوں کے منہ آنے لگتے ہیں۔ کنیزیں شہزادوں سے اور غلام شہزادیوں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔''

اسی وقت خانِ خاناں ہانپتا کانپتا دربار میں آیا اور چڑھے ہوئے سانسوں کے درمیان رک رک کر بولا۔

''بادشاہ سلامت بادشاہ سلامت! انار کلی فرار ہو گئی۔''

''فرار ہو گئی؟ کیسے؟ کیا تم نے اسے دیوار میں نہیں چنوایا تھا؟'' بادشاہ مسند سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہ دیوار توڑ کر فرار ہوئی ہے بادشاہ سلامت!'' خان خاناں نے بے بسی سے کہا۔

''دیوار توڑ کر؟ کیسی دیوار تھی جو ایک کمزور لڑکی سے ٹوٹ گئی؟''

''بادشاہ سلامت! آپ نے ساری شاہی دیواروں کا ٹھیکا اپنے ماموں کو دیا ہوا تھا۔ اس دیوار میں بھی دو نمبر میٹریل استعمال ہوا ہے۔ اسی لیے اتنی آسانی سے ٹوٹ گئی۔''

''خدا کی پناہ! ہم نے اس محل کا ٹھیکا بھی تو اسی ماموں کو دیا تھا۔'' بادشاہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور پھر یک لخت باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہر طرف بھاگو، دوڑو، نکلو کی چیخ پکار مچ گئی۔ سب دیوانہ وار محل کے در و دیوار سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بھگدڑ میں بادشاہ بھی نکاسی کی راہ تلاش کر رہا تھا!

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

- عُمیرہ احمد
- نمرہ احمد
- فرحت اشتیاق
- قُدسیہ بانو
- نگہت سیما
- نگہت عبدُاللہ
- رضیہ بٹ
- رفعت سراج
- صائمہ اکرام
- سعدیہ عابد
- عفت سحر طاہر
- تنزیلہ ریاض
- فائزہ افتخار
- سباس گُل
- رُخسانہ نگار عدنان
- اُمِ مریم
- عُشنا کوثر سردار
- نبیلہ عزیز
- فائزہ افتخار
- نبیلہ ابر راجہ
- آمنہ ریاض
- عنیزہ سید
- اقراء صغیر احمد
- نایاب جیلانی
- اشفاق احمد
- نسیم حجازی
- عنایتُ اللّٰہ التمش
- ہاشم ندیم
- مُمتاز مُفتی
- مُستنصر حُسین
- علیمُ الحق
- ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

راکیل لیلی کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اس لیے وہ آنے والوں کو نہ دیکھ سکی لیکن وہ ڈرائیووے سے آنے والی گھسٹتے ہوئے قدموں کی آواز سن سکتی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ گاجر اور آلو کاٹنے پر تھی۔ اس لیے اس نے پلٹ کر اپنے بیٹے اور اس کے دوستوں کا استقبال کرنے کی زحمت نہیں کی جو نائٹ کلاس سے واپس آئے تھے، اسے اپنی شفٹ شروع ہونے سے پہلے رات کا کھانا بنانا تھا۔ اچانک ہی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سن کر وہ

جال

تنویر ریاض

بچے والدین کی زندگی بھر کی محنت اور محبت کا ثمر ہوتے ہیں... ان کی پرورش و تربیت میں ماں باپ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ خوب سے خوب تر ہو... مگر کبھی کبھی یہ بچے ماں باپ کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل جاتے ہیں...

ماں اور بیٹے کی محبت میں لالچ کی دراڑ ڈالنے والے مجرم کا قصہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

چونک اٹھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ مقامی خبروں میں تیز آندھی اور طوفان آنے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ اس کی تصدیق کھڑکی پر لگے ہوئے پردوں کے لہرانے سے بھی ہوگئی۔

"اچھا ہوا کہ تم لوگ طوفان شروع......" وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ اس نے اپنے عقب میں ہنسی مذاق اور چبھتے ہوئے جملوں کے بجائے غرغرارے لیتی ہوئی آواز سنی جیسے کوئی کلی کر رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی نظر اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے پر گئی جو کچن ٹیبل پر جھکا ہوا تھا جہاں وہ دونوں عموماً کھانا کھاتے تھے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور حلق سے خوفناک آواز نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید اور دہشت زدہ لگ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے میز کو چھوڑ دیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے ڈگمگایا۔ راکیل کے ہاتھ سے چھری فرش پر گر گئی۔

"اسٹیفن۔" وہ چلائی۔ "یہ کیا ہوا؟"

اسٹیفن کے ہاتھ گلے کی طرف گئے۔ جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو یا خود اپنا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے ماں کو ایک طرف دھکیلا۔ وہ فرش پر گر گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سنک سے جا ٹکرایا۔ راکیل نے سر اٹھا کر اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف دیکھا اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ بیسن پر جھکا خون کی الٹی کر رہا تھا۔ راکیل نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ دہشت سے اس کے ہاتھ پاؤں کمزور اور ڈھیلے پڑ گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتی، اسٹیفن بھی گر پڑا۔

وہ رینگتے ہوئے اس تک پہنچی اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسٹیفن کا ایک بازو گولی کی طرح اس کے چہرے سے ٹکرایا اور وہ تقریباً اپنے حواس کھو بیٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیفن بھی بے حس و حرکت ہوگیا۔

☆☆☆

"ہمیں وہاں سے کچھ نہیں ملا۔" سراغ رساں سارجنٹ گیون وولف نے پولیس ڈپارٹمنٹ کے چیف کو بتایا۔ "کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر شک جا سکتا ہے۔ مثلاً گیراج میں رکھا ہوا ریڈی ایٹر، مائع کا آدھا کنٹینر اور باتھ روم میں پائی جانے والی ڈرین کلینر کی کھلی ہوئی بوتل لیکن میڈیکل ایگزامنر کی تحقیقات کے مطابق ان میں سے کوئی بھی چیز اس واردات میں استعمال نہیں کی گئی۔

"پھر یہ کیا ہو سکتی ہے؟" جولین ہال نے اسکرین ڈور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں گھر کے باہر اندھیرے میں کھڑے ہوئے تھے۔

"خون کی لکیر دراصل باہر پورچ سے شروع ہوتی ہے۔" گیون نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا بہت سا حصہ تیز ہوا اور بارش کی وجہ سے صاف ہو گیا ہے لیکن یہ لکیر سیدھی کچن کی طرف جا رہی ہے۔ جہاں پہنچ کر اس لڑکے کو خون کی الٹی ہوئی اور وہ وہیں مر گیا۔ یہ بالکل ظاہر نہیں ہو رہا کہ اسے گھر میں کچھ کھانے یا کوئی دوا لینے کا وقت ملا ہوگا۔"

جولین نے اپنے سینئر سراغ رساں کے عقب میں چھوٹے سے کچن کی طرف دیکھا جو کسی دہشت ناک فلم کے سیٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ فرش، سنک اور کیبنٹ پر خون ہی خون تھا جو سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ منظر دیکھ کر اس کی ماں پر کیا گزری ہوگی لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکی۔ پھر اسے وہ غیر مطمئن نظر آنے والا نوجوان سراغ رساں یاد آیا جسے اس نے آخری بار مرنے والے کے ساتھ مردہ خانہ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارا ماتحت کیسا جا رہا ہے؟"

سراغ رساں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "بالکل ویسا ہی جیسی کہ تمہیں توقع تھی۔ اسے مردہ خانے جانے کی ڈیوٹی بالکل پسند نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر واپس پٹرولنگ میں چلا جائے۔"

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی نظریں چیف کے چہرے سے ہٹائیں اور بولا۔ "وہ اس کام کے لیے موزوں نہیں ہے چیف۔ وہ بالکل مختلف ہے۔"

"کیا ہم سب ایسے نہیں ہیں۔" جولین نے جواب دیا۔ "اسے صرف ایک اچھے استاد کی ضرورت ہے۔"

"تم بہتر سمجھتے ہو۔" گیون نے کہا۔

"وہ پٹرولنگ میں بھی خوش نہیں تھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایک اچھا سراغ رساں بن سکتا ہے۔ اسے کچھ وقت دو۔"

"لیکن اس کے ساتھ کوئی خصوصی برتاؤ نہیں ہوگا چیف کیونکہ میں اس کے ساتھ بھی دوسرے لوگوں جیسا سلوک کر رہا ہوں۔"

"تب تو مجھے پہلے ہی اس کی حالت پر افسوس کر لینا چاہیے۔" جولین نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ

کب ملے گی۔ میڈیکل آفیسر عام طور پر دفتر کا وقت ختم ہونے تک انتظار کرتا ہے۔''

''ابھی یہ معلوم کیا جا رہا ہے کہ اسے ایسی کیا چیز دی گئی جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔''

''اوہ میرے خدا۔'' جولین بڑبڑاتے ہوئے بولا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ گھر کس طرح پہنچا۔ کیا وہ گاڑی خود چلا کر لایا یا کسی نے اسے گھر پر اتارا؟''

''اس کی ماں کا خیال ہے کہ اسٹیفن کے ساتھ کوئی اور بھی آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے دیکھتی وہ جا چکا تھا۔'' گیون نے ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی کار کو دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ایک ہی کار ہے جو گھر پر کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گیا تھا لیکن اس نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ کون تھے اور اسی طرح کوئی اسے واپس بھی چھوڑ گیا۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''اس لڑکے کی دوستی گھٹیا درجے کے لڑکوں سے تھی۔ وہ اس گروہ کا رکن تھا جو ہمیں ڈکیتی کی وارداتوں میں مطلوب ہے اور وہ کبھی کبھی ان کا ساتھ دیتا تھا۔ یاد رہے کہ اس نے پہلی بار اس واردات میں حصہ نہیں لیا تھا۔''

جولین کو یاد آ گیا کہ اسٹیفن چوری اور نقب زنی کی کئی وارداتوں میں ملوث تھا۔ اس کے علاوہ منشیات کا بھی دھندا کرتا تھا۔ اس کے طویل عرصے سے غائب باپ کے گزشتہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔

''گویا تم ان میں سے چند کے نام جانتے ہو گیون؟''

''میں ان سب کھلاڑیوں کو جانتا ہوں چیف۔'' اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔ ''ٹریسی مینڈل، بلیز او برے اور شاید میک الفی بھی۔ یہ مقامی بدمعاشوں کا چھوٹا سا گروہ ہے۔ جنھوں نے ان دنوں شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اسٹیفن کو ویسکس کیمونٹی کالج میں رات کی کلاس لینا تھی۔ میں کل کالج جا کر چیک کروں گا۔ اگر وہ کالج سے غیر حاضر تھا تو ضرور کسی کے ساتھ کہیں گیا ہوگا۔''

جولین نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ''تمہیں جو کچھ بھی معلوم ہو، وہ مجھے ضرور بتانا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

''اوہ، میرے خدا! میں بہت تھک گیا ہوں۔'' سراغ رساں ٹیلر ایرکسن نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟'' اس کے باس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''مجھے صرف چند گھنٹے سونا نصیب ہوا۔'' ٹیلر نے جواب دیا۔ ''میں اپنے دماغ سے پوسٹ مارٹم اور اس بو کو ابھی تک نہیں نکال سکا جبکہ میں دو مرتبہ غسل کر چکا ہوں لیکن وہ بُو میرے دماغ میں بس گئی ہے۔''

''میڈیکل ایگزامنر کیا کہتا ہے۔ اسٹیفن کی موت کیسے واقع ہوئی؟ اس کے جسم میں ایسی کیا چیز گئی جو اس کے لیے زہر قاتل تھی؟''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کی موت ایک ایسے زہر سے ہوئی جو خون کی نالیوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن وہ بھی اصل وجہ نہیں جانتا جب تک اسٹیفن کے معدے میں موجود مواد کا تجزیہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کوئی الکحلی تھی۔ اب تک وہ یہی اندازہ کر پایا ہے۔''

گیون اپنی کرسی سے اٹھا اور ٹیلر کی کہنی پکڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ تمہاری نئی ذمے داری کا پہلا دن ہے۔ وہ اسے دروازے سے باہر لے گیا اور کہنے لگا۔ ''تم کیا کہتے ہو۔ کیوں نا ہم چند معصوم شہریوں کو پریشان کریں اور دیکھیں کہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے، وہ اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں۔

☆☆☆

وہ دونوں ٹریسی مینڈل کے بنگلے پر پہنچے جو اسے والدین سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کے ماں باپ دو سال پہلے ایک کار حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ دروازے پر ایک زرد رو دبلی پتلی عورت آئی۔ گیون نے اسے اپنا بیج اور شناختی کارڈ دکھانے کے بعد کہا۔ ''ٹریسی مینڈل! ہم تمہارے دوست اسٹیفن لیلی کے بارے میں کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں اندر آنے دو گی؟''

''میں نہیں جانتی...... مجھے کچھ کام کرنے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' گیون نے کہا۔ ''ہم یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ تمہارا دوست اسٹیفن اس دنیا میں نہیں رہا۔''

ٹریسی کے چہرے کا رنگ سفید ہو گیا اور وہ کپکپاتا ہوا ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دروازہ کھولو۔ پھر ہم اس پر گفتگو کریں گے۔'' گیون نے اصرار کیا۔

وہ انہیں لیونگ روم میں لے گئی۔ اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔ ''وہ ٹھیک تو ہے؟''

"تمہارا کیا خیال ہے؟" گیون نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔ وہ اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا جبکہ ٹیلر ایک کاؤچ پر بیٹھ چکا تھا۔

"میں نہیں جانتی کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "یہ سب کیا ہے؟ کیا مجھ پر کسی بارے میں شبہ کیا جارہا ہے؟"

"مس مینڈل۔" ٹیلر نے نرمی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ گزشتہ شام اسٹیفن تمہارے ساتھ گاڑی میں اسکول گیا تھا۔ لہٰذا تم وہ آخری فرد ہوسکتی ہو جس نے اسے زندہ دیکھا ویسے تو ہم اس کے تمام دوستوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا...... آخری فرد......" اس نے بولنا شروع کیا پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔

"اوہ میرے خدا اسٹیفن۔" اس کا چہرہ سفید ہوگیا۔

"کیا اسٹیفن بیمار تھا جب تم اسے گھر لے کر آئیں؟" ٹیلر نے اپنی بات جاری رکھی۔

وہ جواب دینے سے پہلے تھوڑا سا ہچکچائی پھر مضبوط لہجے میں بولی۔ "کس نے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھا؟"

"کیا کل تمہاری اور اسٹیفن کی نائٹ کلاس نہیں تھی؟ اس کی ماں کا یہی خیال ہے۔"

"میں...... میں کل بیمار تھی۔" ٹریسی نے کہا۔ "مجھے ہیپاٹائٹس سی ہے۔ بعض اوقات آرام کی غرض سے گھر پر رکنا پڑتا ہے۔"

"کیا تم دونوں نے گزشتہ شب کوئی نشہ کیا تھا؟"

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی؟" وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔

"میں تمہارا ڈوپ ٹیسٹ بھی کروا سکتا ہوں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ خود ہی بتادو۔"

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو فوراً میرے گھر سے چلے جانا چاہیے۔"

ٹیلر اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور ٹریسی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "اگر تم سچ بتادو تو میں کوئی سختی نہیں کروں گا لیکن اگر ہمیں معلوم ہوا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو یا اپنے دوست کی موت کے بارے میں کچھ چھپا رہی ہو تو تم پر تحقیقات میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام لگ سکتا ہے۔ اس لیے اس پر اچھی طرح سوچ لو۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹریسی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چلاتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے دھمکی نہیں دے سکتے۔"

گیون نے دروازہ کھول کر ٹیلر کو باہر جانے کا راستہ دیا اور مڑتے ہوئے بولا۔ "اور تم بھی ایک قتل کی تحقیقات میں معلومات نہیں چھپا سکتیں تاوقتیکہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو۔"

"قتل؟" ٹریسی نے گھبراہٹ میں دہرایا۔ اس کی آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔

"ہاں۔" گیون نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "ممکنہ طور پر یہ قتل ہی تھا۔ میں تمہارے باقی ساتھیوں سے بھی ملوں گا۔ ان سے ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہوجائے گا۔"

جب وہ دونوں اپنی گاڑی کی طرف واپس آرہے تھے تو گیون نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "کیا تم نے برآمدے میں رکھے ہوئے فلیٹ اسکرین پر غور کیا؟"

ٹیلر نے نفی میں سر ہلا دیا تو وہ بولا۔ "اوہ میرے خدا، اس کا سائز کسی کار کے برابر تھا۔ اسے نہ تو نصب کیا گیا اور نہ ہی اس کے اردگرد پیکنگ میٹریل پڑا ہوا تھا اور یہی بات مجھے شک میں ڈال رہی ہے۔"

"اس نے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ اسٹیفن کے ساتھ کیا ہوا...... وہ کیسے مرگیا۔" ٹیلر نے آہستہ سے کہا۔

گیون نے اپنی بھویں اوپر چڑھائیں اور بولا۔ "اس بارے میں شور وغل کرنے کی ضرورت نہیں۔"

☆☆☆

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لڑکا اسٹیفن لیلی اور اس کے گروہ کے ساتھ مل کر کیا کر رہا تھا۔"

گیون نے شیورلیٹ کی پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔ "وہ ڈیسیکس ہائی اسکول کا اسٹار ایتھلیٹ ہے اور اسے مختلف اداروں سے وظائف ملتے رہتے ہیں۔ اگر وہ صحیح سمت میں چلتا رہے تو بہ آسانی کاؤنٹی کالج میں جاسکتا ہے۔"

"کچھ لوگ محض دوستی نبھاتے ہیں۔" ٹیلر نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے کہ اس کے بہت سارے دوست ہیں اور وہ سب اکٹھے رہتے ہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ بلیز اور اسٹیفن بہت گہرے دوست تھے۔"

"اس تیز مشاہدے کے لیے شکریہ۔" گیون نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس مجھے انسانی فطرت کے بارے میں سکھانے کے لیے بہت کچھ ہے۔"

ٹیلر منہ بنا کر رہ گیا۔ پھر سارے راستے اس نے کوئی بات نہیں کی۔

”اس نے پہلے ہی فون کر دیا ہوگا۔“ گیون نے بلیز کے گھر کے قریب پہنچ کر اپنے پارٹنر کو خبردار کیا۔ اس نے دوسری منزل کی کھڑکی کا پردہ ہلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دستک دیتے، مسز اوبرے دروازہ کھول چکی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ رو رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آرہا۔“ اس نے ان دونوں کے بیچ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسٹیفن مر چکا ہے۔ میں تمہیں نہیں بتا سکتی کہ ہم نے اسے کتنی مرتبہ رات کا کھانا کھلایا جب اس کے والدین مشکل دور سے گزر رہے تھے۔ وہ بلیز کے لیے بھائیوں جیسا تھا۔ ان دونوں میں بہت قربت تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اتنی ہی راتیں یہاں بھی گزاریں جتنی اپنے بستر میں۔“

”تمہارے بیٹے نے اس خبر کا کیا اثر لیا مسز اوبرے؟“ ٹیلر نے نرمی سے پوچھا۔

”ہمیں ابھی ابھی یہ خبر ملی ہے۔ اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔“

”ہاں میڈم، میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس پر بہت زیادہ اثر ہوا ہوگا کیونکہ اس نے گزشتہ رات اسٹیفن کو گھر چھوڑا تھا۔“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم نہیں جانتے کہ اس کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“

گیون نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمیں اس تک پہنچا دو۔“

”اوہ نہیں۔“ مسز اوبرے چلاتے ہوئے بولی۔ ”وہ بہت پریشان ہے۔ اسے اس وقت تنگ مت کرو۔“

”میڈم! ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو۔“

”انہیں اوپر آنے دو مما۔“ سیڑھیوں پر سے ایک بیٹھی ہوئی آواز آئی۔

مسز اوبرے ایک طرف ہوتے ہوئے غیر یقینی انداز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے اگر تمہیں یقین ہے ہنی کہ اس کے لیے تیار ہو۔“

دونوں سراغ رساں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ جہاں چیزیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کرسی پر سے فٹ بال اور دوسری پر سے رسالوں کا ڈھیر اٹھا کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا جبکہ وہ خود اپنے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے پہلی نظر میں دیکھ لیا کہ وہ روتا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک سرخ ہو رہی تھیں۔

ٹیلر نے پہلا سوال کیا۔ ”کل جب تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تو کیا وہ تمہیں بیمار لگ رہا تھا؟“

”میں نے کل اسے نہیں دیکھا۔“ اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ٹیلر کو اس صاف جھوٹ پر بہت حیرت ہوئی۔ وہ بولا۔ ”لیکن تمہاری مما نے ابھی ابھی تصدیق کی ہے کہ کل شام تم اسے اس کے گھر چھوڑنے گئے تھے۔“

اچانک ہی کمرے میں ایک آواز گونجنے لگی اور بلیز نے گھبرا کر نائٹ اسٹینڈ پر رکھے اپنے سیل فون کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اٹھانا نہیں چاہ رہا تھا۔

”نہیں، ماں کو معلوم نہیں ہوگا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسے چھوڑنے گیا تھا جبکہ میں گزشتہ روز کلاس میں ہی نہیں گیا۔“

ٹیلر نے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکتی دیکھیں۔ اس کا باس اپنی جگہ سے اٹھا اور فون کی طرف چند قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟“

”کوئی بات نہیں۔ بعد میں بات کرلوں گا۔“ بلیز نے کہا۔

”دیکھو تو سہی کون ہے۔“ سراغ رساں چلاتے ہوئے بولا۔ ”ٹریسی شاید تمہیں کوئی اہم بات بتانا بھول گئی تھی۔ اسی لیے اس نے دوبارہ فون کیا ہے۔ آگے بڑھو اور اس کی بات سن لو۔“ وہ فون اس کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم انتظار کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اگر تم کلاس میں نہیں گئے تو اس کے بجائے کیا کرتے رہے؟“ ٹیلر نے پوچھا۔

”میں دوڑنے چلا گیا تھا۔“

”کہاں؟“

”کاؤنٹی پارک میں۔ وہ جگہ چڑیا گھر کے قریب ہی ہے۔“

”اندھیرے میں؟“ سراغ رساں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہاں کچھ اسٹریٹ لائٹس لگی ہوئی ہیں۔“

”تم بارش میں دوڑتے رہے؟“ گیون نے پوچھا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟“

بلیز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، میں

اکیلا ہی تھا۔“

”اکیلا۔“ گیون نے دہراتے ہوئے کہا۔ ”بہت افسوس کی بات ہے۔ یہ سن کر میرا رونے کو دل چاہ رہا ہے۔“

بلیز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اکیلے رہنا پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی جرم نہیں۔“

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہیں چند اداروں کی جانب سے وظیفہ ملتا ہے۔“ گیون نے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔ ”اور ان کی مدد سے تم آگے بڑھنے کی توقع کر سکتے ہو؟“

”ہاں۔“ بلیز نے پُرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے کچھ نے مجھ سے بات کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ویکسس سے ہی گریجویشن کروں۔ اب تک سب ٹھیک جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اگلے موسمِ گرما تک کوئی خوش خبری سننے کو ملے گی۔“

”کیا کسی بڑے وظیفے کی بات ہو رہی ہے؟“ گیون نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔“ بلیز نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ ڈیڈی کا بزنس ختم ہونے سے ہمیں مالی مشکلات کا سامنا ہے۔“

”ایرکسن۔“ گیون نے اچانک اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ بات اسکول سے ہی معلوم ہو سکے گی کہ گزشتہ روز کن لوگوں نے نائٹ کلاس اٹینڈ کی تھی۔“ پھر اس نے بلیز کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ اس موسمِ خزاں میں ٹی وی پر تمہارے میچ ضرور دیکھوں گا۔ میں تمہارا بہت بڑا پرستار ہوں۔“

پھر وہ تھوڑا سا جھکا اور رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”شاید تم اپنی ٹریسی کو فون کر کے بتانا چاہو کہ تم سے پوچھ گچھ مکمل ہو گئی اور تم محفوظ ہو۔ وہ پریشان ہو رہی ہو گی۔“

☆☆☆

”وہ بہت پریشان لگ رہا تھا باس۔“ واپس آتے ہوئے ٹیلر نے راستے میں کہا۔ ”اگر ہم اس سے مزید پوچھ گچھ کرتے تو وہ سچ اگل دیتا۔“

”نہیں، اس کے لیے بھی اسے اوپر کے احکامات کی ضرورت ہوتی۔“

”تمہارا اشارہ ٹریسی کی جانب ہے؟“

”شاید......“ گیون نے کہا۔

”اوہ میرے خدا! یہ تو بڑی قابلِ نفرت بات ہے۔“

”لیکن شاید نہیں۔“ گیون بولا۔ ”یاد رکھو کہ یہ بچے ہماری نظروں میں ان ڈکیتیوں کی وجہ سے آئے جن کا ابھی تک سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

ٹیلر نے مستعدی سے سر ہلایا۔

”ہمیں کرس میک ایلفی کو نہیں بھولنا چاہیے جو بہت بڑا بدمعاش ہے اور اصلاح خانہ میں بھی رہ چکا ہے۔ اگر یہ بچے ان وارداتوں میں ملوث ہیں تو مجھے شبہ ہے کہ چوری کا مال اسی کے پاس جا رہا ہے۔ تم نے ہی اس موسمِ سرما میں یہ رپورٹ دی تھی کہ اس کی کار ٹریسی کے گھر کے باہر کھڑی دیکھی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی نے ان لوگوں کی زبان بند کر دی ہو۔ ممکن ہے کہ اسی نے ہمارے مقتول کو بھی روکا ہو۔“

ٹیلر اس کے بارے میں جانتا تھا لیکن اس سے کبھی براہِ راست واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس علاقے میں وہ ایک بدمعاش اور رہزن کے طور پر مشہور تھا۔ گو کہ اس کا قد صرف پانچ فٹ چھ انچ تھا لیکن اس نے ورزش کے ذریعے اپنا جسم مضبوط بنا رکھا تھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ ٹیلر نے اسے سڑک پر کھڑے ہوئے دیکھا تھا جیسے وہ اسے ایک انگلی سے سیلیوٹ کر کے چیلنج کر رہا ہو۔

ویکسس کیمونٹی کالج میں کچھ دیر رکنے کے بعد وہ میک ایلفی کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ گیون نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے کوئی بھی گزشتہ روز کلاس میں نہیں گیا۔“

”اب ہمارے پاس کیا باقی رہ گیا ہے۔“ ٹیلر نے کہا۔ ”اس حقیقت کے علاوہ کہ وہ کہیں نہیں گئے اور انہوں نے کچھ نہیں کیا جو ہم شروع سے جانتے ہیں۔“

سارجنٹ گیون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس نے ایک مناسب جگہ پر گاڑی روکی اور اترتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں رکوں گا اور تم اس سے بات کرو گے۔ ہمارے درمیان پہلے ایک تنازعہ ہو چکا ہے اور میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔ اس لیے آج تم اس کے سامنے جاؤ گے۔“

یہ کہہ کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ایک مکان کی جانب بڑھ گیا۔ ٹیلر اس کے پیچھے پیچھے گیا تو وہ ایک لکڑی کے بنے ہوئے گیرج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ یہاں رہتا ہے۔“ اس نے ایک اپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آگے بڑھو۔“

ٹیلر مشتبہ انداز میں اپنے باس کی طرف دیکھتے ہوئے

اس مکان کی جانب بڑھا تو پیچھے سے آواز آئی۔ “ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔”

ٹیلر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتا، اس نے اپنے آپ کو ان سیڑھیوں پر پایا جو گھر کے دروازے تک جا رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر باس کی طرف دیکھا اور سیڑھیاں چڑھ کر دو مرتبہ دروازے پر دستک دی جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے کچھ دیر بعد یہی عمل دہرایا۔

“کیا بات ہے؟” میک الفی نے چلاتے ہوئے کہا۔ وہ اچانک ہی قمیص پہنے بغیر دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔

ٹیلر نے اسے اپنا بیج اور شناختی کارڈ دکھایا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ “کیا چاہتے ہو؟”

“ہم تم سے بات کرنا چاہتے ہیں مسٹر میک الفی۔ کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟”

“ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اکیلے ہو۔”

ٹیلر کو اچانک ہی احساس ہوا کہ گیون اس کے پیچھے نہیں آیا اور نہ ہی کہیں دکھائی دے رہا ہے۔ میک الفی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ “اگر تم میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے ہو تو وارنٹ لے کر آؤ۔”

ٹیلر اپنا پاؤں دروازے کی چوکھٹ پر رکھتے ہوئے بولا۔ “دروازہ بند مت کرنا۔ تم پے رول پر ہو اور میں ایک پولیس آفیسر۔” یہ کہہ کر اس نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور وہ دوبارہ کھل گیا۔

میک الفی اپنے ہی زور میں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی جانب کافی کی میز پر جا گرا۔ جہاں پہلے سے ہی بیئر کی خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ لڑھک کر فرش پر گر گئیں۔

ٹیلر غصے سے بولا۔ “ایک بات اور۔ اب اگر کوئی پیٹرول کار تمہارے پاس سے گزرے تو اسے عزت دینا۔ اگر آئندہ تم نے اس پر انگلی اٹھائی تو تمہاری خیر نہیں۔”

“تم مجھے پریشان نہیں کر سکتے۔” میک چلاتے ہوئے بولا۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ “میں تمہارا سر توڑ دوں گا......”

“سراغ رساں۔” ایک جانی پہچانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ “یہاں کیا ہو رہا ہے؟”

ٹیلر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ میک کو اس گستاخی کا مزہ چکھانا چاہ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نووارد کی موجودگی کو محسوس کر کے میک کی آنکھوں میں بھی حیرت اُتر آئی تھی۔

“تم کچھ نہیں کرو گے۔” گیون نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا اور میک کو اٹھنے میں مدد دینے لگا۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ “اسے ہمارے ساتھ کام کرتے ہوئے چند ہی مہینے ہوئے ہیں مسٹر میک الفی، یہ صرف اپنا تاثر قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ نوجوان خون ہے۔”

“اس نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر تم نہ روکتے تو میں اسے مزہ چکھا دیتا۔” میک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

“اگر اجازت ہو تو میں بھی بیٹھ جاؤں۔” اس کا ہاتھ ابھی تک میک کے.... کندھے پر تھا۔

میک نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں ابھی تک ٹیلر پر جمی ہوئی تھیں۔ “ٹھیک ہے میں اس بات کو یہیں ختم کرتا ہوں۔” وہ اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ “لیکن میں اس سے بات نہیں کروں گا۔”

“نہیں بالکل نہیں۔” وہ یقین دلاتے ہوئے بولا پھر اس نے ٹیلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ “بہتر ہو گا کہ تم دروازے کے باہر انتظار کرو۔ جب تک تمہارا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔”

ٹیلر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تبھی اس نے اپنے باس کو کہتے ہوئے سنا۔ “اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے کرس...... کیا میں تمہیں کرس کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟”

“کوئی بات نہیں۔ میں اسے بھول چکا ہوں اور تمہاری عزت کرتا ہوں۔”

“شکریہ کرس...... تم مجھے گیون کہہ کر مخاطب کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ پل کے نیچے سے کافی پانی گزر چکا ہے۔ اب ہم اسے بھلا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔” پھر وہ اچانک ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ “مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم نے اسٹیفن کی موت کے بارے میں سنا ہو گا۔”

میک نے محتاط انداز میں سر ہلا دیا۔

“اور تم اس کے کچھ دوستوں کو بھی جانتے ہو گے؟”

اس بار اس نے نفی میں سر ہلایا اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ “میں ایسا نہیں سمجھتا، وہ سب نوجوان لڑکے ہیں۔”

“گویا تم انہیں جانتے ہو؟” سراغ رساں طنزیہ

انداز میں بولا۔ ''ٹریسی مینڈل، بلیزاوبرے وغیرہ وغیرہ۔''

''میرا مطلب ہے کہ میں نے انہیں دیکھا ضرور ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

''بالکل۔'' گیون متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہیں ان کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ تم اس لڑکی کے پاس جاتے رہتے ہو؟''

''ایک منٹ۔'' اس نے احتجاج کے طور پر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

''کیا وہ تمہارے لیے کام کر رہے ہیں یا صرف چوری کا مال تمہیں لاکر دیتے ہیں۔ ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس لڑکے کے ساتھ کیا ہوا۔ تمہارے پاس اپنے آپ کو بچانے کا یہی ایک موقع ہے ورنہ تم ہماری نظر میں سب سے زیادہ مشتبہ ہو۔ ممکن ہے کہ تمہارا مقصد اس کو نقصان پہنچانا نہ ہو لیکن اس صورت میں بھی بہتر ہے کہ تم وضاحت پیش کردو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔''

کرس نے اپنی آنکھوں کو دائیں بائیں حرکت دی پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور وہ گیون کی طرف ایک انگلی کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اس جگہ کی تلاشی لے سکتے ہو۔ یہاں کوئی غیر قانونی چیز نہیں ہے۔ نہ تو چوری کا مال اور نہ ہی منشیات۔ اگر واقعی تمہیں کچھ مل گیا تو مجھے ہتھکڑی لگا سکتے ہو لیکن تم یہاں صرف مچھلیاں پکڑنے آئے ہو۔ ان بچوں نے تم سے کچھ نہیں کہا کیونکہ ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات نہیں ہے۔ میں دوبارہ جیل جانا نہیں چاہتا کیونکہ اب میری عمر زیادہ ہوگئی ہے۔''

گیون نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اچھی امید رکھنی چاہیے لیکن اس معاملے پر جلدی سوچو۔ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں ورنہ میرے بس میں کچھ نہیں رہے گا۔ تم دوبارہ جیل جانا پسند نہیں کرو گے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ اصلاحی مرکز میں افسران دوسرے قیدیوں کو بتائیں کہ تم نے کس طرح ایک لڑکے کو مار دیا کیونکہ وہ تم سے بے ایمانی کر رہا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔ ٹیلر بھی اس کے پیچھے پیچھے کار تک آیا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ ''مجھے تم سے شکایت ہے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں۔ سپروائزر کو اپنے ماتحتوں سے ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔''

''تم نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے مداخلت کرنا پڑی۔'' گیون نے کہا۔ ''البتہ مجھے کوئی پیشکش نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں صرف ان بچوں کے نام لیتا اور باقی اس کے سوچنے کے لیے چھوڑ دیتا۔''

ٹیلر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ گیون نے ایک غلطی کا اعتراف کرلیا تھا۔ وہ اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''آج کا کام ختم ہوا۔ اب ہمیں گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔ اس معاملے کو کل دیکھیں گے۔''

☆☆☆

''میں بہت تھک گیا ہوں۔'' ٹیلر فریاد کرتے ہوئے بولا۔ ''میری آنکھ ہی لگی تھی کہ ڈسپیچر کا فون آگیا۔'' اس کے سامنے کافی کا تیسرا کپ رکھا ہوا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔

''بہتر ہے کہ تم کافی ختم کرلو۔'' گیون بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ یہ وہی لوگ تھے۔'' اس نے گزشتہ شام ہونے والی ڈکیتیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

نوجوان سراغ رساں نے اپنا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ وہی لوگ تھے۔ انہیں پرانے مکانوں کی وجہ سے یہ علاقہ پسند ہے کیونکہ ان میں سے زیادہ تر میں سیکیورٹی کیمرے نہیں لگے ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈکیتیوں کی گزشتہ لہر کے باوجود ان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ان میں سے دو جگہوں پر پہلے بھی واردات ہو چکی ہے لیکن ان کے مالکان نے اپنے آپ کو یا ڈاکوؤں کے بجائے ہمیں موردِ الزام ٹھہرایا۔''

''مجھے ایک جگہ سے سگریٹ کا ٹکڑا ملا ہے جبکہ مالک کا کہنا ہے کہ ان کے گھر میں کوئی سگریٹ نہیں پیتا۔''

''مارلبرو مینتھول......؟'' ٹیلر نے پوچھا۔

''اگر تم میک کے بارے میں سوچ رہے ہو تو یہ درست نہیں۔ وہ سگریٹ مینتھول نہیں تھا۔ تم نے کچھ دریافت کیا؟''

''ہمیں ایک تکیہ ملا جو ڈاکوؤں نے ایک مکان سے اٹھایا تھا تاکہ دوسرے مکان کی کھڑکی توڑ سکیں۔ میں ایک کتے کی مدد سے اس مکان تک پہنچ گیا جس میں وہ داخل ہوتے تھے لیکن مالک مکان نے کہا کہ اس کے یہاں ڈکیتی نہیں ہوئی اور وہ سیکیورٹی سسٹم کی وجہ سے بچ گیا۔''

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی۔'' گیون نے تبصرہ کیا۔

''پھر کیا ہوا؟''

ٹیلر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''کچھ نہیں باس۔

کتے نے ایک بار فٹ پاتھ پر بو سونگھی۔ آدھے بلاک تک اس کا تعاقب کیا اور پھر رک گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی کار میں سوار ہو گئے۔“

”کتے کے نگراں افسر کا بھی یہی خیال ہے۔“

”یہ دونوں چیزیں لیبارٹری بھیج دو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔“

فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلر نے ریسیور اٹھالیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”ڈسیچ کو ابھی ابھی ٹریسی مینڈل کی آنٹی کا فون ملا ہے۔ اس کی کار گھر پر ہے اور سیل فون بھی وہیں موجود ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں جدوجہد ہوئی ہے۔“

☆☆☆

”میں کل شام سے اسے فون کر رہی ہوں لیکن جواب نہیں ملا۔“ آنٹی نے روتے ہوئے بتایا۔ ”وہ باون سال کی تھی اور اس کا وزن دو سو پونڈ کے قریب تھا۔“ ”ہم ہر ہفتے کی صبح ناشتے پر اکٹھے ہوتے تھے لیکن جب کوئی جواب نہیں ملا تو مجھے پریشانی ہوئی اور میں اسے دیکھنے چلی آئی۔“

”تم نے کسی چیز کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟“ گیون نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔ جب میں نے یہاں کا منظر دیکھا تو سمجھ گئی کہ کوئی واردات ہوئی ہے۔“

سارجنٹ نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“ پھر اس نے سراغ رساں ایرکسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اس جگہ کی اچھی طرح تلاشی لو۔ شاید تمہارے مطلب کی کوئی چیز مل جائے۔ اس کا سیل فون بھی چیک کرو۔“

”ہمیں اس کا فون چیک کرنے کے لیے وارنٹ درکار ہوگا۔“ ٹیلر نے اسے یاد دلایا۔ ”اس بارے میں احکامات موجود ہیں۔“

”دفع کرو ان احکامات کو۔ یہ ایک ہنگامی صورتِ حال ہے اور میں مارشل لا کا اعلان کر رہا ہوں۔“ اس نے دروازہ بند کیا اور اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”کچھ نمونے ڈی این اے کے لیے لے لینا۔ مثلاً اس کا ہیئر برش۔ کافی کپ، میلے کپڑے، وغیرہ وغیرہ۔“

ٹیلر بیڈروم کی طرف جانے لگا تو وہ بولا۔ ”وہاں موجود فلیٹ اسکرین کا نمبر بھی نوٹ کر لینا تاکہ چوری ہونے والے اسکرین کے نمبروں سے اسے چیک کیا جاسکے۔“

☆☆☆

گیون کے پولیس اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی گشتی پولیس نے میک کو حراست میں لے لیا تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے گرفتاری دینے میں کچھ مزاحمت کی تھی اور وہ بہت بُرے حال میں نظر آرہا تھا۔ گیون نے ان دونوں پولیس والوں کو باہر جانے کا حکم دیا جو اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان میں سے ایک نے کمرے سے نکلتے وقت گیون کے خطرناک تیور بھانپتے ہوئے کہا۔

”مت بھولو سارجنٹ کہ یہاں کیمرا لگا ہوا ہے۔“

گیون نے غیر ارادی طور پر اوپر کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”دروازہ بند کردو۔“

میک الفی ابھی تک قمیص کے بغیر تھا۔ اس کی کہنیوں اور داہنے گال پر تازہ خراشیں نظر آرہی تھیں۔ گیون اسے دیکھ کر مطمئن انداز میں مسکرایا جبکہ میک کی نظریں فرش پر تھیں اور اس کی ایک کلائی دیوار میں نصب زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔

”میں مختصر بات کروں گا۔“ گیون غراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے لڑکی چاہیے، ابھی اور اسی وقت۔ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟“

میک اپنا گنجا سر ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔“

”تم اس کے ساتھ سب کچھ کر سکتے ہو۔ میں نے ایک ڈکیتی کی واردات سے تمہارا اور اس لڑکی کا ڈی این اے لیا ہے۔“ گیون نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ ”وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ تمہیں اس کا پتا چل گیا اور تم نے اسے غائب کر دیا۔ یاد کرو میک۔ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا کہ دوبارہ اندر جانا نہیں چاہتے۔“

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میک احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ”تم میرا ڈی این اے نہیں لے سکتے کیونکہ میں کبھی کسی ڈکیتی میں شامل نہیں رہا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”مجھے تمہارے گھر سے دو چیزیں ملی ہیں جن سے بہت کچھ معلوم ہو رہا ہے۔ اب تمہارے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ تم کتنے عرصے کے لیے اندر جاتے ہو۔ ورنہ جو سچ ہے وہ بتادو۔“

میک چند لمحوں تک اپنی پوزیشن پر غور کرتا رہا پھر جھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کچھ جگہیں منتخب کر رکھی ہیں جہاں میں چوری کا مال اپنے جاننے والوں کو بیچتا ہوں۔ وہ بچے چوریاں کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آئے۔ جب اسٹیفن کا قتل ہوا تو بلیز پاگل ہو

گیا۔ وہ دونوں بھائیوں کی طرح تھے اور وہ حقیقت میں ٹوٹ پھوٹ گیا۔ پھر تم لوگ پوچھ گچھ کرنے آئے تو وہ اور بھی خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے اسکالرشپ سے محروم ہوجانے کا ڈر ہے۔ وہ ٹریسی کے لیے بھی فکرمند تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو اسٹیفن کا قاتل سمجھ رہی ہے اور اب اس کی باری ہے۔ وہ پاگلوں جیسی باتیں کررہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی نے ٹریسی کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”تم نے ہی یہ سب کیا ہے ذلیل انسان۔“ گیون نے چیختے ہوئے کہا پھر اس نے ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ”مسز اوبرے، کیا تمہارا بیٹا گھر پر ہے؟“ اس کا جواب سننے کے بعد وہ بولا۔ ”ہم ابھی اس کی تلاش شروع کرتے ہیں۔ تم بالکل پریشان مت ہو میڈم۔“

ریسیور رکھنے کے بعد وہ میک سے بولا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں؟“

اس نے ایک کنٹینر کی طرف اشارہ کیا جس میں اس کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں اور بولا۔ ”مین لینڈ پر ایک ٹریلر کھڑا ہے۔ میرے خیال میں اس کا نمبر ستائیس ہے۔ اس میں چوری کا مال رکھتا ہوں اور اس کی چابی یہاں ہے۔“

گیون نے اس کے سامان میں سے چابی تلاش کی اور میک ایفی کے کچھ کہنے سے پہلے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

”وہ دونوں چیزیں لیبارٹری پہنچا دی گئی ہیں۔“ ٹیلر نے کار میں بیٹھتے ہوئے گیون کو بتایا۔ ”جہاں تک فلیٹ اسکرین کا تعلق ہے تو اس کی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود میں نے مینوفیکچرر سے درخواست کی ہے کہ وہ ہمیں اس کا لاٹ نمبر بتائیں۔ ایک دفعہ ہمیں معلوم ہوگیا کہ یہ کس دکاندار کو بھیجا گیا تھا تو ہمیں اس کے ریکارڈ سے خریدار کا نام بھی معلوم ہوجائے گا۔ ممکن ہے کہ انہیں ابھی تک یہ معلوم ہی نہ ہو کہ یہ فلیٹ اسکرین چوری ہوچکا ہے۔“

گیون نے کوئی ردِعمل ظاہر کیے بغیر کہا۔ ”بائیں جانب موڑ لو۔“ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں قطار در قطار ٹریلر کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ ستائیس نمبر ٹریلر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے کار ٹریلر کے دروازے پر روکی۔ گیون نے دروازہ کھولا اور ٹیلر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اندر چلنے کی جگہ نہیں تھی۔ سب چیزیں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں ٹیلی وژن، موسیقی کے آلات، کچن کا سامان، یہاں تک کہ ایک ریک میں قیمتی جوتے بھی بھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان بلیز اوبرے پوری کوشش سے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

”پولیس، کوئی حرکت مت کرنا۔“ ٹیلر نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”تم زیرِحراست ہو۔“

بلیز نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ”کیا کوئی زلزلہ آیا ہے؟“

اس کے عقب میں چوری شدہ مال کے درمیان کوئی چیز کمبل میں لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس نے بھی بل کھانا اور کراہنا شروع کردیا۔ جیسے ہی گیون اندر داخل ہوا۔ ٹیلر نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔

”باس، وہ زندہ ہے۔“

بلیز کو پولیس کار اور لڑکی کو ایمبولینس کے ذریعے روانہ کرنے کے بعد گیون نے کہا۔ ”اب ہمیں میک پر قتل کا الزام عائد کردینا چاہیے تاکہ یہ خوش گوار دن اپنے اختتام کو پہنچے۔“

”ہمیں نہیں معلوم کہ میک نے ہی اسٹیفن کو قتل کیا ہے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔“ ٹیلر نے کہا۔ ”ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم اسے ثابت نہیں کرسکتے۔“

”ثابت کیا کرنا ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔“ گیون نے کہا۔ ”اس کے دل میں لالچ آگیا تھا اور وہ اسٹیفن کا حصہ بھی ہڑپ کرنا چاہ رہا تھا یا پھر کسی نے اس کے کان میں ڈال دیا تھا کہ اسٹیفن اس سے بے ایمانی کررہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے میک کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہو جس پر میک اس سے ناراض ہوگیا۔ شاید تم نے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔“

”لہٰذا اس نے اسے شراب میں کوئی تیز کاسٹک محلول ملا کر پلا دیا اور بلیز پر اعتبار کرنے لگا کہ وہ اپنے بہترین دوست کے قتل کے بارے میں کوئی کہانی گھڑ لے۔ کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے؟“ ٹیلر نے چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”میں دنیا میں ہونے والے ہر واقعے کا جواز پیش نہیں کرسکتا۔“ گیون نے کہا۔ ”یہ خدا کے کام ہیں۔“

چیف کی گاڑی ان کے پاس آکر رکی اور اس نے کہا۔ ”تم دونوں نے بہت اچھا کام کیا ہے۔“

”شکریہ چیف۔“ وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

چیف کے جانے کے بعد گیون نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ٹیلر کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون کان سے لگایا اور مختصر گفتگو کے بعد رابطہ منقطع کردیا اور بولا۔ ”وہ

فلیٹ اسکرین لارنس فورٹ نامی شخص نے خریدا تھا۔“

”کیا ہم اسے جانتے ہیں؟“ گیون نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ٹیلر نے جواب دیا۔ ”یہ وہی شخص ہے جس کے مکان پر گزشتہ سرما میں چوری ہوئی تھی پھر اس نے کہا کہ وہ کام پر گیا ہوا تھا جب چور اس علاقے سے گزرے حالانکہ سراغ رساں کتے اس کے مکان تک پہنچ گئے تھے۔“

”وہ تو اپنا ٹی وی ملنے پر خوش ہوا ہوگا۔“ گیون نے پوچھا۔

ٹیلر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے اس ٹی وی کی رپورٹ درج نہیں کروائی تھی۔ یہ اس ماڈل سے بالکل مختلف ہے جو اس کے مطابق چوری ہو گیا تھا۔“

”پھر یہ ٹی وی کیسے......؟“ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

”کتیا کا بچہ۔“ ٹیلر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”باس، تم نہیں سمجھتے......؟“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گیون کار کی طرف چل دیا۔ ٹیلر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

☆☆☆

جب سراغ رسانوں کو سرچ وارنٹ ملا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ چیف جولین ہال فورٹ کے مکان کے باہر اندھیرے میں کھڑا ہوا تھا کہ اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور سارجنٹ گیون اپنے ساتھی کے ہمراہ باہر آیا۔ اس کے ساتھ لارنس فورٹ بھی تھا جسے ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔ جولین کو دیکھتے ہی سارجنٹ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”ہم نے اسے پکڑ لیا چیف۔“ پھر اس نے فورٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے؟ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ کیمیکل انجینئر ہے اور اس نے ہم سے جھوٹ بولا کہ دوسری بار اس کے گھر چوری نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے گھر سیکیورٹی سسٹم لگا ہوا تھا البتہ صحن میں ایک نشان ضرور لگا دیا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس کا بچھایا ہوا جال کامیاب ہو گیا ہے۔“

”ان مسخروں نے میری بے عزتی کی ہے۔“ فورٹ نے جولین سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ عام مجرموں جیسا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہارے پورے ڈپارٹمنٹ پر کیس کر دوں گا۔“

”چپ ہو جاؤ۔“ گیون نے اسے باس کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”یہ کارنامہ ٹیلر نے انجام دیا ہے چیف! وہی تمہیں اس کی تفصیل بتائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ فورٹ کو وہاں سے لے جانے لگا۔

ٹیلر نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ”اسی نے اسٹیفن، ٹریسی اور بلیز کے لیے یہ جال بچھایا۔ اس نے پہلی چوری کے بعد بازار سے ایک انتہائی مہنگا فلیٹ اسکرین خریدا اور اسے اپنے گھر میں ایسی جگہ پر رکھ دیا کہ وہ بہ آسانی سڑک سے نظر آ سکے پھر اس نے اپنے گھر میں ایک بار بنایا اور بوتلوں میں وہ محلول بھر دیا جو وہ اپنی فیکٹری سے لایا تھا پھر وہ گھر کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم نے اس کے گھر سے یہ اجزا تلاش کیے۔ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ سب مارے جائیں گے۔ وہ ایک بیمار ذہن کا بے وقوف انسان ہے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اسٹیفن وہاں دیر تک رک کر وہ محلول پیتا رہا جسے وہ اسکاچ سمجھ رہا تھا۔ ہمیں ایک بالکل نئے قالین کے نیچے خون کے دھبے ملے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسٹیفن کے ڈی این اے سے مل جائیں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ ”ٹریسی اور بلیز بالکل نہیں سمجھ سکے کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے اسٹیفن کو گاڑی میں ڈالا اور اس کے گھر کے باہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔“

”شکریہ ٹیلر۔“ جولین نے کہا۔ ”تم نے آج بہت بڑا کام کیا ہے۔“

ٹیلر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی مستقبل کے چیف سے سیکھ رہا ہوں۔“

”میک ایفی کا اس واقعے میں کیا کردار ہے؟“

”کچھ نہیں چیف۔ وہ صرف چوری کا مال خرید کر بازار میں بیچتا تھا۔ جب ہم نے پوچھ گچھ شروع کی تو اسے ڈر ہوا کہ ٹریسی یا بلیز اس کا نام نہ لے دیں۔ اس لیے اس نے ان دونوں کو اغوا کر کے ٹریلر میں قید کر دیا۔ دیگر واقعات بالخصوص اسٹیفن کی موت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابھی یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ یہ بچے اپنے طور پر چوریاں کرتے تھے یا میک ایفی ان کا سرغنہ تھا۔“

جولین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اب اسے راکیل لیلی کو بتانا تھا کہ اس کے بیٹے کا قاتل پکڑا گیا ہے گو کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خبر سے اس کی تشفی نہیں ہوگی۔ جو چلا گیا وہ تو واپس نہیں آ سکتا تھا۔

www.paksociety.com

طاہر جاوید مغل

انگارے

ستائیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کردیا۔ میں نے سرراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کردیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کررہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دست راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کردیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جارہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کررکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس بلیک میلنگ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کردیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرادیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کردیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کردیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کردیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نو بیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پاراہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ناقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پاراہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلیں اور مقابلے میں سرغنہ ناقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کرکے وڈے صاحب کے برادر نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں

ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی تیخنی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے شروع سے آقا جان پر شک تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے اپنے ٹارچر سیل لے گیا۔ میرے ساتھ جاناں بھی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ جاناں کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گئی وہ زخموں سے چور تھی۔ آقا جان اور حلمی نے خوفناک منصوبہ بندی کی تھی۔ بالآخر میرے جو خدشات تھے وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ ہم سب زیرزمین پر آسائش تہ خانے میں منتقل ہوچکے تھے...... آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا اسہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ نہایت ہوشیاری سے ایک منصوبہ تشکیل دیا۔ اور میں اس جلسے میں جا پہنچا جہاں رائے زل اور آقا جان کی ٹیم موجود تھی۔ میں نے رائے زل کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا اور یہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا۔ ہمارا منصوبہ تقریباً کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ رائے زل بالکل ٹھیک ہے۔ اسٹیج پر اس کی جگہ نقلی رائے زل تھا۔ ہم زیرزمین مقید تھے۔ رائے زل زندہ ہے یہ خبر بہت ہی دل سوز تھی۔ ہم خون کے گھونٹ پی کے رہ گئے مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک باہر جاتے ہیں مگر پتا چلتا ہے کہ باہر ایجنسی کے لوگ تھے...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی بری حالت تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کردی تھی۔ برونائی کے حالات روز بروز بدتر ہورہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ ان کا ایک ہی تقاضا تھا کہ اب مار دو یا مر جاؤ۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارے قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”یہ کیسے ہوسکتا ہے شاہ زیب؟“ پال کی آواز میں ارتعاش تھا۔

”یہ ہوا ہے پال، بکتر بند گاڑیوں کی طرف جھپٹنے سے پہلے مجھے اور میرے ساتھی انیق کو معلوم تھا کہ مشین گنوں کے منہ کھل سکتے ہیں، تم صرف طفل تسلی دے رہے ہو۔“

”مگر کیسے معلوم ہوا؟“ پال کی نیلی آنکھوں میں تجسس آمیز حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے پال کے اس ساتھی کی طرف اشارہ کیا جس کا نام اس نے راجر بتایا تھا اور جو شکل و صورت سے کوئی اسکیمو دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چارج کرنے سے چند منٹ پہلے تم نے راجر سے کسی جناتی زبان میں تھوڑی سی بات کی تھی۔ وہ زبان یہاں کسی کو نہیں آتی تھی لیکن میرے پاس یہاں ایک ایسا جن ہے جو ہر طرح کی جناتی زبان کو سمجھ سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ تم دونوں میں کیا بات ہوئی ہے۔“

پال کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے جیپ سے کچھ فاصلے پر کھڑے انیق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انیق نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم راجر کو تسلی دے رہے ہو۔ اس سے کہہ رہے ہو کہ گولی چلی بھی تو زیادہ ہلاکتیں نہیں ہوں گی۔ جواب میں راجر نے کہا تھا کہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ راجر نے تمہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ تم اس کی بلٹ پروف جیکٹ پہن لو۔ تم نے کہا تھا، جب سیکڑوں ہزاروں لوگ بلٹ پروف جیکٹ کے بغیر آگے بڑھیں گے تو ہم بھی بڑھ سکتے ہیں اور ویسے بھی بلٹ پروف زندگی کی ضمانت تو نہیں ہوتی۔“

پال خاموشی سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے کہی تھی ناں یہ باتیں؟“

پال نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ”اور اسی لیے تم نے مجھے جیکٹ منگوا کر دی تھی۔“

”پھر بھی تمہارا کندھا تو زخمی ہو ہی گیا۔“ میں نے کہا۔

”یہ کچھ بھی نہیں ہے میرے دوست! میں تمہاری مدد کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم حق پر ہو اور ان لوگوں کے کندھے سے کندھا ملا رہے ہو جو

ظلم کے پنجے میں ہیں۔"

پندرہ بکتر بند گاڑیوں میں سے دس بارہ ضرور ایسی تھیں جن کے گن مینوں کو ہمت ہی نہیں ہو سکی تھی کہ وہ انسانوں کے سیلاب کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس پر مشین گن کا فائر کھول سکیں۔ ان بکتر بند گاڑیوں میں موجود زیادہ تر امریکیوں کی جان بچ گئی تھی اور قائم مقام جاسم کے حکم پر سرکردہ مظاہرین نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا مگر جن گاڑیوں سے فائر کھولا گیا تھا، ان کے سواروں کو ہجوم کے قہر سے کوئی نہیں بچا سکا تھا۔ آٹھ دس اہلکاروں کی ہلاکت یقینی تھی اور ابھی بہت سے شدید زخمی تھے۔ ایسے ہی ایک امریکی گارڈ کی لاش کو میں نے لوگوں کے پاؤں میں روندے جاتے دیکھا۔ ایک وہ امریکی تھا اور ایک یہ تھا جو میرے ساتھ جیپ میں بیٹھا تھا۔ دونوں کے کردار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

جیپ پر سے ہمیں حدِ نگاہ تک انسانی سر اور لہراتے ہوئے پرچم نظر آتے تھے۔ اس بیکراں ہجوم کو اب زیادہ دیر روکے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے باہمی مشورے کے بعد آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی میری اور عارفہ خاتون کی جیپیں آگے بڑھیں، جاسم والی جیپ بھی حرکت میں آگئی۔ ان جیپوں کو آگے بڑھتے دیکھ کر انسانی سروں کا بیکراں سمندر بھی متحرک ہو گیا۔

زمین جیسے دہل رہی تھی۔ آسمان محوِ حیرت تھا۔ کل کے قتلِ عام میں تین سو سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے تھے۔ یہی قتلِ عام تھا جس نے آج لوگوں کو دیوانہ وار گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ قتلِ عام آقا جان نے بنفسِ نفیس کروایا تھا۔ ظالم اور جابر حکمراں اسی طرح اپنی پھانسی کا پھندا اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ عوامی ردِعمل بس اتنا کرتا ہے کہ یہ پھندا ان کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔

ڈی پیلس کی بلند و بالا دیواروں تک ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آئی۔ دو کلومیٹر کے اس نہایت پُرجوش سفر کے دوران میں ہی ہمیں ایک خوش کن اطلاع بھی ملی۔ یہ اطلاع جاسم نے ہم تک پہنچائی، اس نے بتایا۔ "شہر کے مشرقی ساحل سے گرے فورس کے تین بریگیڈ ایک بڑے کانوائے کی صورت میں ڈی پیلس کی طرف آرہے تھے۔ وہ اس نفری میں شامل ہونا چاہ رہے تھے جو ڈی پیلس کی حفاظت کر رہی ہے مگر عظیم الشان انسانی ریلے کی خبروں نے انہیں ہراساں کر دیا ہے اور وہ وہیں سے واپس نیوسٹی کی طرف چلے گئے ہیں۔"

پال نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ کل والے قتلِ عام نے رائے زل اور آقا جان کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے جہاں عام لوگوں میں بے پناہ اشتعال پیدا ہوا ہے وہاں رائے زل کی فوج میں بھی کئی طرح کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ گرے فورس میں کئی لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح عزت مآب ریان فردوس کی فیملی نے آقا جان پر اندھا بھروسا کر کے بہت نقصان اٹھایا اسی طرح عزت مآب رائے زل بھی اس شخص کو وسیع اختیارات دے کر غلطی کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ کسی کا خیرخواہ نہیں۔ بس اقتدار کا بھوکا ہے۔"

اب ہمیں ڈی پیلس کے بلند کلس اور برجیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ نیوسٹی کا بہت بڑا پرچم غاصبانہ قبضے کی علامت بن کر ایک برجی پر لہرا رہا تھا۔ گرے فورس نے ڈی پیلس کے گرد مورچے بنا رکھے تھے اور خندقیں کھود رکھی تھیں۔ بکتر بند گاڑیوں کی قطاریں، خاردار تاروں کے چھلے، ریت کی بوریاں، غرض دیوانوں کے راستے روکنے کا ہر سامان یہاں موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں گریبانوں کے ڈھیر بھی لگیں گے۔

"اب کیا کرنا ہے جناب؟" جاسم نے براہِ راست مجھ سے پوچھا۔

"تمہاری کیا رائے؟"

"لوگ آپ کے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ ہر رکاوٹ سے ٹکرا جائیں گے۔ لاکھوں کے اس مجمع میں ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے ہیں۔"

"یہاں اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بہت بڑی خونریزی بھی ہو سکتی ہے۔" میرے لہجے میں بجا طور پر تشویش کی لہر تھی۔

پال نے اپنی نیلی آنکھیں سکیڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سہ پہر کی دھوپ میں بہت بلندی پر ہیلی کاپٹرز کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ پال بولا۔ "اب یہ آخری مرحلہ ہے اور یہاں پر امکان ففٹی ففٹی کا لگ رہا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو پال؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"یہاں بھی اگر ہجوم، رش کر کے ڈی پیلس کی طرف بڑھے تو بے پناہ نفسیاتی دباؤ کام کر سکتا ہے، فائر کھولنے والے ذہنی مفلوج ہو سکتے ہیں مگر اتنا ہی امکان اس بات کا بھی ہے کہ تخت یا تختہ کے مصداق، زمین اور فضا سے نہتے

لوگوں پر موت کی بارش کر دی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت سی جانیں چلی جائیں گی۔‘‘

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل و دماغ پر بے پناہ بوجھ تھا۔ یہ بوجھ اتنا شدید تھا کہ زخموں کی اذیت بھی پیچھے چلی گئی تھی۔ ایسے میں وہی نورانی چہرہ میرے تصور میں اُبھرا جس نے کل رات کے آخری پہر مجھے مرکوزا چھوڑنے سے روکا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے ہزاروں چاہنے والوں کو اس موقع پر اکیلا نہ چھوڑوں۔ اس کٹھن ترین مرحلے میں میرا دھیان سیدھا محترم حاذق ذکری کی طرف گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ مجھے ان سے رہنمائی لینا چاہیے۔

میں دیکھ رہا تھا، قائم مقام ناظم جاسم کے پاس سیٹلائٹ فون موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ چند ہی لمحے بعد میں محترم ذکری سے بات کر رہا تھا۔ وہ مرکوزا کے اسی گھر میں تھے جہاں تاجور بھی موجود تھی۔ محترم ذکری کے سیکڑوں جانباز اور پاسبان بریگیڈ کے لوگ اس جگہ کی حفاظت کر رہے تھے۔

محترم ذکری نے کہا۔ ’’مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم اس چار دیواری میں نہیں رہ سکو گے اور نکل کر لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ گے۔‘‘

’’میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو آگاہ کیے بغیر نکل آیا۔ مجھے معاف کر دیجیے۔‘‘

’’جو ہو گیا سو ہو گیا...... اور شاید اچھا ہی ہوا۔ مجھے جو اطلاعات مل رہی ہیں ان کے مطابق تم لوگ ڈی پیلس کی دیواروں تک پہنچ چکے ہو۔ یہ بڑی کامیابی ہے مگر حالات یہ بھی بتا رہے ہیں کہ بہت زیادہ خونریزی بھی ہو سکتی ہے۔‘‘

’’میں اسی حوالے سے آپ کی رائے چاہ رہا ہوں جناب! میں تنہا اس ذمّے داری کو نبھانے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔‘‘

’’تم غلط کہہ رہے ہو شاہ زیب! تم تنہا یہ ذمّے داری اٹھانے کے قابل ہو اور تم نے اٹھا کر دکھائی بھی ہے...... باقی میں اپنی رائے ضرور دے سکتا ہوں۔ آخری فیصلہ تمہیں خود ہی کرنا ہے...... اور میری رائے یہ ہے کہ ہمیں حتی الامکان خونریزی سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہانا وانی اور اس کا بیٹا ان لاکھوں لوگوں کو دیکھ ہی چکے ہیں جنہوں نے پیلس کو گھیرا ہوا ہے۔ وہ لوگ نہتے ہونے کے باوجود اپنے ارادے میں چٹانوں کی طرح مضبوط ہیں۔ ہانا وانی، رائے زل اور ان کے گماشتے آقا جان کو...... صورتِ حال سمجھنے کا ایک موقع دیا جانا چاہیے۔ ان کو بتایا جائے کہ سرنڈر کے سوا ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔‘‘

’’جناب! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کی طرف کوئی مذاکراتی ٹیم روانہ کی جائے؟‘‘

’’مجھے لگتا ہے کہ مناسب رہے گا مگر ہم ان مذاکرات کو ایک دو گھنٹے سے زیادہ طول نہیں دے سکتے۔ جاماجی کے لاکھوں شہری اس وقت سڑکوں پر ہیں۔‘‘

’’آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں جناب۔‘‘

’’میں تمہاری حالت کی طرف سے بھی پریشان ہوں۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ تم اپنے آپ پر بہت ظلم کر رہے ہو۔ اتنے شدید بخار اور ایسے ’’انفیکشن‘‘ میں تم پر کسی بھی وقت بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔‘‘

’’آپ کی دعائیں ساتھ ہیں تو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔‘‘

’’یہ لڑکی کون ہے؟‘‘ محترم ذکری نے اچانک موضوع بدلا۔ ’’یہ تمہارے لیے مسلسل آنسو بہا رہی ہے اور دعائیں کر رہی ہے۔‘‘

میں سمجھ گیا کہ وہ تاجور کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ’’وہ میری ہم وطن ہے حضرت! مجھ پر بے حد بھروسا کرتی ہے اور میری ہی وجہ سے ان حالات میں پھنسی ہوئی ہے۔‘‘

’’کہا جا رہا ہے شاہ زیب کہ وہ تمہاری منگیتر ہے اور کسی وجہ سے تم دونوں کے درمیان ناراضی چل رہی ہے۔‘‘

’’مم...... منگیتر والی بات درست نہیں ہے حضرت!‘‘

’’اس کا مطلب ہے ناراضی والی بات درست ہے...... نہیں شاہ زیب...... میں نے اس لڑکی کی آنکھوں میں سچے موتیوں کی پاک چمک دیکھی ہے۔ ایسی چمک مجھے بہت ہی کم آنکھوں میں دکھائی دی ہے۔ اگر کسی وجہ سے تم نے اس کا دل دکھایا ہے تو اس کی دلجوئی کرو۔ خاص طور سے ایسے نازک موقع پر تمہیں اس کی بہترین دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ایسی دعائیں جن میں ناراضی کا شائبہ تک نہ ہو۔‘‘

’’محترم کہاں ہے وہ؟‘‘

’’بہت فرمانبردار اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود ابھی یہاں بیٹھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی۔ تم چند سیکنڈ ہولڈ کرو۔ میں اس سے تمہاری بات کراتا ہوں۔‘‘

محترم حاذق ذکری کے قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر تھوڑی دیر بعد مجھے تاجور کی مدھم آواز سنائی دی۔ ’’شاہ زیب! آپ کیسے ہیں؟ بہت خطرے والی خبریں مل رہی

ہیں۔ میرا دل اب بھی اتنی زور سے دھڑک رہا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“

”محترم ذکری کہاں ہیں؟“

”وہ مجھے فون تھما کر باہر چلے گئے ہیں۔“ تاجور نے جواب دیا۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ تم بہت افسردہ ہو...... رو رہی ہو؟“

”شاہ زیب اپنے دل پر میرا بس نہیں ہے۔ آپ مجھے بہت تسلی دے کر گئے ہیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہو جائے گا...... بُرا ہو جائے گا۔“

”وہم کا کوئی علاج نہیں ہوتا تاجور! تم اپنے دل کو مضبوط کرو۔ محترم ذکری بالکل سادہ اور عام نظر آتے ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ بہت بڑی شخصیت ہیں۔ تم ان کے آس پاس رہو۔ تمہیں سکون ملے گا۔“

”وہ تو میں خود بھی محسوس کرتی ہوں شاہ زیب! لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ......“ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ اس کی آواز بھرّا گئی۔

”بولو تاجور! جو کہنا ہے کھل کر کہو۔“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔

”میرا دل چاہتا ہے شاہ زیب! کہ ان حالات میں...... میں آپ کے ساتھ رہوں...... جو کچھ بھی اچھا یا برا ہونا ہے، ہم دونوں کے ساتھ ہو۔“

”پھر وہی مایوسی والی باتیں...... یہاں کچھ بُرا نہیں ہونے والا تاجور! ہم حق پر ہیں اور ہم جیتیں گے۔“

”کہتے ہیں کہ جلوس شاہی محل کے دروازوں تک پہنچ گیا ہے...... اب یہ لوگ ہیلی کاپٹروں سے بم پھینکیں گے......“ تاجور کی آواز لرز رہی تھی۔

”جب لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں تو ان کی اپنی ایک ہیبت ہوتی ہے۔ ان کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تم بس دعا کرو۔“

ایک ہیلی کاپٹر چنگھاڑتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ ہمارے اردگرد شور اتنا زیادہ تھا کہ میری آواز بمشکل تاجور تک پہنچ پا رہی تھی۔ تاجور نے بمشکل اپنی سسکی روکی اور مجھے خدا حافظ کہا۔

میں نے کہا۔ ”نہیں اس طرح نہیں تاجور! مجھے پورے اطمینان کے ساتھ مسکرا کر خدا حافظ کہو۔ تمہارے اطمینان سے اور...... مسکرانے سے مجھے بھی توانائی ملے گی۔“

وہ کئی سیکنڈ تک خاموش رہی۔ شاید میرے الفاظ کی گہرائی پر غور کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”اچھا...... خدا حافظ......“

”ایسے نہیں تاجور، تم اب بھی مسکرائی نہیں ہو۔“

”میرے مسکرانے کا آپ کو کیسے پتا چلے گا؟“ وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ اب اس کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

”مجھے پتا چل جائے گا۔“

”آپ بہت عجیب ہیں۔“ اس نے ہارے ہوئے سے انداز میں کہا۔ ”اچھا خدا حافظ، اپنا خیال رکھیے گا۔“

”شکریہ۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جاسم اور شہر کے دیگر عمائدین جیپ سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ جیسے میری کال کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہوں۔ جونہی بات ختم ہوئی، جاسم آگے آیا اور دیگر عمائدین کی ترجمانی کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم آپ کے حکم کے منتظر ہیں شاہ زیب صاحب۔“

”دیگر لوگوں کی رائے کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”رائے تقسیم ہے جناب۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈی پیلس والوں کو بُری موت سے بچانے کے لیے انہیں سوچنے سمجھنے کے لیے چند گھنٹے کا وقت دینا چاہیے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اب مہلت نہ دی جائے۔ لاکھوں لوگ یہاں موجود ہیں اور پوری طرح ”چارجڈ“ ہیں، جب یہ ڈی پیلس کی طرف بڑھیں گے تو کوئی ان کو روک نہیں سکے گا۔ بہرحال آخری فیصلہ، سب لوگ آپ کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔“

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”اگر ہم پہلے مذاکرات والا آپشن اختیار کرتے ہیں تو تمہارے خیال میں کون سے افراد مذاکرات میں حصہ لے سکتے ہیں؟“

جاسم شتابی سے بولا۔ ”اس کے لیے میں نے ایک چار رکنی ٹیم پہلے سے سوچ رکھی ہے جناب! ایک اعلیٰ افسر فوج کی نمائندگی کرے گا۔ دو افراد حکومت کے اور ایک شخص رضاکار تنظیموں کا نمائندہ ہوگا۔ تاہم میری رائے ہے کہ ایک پانچواں شخص بھی مذاکراتی ٹیم کا رکن ہو۔“

”وہ کون؟“

”ناظم باذان صاحب! وہ اس وقت رائے زل کی حراست میں ہیں۔ مذاکرات کی پہلی شرط ہی یہ رکھی جائے کہ مسٹر باذان کو مذاکرات میں حصہ لینے کے لیے رہا کیا جائے۔“

میں نے کہا۔ ”اس حوالے سے یہاں کافی تجربہ کار لوگ موجود ہیں جو کچھ بھی کرنا ہے آپ لوگ خود کریں مگر میری خواہش ہے کہ اس بات چیت کو تین چار گھنٹوں سے زیادہ وقت نہ دیا جائے۔“

”ہمارے یہی کوشش ہوگی جناب! ہم آپ کو ساری صورتِ حال سے مسلسل باخبر بھی رکھیں گے۔“

میں نے پال کی طرف دیکھا، اس نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میرے دونوں ڈاکٹرز نے ایک بار پھر معائنہ کیا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ مجھے ”ہاسپٹلائزڈ“ کیے جانے کی ضرورت ہے۔ میرے جو زخم ٹھیک ہو رہے تھے، وہ بھی پھر سے بگڑنے لگے تھے۔ خصوصاً جہاں سے مردہ جلد کاٹی گئی تھی وہ جگہیں انفیکشن زدہ تھیں۔ بخار کی شدت بھی صرف دواؤں کی وجہ سے کم محسوس ہوتی تھی۔

شام کے سائے بڑی تیزی سے پھیلے اور پھر جاماجی کی لائٹس آن ہو گئیں۔ مذاکرات جاری تھے...... نو بجے کے بعد عوام نے اور خواص نے جیسے تیسے پیٹ پوجا کی۔ اسی دوران میں خبر ملی کہ رائے زل اور آقا جان نے ایجنسی سے مشورہ کرنے کے بعد باذان کی رہائی والی شرط مان لی ہے اور مسٹر باذان کو مذاکرات کے لیے جیل سے رہا کیا جا رہا ہے۔

اس بات کا صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ مذاکرات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے، ہوسکتا تھا کہ ہمیں کل صبح تک انتظار کرنا پڑتا۔

رات دس بجے کے لگ بھگ دو بڑے کنٹینرز ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کنٹینرز کے چاروں طرف بلٹ پروف چادریں تھیں اور ان چادروں پر جاماجی کے جھنڈے پرنٹ تھے۔ اس کے علاوہ ان پر شہید کمانڈر افغانی، قسطینا اور میری تصویریں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ (میری تصویر جہاں بھی دکھائی دیتی تھی یہ وہی زخمی حالت والی تصویر ہوتی تھی)

جاسم نے بتایا۔ ”عمائدین نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈی پیلس کی طرف بڑھتے وقت آپ، مسٹر پال، عارفہ بی بی اور دیگر اہم افراد اس کنٹینر پر سوار ہوں گے۔ فی الوقت یہ کنٹینر آپ لوگوں کے آرام کے کام آئے گا۔ خاص طور سے آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے شاہ زیب صاحب۔“

جاسم ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے دو چار گھنٹے آرام کی شدید ضرورت تھی۔ میں انیق کا سہارا لیتا ہوا اور تلووں کی تکلیف جھیلتا ہوا کنٹینر کے نچلے حصے میں چلا گیا۔ یہاں تین چار ”بنک بیڈز“ موجود تھے اس کے علاوہ ایک آرام دہ ڈبل بیڈ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت ایک اچھے بیڈ روم کی بیشتر سہولتیں اس نچلے پورشن میں موجود تھیں۔

پال کے مجبور کرنے پر میں ڈبل بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ زخم آگ کی طرح جل رہے تھے مگر میں اپنے تاثرات سے زیادہ ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ حالات کا رخ دیکھ کر ٹی وی چینلز کے تیور بھی کچھ بدل رہے تھے۔ ایک چینل پر نیوز کاسٹر اپنے فیلڈ رپورٹر سے سوال جواب کر رہا تھا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے آگ صرف ان ہی ”پراپرٹیز“ کو لگائی جا رہی ہے جو آقا جان کی ملکیت ہیں؟“

”جی ہاں۔“ رپورٹر نے موبائل فون پر جواب دیا۔ ”ہماری اطلاعات کے مطابق یہ تقریباً ساری ”پراپرٹیز“ واڈا کمپنی کی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ واڈا کمپنی میں آقا جان نے حال ہی میں باون فیصد حصص خریدے ہیں......“

نیوز کاسٹر نے کہا۔ ”کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تشدد کی یہ لہر اس قتل عام کا نتیجہ ہے جو کل ”اسکوائر ون“ پر ہوا اور جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اس کا آرڈر محترم آقا جان کی طرف سے ہوا تھا۔“

”بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے جی۔ آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں کہ جہاں جہاں آگ لگی ہوئی ہے وہاں واڈا کمپنی کے سائن بورڈز بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کروڑوں ڈالر مالیت کی اشیا ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے راکھ ہو رہی ہیں۔“

ٹی وی کی آدھی اسکرین پر آتشزدگی کے مختلف مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی جھلکی آقا جان کی بھی نظر آئی۔ اس کا نیم گنجا سر پسینے سے تر تھا اور وہ کسی نیوز رپورٹر پر بُری طرح برس رہا تھا۔

نیوز کاسٹر نے ایک تجزیہ نگار کو لائن پر لے لیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ آئندہ تین چار گھنٹوں میں حالات کیا رخ اختیار کرنے جا رہے ہیں؟ یہ تجزیہ نگار سراسر رائے زل کی زبان بول رہا تھا۔ اس کی بکواس سننا بیکار تھا۔ انیق نے چینل بدل دیا۔

میری نگاہ کنٹینر کی کھڑکی سے باہر گئی۔ کھڑکی کے بالکل پاس مجھے خورسنہ نظر آئی۔ اس نے اپنے دونوں رخساروں پر جاماجی کا دو رنگا جھنڈا پینٹ کرا رکھا تھا۔ اب وہ اپنے تیرہ چودہ سالہ خوبرو بیٹے کے چہرے پر ”آزادی“

کے حروف پینٹ کر رہی تھی۔ آخری حرف پینٹ کرنے کے بعد وہ قریب کھڑے سجاول کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ابھی تک سکھ پربت سنگھ والے گیٹ اپ میں تھا۔ خورسنہ، سجاول کے چہرے پر بھی کچھ لکھنا چاہ رہی تھی مگر وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح سجاول کا چہرہ گہری سنجیدگی میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھنے والا عموماً خوف زدہ ہو جاتا تھا مگر خورسنہ اور اس کا بیٹا، سجاول سے کافی بے تکلف دکھائی دیتے تھے۔

سجاول نے چہرے پر پینٹ کروانے سے مسلسل انکار کیا تو خورسنہ نے رنگ اور برش اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھمایا اور عقب میں جا کر سجاول کو اس طرح جکڑ لیا کہ سجاول کے بازو بھی خورسنہ کی گرفت میں آ گئے۔ ''کرو انکل کو پینٹ۔'' وہ بولی۔

''مجھے ایسا مذاق چنگا نہیں لگتا۔'' سجاول نے پکا منہ بنا کر کہا۔

''لیکن مجھے تو بہت چنگا لگتا ہے۔'' خورسنہ نے سجاول کے ہی لہجے میں کہا۔

خورسنہ کی گرفت میں یقیناً اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ سجاول جیسے گرانڈیل کو بے بس کر سکتی۔ اسے سجاول کی مہربانی ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ زبردستی نہیں کر رہا تھا پھر غالباً اس نے مدھم لہجے میں خورسنہ سے یہی کہا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ تھوڑا بہت پینٹ کروا لیتا ہے۔

خورسنہ نے اسے چھوڑ دیا مگر اس کے عقب میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی رہی۔ خوش رو لڑکے نے سجاول کے ایک رخسار پر ایک چھوٹا سا جھنڈا بنایا اور خوش ہو گیا۔ سنگین ترین حالات میں ان لوگوں کی یہ ہلکی پھلکی مصروفیت اس امر کی گواہ تھی کہ لوگوں کے حوصلے بلند ہیں اور وہ مستقبل قریب کے نقشے میں کامیابی کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔

میں نے بہ زبانِ اردو، انیق سے پوچھا۔ ''کیا معاملہ ہے، لگتا ہے کہ دو دنوں میں ہی سجاول اور یہ خورسنہ کافی قریب آ گئے ہیں؟''

''نہیں جی۔ اتنی جلدی بھی نہیں ہوا یہ سب کچھ۔ یہ تانا بانا چند دن پیچھے تک گیا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''آپ نے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اور امریش...... میرا مطلب ہے سجاول صاحب ٹاپو سے نکل کر یہاں تک کیسے پہنچے؟''

''میں نے پوچھا تھا لیکن تم نے کہا تھا کہ خود ہی بتائیں گے۔''

انیق نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر طویل سانس لی۔ کنٹینر کی کھڑکیوں سے باہر ہجوم کا ولولہ ایک مسلسل شور کی صورت میں ڈھلا ہوا تھا۔ لیکن کنٹینر کے اندر یہ شور پچاس ساٹھ فیصد کم تھا۔ انیق نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں جناب کہ اگر خورسنہ صاحبہ نہ ہوتیں تو شاید آپ کو ہماری لاشوں کا سراغ بھی نہ ملتا۔ انہوں نے ہماری جان بچائی اور جاماجی تک پہنچنے میں ہماری بہت مدد بھی کی۔ درحقیقت اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہم نے ٹاپو والی پناہ گاہ سے نکل کر سخت غلطی کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہم رات کی تاریکی اور بارش کا فائدہ اٹھا لیں گے اور کسی طرح ساحل پر پہنچ جائیں گے۔ ہمارے پاس ربڑ کی ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس میں دستی پمپ سے ہوا بھری جاتی ہے......''

''تم شروع سے بتاؤ گے تو کچھ پتا چلے گا۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

وہ بولا۔ ''پچھلے ہفتے جب ہم نے ٹی وی پر دیکھا کہ یہاں حالات خراب تر ہوتے جا رہے ہیں اور آپ کو ٹارچ سیل میں شدید ترین اذیت پہنچائی گئی ہے تو ہماری برداشت جواب دینے لگی۔ میں نے سجاول سے مشورہ کیا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ہر صورت باہر نکلیں گے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ بارودی بیلٹس ڈھونڈیں اور عہد کیا کہ گرفتاری کی صورت میں ہم بلا تاخیر خود کو اڑا لیں گے۔ اس کے بعد ضروری سامان اور ربڑ بوٹ کے ساتھ ہم دہانے تک پہنچے اور پتھر سرکا کر باہر نکل آئے۔ باقی ساتھی ہماری اس کارروائی سے بالکل لاعلم تھے۔ اس رات تیز بارش بھی ہو رہی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ شاید ہم نگرانوں کی نظروں سے بچ جائیں گے۔''

''بہت غلط خیال تھا۔'' میں نے کہا۔

''بجا کہہ رہے ہیں آپ، یوں لگتا ہے کہ ان خبیثوں نے وہاں چپے چپے پر رائفل بردار بٹھا رکھے ہیں۔ ہم بمشکل دس پندرہ قدم دور ہی گئے تھے کہ کسی نگران کو شک ہوا......

''ہالٹ...... ہالٹ'' کی آوازیں آئیں اور سرچ لائٹس گردش کرنے لگیں۔ ہم اترائی کی طرف دوڑے اور کنارے کے قریب ایک ابھری ہوئی چٹان کے نیچے کیچڑ میں چھپ گئے۔ ہماری پلاننگ غلط ثابت ہو چکی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم کسی سنسان کنارے پر ربڑ بوٹ میں ہوا بھریں گے اور چھوٹے چھوٹے چپوؤں کے ذریعے ٹاپو سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دور جانے کی کوشش کریں گے مگر اب ہر طرف سرچ لائٹس حرکت کر رہی تھیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم ربڑ بوٹ پر یہاں سے نکل سکتے۔ چند ہی منٹ میں ہمیں اپنے اردگرد بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پتا چل رہا تھا کہ گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ ہم دلدلی زمین پر چلتے اور رینگتے ہوئے سمندر کے ساتھ ساتھ قریباً ایک فرلانگ آگے نکل گئے۔ یہ جگہ قدرے پُرسکون نظر آتی تھی۔ ہم بوٹ میں ہوا بھرنے کا سوچ ہی رہے تھے جب ٹارچ کی روشنی ہم پر پڑی۔ کچھ پرچھائیاں درختوں سے نیچے کودیں۔ یہ تین امریکی گارڈز تھے جو ہم پر جھپٹے۔ اس دن آپ کے امریش پوری کا وہ ہنر میں نے دیکھا جس سے آپ ڈرایا کرتے ہیں۔ اس کے دو مکوں نے دو گارڈز کی کھوپڑیاں چٹخائیں جیسے ناریل پر ہتھوڑا مارا گیا ہو۔ تیسرا گارڈ پہلو کی طرف سے آیا اور اس نے سجاول پر شکاری چاقو سے حملہ کیا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا اور ایک درخت سے دے مارا۔ میرے پستول کے دستے کی دو تین ضربوں نے اسے نیم مردہ کر دیا۔ ہم نے مرنے والوں کی برساتیاں پہن لیں۔ اردگرد ہلچل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نوّے فیصد امکان یہی تھا کہ اب ہم بچ نہیں سکیں گے۔ ہم کہیں چھپنے کا ٹھکانا ڈھونڈ رہے تھے جب ایک نسوانی آواز آئی۔ یہ خورسنہ تھی۔ وہ ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی رائفل تھی مگر انداز میں دشمنی نہیں تھی۔ ہم اس کے پاس پہنچے۔

وہ بولی۔ ”تم دونوں ہرہائی نس کے ساتھی ہو؟“

میں نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

اس نے کہا۔ ”جن سے بھاگ رہے ہو، میں تمہیں ان سے بچا سکتی ہوں۔ اگر اعتماد کر سکتے ہو تو آؤ میرے ساتھ۔“

وہ صاف ستھری اردو بول رہی تھی۔ انداز میں بھی ہمدردی تھی۔ میں اور سجاول اس کے پیچھے چل دیے...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دوڑ پڑے۔ ایک جگہ سامان ڈھونے والی کچھ کشتیاں اور لانچیں کھڑی تھیں۔ خورسنہ ہمیں گھنے درختوں کے درمیان سے گزار کر ایک لانچ تک لے آئی۔ اس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لانچ کی اندرونی روشنی میں ہم نے پہلی بار خورسنہ کو دھیان سے دیکھا۔ وہ شکل سے بھلی لگی۔ متناسب جسم کی مالک تھی، لباس بارش میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے جو سفید لباس پہن رکھا تھا وہ نرسنگ یونیفارم سے ملتا جلتا تھا۔ ہم اندر گئے اور سیڑھیاں اُتر کر لانچ کے پیندے میں چلے گئے۔ بارش کا شور اور بادلوں کی گرج چمک یہاں معدوم ہوگئی......“

انیق کی روداد دلچسپ تھی مگر میرے زخموں میں لگی ہوئی آگ مجھے کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ خصوصاً جہاں پسلیوں پر سے اسکن کاٹی گئی تھی وہاں بہت تکلیف تھی۔ ویسے بھی اب پین کلر انجکشن ”ری پیٹ“ کیا جا سکتا تھا۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر نے ایک انجکشن مزید دے دیا، یہ فوری ریلیف دیتا تھا۔ کچھ سکون ملا تو ڈاکٹر کے اصرار پر میں نے ایک اور انرجی بار بر کھا کر ایک برگر کے چند لقمے لیے۔ اس دوران میں انیق نے اپنی باقی روداد سنائی۔

وہ بولا۔ ”اس لانچ میں دواؤں کی بو تھی۔ یہ زیادہ تر مقامی طور پر تیار کی گئی دیسی ادویات تھیں۔ کچھ جڑی بوٹیاں خام شکل میں بھی یہاں موجود تھیں۔ سنگھاڑے کی شکل والا ایک مقامی پھل (جو ایک مرتبہ سیف بھی لایا تھا) تین چار بوریوں میں یہاں اسٹور کیا گیا تھا۔ کچھ دیگر خشک نباتات بھی اسی طرح یہاں ”اسٹورڈ“ تھیں۔ خورسنہ نے فرش کے چند چوبی تختے اپنی جگہ سے ہٹائے اور ہمیں ایک چھوٹے سے تاریک خلا میں گھسا دیا۔ یہ مستطیل جگہ بمشکل دس ضرب سات فٹ کی ہوگی۔ اس کی چھت چار فٹ سے بلند نہیں تھی۔ ہم اس میں بس جھک کر بیٹھ سکتے تھے۔ خورسنہ نے تختے دوبارہ جوڑ دیے۔ پھر ہمیں آواز سے پتا چلا کہ اس نے ایک دو بوریوں کے منہ کھول دیے ہیں اور ان میں موجود سنگھاڑے جیسا پھل فرش پر بکھر گیا ہے۔ خورسنہ اس لانچ میں اکیلی تھی مگر چند منٹ بعد کچھ اور لوگ بھی لانچ میں داخل ہوگئے۔ آوازوں اور لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ خورسنہ کے ساتھی ہی ہیں۔ وہ لمحے ہمارے لیے شدید تناؤ والے تھے شاہ زیب بھائی۔“

انیق نے جُھرجُھری سی لی اور...... بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر خورسنہ وہ نہیں تھی جو اس نے ظاہر کیا تھا...... تو پھر ہمیں کسی بھی وقت اپنی دھماکا خیز بیلنس کی ڈوریاں کھینچنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی شدید ٹینشن کے بعد ہمارے اندیشے زائل ہونا شروع ہوگئے۔ ہم دم سادھے اپنی جگہ بیٹھے رہے اور باہر سے آنے والی آوازیں اور آہٹیں سنتے رہے۔ شکاری چاقو کے حملے سے امریش...... میرا مطلب ہے سجاول کی کلائی اور ٹانگ پر کٹ آئے تھے۔ خورسنہ نے کہا تھا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد دوبارہ آئے گی لیکن ہمیں زیادہ دیر اس کا انتظار کرنا پڑا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ کتنی دیر؟“ انیق نے پوچھا۔

''پہیلیاں نہ بجھواؤ یار!'' میں نے ... بیزاری سے کہا۔

''کہانی میں پہیلیاں نہ ہوں تو مزہ نہیں آتا۔ آپ نے کبھی ڈائجسٹ پڑھا ہے۔ یہ جو نامور رائٹر تھے، شوکت صدیقی، ایم اے راحت، محی الدین نواب اور علیم الحق حقی...... اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے، یہ اسی طرح اپنے قارئین کو اپنی تحریروں کا دیوانہ بناتے تھے۔ دراصل کہانی ڈائجسٹ کی ہو فلم کی یا......''

''اچھا اِدھر اُدھر کی نہ ہانکو، اپنے موضوع پر آؤ۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''پہلوان حشمت ٹھیک ہی فرماتے ہیں، بندر کیا جانے ٹماٹر کا سواد...... ویسے جناب، یہ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ ٹماٹر پھل ہے یا سبزی......؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بھی پتا نہیں چلے گا کہ تھپڑ کس طرف سے آیا ہے اور کس طرح تمہارے دانت ٹوٹے ہیں۔''

میری... بیزاری کو عروج پر دیکھ کر وہ جلدی سنجیدہ ہو گیا۔ روداد کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''خورسنہ صاحبہ نے ایک دو گھنٹے کا کہا تھا لیکن ہمیں پورے تیس گھنٹے وہاں محترمہ کا انتظار کرنا پڑا۔ اگلی رات کے تین چار بجے کا عمل تھا جب لکڑی کے فرش پر قدموں کی بہت مدھم آواز آئی۔ فرش پر بکھرے ہوئے ''سنگھاڑے'' سمیٹے گئے۔ تین تختے ہٹائے گئے اور خورسنہ خاموشی سے اندر آ گئی۔ آج وہ مختلف لباس میں تھی۔ پاجامہ قمیص اور اسکارف میں وہ جاذبِ نظر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی تاخیر کے لیے معافی مانگی۔ وہ ہمارے لیے کھانا اور فرسٹ ایڈ کا سامان بھی لائی تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں سجاول کی کلائی اور ٹانگ کے بالائی حصے کا زخم دیکھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایسے زخموں کے لیے تیر بہدف دوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لانچ دراصل طبّی سامان اور کچھ مقامی طرز کی ادویات لے کر ہی اس ٹاپو پر آئی ہے۔ اس میں تین چار مقامی معالج بھی ہیں جنہیں ''وی ڈوک'' کہا جاتا ہے۔ یہ مقامی طریقے سے علاج کرتے ہیں۔ خورسنہ بطور نرس ان کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ اس نے بتایا کہ ٹاپو کے اردگرد سمندری پانی میں مگرمچھ اور آبی سانپ وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے کاٹنے سے کئی فوجی زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے ہی ''وی ڈاکٹر یا وی ڈوک'' یہاں آئے ہیں۔ خورسنہ کے والدین پاکستانی تھے۔ وہ پہلے برونائی میں رہے پھر یہاں آ گئے تھے۔ خورسنہ جاماجی کی ہی پیدائش ہے۔ اردو بالکل اردو دانوں کی طرح بولتی ہے جی۔ خورسنہ نے ٹارچ کی روشنی میں ایک جگہ سے سجاول کی شلوار کو چاک کیا اور ازخود سجاول کے زخم کا معائنہ کیا۔ اس نے اپنے طریقۂ علاج کے مطابق ہلدی اور پپیتے کے محلول سے سجاول کے زخم کو صاف کیا اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ اس نے پورے یقین سے کہا کہ تین چار دن کے اندر یہ زخم بغیر ٹانکوں کے ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کی ساری ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور قسطینا کو اپنا لیڈر تصور کرتے ہیں۔ قسطینا ہی کے بارے میں سن گن لینے کے لیے خورسنہ بطور نرس مقامی معالجوں یعنی وی ڈاکٹرز کے ساتھ اٹیچ ہوئی تھی اور ٹاپو تک پہنچی تھی۔ وہ قسطینا کے بارے میں تو کچھ نہ جان پائی تھی مگر ہماری مدد کرنے میں کامیاب رہی تھی۔''

''خورسنہ نے تم دونوں سے پوچھا نہیں کہ قسطینا کہاں ہے؟''

''اس نے پوچھا لیکن وہ بہت معاملہ فہم ہے۔ ہمارے رویے نے اسے سمجھا دیا کہ ہم نے اس سلسلے میں اپنے منہ پر بڑے پکے تالے لگائے ہوئے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کل خورسنہ کے بیٹے کو مصیبت میں دیکھ کر سجاول نے جو غیر معمولی دلیری دکھائی' اس کے پیچھے ٹاپو والی روداد بھی ہے۔''

انیق کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ابھری۔ دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ ''یہ آپ کا امریش پوری جتنا سنجیدہ نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی کھوچل ہے جناب...... مجھے تو شک پڑتا ہے کہ چاقو کے حملے میں اسے صرف کلائی پر ہی کٹ آیا تھا، یہ ٹانگ والا کٹ اس نے بعد میں خورسنہ کو، اور اس کے نرسوں والے لباس کو دیکھ کر خود لگایا ہوگا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کافی کامیاب رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''خورسنہ اب تک دو تین بار تو اس کی ٹانگ کے بالائی حصے کا معائنہ کر چکی ہے۔ بالکل ترکی دنبے جیسی ران ہے اس کی۔ اگر وہ سچ مچ دنبہ ہوتا تو میں نے سوتے میں اس کی ران تو ضرور کاٹ لینی تھی۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ تم سجاول پر خورسنہ کو رجھانے کا الزام لگا رہے ہو۔ تمہاری ذہنیت اتنی گندی نہیں ہے...... صرف سجاول کے حوالے سے گندی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے تمہاری موت بھی واقع ہونی ہے۔''

رات کو میں بس تھوڑی دیر کے لیے ہی سو سکا۔ ذہن مسلسل اپنے اردگرد کی تہلکہ خیز صورتِ حال میں الجھا ہوا تھا۔ کل کا سورج نہ جانے کس رنگ میں طلوع ہونے والا تھا۔ سوچوں کا دھارا بار بار ٹاپو کے حالات کی طرف بھی جارہا تھا۔ انیق کی گفتگو سے پتا چلا تھا کہ وہ لوگ ہمت نہیں ہارے اور کئی دن گزرنے کے باوجود مسلسل قسطینا وغیرہ کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ امریکا سے ایسے جدید آلات منگوائے جارہے ہیں جو زیرِ زمین اشیا کا سراغ لگانے میں مدد دیتے ہیں۔

اگلا دن شروع ہوتے ہی نعروں کی لگاتار آوازوں سے اطراف گونجنے لگیں۔ ہجوم میں کئی طرح کے ضمیمے اور اشتہار بھی گردش کررہے تھے۔ ایسے ہی ایک اشتہار میں دو تین تصویریں تھیں۔ ان تصویروں میں کئی خوبرو لڑکیوں کو ڈانس کی تربیت پاتے دکھایا گیا تھا۔ تربیت دینے والا خواجہ سرا خیام دانش تھا۔ اس ہینڈ بل میں لکھا تھا کہ شریف گھرانوں کی ان لڑکیوں کو رائے زل کی تفریحِ طبع کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔ ناظم باذان کی رہائی کا اعلان رات کو ہی کردیا گیا تھا مگر وہ عملی طور پر ابھی تک رہا نہیں ہوا تھا۔ اس کے حوالے سے مسلسل ٹال مٹول سے کام لیا جارہا تھا۔ میں نے قائم مقام جاسم سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”وہ لوگ بتارہے ہیں کہ جیل کی انتظامیہ کو باقاعدہ تحریری حکم کا انتظار ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں محترم باذان ہمارے درمیان ہوں گے۔“

عارفہ خاتون نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”شاہ زیب! ام کو تو یہ شک پڑ رہا ہے کہ ان لوگوں نے ناظم صاحب پر تشدد کیا ہے...... اور ان کا حالت ایسا نہیں کہ ان کو امارے سامنے لایا جاسکے۔ لونگ کو تم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا...... یہ ایک بہت ظالم جناور کا نام ہے۔“

عارفہ خاتون کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اس بارے میں پال سے بات کی تو اس کی نیلی آنکھوں میں بھی سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں، وہ بولا۔ ”شاہ زیب! جب لوگوں نے تمہیں اسپتال سے چھڑا کر مرکوزا میں پہنچایا تو لونگ کو ایسے ہی لگا جیسے سخت بھوک کے عالم میں اس کے منہ سے شکار چھین لیا گیا ہو۔ وہ غصے سے دیوانہ ہورہا ہے۔ کچھ بھی کرسکتا ہے۔“

”اس سلسلے میں تمہارا کیا مشورہ ہے پال؟“ میں نے پوچھا۔

”مائی ڈیئر شاہ زیب!“ ابھی پال نے اتنا ہی کہا تھا کہ کنٹینر کے سامنے والے حصے سے کرنل احرار کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ”یہ دیکھیں...... ٹی وی پر کیا نیوز آرہی ہے، مسٹر باذان کے بارے میں بتارہے ہیں۔“

ہم سامنے والے پورشن کی طرف گئے۔ انیق نے مجھے سہارا دے رکھا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر بریکنگ نیوز کی سلائڈز چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بلند آواز میں بول رہا تھا۔ ”کہا جارہا ہے کہ محترم باذان کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے ان کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے حکومتی ترجمان نے بھی اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ جب محترم باذان کو جیل سے باہر لایا جارہا تھا تو انہیں سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ انہیں فوری طور پر ملٹری اسپتال لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہوسکے......“

”بکواس ہے...... یہ سب بکواس ہے۔“ عارفہ خاتون چلائی۔ ”ان حرامی سؤروں نے ناظم صیب کا جان لیا ہے۔ انہیں مار دیا ہے۔ یہ سب کا سب درندہ ہے...... جناور ہے...... ام ان کو نہیں مارے گا تو یہ ام کو مار دے گا۔“

جاسم نے روتے ہوئے کہا۔ ”انہیں بھی کبھار ہائی بلڈ پریشر ہوجاتا تھا لیکن دل کی تکلیف نہیں تھی انہیں...... یہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ ایجنسی کے جلاد لونگ کی نگرانی میں قتل کیا گیا ہے انہیں۔ ہم اس کا بدلہ لیں گے...... ہم ماریں گے یا مرجائیں گے۔“

کنٹینر کے اندر ہر چہرہ تمتما گیا تھا اور اکثر آنکھوں میں نمی نظر آرہی تھی۔ نیوز کاسٹر کی آواز گونج رہی تھی۔ ”ان بگڑے ہوئے حالات میں محترم باذان کی موت ایک بہت بڑے دھماکے کی طرح ہے۔ اس کی تشریح مختلف لوگ مختلف طریقے سے کریں گے۔ صورتِ حال کوئی بھی رخ اختیار کرسکتی ہے۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔“

بریکنگ نیوز کی سلائڈ دکھائی گئی اور اس کے ساتھ ہی نیوز کاسٹر نے مزید سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ”ناظرین! ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اسپتال کے باہر مظاہرین کی بڑی تعداد جمع ہوگئی ہے۔ وہ سخت مشتعل ہیں اور اسپتال کے اندر گھسنے کی کوشش کررہے ہیں......“

باذان کی موت کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ یہ پتا بھی چلا کہ باذان کی موت آج واقع نہیں ہوئی...... لاش کل رات سے اسپتال کے سردخانے میں پڑی ہے۔

ہجوم جو پہلے ہی بپھرا ہوا تھا اب سراپا آتش نظر آرہا

تھا۔ پال نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر کنٹینر کی کھڑکی سے باہر ہجوم کی بے پناہ بے چینی کا جائزہ لیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''مائی ڈیئر شاہ زیب! مجھے لگتا ہے کہ اب ہم تادیر ان لوگوں کو سنبھال نہیں سکیں گے۔ ان میں سے کچھ گروپ ہمارے کنٹرول میں نہیں رہیں گے اور ڈی پیلس کی طرف چارج کریں گے۔ بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوگا۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''آخری فیصلہ تم کو... ہی کرنا ہے ڈیئر، کیونکہ لوگ اس وقت جس کی بات سب سے زیادہ مان رہے ہیں وہ تم ہو۔ وہ تمہارے اشارے پر کٹ مرنے کو بھی تیار ہیں۔''

''لیکن انہیں کٹ مرنے دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے پال۔'' وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''اگر ہم نے آگے ہی بڑھنا ہے تو پھر کیوں نا ان بکتر بند گاڑیوں سے کام لیا جائے جو کل کے ہلے میں ہمارے قبضے میں آئی ہیں۔ انہیں فوری طور پر آگے لایا جائے؟''

''لیکن وہ گاڑیاں جلوس کے عقبی حصے میں ہیں۔ یہ قریباً ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور راستے میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ہجوم میں راستہ بنا کر گاڑیوں کو یہاں پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگے گا اور یہ وقت ہمارے پاس نہیں۔''

میں کنٹینر کی کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھ رہا تھا کہ نوجوانوں کی کئی مشتعل ٹولیاں دیوانہ وار نعرہ زنی کرتے ہوئے مورچوں کے قریب چلی گئی تھیں۔ یہ مظاہرین مورچا زن اہلکاروں پر زبردست پتھراؤ کر رہے تھے۔ مورچا زن اور گاڑی بند اہلکاروں کی مہلک رائفلیں اس سنگ باری کے جواب میں خاموش تھیں لیکن انہیں زیادہ دیر خاموش نہیں رہنا تھا۔

مشین گنوں کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر پتھراؤ کرنے والی مشتعل ٹولیوں میں، میں نے خورسنہ کو بھی دیکھا۔ وہ ہر خطرے سے بے نیاز تھی مگر خطرہ تو موجود تھا۔ اگر گولی چلنا شروع ہوتی تو سب سے پہلے یہی مشتعل گروپ نشانہ بنتے۔ تب میری نگاہ دراز قد سجاول پر پڑی۔ وہ تیزی سے آگے گیا اور خورسنہ کو ''پتھراؤ کرنے والے افراد'' میں سے کھینچ کر واپس لے آیا۔ خورسنہ کا سرخ اسکارف اس کے سر پر سے اتر گیا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس کا رخ مورچا زن رائفل برداروں کی طرف تھا اور وہ سجاول کی گرفت سے نکل نکل جارہی تھی۔

اس کے اور سجاول کے درمیان تکرار ہو رہی تھی تاہم آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ شاید رو بھی رہی تھی۔ یقیناً یہ باذان کی ناگہانی موت کا غم تھا۔ جب خطرناک زون کی طرف جانے کے لیے خورسنہ کی جدوجہد نے جنونی شکل اختیار کی تو سجاول نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ہمارے کنٹینر کے پہلو سے ٹکرائی اور پھر وہیں سڑک پر گر کر ہچکیاں لینے لگی۔ اس کا خوبرو بیٹا قریب ہی سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ سجاول کچھ دیر تک خاموشی سے خورسنہ کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے بڑھا اور کندھوں سے تھام کر اس کو اٹھا لیا۔ وہ بکھرے بالوں کے ساتھ مسلسل رو رہی تھی پھر وہ سجاول کے گلے سے لگ گئی۔ سجاول تسلی بخش انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔

پال اور اس کے اسکیمو اسٹائل ساتھی راجر نے بھی یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ راجر بولا۔ ''یہ سردار سنگھ بہت دبنگ آدمی نظر آتا ہے۔ ایسا ہی ایک کریکٹر میں نے ہالی ووڈ کی انگلش مووی میں دیکھا۔ وہ ایک سکھ ڈکیت تھا......''

میں راجر کو کیسے بتاتا کہ اب وہ جس شخص کو دیکھ رہا ہے وہ بھی ایک بڑا ڈکیت ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ سکھ نہیں۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ سجاول لمبے لمبے ڈگ بھرتا، کنٹینر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ اس نے پال، راجر اور دیگر افراد کو خاطر میں لائے بغیر براہ راست مجھے مخاطب کیا اور بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب! مجھے لگدا ہے کہ اب یہ لڑائی زیادہ دیر رکے گی نہیں۔ بہت چھیتی وڈا پھڈا شروع ہوجانا ہے۔ اس موقع پر ایک گل ہم کو دماغ میں رکھنی چاہیے۔ بیگم نورل بھی محل کے اندر ہیں۔ یہ رائے زل اور اس کے گورے بدمعاش بیگم نورل کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے...... اور اس کا ایک حل بھی ذہن میں آرہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ لوگ بیگم نورل کو یرغمال بناتے ہیں تو پھر ہم بھی ان کو انہی کے سکوں میں جواب دے سکتے ہیں۔ ہم...... مادام ہانا وانی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، وہ ابھی تک اسی اسپتال میں ہے جہاں مسٹر باذان کی لاش رکھی گئی ہے اور جہاں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے ہیں۔''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' سجاول نے اپنی مصنوعی داڑھی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''میں کرنا چاہتا نہیں ہوں، میں کر رہا ہوں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا اور جاسم کو اپنے پاس بُلا کر انگلش میں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done

http://paksociety.com

اسے ہدایت جاری کی۔ یہ بڑی اہم ہدایت تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس پر فوری عمل ہو سکے گا۔ وہ فٹ بال اسٹیڈیم، اسپتال سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں بیگم نورل کی دشمن اول میڈم ہاناوانی موجود تھی۔ چند منٹ کے اندر سیکڑوں گرین فوجی اسٹیڈیم میں سے نکل کر اسپتال کو گھیرے میں لے سکتے تھے۔

میں نے جاسم سے کہا۔ ”فوری ایکشن کی ضرورت ہے جاسم۔ دس منٹ کے اندر ہمیں اطلاع مل جانی چاہیے کہ اسپتال پر گرین فورس کا قبضہ ہو چکا ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر شاہ زیب! اگر یہ آپ کا حکم ہے تو دس منٹ کے اندر اس پر عمل ہو گا۔“

اسی دوران میں کرنل احرار نے اطلاع دی کہ کل کے حملے میں جو بکتر بند گاڑیاں مشین گنوں سمیت ہمارے قبضے میں آئی ہیں، ان کو ہجوم کے اندر سے گزار کر فرنٹ کی طرف لایا جا رہا ہے۔

جنگ اور مبارزت کا اپنا ایک بہاؤ ہوتا ہے۔ تصادم کی صورتِ حال ہمیشہ اپنے راستے اور اپنے اوقات خود منتخب کرتی ہے۔ شاید اسی غیر یقینی طرزِ عمل کو لڑائی کا چھڑ جانا کہتے ہیں۔ بپھری ہوئی ٹولیاں اپنے قائدین کے منع کرنے کے باوجود مورچوں سے نزدیک تر ہو رہی تھیں۔ ایک طوفانی لہر تھی جو کنارے توڑ کر ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینا چاہتی تھی۔ اسی دوران میں وہ خبر بھی آ گئی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ تمتمائے چہرے والے جاسم نے آ کر اطلاع دی۔

”اسپتال کے باہر گرے اور گرین فوجیوں میں خونی جھڑپ ہوئی ہے۔ اسپتال کے باہر رائے زل کے سپاہیوں کی صرف ایک کمپنی تعینات تھی۔ اسٹیڈیم سے نکلنے والے سیکڑوں فوجیوں نے انہیں روند کر رکھ دیا ہے۔ میڈم ہاناوانی کو حفاظتی تحویل میں لے لیا گیا ہے۔“

”بکتر بند گاڑیاں کہاں تک پہنچی ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ان کی رفتار سست ہے جناب! ہجوم میں سے راستہ بنانا بہت مشکل ہے لیکن وہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں۔“

اس روز مجھے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ عوامی بہاؤ کیا ہوتا ہے اور جب ایک بار یہ پہاڑی دریا کی طرح رفتار پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کے راستے کو بدلنا یا اسے کناروں میں بند کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ اس روز مجھے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی کہ بپھرے ہوئے ہجوم لیڈروں کے کنٹرول سے باہر کیسے ہوتے ہیں۔ میرا حکم تو یہی تھا کہ ابھی آگے نہیں بڑھا جائے گا۔ عارفہ خاتون اور جاسم کنٹینر کی چھت پر موجود تھے اور میگا فونز کے ذریعے بار بار پکار رہے تھے کہ مورچوں کی طرف نہ بڑھا جائے مگر نوجوانوں کی مشتعل ٹولیوں نے جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ پتھراؤ کرتے کرتے مورچوں اور خندقوں کے نزدیک تر پہنچ رہے تھے۔

”بکتر بند گاڑیاں آ رہی ہیں۔ آپ لوگ چند منٹ انتظار کریں۔“ یہ جاسم کی آواز تھی جو بے پناہ شور میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی...... اور پھر وہ کچھ ہوا جس کا اندیشہ ہر دل کو ڈرا رہا تھا۔ ہجوم میں سے کچھ لوگوں نے مورچا بند اہلکاروں پر گولی چلا دی۔ گولی کا جواب گولی سے آیا اور یہ کوئی معمولی جواب نہیں تھا۔ کئی مشین گنوں نے اپنے منہ کھولے تھے اور موت کی سوغات تقسیم کی تھی۔

بالکل یہی لگا جیسے ایک بہت بڑے بارودی ڈھیر کو چنگاری دکھا دی گئی ہے اور زمین و آسمان کے قلابے میں قیامت بپا ہو گئی ہے۔ لوگ زخمی ہو ہو کر گرے۔ پہلے سارا ہجوم دس پندرہ قدم پیچھے کی طرف گیا، پھر وہ رکا، سنبھلا اور دوبارہ مورچوں کی طرف جھپٹا۔ یہ جانباز اس مصرع کی زندہ تصویر تھے۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔

اور بازوئے قاتل میں بہت زور تھا۔ انہوں نے کوئی رعایت نہیں کی۔ ایک بار پھر گولیوں کی باڑیں آئیں اور لاشیں ایک دوسرے کے اوپر گریں۔ اب ہمارا رکنا بھی بیکار تھا۔ ہمارا کنٹینر حرکت میں آیا اور یہی وقت تھا جب میری نگاہ ڈی پیلس کی فصیل نما دیوار پر پہنچی۔ میں نے ایک بوفر گن کے دیوہیکل بیرل کو حرکت کرتے دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ کنٹینر کو نشانہ بنایا جانے والا ہے۔ میں نے فوری طور پر کنٹینر چھوڑنے کا حکم دیا اور خود بھی انیق کے سہارے باہر آ گیا۔ بوفر گن کا شیل بنیادی طور پر تو طیارے کو گرانے کے لیے ہوتا ہے مگر اسے دیگر ٹارگٹس کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک منٹ میں تقریباً 120 راؤنڈ فائر ہوتے ہیں۔ یہ شیل سات آٹھ کلو میٹر تک بہ آسانی مار کر سکتا ہے، مگر اس وقت اسے صرف پانچ چھ سو فٹ کی دوری سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ چند سیکنڈ بعد ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ہمارا کنٹینر آگ اور دھوئیں کے ایک بڑے گولے میں تبدیل ہو گیا۔ کنٹینر کے اردگرد موجود درجنوں افراد اس فائرنگ کی زد میں آئے۔

دوسرا منظر اس سے زیادہ ہولناک تھا۔ عارفہ خاتون جوش کے عالم میں ابھی تک دوسرے کنٹینر پر موجود تھیں اور اسے کافی آگے لے گئی تھیں۔ اس کنٹینر پر ایم آر ایل سے

حملہ کیا گیا۔ دو راکٹ کنٹینر کے سامنے والے حصے سے ٹکرائے۔ میں نے عارفہ خاتون کی سفید چادر کے ٹکڑے ہوا میں اڑتے دیکھے۔ یقینی بات تھی کہ عارفہ خاتون کے علاوہ درجنوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ مشتعل ہجوم اب مورچوں تک پہنچ چکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

جب مارے کاٹے گئے لوگ اپنے ہی پیاروں اور اپنے ہی ساتھیوں کی تڑپتی لاشوں کو پھلانگ کر قاتلوں کی کمین گاہوں تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ تاریخ کے ہزارہا صفحات پر رقم ہے اور جب قاتلوں تک پہنچنے والے لاتعداد ہوں تو پھر وہاں لاشیں نہیں گرتیں، پرخچے اڑتے ہیں اور ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جو مناظر ہم نے دیکھے وہ دست بدست لڑائی کے تھے، مگر یہ لڑائی بیس تیس سیکنڈ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکی۔ ہزاروں فٹ اونچی پھنکارتی لہروں اور ریت کی دیواروں کے درمیان لڑائی بھلا کتنی دیر جاری رہ سکتی ہے؟ وہاں ہم نے رائے زل کے فوجیوں اور ایجنسی کے گارڈز کو پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح ہجوم میں اچھلتے اور پاؤں میں روندے جاتے دیکھا۔ ہاں ایسے ہی موقع ہوتے ہیں جب کوئی خاص یونیفارم موت کا لباس بن جاتی ہے۔ اب لوگ جنونی انداز میں ڈی پیلس کے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں یہ دیکھ کر دنگ ہوا کہ ہم سے قریباً ڈیڑھ سو میٹر کی دوری پر ڈی پیلس کا مین گیٹ بند نہیں ہے۔ یہ وہی مضبوط ترین سلائڈنگ گیٹ تھا جسے ریان فردوس نے ڈی پیلس کے دفاع کے لیے ہنگامی طور پر تعمیر کرایا تھا۔ کمانڈر افغانی نے اسی گیٹ کے سامنے اپنی جان دی تھی کیونکہ جب وہ واپس ڈی پیلس میں داخل ہونا چاہتا تھا گیٹ آٹومیٹک طور پر بند ہو گیا تھا۔ آج بھی اندیشہ یہی تھا کہ اس گیٹ کو پار کرنے کے لیے ہمیں سخت کوشش کرنا پڑے گی لیکن اس نہایت نازک موقع پر یہ گیٹ اچانک کھلا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے سیکڑوں پُرجوش افراد کو دیکھا جو اندھا دھند گیٹ کی طرف لپکے چلے جا رہے تھے۔

”کہیں یہ کوئی چال نہ ہو؟“ میرے پاس کھڑے پال کورنی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”اگر چال ہے بھی تو اب ان لوگوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ برستی گولیوں میں عظیم الشان گیٹ تک پہنچ گئے۔ اطراف میں موجود سیکڑوں گرے فوجیوں اور امریکن گارڈز کے ساتھ زوردار دوبدو لڑائی شروع ہو گئی۔ جب ایسا گھمسان کا رن پڑ جائے تو مشین گنیں اور مارٹرز، بوفرز وغیرہ کہاں استعمال ہو سکتی ہیں۔ ہاں چھوٹے ہتھیاروں کے فائر متواتر سنائی دے رہے تھے یا پھر آرمی ڈیگرز اور خنجروں وغیرہ کی چمک نظر آتی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ انیق میرے قریب موجود نہیں ہے۔ میں اسے دیکھ رہا تھا جب راجر نے اپنی ٹیلی اسکوپ میری طرف بڑھائی اور گیٹ کی داہنی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر شاہ زیب! ادھر دیکھو، تمہارا دوست ہے وہاں۔ یقیناً بہادر آدمی ہے۔“

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگا کر اسے فوکس کیا اور تھوڑا دائیں بائیں ہلایا۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔ مجھے وہاں سجاول کی جھلک نظر آئی۔ وہ گھمسان کی لڑائی کا حصہ تھا۔ اس کی پگڑی کھل چکی تھی۔ داڑھی اتر چکی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی مگر شاید خالی ہو چکی تھی۔ وہ اسے کسی برچھی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ رائفل کی سنگین، دوپہر کے سورج کی روشنی میں گاہے بگاہے بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ وہ اس ٹولی میں سب سے آگے تھا جو گرے فوجیوں اور امریکی گارڈز کی صفیں چیر کر گیٹ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔

اور پھر مجھے انیق بھی نظر آیا۔ اس نے سجاول کے کندھے سے کندھا ملا رکھا تھا۔ دست بدست لڑائی میں انیق بھی ایک نہایت خطرناک حریف تھا اور اس کا ثبوت ڈی پیلس کے گیٹ پر مل رہا تھا۔ اس نے میری نظروں کے عین سامنے ایک امریکی گارڈ کے پیٹ میں چھرا گھونپا اور پھر سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔ ”شاباش۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور یہ لفظ انیق اور سجاول دونوں کے لیے تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں زخمی اور لاچار ہونے کے باوجود زخمی اور لاچار نہیں ہوں۔ میں اس لڑائی میں حصہ لے رہا ہوں۔

میرے اردگرد سیکڑوں جانبازوں نے دہرا تہرا حفاظتی حصار قائم کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں ہماری نظر بلیک ہاک گن شپ ہیلی کاپٹرز پر پڑی۔ سابقہ لڑائیوں میں ہم نے ان ہیلی کاپٹرز کو باقاعدہ بم گراتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ ہیلی کاپٹرز کی آمد پُرتشویش تھی۔ وہ نیچی پرواز کرتے ہوئے ڈی پیلس کے گیٹ کی طرف آئے مگر ان کو چلانے والے اندھے نہیں تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ نیچے گھمسان کی دست بدست لڑائی ہو رہی ہے۔ یہاں فائرنگ کر کے یا بم

پھینک کر وہ اپنے ہی چہیتے بھائیوں کے قاتل گردانے جاتے۔ درحقیقت وقت ان کے ہاتھ سے نکلتا چلا جارہا تھا۔

دو تین منٹ بعد ہی ہم دیکھ رہے تھے کہ لہریں لیتا ہوا ایک انسانی سمندر ڈی پیلس کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ ہر طرف ایک ہی نغمے کی گونج تھی۔

ہم نے جی جان سے جینا ہے
اور سینہ تان کے جینا ہے
ہم نے عزم کرلیا...... جنگ میں قدم دھرلیا......

بکتر بند گاڑیاں اب موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں پر جاماجی کے جھنڈے لہرا دیے گئے تھے۔ مجھے ایک بکتر بند گاڑی میں سوار کردیا گیا۔ پال، راجر اور کرنل احرار بھی اسی میں سوار ہوئے۔ بے شمار لوگوں کے حصار میں اس گاڑی نے ڈی پیلس کے گیٹ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ بڑا ولولہ انگیز منظر تھا۔ سیکڑوں پرچم لہرا رہے تھے اور للکاروں سے ڈی پیلس کی دیواریں لرز رہی تھیں۔

ہاں...... یہ صرف ایک جاماجی کی کہانی نہیں تھی۔ یہ ہر اس علاقے اور خطے کی کہانی تھی جہاں آزادی چھینی جاتی ہے اور جبر کو رواج دیا جاتا ہے۔

کچھ دن پہلے یہی ڈی پیلس تھا اور یہی گیٹ تھا جس میں سے رائے زل کی سواری بادِ بہاری بڑے فاتحانہ انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ آج پانسا پلٹ چکا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ ناجائز طور پر کسی کا خون نہ بہے۔ اسی دوران میں میرا ٹیلی فونک رابطہ محترم حاذق ذکری سے بھی ہوگیا۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ صرف ان لوگوں سے لڑا جائے جو اب بھی لڑنا چاہتے ہیں۔

میں نے فوری طور پر جاسم کو بُلایا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ جاسم کے ذریعے یہ ہدایات دو چار منٹ کے اندر سب ناظمین، کمانڈرز اور کرتا دھرتا افراد تک پہنچ گئیں۔

جب ہم ڈی پیلس کے مین گیٹ کے اندر سے گزر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ اس کا ایک دیوہیکل پٹ پورا کھلا ہوا تھا مگر دوسرا تین چار فٹ کے قریب دیوار کے اندر نہیں گیا تھا۔ میں نے کرنل احرار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”کرنل صاحب! مجھے لگتا ہے کہ گیٹ کے میکنزم میں کوئی خرابی ہے...... یا پھر پیدا کی گئی ہے۔“

”آپ کی دوسری بات درست ہے شاہ زیب صاحب! کسی نے عین موقع پر ہماری مدد کی ہے۔“

”کون ہوسکتا ہے؟“

”جو کوئی بھی ہوگا اپنی جان پر کھیلا ہوگا۔ یہاں بہت سخت سیکیورٹی تھی۔“

اسی اثنا میں جاسم سرخ چہرے اور ہانپتی سانسوں کے ساتھ بکتر بند کی کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب صاحب! زیادہ تر لوگ ہتھیار ڈال رہے ہیں بس اِکا دُکا پاکٹس میں (کہیں کہیں) فائرنگ ہو رہی ہے۔ رائے زل اور آقا جان وغیرہ نے خود کو ڈی پیلس کی انیکسی میں بند کرلیا ہے۔ ریان فردوس مرحوم کے کئی قریبی عزیز یرغمال کے طور پر ان کے ساتھ ہیں اور ان میں...... بیگم نورل بھی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اندیشہ درست تھا۔“ میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔

”اور فیصلہ بھی درست تھا جو آپ نے کیا۔“ جاسم نے میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ہاناوانی کو اپنے حفاظتی حصار میں لے کر رائے زل کی اس خباثت کا توڑ کردیا ہے۔“

پال نے پوچھا۔ ”آفیسر لونگ کا کچھ پتا چلا؟“

جاسم بولا۔ ”سب لوگ جانتے ہیں کہ یہاں چپے چپے پر شاہ زیب صاحب کی جو تصویر نظر آرہی ہے...... وہ کیوں نظر آرہی ہے۔ اس تصویر کو لونگ کی وحشت نے ہی وجود دیا ہے۔ لوگ ہر جگہ اس وحشی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”جاسم! ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اسے زندہ گرفتار کیا جائے۔“ میں نے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا جی۔“ وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

ہماری بکتر بند کے شیشے بلٹ پروف تھے۔ اس کے اوپر BMG ٹائپ کی طاقتور مشین گن ماؤنٹ کی گئی تھی۔ ایک بکتر بند ہمارے آگے اور ایک عقب میں تھی۔ یہ تینوں گاڑیاں ہجوم میں سے راستہ بناتی سست روی سے انیکسی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ انیکسی جہاں جاماجی کا قابض حکمران اور ایک شیطان صفت عیار (آقا جان) موجود تھے۔ دور ہی سے پتا چل گیا کہ انیکسی کو چاروں طرف سے پاسبان بریگیڈ کے مسلح افراد نے گھیر رکھا ہے اور پوزیشنیں لی ہوئی ہیں۔ تینوں بکتر بند گاڑیاں انیکسی کے سامنے جا کر رک گئیں۔ گرین فورس کے ایک ون اسٹار آفیسر نے ہمیں ایک موبائل فون مہیا کردیا۔ اس فون پر رائے زل آن لائن تھا۔ وہ اپنی کرخت آواز میں گرج رہا تھا۔ ”میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ بہت سوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا اور ان میں یہ منحوس عورت بھی شامل ہوگی۔“ اس کا اشارہ یقیناً بیگم نسا نورل کی

طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ”رائے زل! تم اس عورت کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ اگر کرو گے تو پھر تمہاری والدہ محترمہ بھی زندہ دفن ہوں گی۔ ان کو بہت شوق ہے نا اپنی کھلی قبر میں راتیں گزارنے کا۔“

چند لمحے فون لائن پر سناٹا رہا پھر رائے زل کی بدلی ہوئی آواز آئی۔ ”کون ہو تم؟ یہ کیا بک رہے ہو؟“

”میں تمہارا باپ شاہ زیب بول رہا ہوں اور تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ تمہاری امی جان ہماری مہمان ہیں۔ بیگم نورل کے بارے میں کچھ بھی بُرا سوچنے سے پہلے اپنی ماں کی بری موت کے بارے میں بھی سوچ لینا۔“

”تم مادرِ محترم کی بات کر رہے ہو؟“ رائے زل کی آواز میرے کان میں گونجی۔

”جی...... اسی محترم کی بات ہو رہی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

چند لمحے تک مدھم کھسر پسر سنائی دی۔ یوں لگا جیسے رائے زل نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کسی سے بات کی ہے۔ پھر اس کی سنگلاخ آواز دوبارہ اُبھری۔ ”تم باسٹرڈ گھس بیٹھیے...... تم اپنی بکواس بند رکھو...... مادرِ محترم کو تمہاری ہوا بھی نہیں چھو سکتی...... اور اب تم وہ سنو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک اس بات سے آگاہ نہیں کہ اسپتال پر گرین فورس کا مکمل کنٹرول ہو چکا ہے اور اس کی ماں ہاناوانی ہماری تحویل میں ہے۔

وہ بغیر کوئی بات سنے تند لہجے میں بولتا چلا گیا۔ ”میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو صرف دس منٹ دیتا ہوں۔ سیڑھیوں کی طرف سے اپنے حرامی ٹٹوؤں کو ہٹا دو۔ ورنہ ان کے جسم میں اتنے سوراخ ہوں گے کہ ڈی این اے کے بغیر لاشیں پہچانی نہیں جائیں گی...... اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں گھس بیٹھیے! بیگم نورل اس کی بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں، بھانجیوں کی لاشوں کے لیے بھی ڈی این اے ٹیسٹ ضروری ہو جائے گا۔ گیٹ لاسٹ...... میں کہتا ہوں گیٹ لاسٹ۔“

اس نے قریب پڑی ہوئی کوئی چیز پٹخ کر توڑ ڈالی تھی۔ یہ آواز بھی فون پر گونجی۔

تب مجھے فون پر وہ آواز سنائی دی جو میرے لیے اس چار دیواری میں منحوس ترین تھی۔ یہ آقا جان کی آواز تھی۔ اس نے گفتگو ایک گالی سے شروع کی اور بولا۔ ”انیکسی کی چھت پر جانا چاہتے ہیں ہم۔ اپنے بندوں کو وہاں سے ہٹا لو۔ ورنہ ہم اس گابھن گائے کا ماس کاٹ کاٹ کر باہر بھیجنا شروع کر دیں گے۔“ آقا جان کی آواز میں درندگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گابھن گائے کے الفاظ وہ یقیناً محترمہ بیگم نورل کے لیے استعمال کر رہا تھا۔

وہ چھت پر جانے کی بات کر رہا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ کوئی ہیلی کاپٹر انہیں وہاں سے اٹھا لے گا۔

میں نے جاسم سے کہا۔ ”ان حرام زادوں کو یقین نہیں آ رہا کہ ہاناوانی ہمارے پاس ہے۔ اسپتال میں رابطہ کرو اور اس حرافہ کی آواز اس کے بیٹے کو سناؤ۔“

جاسم نے فوراً موبائل پر اسپتال میں رابطہ کیا۔ وہاں گرین فورس کے کسی میجر سے جاسم کی بات ہوئی۔ میجر نے جاسم کو بتایا کہ ہاناوانی کو حفاظت اور رازداری کی غرض سے پہلی منزل کے ایک ساؤنڈ پروف سیٹنگ روم میں رکھا گیا ہے۔ وہ ابھی اس سے بات کرواتا ہے۔

جاسم بولا۔ ”ہم سے بات کروانے کی ضرورت نہیں میجر! میں تمہیں ایک فون نمبر دے رہا ہوں۔ یہ رائے زل یا اس کے پرسنل سیکریٹری کا ہے۔ تم ہاناوانی کی بات اس نمبر پر کرواؤ۔ لیکن دھیان رہے کہ ہاناوانی اپنی لوکیشن نہ بتانے پائے اور نہ ہی کوئی غیر ضروری بات کر سکے۔“

”اوکے جناب ناظم۔“ میجر کی آواز فون کے اسپیکر پر سنائی دی۔

اسی اثنا میں ہم نے ایک تکلیف دہ منظر دیکھا۔ دس بارہ سالہ ایک بچی انیکسی کی ایک کھڑکی توڑتی ہوئی باہر آ گری۔ وہ خود نہیں آئی تھی، اسے پھینکا گیا تھا۔ اس کا سینہ خون سے رنگین تھا۔ ہمیں گولی کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بچی کو خنجر وغیرہ گھونپا گیا ہے۔

”اوہ گاڈ!“ جاسم نے سر پکڑ لیا۔ ”یہ بیگم نورل کی لے پالک بیٹی ہے۔ بیگم جی کو بے حد پیار تھا اس سے...... ویری ویری سیڈ۔“

لڑکی غالباً باہر گرنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو چکی تھی۔ بس اس کے پاؤں میں تھوڑی بہت حرکت باقی تھی۔ اس کا خوب صورت فراک، تصویرِ حسرت بن کر ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

جاسم کے فون پر بیل ہوئی۔ دوسری طرف رائے زل ہی تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا وہ بے رحم ریچھ جس کی آواز کثرتِ شراب نوشی سے مستقل طور پر بھرائی رہتی تھی۔ عورت بازی اس کی شناخت تھی اور ایجنسی کی یاری نے اسے سیاہ سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔ وہ دہاڑا۔ ”یہ پہلا نمونہ

ہے۔ سیڑھیوں پر تمہارا کوئی پالتو نظر نہیں آنا چاہیے ورنہ یہ بدذات عورت تڑپنا شروع کردے گی۔'' اس کا اشارہ پھر بیگم نورل کی طرف ہی تھا۔

فون پر بیگم نورل کے رونے کی اور بولنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ان کا یہ نوحہ یقیناً اس بچی کے لیے ہی تھا جو ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر، شیشے کی کرچیوں کے درمیان بے سدھ پڑی تھی۔

میں نے سجاول کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو ویسے ہی سرخ رہتی تھیں، بالکل انگاروں کی طرح دہک گئی تھیں۔ بیگم نورل نے اسے بھائی کہا تھا...... بے شک سجاول نے اسے بہن نہیں کہا تھا مگر میں جانتا تھا، وہ دل سے اس کی عزت کرتا ہے۔

میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ڈی پیلس کے وسیع سبزہ زاروں اور اس کی مختلف عمارتوں کے گرد ہزاروں افراد موجود تھے۔ خاص طور سے انیکسی کی وسیع عمارت کو لاتعداد مشتعل افراد نے گھیرا ہوا تھا۔ ناظم باذان اور عارفہ خاتون کی موت نے انہیں سراپا آتش بنا رکھا تھا۔ وہ ایک اشارے پر اندر گھسنے اور قاتلوں کی تکا بوٹی کرنے کو تیار تھے۔ میں نے رائے زل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں وارننگ دیتا ہوں، تمہاری ماں مرنے سے پہلے تمہیں بدترین بددعاؤں سے نوازے گی۔ اگر ابراہیم کی ماں کے ساتھ کچھ ہوگا تو اس کا بدلہ تمہاری ماں کو چکانا ہوگا...... ابھی اور اسی وقت......''

یہی وقت تھا جب جاسم کے دوسرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد ہوگیا ہے۔ اس نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں فی الحال رائے زل سے گفتگو منقطع کردوں۔

میں نے لائن کاٹ دی۔ جاسم دوسری طرف سے کی جانے والی بات بغور سن رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی چمک محسوس ہوئی۔ بات ختم کر کے وہ بولا۔ ''اچھی خبر نہیں ہے شاہ زیب صاحب!''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''رائے زل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہاناوانی ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' میں حیران رہ گیا۔

''جس کمرے میں اسے بند کیا گیا تھا، وہاں پانچ بندوں کی لاشیں پڑی ہیں، چھٹا غائب ہے اور ہاناوانی بھی۔'' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ بولا۔ ''لگتا ہے کہ ہاناوانی نے کچھ کیا ہے...... ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں...... وہ بے حد خطرناک اور عیار عورت ہے...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گرین فورس کے آفیسر نے اپنے ساتھیوں کو خود ہلاک کیا ہے اور ہاناوانی کو وہاں سے نکال لے گیا ہے۔''

میرے تصور میں وہی دو چمکیلی آنکھیں گھوم گئیں جن کو ایک سیاہ شیشوں والی عینک ڈھانپے رکھتی تھی۔ ہاناوانی کی پہچان اس کی وہ پُراسرار صلاحیتیں تھیں جن کی بنا پر وہ اپنے دوستوں دشمنوں کو زیر کرتی تھی...... اور ڈاکٹر ماریہ نے مجھ سے کہا تھا (اور محترم ذکری نے بھی) کہ ہپناٹزم ایک مسلّمہ سائنسی حقیقت ہے۔ جدید دور میں اس کے نئے رخ سامنے آرہے ہیں۔ یہ وہ جادو ہے جس کا تعلق براہِ راست انسان کے دل و دماغ سے ہے۔

تو کیا ہاناوانی کی آنکھوں کے جادو نے ایک بار پھر کام کر دکھایا تھا...... اور وہ ایسا کچھ کر گزری تھی، جس کی توقع ہم میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔ بے پناہ حیرت کے ساتھ غم و غصے کی شدید لہر بھی میرے اندر سے اٹھی اور اس عورت کے لیے نفرت کا دریا سا سینے میں بہہ گیا۔

جاسم کے فون کی بیل ایک بار پھر کریہہ آواز میں پکارنے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف حسبِ توقع رائے زل ہی تھا۔ اس کی آواز اسپیکر سے نکل کر بکتر بند کے اندر سنائی دے رہی تھی۔ ''کہاں مر گئے ہو...... سامنے آؤ...... تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے حرام کے جنو، میں صرف دو منٹ بعد اس عورت کے گوشت کا ایک اور ٹکڑا کاٹنے والا ہوں......''

اب اس کی زبان کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ گوشت کا ٹکڑا کاٹنے سے اس کی مراد کسی اور بچے یا نوجوان کو مارنا تھا۔ ویسے یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وقت پڑنے پر وہ سچ مچ بیگم نورل یا کسی اور یرغمالی کا گوشت کاٹنا شروع کر دیتا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''تم بدذات، تم بات نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔'' وہ پھنکارا۔ ''تمہاری آواز سن کر میرے دماغ میں چنگاریاں چھوٹ جاتی ہیں۔ کسی اور کتے کو فون پکڑاؤ۔''

''تمہیں مجھ سے ہی بات کرنا پڑے گی رائے زل...... کیونکہ یہاں اور کوئی ایسا نہیں جو تم جیسے پلید جانور کی غلیظ آواز سننے کو تیار ہو، بولو کیا چاہتے ہو؟''

وہ دہاڑا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ تم ایک اجنبی گھس بیٹھیے ہو۔ میں تم پر اور تمہاری شکل پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں...... میری بات کسی مقامی سے کرواؤ۔''

''مقامیوں نے ہی، تمہارے گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے مجھے منتخب کیا ہے۔''

وہ مغلظات بکنے لگا۔ آخر میں بولا۔ ''تم جیسے خارش زدہ فائٹر میرے سامنے کیڑے مکوڑے ہیں۔ تمہاری حیثیت میرے لیے گندی نالی کے کیڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ دفان ہو جاؤ یہاں سے ورنہ بہت شرمندگی والی موت مرو گے......'' اس کی آواز طیش کی شدت سے لرز رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے مرتبے کا نہیں سمجھ رہا تھا مگر وہ جانتا نہیں تھا کہ مرتبہ اور معیار بدل چکے ہیں۔ وقت کی باگیں اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہیں۔

میں نے پھر بولنا چاہا۔ ابھی میں نے ''سنو رائے زل......'' ہی کہا تھا کہ آٹومیٹک رائفل کی لرزہ خیز ''تڑتڑ'' گونجی۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آ کر ہماری بکتر بند سے ٹکرائی۔ بکتر بند کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے شیشے بلٹ پروف تھے، مگر ایک کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی، برسٹ کی ایک گولی اندر گھسی اور انیق اور کرنل احرار کے سروں کو چھوتی ہوئی ''روف لائٹ'' سے ٹکرائی۔ لائٹ چکنا چور ہو گئی۔ اس کی کچھ کرچیاں میری گردن میں لگیں اور گردن پر خون کی نمی کا احساس ہوا۔ انیق نے ''پاورونڈو'' فوراً بند کر دی تھی۔ ہم سب نیچے جھک گئے۔ میرا دایاں ہاتھ اپنی گردن پر تھا اور ہاتھ پر بھی خون کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ بکتر بند کے اوپر لگی ہوئی مشین گن سے جوابی برسٹ چلایا گیا مگر یہ گن مین کی اضطراری حرکت تھی۔ اس کے سامنے کوئی نشانہ نہیں تھا۔ اس نے انیکسی کی سپاٹ دیوار پر گولیاں چلائی تھیں۔

فون کے اسپیکر پر بھرائی ہوئی آواز والا رائے زل جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے...... چلے جاؤ میرے سامنے سے...... اس ہیجڑے ابراہیم کو لاؤ میرے سامنے...... یا اس حرام زادی قسطینا کو...... نہیں تو میں چھلنی کر دوں گا سب کو...... ایک کو نہیں بخشوں گا۔''

اس کے لہجے میں اب ایک جابر حکمران کی جگہ جنونی قاتل بول رہا تھا۔ اس کا پُرتکبر انداز گواہ تھا کہ وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کو چیونٹیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

اسی دوران میں کرنل احرار کے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف رضاکار کمانڈر زمان بول رہا تھا۔ اس نے سخت گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کرنل صاحب! کیا واقعی شاہ زیب صاحب کو گولی لگ گئی ہے؟''

''نہیں، نہیں۔'' کرنل جلدی سے بولا۔ ''وہ بالکل محفوظ ہیں۔ بکتر بند پر برسٹ چلایا گیا تھا۔ ایک اندرونی لائٹ ٹوٹنے سے ان کی گردن پر معمولی زخم آیا ہے۔''

''کیا...... آپ...... کچھ چھپا تو نہیں رہے؟'' کمانڈر کی آواز کانپ رہی تھی اور اس میں اب بھی اندیشے تھے۔

''نہیں، شاہ زیب صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔''

''لیکن یہاں تو افواہ پھیل گئی ہے کہ...... خدانخواستہ...... ان کی زندگی کو...... نقصان پہنچ گیا ہے؟''

پس منظر میں فلک شگاف نعرے اور للکارے سنائی دے رہے تھے۔ میں نے مداخلت کی اور سیل فون پر جھک کر کہا۔ ''نہیں کمانڈر۔ Panic ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ ہم اندر والوں سے بات کر رہے ہیں۔''

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ہم نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ میں پھر وہی بات دہراؤں گا۔ اس دن مجھے پہلی بار پتا چلا کہ لوگوں کے بڑے بڑے مشتعل اجتماع کس طرح سرکش طوفانی ریلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انسانوں کا غیظ و غضب کس طرح بلند دیواروں کو ملیامیٹ کرتا ہے، اور اپنے راستے خود بنا لیتا ہے۔ رائے زل جس شخص سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا، وہ لاتعداد لوگوں کے لیے اہم ہو چکا تھا، اس کی زندگی کو نقصان پہنچنے کی خبر نے ہزاروں کے مجمع میں ایسی لہر پیدا کی جسے روکنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

اور واقعی وہ منظر ایک تند و تیز آبی لہر جیسا ہی تھا۔ انیکسی کی شمالی جانب کے لوگ انیکسی کی چار دیواری سے بمشکل پچاس میٹر دور تھے۔ ان میں پاسبان بریگیڈ کے مسلح جانباز اور ہتھیار بند رضاکار بھی تھے۔ یہ لوگ گولی کی رفتار سے انیکسی کی طرف بڑھے۔ یہ دس بیس نہیں تھے...... سو دو سو بھی نہیں تھے۔ یہ ہزاروں میں تھے مگر فردِ واحد کی طرح حرکت کر رہے تھے...... اور یہ منظر دیکھنے لائق تھا۔

انیکسی کے اندر موجود افراد نے گولیاں چلائیں۔ یقیناً یہ بدحواسوں کی فائرنگ تھی اور ان بدحواسوں کو زیادہ وقت نہیں ملا۔ بمشکل آٹھ دس سیکنڈ۔ ان گنت لوگ شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور پلائی کے دروازے توڑ کر انیکسی میں گھس گئے۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔

اب ہمارا اپنی جگہ رکنا پھر بے کار تھا۔ میری ہدایت

پر ڈرائیور نے اس اسپیشل بکتر بند گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھایا اور ہم بھی ایک بڑے چوبی دروازے کو توڑتے ہوئے انیکسی میں گھس گئے۔ میں نے بہت سے خوش پوش بچوں اور عورتوں کو دیکھا۔ وہ اندرونی حصے سے نکلے تھے اور چلاتے ہوئے مختلف اطراف میں راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ میں انہیں شکلوں سے جانتا تھا۔ ان میں زیادہ کا تعلق شاہی فیملی ہی سے تھا۔ ان میں سے دو چار زخمی بھی تھے۔ میں اس میدانِ کارزار کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ آج سے چند ماہ پہلے جب میں چاند گڑھی میں تھا، میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس گاؤں کی خاموش فضا سے نکل کر ایک ایسی جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ میں ان مسافتوں کا راہی تو نہیں تھا۔ میں تو پاکستان پہنچا تھا انڈر ورلڈ کے کچھ دشمنوں سے اوجھل ہونے کے لیے...... اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دلربا چہرے کی تلاش میں۔ یہ دونوں مقاصد تو بہت پیچھے رہ گئے تھے اور میں گھر گیا تھا ایک ”باقاعدہ جنگ“ کے شعلوں میں۔ شاید اسی کو حالات کی من مرضی اور رخشِ حیات کی سرکشی کہتے ہیں۔

☆☆☆

انیکسی کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دستی بموں کے دھماکے بھی سنائی دیے۔ ہر طرف دھوئیں اور بارود کی بو تھی۔ میری نگاہ سجاول اور انیق پر پڑی۔ ایک بار پھر دونوں اکٹھے نظر آ رہے تھے۔ سجاول کے سامنے ٹھہرنا کسی عام شخص کے بس کا روگ نہیں تھا جو اس کا ایک طوفانی مکا کھا لیتا تھا، دوسرے کی ”ڈیمانڈ“ نہیں کرتا تھا۔ انیق کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی چینی رائفل تھی۔ میں نے اسے ایک ستون کی اوٹ میں دیکھا۔ وہ گاہے گاہے اوٹ سے نکل رہا تھا اور ایک چھوٹا برسٹ چلا کر پھر سے اوٹ میں ہو جاتا تھا۔ وہ ایک خطرناک جگہ پر تھا۔ میری دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔

کرنل احرار بھی دلیرانہ انداز میں اس مار دھاڑ میں شریک ہو چکا تھا۔ تاہم جاسم میرے پاس بکتر بند کے اندر ہی تھا۔ وہ بولا۔ ”ادھر دیکھیے شاہ زیب صاحب! ایک غدار کا انجام۔“

میں نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بالکل یقین نہیں آیا کہ میں حقیقت میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی ”ہارر“ فلم کا سین یا جاگتی آنکھوں کا خواب لگتا تھا۔ کمانڈر راوان کا سر ایک رائفل کی سنگین پر ٹنگا ہوا تھا اور درجنوں لوگ اس رائفل کے اردگرد دیوانہ وار ناچ رہے تھے، کسی رضا کار کے برچھے نے یہ سر تن سے جدا کر کے سنگین پر ٹانگ دیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد جاسم بھی باہر نکل گیا۔ اب میں بکتر بند میں اکیلا تھا۔

یکایک میری نگاہ ہال کے آخری سرے پر ایک ایسے منظر پر پڑی جس نے مجھے سرتاپا جھنجوڑا۔ یہ بس ایک جھلک ہی تھی جو میں نے دیکھی۔ مگر یہ جھلک بھی سینہ چیرنے کے لیے کافی تھی۔ میں نے دیکھا دو تنومند افراد ایک عورت کو بالوں اور بازو سے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف اوجھل ہو گئے۔ ان میں سے ایک یقیناً وہی فربہ اندام شیطان تھا جسے لوگ رائے زل کے نام سے جانتے تھے۔

شدید ترین افراتفری میں کسی کی نظر شاید ہی اس منظر پر پڑی ہو۔ میں نے پاور ونڈو کھولی اور سینے کی پوری طاقت سے پہلے جاسم اور پھر انیق کو پکارا مگر ان تک میری آواز نہیں پہنچی۔ اسی دوران میں عین اسی مقام پر دستی بم کا ایک دھماکا ہوا جہاں میں نے چند لمحے پہلے انیق کو دیکھا تھا۔ طاقتور دستی بم تھا۔ شعلے کے ساتھ دھواں پھیلا اور میں نے انسانی گوشت کا ایک لوتھڑا بکتر بند گاڑی کی ونڈ اسکرین سے چپکتے دیکھا۔ یہ کس کا لوتھڑا تھا...... مرد کا تھا عورت کا...... یا پھر...... اس سے آگے میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور میرے پاس کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں جان چکا تھا کہ رائے زل اور شاید آقا جان بھی بیگم نورل کو لے کر چھت پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ بیگم نورل کو گن پوائنٹ پر رکھ کر یہاں سے راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔

اب یہ منٹوں کا نہیں شاید سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ مجھ میں اتنی سکت ہرگز نہیں تھی کہ میں بکتر بند سے نکلتا۔ برستی گولیوں میں اس طویل ہال کمرے کو پار کرتا اور سیڑھیوں تک پہنچ سکتا۔ یکایک میری نگاہ دائیں جانب المونیم کے دو چھوٹے دروازوں کی طرف اٹھ گئی۔ میں ایک لمبے عرصے تک اس انیکسی کا مقیم رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان دروازوں کے ساتھ ہی ایک لفٹ بھی موجود ہے۔

میں اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے بکتر بند سے اُترا اور جھک کر چلتا ہوا (خود کو گھسیٹتا ہوا) المونیم کے دروازوں تک پہنچ گیا۔ دو قدم آگے دائیں جانب لفٹ کا سلور کلر دروازہ موجود تھا۔ میں لفٹ میں گھس گیا اور ٹاپ کا بٹن دبا دیا۔ بکتر بند سے نکلتے ہوئے ایک M-16 رائفل میں نے اٹھا لی تھی۔

لفٹ نے مجھے پانچ چھ سیکنڈ میں چوتھی منزل کی وسیع و عریض چھت پر پہنچا دیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ ہوا کہ یہاں ایک اوٹ میں چھوٹے سائز کا سرخ اور سیاہ آرش ہیلی

کاپٹر پہلے سے موجود تھا۔ دونوں تنومند افراد بیگم نورل کو بے دردی سے سر کے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف لے جارہے تھے۔ ان میں سے ایک وہی درندہ صفت رائے زل تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین پسٹل تھا۔ دوسرا شخص رائے زل کا کوئی کزن ہی لگتا تھا، کیونکہ وہ بھی اسی کی طرح فربہ اندام اور مکروہ صورت تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ تب میری نگاہ آقا جان اور اس کے دو امریکی گارڈز پر پڑی، وہ بھی رائے زل کے ساتھ ہی راہِ فرار اختیار کررہے تھے۔

سب سے پہلے آقا جان کی منحوس نگاہ ہی مجھ پر پڑی تھی۔ اس نے انگلی میری جانب سیدھی کی اور چلایا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر اس کی بات کا مطلب واضح تھا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک چوکور ستون کی آڑ لے کر رائے زل کو نشانے پر رکھ لیا۔ ”میں آگیا ہوں رائے زل...... اور میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گا۔“ میں نے پورے یقین سے اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے کہا۔

میں نے رائے زل اور اس کے کزن کو بُری طرح چونکتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے مجھے آقا جان کی طرح دیکھا نہیں تھا مگر میری آواز وہ ضرور سن رہے تھے اور شاید M-16 کی خوفناک نال بھی انہیں نظر آرہی تھی۔ مجھے ایڈوانٹیج یہ تھا کہ میں آڑ میں تھا اور وہ لوگ کھلی جگہ پر۔ ہیلی کاپٹر کا پنکھا گھومنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کی آواز بڑھتی جارہی تھی اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کے لباس پھڑپھڑانے لگے تھے۔

رائے زل نے اپنے مشین پسٹل کی نال بیگم نورل کی کنپٹی سے لگادی اور دہاڑا۔ ”تم مجھے نہیں روک سکتے...... کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔ اگر روکنا چاہتے ہو تو پھر اس کی کم از کم قیمت اس بدذات بڈھی کی موت ہے...... اس کی موت ہے۔“

اس نے اتنے زور سے مشین پسٹل کا بیرل بیگم نورل کی کنپٹی میں گھسایا کہ وہ بے ساختہ چلّا اٹھیں۔ ان کی حالت بُری تھی۔ چغا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے پر گہری خراشیں تھیں۔ وہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔ میں نے انہیں کبھی حجاب کے بغیر نہیں دیکھا تھا مگر آج ان کے چاندی کے تاروں والے بال پنکھے کی ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کا ایک بازو کندھے تک عریاں ہو رہا تھا۔

اب آقا جان اور اس کے دونوں گورے گارڈز نے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ ستمبر 2017ء
کی جھلکیاں

متنبی
اس شاعر کا زندگی نامہ
جس نے نبوت کا دعویٰ کردیا تھا

روایت شکن
ان لوگوں کا تذکرہ جنہوں نے
علم کی شمع روشن کی

لیڈی کلر
اس اداکار کی حالاتِ زندگی
جو لڑکیوں کا پسندیدہ تھا

پرائی کوکھ
ایسے قصے مشرق میں رونما نہیں ہوتے ہیں

اس کے علاوہ
بھی بہت سی سچ بیانی، ناقابلِ
فراموش واقعات، سچے قصے

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

بھی اسمارٹ ہیلی کاپٹر کی اوٹ میں جا کر اپنی رائفلیں میری طرف سیدھی کر لی تھیں۔ آقا جان کی چال میں اب بھی لنگڑاہٹ موجود تھی۔ یہ لنگڑاہٹ اس چھلانگ کی نشانی تھی جو جلسہ گاہ میں میری فائرنگ کے وقت آقا جان نے جان بچانے کے لیے اسٹیج پر سے لگائی تھی۔

مجھے رائے زل کی آنکھوں میں جو جنون نظر آیا وہ گواہی دے رہا تھا کہ اگر وہ مرے گا تو بیگم نورل کی موت بھی ساتھ ہی واقع ہو گی۔ اس نے اپنی فربہ انگلی مشین پسٹل کی سیاہ لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک ہلکا سا دباؤ کئی مہلک گولیاں بیگم نورل کے سر میں اتار سکتا تھا۔

مقامی لیڈروں میں قسطینا کے بعد بیگم نورل ہی وہ واحد ہستی تھی جسے لوگ دل و جان سے چاہتے تھے اور جو جاماجی کا شیرازہ بکھرنے سے بچا سکتی تھیں۔ ان کی زندگی کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔

اب میں اکیلا نہیں رہا تھا۔ میرے درجنوں ساتھی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں مجھے سجاول، اور کرنل احرار بھی دکھائی دیے۔ ہیلی کاپٹر کو دو طرف سے نشانے پر لے لیا گیا تھا۔ رائفلیں اور گنز تنی ہوئی تھیں اور نگاہوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔ ٹارگٹ بھی سامنے تھا اور مجبوری بھی...... اور مجبوری کوئی معمولی نہیں تھی وہ بیگم نورل تھیں، ان کا زندہ رہنا ضروری تھا۔

رائے زل نے بیگم نورل کو گن پوائنٹ پر رکھا اور اپنے فربہ اندام کزن کو ہیلی کاپٹر میں گھسنے کا اشارہ کیا۔ وہ الٹے قدموں چلتا ہوا ہیلی کاپٹر کے اندر چلا گیا۔ اب رائے زل بھی بیگم نورل کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا الٹے قدموں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

بیگم نورل نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا۔ ”میری پروا نہ کرو...... تمہیں اللہ کا واسطہ ہے میری پروا نہ کرو۔ مار دو اس کو...... یہ قاتل ہے عزت مآب کا...... یہ قاتل ہے کمال کا...... اور...... اور اس نے تڑپا تڑپا کر مارا ہے میرے بے شمار بچوں کو اور بھائیوں کو...... اسے جانے نہ دو......“

بیگم نورل کی آواز گلے میں گھٹ گئی...... کیونکہ رائے زل نے اپنی توانا کلائی کا بے رحم دباؤ بیگم نورل کی گردن پر بڑھا دیا تھا۔ سوتیلی ہی سہی لیکن وہ اس کی ماں تھیں اور کچھ بھی نہ ہوتیں تو بھی وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ رائے زل بڑی وحشت سے اور بے حد توہین آمیز انداز میں انہیں اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔ میری نگاہ جیسے اس کی فربہ انگلی پر جم کر رہ گئی تھی۔ وہ اس انگلی کو سیاہ ٹریگر پر ایک جنبش بھی دیتا تو موت کے شعلے آزاد ہو جاتے۔

رائے زل جنونی انداز میں ہنسا اور دہاڑا۔ ”اکیلا نہیں مروں گا۔ میں بتا دوں اکیلا نہیں مروں گا...... حرام زادو اس کی زندگی چاہتے ہو تو میرا راستہ چھوڑنا ہو گا۔“

وہ بیگم نورل کو کھینچتا ہوا ہیلی کاپٹر کے دروازے تک لے گیا۔ یہ خاص قسم کا کم وزن اسمارٹ ہیلی کاپٹر آرٹش ساخت کا تھا۔ ایسے ہیلی کاپٹر مضبوط چھتوں پر آسانی سے لینڈ اور پرواز کر سکتے ہیں۔ اب بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ آقا جان اور اس کے دونوں سفید فام گارڈز بھی ہیلی کاپٹر کے قریب سمٹ آئے تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ وہ حاوی ہو چکے ہیں، جب تک بیگم نورل گن پوائنٹ پر ہیں، ہم میں سے کوئی گولی نہیں چلا سکتا۔ نہ اب...... نہ ہیلی کاپٹر کے پرواز کرنے کے بعد۔

یہ واقعی بے بسی کے لمحے تھے۔ سجاول کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ کمانڈر زمان اور کرنل احرار بھی دم بخود تھے۔ جاسم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر کو ہولے سے نفی میں ہلایا...... اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

بیگم نورل کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ اب بھی پکار رہی تھیں۔ ”یہ قاتل ہے۔ اس کو جانے نہ دو...... اسے مار دو......“

درجنوں رائفلیں ”موت“ اگلنے کے لیے تیار تھیں مگر ان کے ٹریگرز دبانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ فتح کے ابرِ کرم کے اندر سے شکست کی بجلی لشکارے مارنے لگی تھی۔ رائے زل کے چہرے پر جنون تھا اور ایک خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔

یکایک میں نے کچھ محسوس کیا۔ منظر میں کچھ تبدیلی آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بیگم نورل نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی ہے۔ ان کی شہادت کی انگلی سیدھی تھی۔ پھر جیسے فلم کے سلوموشن میں چیزیں آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں، میں نے دیکھا کہ وہ اپنی انگلی کو اوپر کی طرف اٹھا رہی ہیں۔ انگلی اور مشین پسٹل کا فاصلہ کم ہوتا چلا گیا۔ وہ سلوموشن نہیں تھا لیکن مجھے سلوموشن ہی کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا یا کرتا...... بیگم نورل اپنی انگشتِ شہادت کو ٹریگر تک پہنچا چکی تھیں۔ میں نے ان کی انگلی کو رائے زل کی فربہ انگلی کے اوپر دیکھا۔ دوسرے لفظوں میں اب ٹریگر پر دو افراد کا کنٹرول تھا۔ ایک وہ جو

ڈرانا چاہتا تھا اور ایک وہ جو ڈر کے بت کو توڑنا چاہتا تھا اور کامیاب اسی نے ہونا تھا جو ڈر کے بت کو توڑنا چاہتا تھا اور وہ کامیاب ہوا۔ خوفناک آواز سے مشین پسٹل سے گولیاں نکلیں۔ بیگم نورل کا سر بُری طرح دائیں بائیں ہلا۔ خون کی ایک پچکاری سی دوسری کنپٹی سے نکلی۔ شوہر اور بیٹے کی قربانی کے بعد بیگم نورل نے اپنی جان کا نذرانہ بھی اپنے ہاتھوں سے پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے ہمارے اور رائے زل جیسے خطرناک شخص کے درمیان سے وہ رکاوٹ ہٹادی تھی جو اس کے لیے ایک نئی زندگی کی نوید بن سکتی تھی۔

ان ناقابلِ فراموش لمحوں میں رائے زل کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ جیسے بل میں گھسنے والے کسی موذی جانور کو دم سے پکڑ کر کھلے میدان میں پھینک دیا گیا ہو۔ سکتے کے چند لمحے گزر گئے تو رائے زل نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ اپنا پسٹل سیدھا کیا لیکن وہ ہمیں جتنا نقصان پہنچا سکتا تھا، پہنچا چکا تھا...... اب اس کی باری تھی۔ میرے ہاتھوں میں موجود M-16 گن کا سنگل شاٹ سیدھا اس کی شہ رگ میں لگا۔ درجنوں رائفلوں نے پلک جھپکتے میں رائے زل اور اس کے ساتھیوں کو بھون کر رکھ دیا۔ فقط ایک شخص اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا اور وہ آقا جان تھا۔ اس عیار نے ہمیشہ کی طرح پھرتی دکھائی تھی اور پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

مگر ابھی ہیلی کاپٹر فضا میں دس بارہ فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوا تھا کہ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک پرچھائیں سی اڑ کر ہیلی کاپٹر کے ادھ کھلے دروازے میں داخل ہوگئی۔ ہم میں سے کوئی ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا۔ یہی لگا جیسے یہ کوئی رکھوالی کا کتا ہے لیکن وہ کتا نہیں تھا۔ وہ ایک اور جانور تھا۔

بعض اوقات، واقعات کے تسلسل میں کچھ کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو وقتی طور پر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، لیکن وہ موجود رہتے ہیں...... اور بھی بھی حیران کن طور پر پھر سے نمودار ہوتے ہیں۔ جو پرچھائیں، آقا جان کے پیچھے ہیلی کاپٹر کے اندر گھسی تھی وہ کسی کتے یا دوسرے پالتو جانور کی نہیں تھی...... وہ لوسی کی تھی۔ ازمیر طیب کی وہی پالتو بندریا...... جولیہ کے پارا ہاؤس میں اور پھر یہاں ڈی پیلس میں ہر جگہ گھومتی پھرتی نظر آتی تھی۔ خانساماں ازمیر طیب کی موت کے بعد اسے میں نے کئی مرتبہ اداس بیٹھے دیکھا تھا...... ست اور بیزار...... لیکن آج وہ اچانک نمودار ہوئی تھی اور بجلی کی طرح کوندی تھی۔

وسیع چھت پر موجود گرین فوجیوں میں سے دو کے پاس راکٹ لانچر موجود تھے۔ انہوں نے لانچر کندھوں پر رکھے اور ہیلی کاپٹر کو ''ہٹ'' کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے پکار کر انہیں منع کیا۔ میں دیکھ رہا تھا اور کرنل احرار وغیرہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر بیس پچیس فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہو سکا۔ وہ بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی کھلبلی مچی تھی پھر وہ ایک دم گھوم کر مزید نیچے آگیا۔ اس کا دروازہ ابھی تک پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ آقا جان اور لوسی ایک دوسرے سے گتھم گتھا چھت پر گرے۔ ہیلی کاپٹر نے دوبارہ اوپر اٹھنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔

راکٹ لانچر والوں نے لانچر دوبارہ اپنے کندھوں پر رکھ لیے تھے۔ ان میں سے ایک نے پکار کر کرنل احرار سے پوچھا۔ ''سر! ہم ہٹ کریں؟''

کرنل احرار نے میری طرف دیکھا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ تب تک بات کرنل کی سمجھ میں بھی آچکی تھی۔ اس نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ''ٹھہرو ابھی۔''

میں نے دیکھا گرین فوجیوں نے آقا جان کو چھت کے کنکریٹ پر الٹا لٹایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گنجے سر پر بے شمار خونی خراشیں تھیں۔ شرٹ بھی پھٹ چکی تھی۔

''ہتھکڑی لگاؤ۔'' کرنل احرار نے پکار کر حکم دیا۔

اسے ہتھکڑی لگائی جانے لگی۔

ہیلی کاپٹر اب کچھ فاصلے پر جا چکا تھا مگر راکٹ اب بھی اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتے تھے۔ کرنل احرار نے ایک بار پھر مشورہ طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔ اس مرتبہ میں نے کرنل کی توقع کے مطابق اثبات میں سر ہلایا۔

لانچر والے نے بڑے تربیت یافتہ انداز میں ایک گھٹنا فرش پر ٹیک کر اور ''ویو فائنڈر'' میں دیکھتے ہوئے نشانہ لے لیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مخصوص انداز میں الٹی گنتی گنی اور پھر فائر کر دیا۔ ہیلی کاپٹر بمشکل 100 میٹر دور گیا تھا۔ راکٹ اس کے پچھلے حصے میں لگا۔ اس کی دم جھڑ کر گری۔ سپاہیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ہیلی کاپٹر چرخی کی طرح گھوما اور پھر دھماکے سے بلاسٹ ہوگیا۔ اس کا کچھ ملبا ساحل کی طرف گرا۔ کرنل احرار نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اس نے تعریفی نظروں سے کیوں دیکھا ہے (بے شک وہ ایک تجربہ کار فوجی آفیسر تھا لیکن شدید تناؤ کے ان لمحات میں میرے ذہن نے اس کے ذہن سے تھوڑا سا بہتر کام کیا تھا۔ اگر ہم شروع میں ہی ہیلی

کا پٹر کو ہٹ کر دیتے تو ہو سکتا تھا کہ اس کا ملبا کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈی پیلس کے اندر گرتا اور جانی نقصان ہوتا)

ہم بیگم نورل کی لاش کی طرف بڑھے۔ سجاول آگے تھا۔ اس نے بڑے دکھی انداز میں بیگم کی خونچکاں لاش کو اپنی پگڑی کے وسیع کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ پھر وہ ایک طرف جھپٹا۔ اس نے ایک رضا کار کے ہاتھ سے کٹار نما وزنی برچھا چھینا اور رائے زل کی طرف گیا۔ شاہی لباس والے فربہ اندام رائے زل پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی مگر اس نے بلٹ پروف پہن رکھی تھی۔ اس بلٹ پروف کے باوجود اسے تین چار گولیاں تو ضرور لگی تھیں۔ وہ ابھی سانس لے رہا تھا۔ مشتعل افراد اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے بیگم نورل کی لاش سے دور لے گئے تھے۔ سجاول لپکا۔ اس نے رائے زل کے سر کے ''خون آلود بال'' مٹھی میں جکڑے اور برچھے کے ایک ہی طوفانی وار سے اس کا سر، اس کے تن سے جدا کر دیا...... بالکل جدا...... یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ پھر ایک اور ڈرامائی منظر سامنے آیا۔ چند افراد نے رائے زل کے ''سر کٹے دھڑ'' پر سے شاہی چغا پھاڑ دیا اور اس کے تھل تھل کرتے چربی دار سینے پر کچھ تلاش کرنے لگے۔ تب انہوں نے یکبارگی فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، ان لوگوں نے رائے زل کے بدن پر کوئی نشانی دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی تھی کہ اس بار واقعی اصلی رائے زل نشانہ بنا ہے۔

میرے سینے میں ایک اضطراب سا تھا۔ مجھے انیق نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے بڑی خطرناک جگہ پر دیکھا تھا...... اور پھر اسی جگہ پر ہینڈ گرینیڈ کا سماعت شکن دھماکا ہوا تھا...... اور بکتر بند گاڑی سے ٹکرانے والا انسانی گوشت کا لوتھڑا۔ کہیں انیق......؟ میں اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو میری رگِ جاں کے قریب ہو چکا تھا۔ جیسے میرے جسم کا حصہ بن چکا تھا...... کہاں تھا وہ؟

میں نے جاسم سے کہا کہ وہ نیچے جا کر انیق کو دیکھے۔ وہ فوراً اپنے دو محافظوں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف لپک گیا۔ میری دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ رائے زل کا پُرغرور سر لوگوں کے پاؤں میں تھا۔ اسی دوران میں مجھے کمانڈر زمان خان دکھائی دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے انیق کو دیکھا ہے؟''

''افسوس، انیق کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔'' یہ انیق کی اپنی ہی آواز تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے مگر وہ ٹھیک تھا۔ ''بہت بڑے لعنتی ہو تم۔ میری جان نکال دی۔'' میں نے کہا۔

''جان تو میری بھی تقریباً نکل ہی گئی تھی، یہ دیکھیں۔'' اس نے اپنی پشت مجھے دکھائی۔ اس کی کمر پر ایک بڑا کٹ تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ سفید شرٹ وہاں سے پھٹی ہوئی تھی۔ شاید دستی بم کے دھماکے کے وقت شیشے کا کوئی ٹکڑا وہاں لگا تھا، وہ بولا۔ ''افسوس اس بات کا ہے جناب کہ زخم پیٹھ پر آیا ہے۔ سینے پر زخم کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ ویسے آپ گھبرایا نہ کریں۔ میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں۔''

''اچھا زیادہ بک بک نہ کرو۔ خون بہہ رہا ہے فوراً ڈریسنگ کرواؤ۔''

اتنے میں ایک طرف سے خورسنہ نمودار ہوئی۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بھی باقاعدہ لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ اس نے فوراً انیق کے زخم پر روئی کا پھایا رکھا اور اسے لے کر نیچے میڈیکل سینٹر کی طرف چلی گئی۔ چھت پر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا...... اور اس ہجوم میں ہی کہیں رائے زل کا کٹا ہوا سر بھی گم تھا۔

☆☆☆

انقلاب کو راستہ نہیں دیا جاتا تو پھر خونی انقلاب کو راستہ ملتا ہے۔ جاماجی میں بھی اس سے ملتا جلتا کام ہی ہوا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں جاماجی کے عوام نے درجنوں ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو قابضین سے تعلق رکھتے تھے۔ ایجنسی کے زیادہ تر اہلکار تو موقع تاک کر پہلے ہی نیوسٹی کی طرف بھاگ گئے تھے جو ہتھے چڑھ گئے انہیں مار دیا گیا یا ہاتھ پاؤں توڑ دیے گئے۔ کئی سو امریکی گارڈز گرفتار ہوئے۔ مختلف جگہوں پر گرفتار ہونے والے گرے فوجیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ تمام ہیلی کاپٹرز گرین فورس کے قبضے میں آ چکے تھے۔

میں اب انیکسی کی عمارت کے ایک محفوظ حصے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ ڈاکٹر میرے پاؤں کی نئی ڈریسنگ میں مصروف تھا۔ جاسم میرے پاس آیا اور بولا۔ ''شاہ زیب صاحب! ڈی پیلس پر جاماجی کا پرچم لہرا دیا گیا ہے۔ اب پیلس کی چار دیواری میں صورتِ حال پوری طرح کنٹرول میں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر ماریہ کا کچھ پتا چلا؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تک تو نہیں جناب، لیکن ہم تلاش کر رہے ہیں۔ خواجہ سرا خیام دانش بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کی تحویل سے درجنوں ایسی لڑکیاں ملی ہیں جنہیں ڈی

پیلس میں دادِ عیش دینے کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ ہم ڈاکٹر ماریہ کے بارے میں خیام سے بھی پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔'' پھر وہ ذرا رک کر بولا۔ ''دوسری بات یہ ہے جی کہ لوگوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے۔''

''کس حوالے سے؟''

''وہ ہز ہائی نس ابراہیم اور سپریم کمانڈر قسطینا کو جلد از جلد آپ کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''ٹاپو کی صورتِ حال کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں کم و بیش سات سو ایجنسی گارڈز اور گرے فوجی موجود ہیں۔ ہماری جنگی کشتیوں نے ٹاپو کو مکمل طور پر گھیر لیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے ان لوگوں کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔''

''ان کا ردِعمل کیا ہے؟''

''یہ بات تو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ان کو معلوم ہو چکی ہے کہ جاماجی میں انہیں شکستِ فاش ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ وہ بے وقوفی نہیں کریں گے اور جلد ہی سرنڈر کر دیں گے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ انہیں جنگی قیدیوں کا اسٹیٹس دیا جائے گا اور ان کی زندگیاں محفوظ ہوں گی۔''

''لیکن اب اس میں زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیے جاسم۔''

''ایسا ہی ہوگا جناب۔'' پھر جاسم میری طرف جھکا اور رازداری کے انداز میں بولا۔ ''اس بات کا امکان ہے جی کہ...... آپ کے دونوں ساتھیوں اور محترم باذان کو تشدد کے ذریعے مارنے والا امریکی افسر لونگ بھی ٹاپو پر ہی چھپا ہوا ہے۔''

''اسے کسی صورت بچ کر نہیں نکلنا چاہیے جاسم۔'' میں نے کہا۔

اس نے بڑے ادب سے میرے زخمی ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

بیگم نسا نورل کی لاش کو بڑے احترام سے ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جا چکا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں لوگ وہاں موجود تھے اور اشک بار تھے۔ ہر طرف اس قربانی کا تذکرہ تھا جو بیگم نورل نے جاماجی کے بدترین دشمن کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے دی تھی۔

گرفتاری کے وقت آقا جان نے زبردست واویلا مچایا تھا۔ گرین فوجیوں اور رضا کاروں نے اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے بکتر بند میں پھینک دیا تھا۔ بندریا لوسی جو ہمیشہ کی طرح رنگ برنگے فراک میں تھی، معمولی زخمی ہوئی تھی۔ ڈی پیلس کے وٹرنری ڈاکٹر نے اس کو ٹریٹ منٹ دی تھی...... اور عارضی طور پر پنجرے میں بند کیا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے، اچھے اور بُرے لوگ جانوروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ بُرے لوگوں کی اندرونی کثافت بے زبان جانوروں کے اندر بھی ان کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت پیدا کرتی ہے اور یہ ناپسندیدگی یا نفرت ان کے سینوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یقیناً لوسی نے بھی آقا جان کو ڈی پیلس کے طول و عرض میں ایک تند بگولے کی طرح چکراتے دیکھا تھا۔ نچلے درجے کے ملازم اس کے خوف سے سہمے رہتے تھے۔ وہ لوگوں کو تھپڑ مارتا تھا اور گالیاں دیتا تھا۔ وہ ڈی پیلس کے اندر اور باہر ہونے والے ہر جور و ستم میں حصے دار تھا۔ ازمیر طیب کی موت میں بھی...... اور لوسی ازمیر طیب کے کندھوں پر جوان ہوئی تھی۔ اس نے ازمیر کی گود میں اٹھکیلیاں کی تھیں اور ازمیر نے اپنے ہاتھوں سے اسے محبت بھرے لقمے کھلائے تھے۔ کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ لوسی نے جو کچھ کیا وہ ایک پالتو جانور کی اضطراری حرکت تھی...... اور اس کے پیچھے کسی طرح کی وفاداری یا محبت کو تلاش کرنا درست نہیں۔ مگر جنہوں نے ہیلی کاپٹر والے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے وہ اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ آقا جان ہیلی کاپٹر پر چڑھنے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتا تو...... بچتا تو اس نے پھر بھی نہیں تھا لیکن اب اس کی موت آسانی سے واقع ہونے والی نہیں تھی۔

جاسم نے اپنا فون میری طرف بڑھایا۔ اس پر محترم ذکری کی کال آ رہی تھی۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی گلوگیر آواز میں بولے۔ ''تمہیں بہت بہت مبارک ہو شاہ زیب! تمہاری قیادت میں آخر جاماجی کے عوام نے فتح پائی۔''

''یہ سب کچھ آپ کی رہنمائی سے ممکن ہو پایا ہے حضرت! اگر آپ نہ ہوتے تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ خلقِ خدا جس پر بھروسا کرتی ہے اس کے اندر کچھ نہ کچھ غیر معمولی ضرور ہوتا ہے۔ آج بہت دنوں بعد میں شہر کی جامع مسجد میں اذان کی صدا سن رہا ہوں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کو...... بیگم نورل کی شہادت کا علم تو ہو گیا ہوگا؟''

''اس نے عظیم قربانی دی ہے۔ اس کا کردار جاماجی کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر رائے زل اور آقا جان وغیرہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو

جاتے تو ایک بار پھر سنگین واقعات کا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔"

"لیکن حضرت! ہاناوانی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔"

"اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے شاہ زیب! اللہ نے چاہا تو وہ بھی جلد انجام کو پہنچے گی۔"

میں نے کہا۔ "حضرت! ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے اطلاع ملی ہے کہ چھاؤنیوں میں بند کیے جانے والے تمام گرین فوجی باہر نکل آئے ہیں۔ انہوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے وہ سارا سرحدی علاقہ خالی کرا لیا ہے جو رائے زل نے پچھلے کچھ عرصے میں قبضے میں لیا تھا۔ اب ہمارے بہت سے دستے نیوسٹی کے اندر ہیں اور پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔"

محترم ذکری بولے۔ "ہاں یہ بات مجھے ابھی جاسم سے معلوم ہوئی ہے لیکن میری رائے ہے کہ ابھی نیوسٹی پر یلغار نہ کی جائے۔ ہاں ان کے کچھ سرحدی علاقے پر کنٹرول ضرور حاصل کر لیا جائے تاکہ ہمارا بارڈر محفوظ رہے۔"

"مجھے یہاں کی سیاست کا کچھ زیادہ علم نہیں ہے حضرت! آپ بڑے ہیں جس طرح مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔"

"میں سمجھتا ہوں شاہ زیب کہ اب قسطینا کا جلد سامنے آنا بھی ضروری ہے۔ اس نے اس جدوجہد میں بہت قربانیاں دی ہیں۔ وہ ان معاملوں کی بہت سوجھ بوجھ بھی رکھتی ہے۔ اس کو جلد از جلد ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب، اب یہ دنوں کی نہیں، گھنٹوں کی بات ہے، ٹاپو کا محاصرہ ہو چکا ہے۔"

"مجھے پوری امید ہے، تمہاری قیادت میں جیسے اب تک بہت اچھا ہوا ہے۔ آگے بھی ہوگا۔" وہ عجیب لہجے میں بولے پھر انہوں نے کہا۔ "لو تاجور سے بات کرو۔"

چند سیکنڈ بعد تاجور کی آواز ابھری۔ "ہیلو شاہ زیب! آپ کیسے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں تاجور۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا رک کر بولی۔ "یہاں مکان کے باہر ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں آپ کی تصویر ہے اور جاماجی کے جھنڈے ہیں۔ وہ خوشی سے ناچ رہے ہیں، نعرے لگا رہے ہیں۔"

"تمہاری دعا سے ہم فتح یاب ہوئے ہیں۔ رائے زل مارا گیا ہے۔ آقا جان گرفتار ہے۔ جلد ہی ابراہیم اور قسطینا وغیرہ بھی ہمارے درمیان ہوں گے۔"

"آپ...... واپس آجائیں...... میں اب بھی بہت فکرمند ہوں...... آپ......" اس کی آواز بھرائی۔ وہ مزید کچھ نہ بول سکی۔

"ہیلو تاجور!" میں نے دو تین بار کہا مگر دوسری طرف خاموشی رہی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

"او کے، تم حوصلہ رکھو...... میں جلد لوٹ رہا ہوں۔"

میں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میرا دھیان بار بار شکیل داراب کی طرف بھی جا رہا تھا۔ یہی شخص تاجور کو پاکستان سے یہاں لانے کا ذمے دار تھا۔ اس نے یہ سب کچھ آقا جان کی خاطر کیا تھا۔ اب آقا جان کی ناک میں نکیل پڑی تھی تو وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہ جاماجی میں ہی نہیں ہے۔

میرا بخار پھر شدت اختیار کر رہا تھا۔ پسلیوں اور پنڈلیوں کے متاثرہ حصے جل رہے تھے۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا، سمندر کے درمیان اس ٹاپو کا۔ یہ مختصر سا خشکی کا ٹکڑا چاروں جانب سے جنگی کشتیوں اور آرمڈ لانچوں میں گھرا ہوا تھا۔ میں بھی ایک آرام دہ لانچ میں کرنل احرار کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ سجاول بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ خورسنہ ایک دوسری لانچ میں تھی۔ انیق کو میں نے ڈاکٹر ماریہ کو کھوجنے کی ذمے داری سونپی تھی اور وہ جاسم کے ساتھ جاماجی میں ہی تھا۔ ٹاپو کو دیکھ کر دل سے ایک آہ نکلی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے کیپٹن تبارک اور کبڈی شاہ سیف کو کھویا تھا۔ ہاں...... پام کے انہی پیڑوں تلے ہمیں...... محاورتاً نہیں حقیقتاً زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیا گیا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں قسطینا اور میرے دیگر ساتھی، اب تک کسی غیبی مدد کے منتظر تھے۔ آج یہ مدد پہنچ چکی تھی۔ لیکن کیا وہ اب تک محفوظ و مامون تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر ابراہیم کی تھی۔ وہ اپنی "زہریلی مجبوری" سے لڑ رہا تھا اور اس معاملے کو شاید آر یا پار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زینب کو مکمل طور پر کھو کر پایا تھا۔ کیا اب پھر کھونے اور پانے کا مرحلہ درپیش تھا۔

لاؤڈ اسپیکرز پر بار بار مختلف اعلان ہو رہے تھے۔ ٹاپو پر کہیں حرکت نظر نہیں آ رہی تھی مگر یقینی بات تھی کہ یہاں سات سو سے زائد خطرناک مسلح افراد موجود ہیں۔ وہ مختلف مورچوں اور اوٹ میں چھپے ہوئے تھے۔

میں نے کرنل احرار سے پوچھا۔ ''کرنل! آپ کا کیا خیال ہے، یہ لوگ ہتھیار ڈال دیں گے؟''

''اگر ان کی کمان کرنے والے بہت بڑے بے وقوف نہ ہوئے، تو ایسا ہی کریں گے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''لونگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ آخر وقت تک لڑنا نہیں چاہے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ وہ جاماجی سے بھاگ کر یہاں کیوں آیا ہے؟ اور واقعی آیا بھی ہے یا نہیں؟''

''یہ بات تو یقیناً سوچنے کی ہے۔ اگر وہ جاماجی میں خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر اس چھوٹے سے ٹاپو پر کیسے بچے گا۔''

ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ ہماری توقع کے مطابق نتائج سامنے آنا شروع ہوگئے۔ گرین فورس کے آفیسرز اور گرے فورس کے آفیسرز کے درمیان ایک طرح کی چھوٹی سی فلیگ میٹنگ ہوئی۔ اس میں ایجنسی کے دو افسر بھی شامل تھے۔ ٹاپو پر موجود افراد نے ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کردیا۔

وہ دو تین طویل قطاروں میں سامنے آئے اور اپنے ہتھیار ''ان لوڈ'' کر کے اپنے سامنے زمین پر رکھ دیے۔ ہتھیار پھینکنے والوں میں دو سو کے لگ بھگ امریکی ایجنسی کے گارڈز بھی تھے۔ ان لوگوں کے لیے چھ کے قریب بڑی کشتیاں کنارے پر لگائی جا چکی تھیں۔ جن قیدیوں کو خطرناک سمجھا جارہا تھا ان کے ہاتھ پشت پر کیبل ٹائی کے ذریعے باندھ دیے گئے۔ وہ قطاروں کی شکل میں کشتیوں پر سوار ہونے لگے۔

میں نے کرنل احرار کے ایک ماتحت کیپٹن سے پوچھا۔ ''لونگ کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ لیکن یہ کہا جارہا ہے کہ وہ دو تین گھنٹے پہلے تک یہیں ٹاپو پر موجود تھا۔''

''تو کیا یہاں سے نکل گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' کرنل احرار بولا۔ ''اتنے سخت گھیرے میں تو چڑیا بھی یہاں سے اڑے گی تو دیکھی جائے گی۔''

کیپٹن بولا۔ ''سر! ٹاپو کی دوسری طرف ایک R22 ہیلی کاپٹر کھڑا ہے۔ ہم نے اسے چیک کیا ہے۔ وہ اڑنے کے قابل نہیں ہے۔ غالباً اس کے اگنیشن میں کوئی خرابی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ٹاپو کا محاصرہ ہونے سے پہلے مسٹر لونگ نے اس ہیلی کاپٹر کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی ہو، اور ناکام ہوکر یہیں ٹاپو میں ہی کہیں روپوش ہوگیا ہو۔''

یہ بات دل کو لگ رہی تھی۔ لونگ کا اس ٹاپو پر آنا بے وجہ نہیں ہوسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی نظر اسی R22 ہیلی کاپٹر پر ہو اور وہ اس پر سوار ہوکر یہاں سے نکلنا چاہتا ہو۔

میں نے کیپٹن سے کہا کہ ایسے دو تین قیدیوں کو یہاں لایا جائے جنہوں نے لونگ کو یہاں ٹاپو پر دیکھا ہے۔

''یس سر!'' کیپٹن نے کہا اور مجھے اور کرنل کو مشترکہ سیلیوٹ کرتا ہوا اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا۔

مگر کیپٹن کے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ لانچ کا ایک شیشہ ٹوٹا اور کوئی کود کر اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی واٹر پروف APS رائفل مجھے پہلی نظر میں دکھائی دے گئی۔ سمندری پانی میں بھیگا ہوا یہ تجیم شخص لونگ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ فائر کھولا۔ میرے عقب میں کھڑے، گرین فورس کے دو جوانوں کو گولیاں لگیں اور وہ لانچ کے فرش کی طرف جھکتے دکھائی دیے۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ لونگ کے انگارہ چہرے پر پڑی۔ اپنی طویل قامتی کے سبب وہ لانچ کی چھت کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ اس نے گن کا رخ میری طرف کیا۔ مجھے اپنا آخری وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیا۔ یہی وقت تھا، جب اپنی ایڑیوں پر گھوم جانے والے اسمارٹ کیپٹن نے لونگ پر چھلانگ لگائی۔ ابھی وہ لونگ کو چھو نہیں پایا تھا کہ لونگ کی چلائی ہوئی نصف درجن گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ اس کے باوجود وہ لونگ کے اوپر گرا۔ لونگ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا۔ میرے پہلو میں کھڑے سجاول کے لیے یہ ایک دو سیکنڈ کا وقت کافی تھا۔

اس کے منہ سے بے ساختہ ایک ٹھیٹ پنجابی گالی نکلی تھی۔ اس نے خود کو نیچے تو اسی وقت جھکا لیا تھا جب پہلی گولی چلی تھی۔ اسی جھکی جھکی حالت میں وہ تیر کی طرح لونگ کی طرف گیا۔ اس نے لونگ کی گن کے بیرل کو اوپر اٹھایا اور لونگ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا لانچ کے کچن ڈور سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ تب تک میں بھی تکیے کے نیچے سے مشین پسٹل نکال چکا تھا مگر اب اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ لونگ اور سجاول بُری طرح گتھم گتھا تھے۔

ایک طرف پرائیویٹ امریکی ایجنسی کا نہایت تربیت یافتہ آفیسر تھا جو وحشت میں ایک ''اعلیٰ مقام'' رکھتا تھا، دوسری طرف ایک ڈکیت تھا جس میں کچھ زبردست خوبیاں بھی تھیں اور جو پرانے وقتوں سے وراثت میں ملنے والا ایک ''قاتل ہنر'' رکھتا تھا۔ اگلے چالیس پچاس سیکنڈ ایک خوفناک کشمکش کے تھے۔ اس مختصر دورانیے میں لگژری لانچ کے کئی حصے کباڑ کی شکل اختیار کر گئے۔ لونگ کی واٹر پروف APS سے کم از کم چھ گولیاں مزید چلیں مگر یہ سب کی سب لانچ کی چھت میں ہی پیوست ہوئیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ گن پر سجاول کی آہنی گرفت موجود تھی۔ شاید یہ گرفت کا مقابلہ بھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے گن کا قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے اور سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ اب کوئی ایک درجن گرین فوجی لانچ میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے لونگ کو نشانے پر لے لیا تھا مگر گولی وہ بھی نہیں چلا سکتے تھے۔

یکا یک اس زور آزمائی کا فیصلہ ہو گیا۔ لونگ نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ گن کو پورے زور سے گھمایا اور اس کا بیرل سجاول کی پکڑ سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گن سجاول کی طرف سیدھی کرنا چاہ رہا تھا مگر سجاول کے جسم میں بھی بجلیاں کوندرہی تھیں۔ اس نے پنجوں پر اچھل کر ایک طوفانی ٹکر طویل قامت لونگ کے سینے پر رسید کی۔ وہ گن سمیت کئی فٹ دور جا گرا۔

''ہالٹ...... ہالٹ۔'' کئی آوازیں گونجیں۔ کم و بیش ایک درجن آٹومیٹک رائفلیں لونگ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ غالباً سیکنڈ کے دسویں حصے میں لونگ نے اپنا ذہن تبدیل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی گن کے 26 راؤنڈ والے میگزین میں ایک آدھ گولی ہی باقی ہوگی...... اور وہ ٹارچر تکنیک کا سُپر اسٹار تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی درندگی اسی کی طرف لوٹ کر آنے والی ہے۔ اس نے سجاول کو نشانہ بنانے کے بجائے گن کی نال اپنی کنپٹی پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔

اور اس روز مجھے پتا چلا کہ خوشی غمی، تکلیف آرام، اچھی موت بُری موت یہ سب کچھ قدرت کس طرح اپنے قبضے میں رکھتی ہے۔ لونگ نے آسان موت چاہی تھی مگر یہ اسے نہیں ملی، گن میں سے ٹھک کی آواز آ کر رہ گئی۔ اس کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ لونگ کی آنکھوں میں حیرت کی یلغار نظر آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گن کو لٹھ کی طرح پکڑ لیا تھا۔ جونہی سجاول اس کے نزدیک گیا۔ اس نے گن کے وزنی دستے سے سجاول کے سر کو نشانہ بنانا چاہا، سجاول نے یہ مہلک وار نیچے جھک کر بچایا اور اس مرتبہ لونگ کے پیٹ پر لات رسید کی۔ وہ جیسے اڑتا ہوا ایک کھڑکی سے ٹکرایا اور اسے توڑ کر قلابازی کھاتا ہوا باہر پانی میں جا گرا۔

یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''اسے زندہ پکڑنا ہے۔'' میں نے پکار کر کہا۔

کرنل احرار اور مسلح فوجی لانچ کے مختصر ٹیرس پر پہنچے۔ میں بھی اپنے زخمی پاؤں پر بمشکل وزن ڈالتا ہوا، ٹوٹی ہوئی کھڑکی تک گیا۔ لونگ پانی میں تھا۔ اور اس نے لانچ کے ساتھ جھولتی ہوئی دو زنجیروں کو تھام رکھا تھا۔ ہمیں بس اس کا بالائی دھڑ ہی نظر آ رہا تھا۔ ''کوئی گولی نہیں چلائے گا۔'' کرنل احرار نے حکم دیا۔

''اسے باہر نکالو۔'' میں نے کہا۔

لونگ کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے خون کے قطرے گر رہے تھے اور سمندر کے پانی میں اوجھل ہو رہے تھے۔ خالی ہو جانے والی گن اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

یکا یک مجھے لونگ کے خونچکاں تھوبڑے پر اذیت کے آثار نظر آئے۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ کوئی اسے نیچے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کے جسم کو ایک دھچکا سا لگا۔

''او گاڈ!'' کرنل احرار کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ ایلی گیٹر ہے۔ اس نے...... پکڑ لیا ہے۔''

کوئی اور ہوتا تو چلانے لگتا لیکن لونگ ایک سنگلاخ شخص تھا۔ اس کا چہرہ ضرور کرب ناک ہو گیا، مگر اس نے کوئی صدا بلند نہیں کی۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ خود کو مگرمچھ کے جبڑوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بے شک وہ ''ملاکیشین سمندر'' کا ایک خاکستری مگرمچھ ہی تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے جسم کی مختصر جھلک بھی پانی میں دکھائی دے جاتی تھی۔

کرنل احرار کے ہاتھوں میں اب ایک ''بڑے کیلیبر'' کی رائفل نظر آ رہی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھ کر لرزاں لہجے میں پوچھا۔ ''اس کو شوٹ کیا جائے؟'' اس کے سوال کا مطلب یہی تھا کہ کیا مگرمچھ کو نشانہ بنایا جائے؟

پتا نہیں کیوں اس وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے حسی اور سنگدلی نمودار ہو گئی اور یہ کیفیت بے وجہ نہیں تھی۔ میں نے کیپٹن تبارک اور سیف کو لونگ کے تشدد سے تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھا تھا۔ میں نے جاباجی کے عقوبت خانے میں قیدیوں کی لرزہ خیز آہ و بکا سنی تھی اور خود بھی ٹمپریچر سیل کی ناقابلِ بیان اذیت جھیلی تھی۔ میں نے کہا۔ ''نہیں کرنل! ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اس جانور سے

جیت پاتا ہے یا نہیں۔“

سجاول کے ہاتھ میں بھی اب ایک طاقتور شاٹ گن نظر آ رہی تھی مگر میرا مطمحِ نظر سمجھتے ہوئے اس نے بھی گن جھکا لی۔ سب دم بخود تھے۔ لونگ نے اپنے ہاتھوں کو گھما کر لانچ کی زنجیروں کو اپنی کلائیوں کے گرد بل دے لیے تھے اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ مگر مچھ اسے پانی میں نہ کھینچ پائے۔ اس کی طویل ٹانگیں اور شاید اس کی ناف کا کچھ حصہ بھی مگر مچھ کے جبڑوں میں تھا۔ اس کے اردگرد کے پانی میں سرخی کی آمیزش تھی۔

میں نے نہایت نفرت سے درندہ صفت لونگ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس لانچ کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ کیپٹن اور دیگر دو فوجیوں کی لاشیں وہاں سے اٹھائی جا چکی تھیں مگر ان کے جوان خون کے بڑے بڑے دھبے ابھی تک فرش پر موجود تھے۔ ایک فوجی کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے لانچ میں ہی فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔

”شکریہ سجاول۔“ میں نے کہا۔

”زیادہ جنٹلمین نہ بنو۔ یاری دوستی میں کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ اور شاٹ گن کو بے قراری سے اپنے ہاتھوں میں گھمانے لگا۔

اس کا اضطراب بتا رہا تھا کہ وہ لونگ کو جلد از جلد لاش کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور بے شمار لوگ بھی تھے جو اس کو لاش کی صورت دیکھنا چاہتے تھے۔ اردگرد کی جنگی کشتیوں پر اور ساحل پر بہت سے فوجی اور رضاکار جمع ہو چکے تھے۔ ہر نگاہ یقیناً پانی کی طرف ہی لگی ہوئی تھی۔

ہماری لانچ کو وقفے وقفے سے ہچکولے لگتے تھے۔ ان ہچکولوں کی وجہ عیاں تھی۔ یہ موذی آبی جانور اور موذی بری درندے کی خونی کشمکش کے ہچکولے تھے۔

چوکس گرین فوجی لانچ کا مکمل معائنہ کر رہے تھے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لونگ کا کوئی ساتھی بھی موجود نہ ہو۔ لانچ کے فرش کو خون کے داغوں سے صاف کیا جا رہا تھا۔ شواہد بتا رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے تک لونگ ٹاپو پر ہی تھا۔ وہ پانی میں غوطہ لگا کر لانچ تک پہنچا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنانے یا پھر مارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کچھ دیر بعد کرنل احرار اندر آیا۔ ”ختم ہوا یا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ کرنل نے کہا۔ ”یہ غالباً زیادہ بڑا مگر مچھ نہیں ہے۔ یہ اسے داب کر بیٹھا ہوا ہے۔ چھوڑ نہیں رہا اور نہ ہی ابھی اسے نگلنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔“

ایک تجربہ کار کوسٹل گارڈ نے کہا۔ ”کبھی کبھی مگر مچھ اس طرح کرتے ہیں سر! یہ شکار کو دبوچ لیتے ہیں اور بہت دیر تک اسی طرح پکڑے رکھتے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ جبڑے کھولیں گے تو شکار نکل جائے گا۔“

ایک بار پھر لانچ بری طرح ہلنے لگی۔ اب لونگ کے کراہنے اور چلانے کی آوازیں بھی ہم تک پہنچنے لگی تھیں۔ اس کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اسے موذی جانور کے بڑوں میں پھنسے اب پندرہ بیس منٹ سے زائد ہو چکے تھے۔ اذیت رساں...... اذیت کے ناقابلِ شکست شکنجے میں تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ لونگ سے کئی گنا طاقتور جانور اسے چھوڑے گا نہیں۔

”کیا اسے شوٹ کر دیا جائے؟“ کرنل احرار نے پوچھا۔

”کس کو؟“ میں نے دریافت کیا۔

”مگر مچھ کو یا لونگ کو...... جس کو آپ کہیں......“

میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں اس سوال کا جواب سوچ ہی رہا تھا جب لانچ نے ایک بڑا ہچکولا کھایا۔ ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہوائی فائرنگ بھی سنائی دی۔ ہم نے ٹیرس پر جا کر دیکھا، منظر عبرت ناک تھا۔ لونگ نے زنجیریں اب بھی نہیں چھوڑی تھیں۔ مگر سینے سے نیچے اس کا دھڑ موجود نہیں تھا۔ اس کے پیٹ کے کچھ اندرونی اعضا پانی پر جھلک دکھا رہے تھے اور پانی سرخ تھا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

اور یہ منظر تھا زیرِ زمین پناہ گاہ کا۔ آج کئی ہفتوں کے بعد میں ایک بار پھر اس تاریک دریا کا شور سن رہا تھا جو نجانے کہاں سے نکلتا تھا اور کن اتھاہ غاروں میں سما جاتا تھا۔ یہ وہی قدرتی پناہ گاہ تھی جس کی تلاش میں سات سو سے زائد فوجی، کھوجی اور سراغ رساں کتے چپے چپے کی خاک چھانتے رہے تھے مگر اس پتھر تک نہیں پہنچ سکے تھے جسے سرکانے سے ان کے لیے ان کا سم سم کھل سکتا تھا۔ طویل سنگی سیڑھیاں اترنا میرے لیے خاصا دشوار تھا لیکن خوشی اور جوش کا یہ عالم تھا کہ میں ایک گرین لیفٹیننٹ کے سہارے سے اتر رہا تھا۔ ابھی ہم نصف سیڑھیاں ہی طے کر پائے تھے کہ ٹارچوں اور سرچ لائٹس کی روشنی میں مجھے دراز قد

قسطینا کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسبِ معمول پینٹ شرٹ میں تھی۔ کمر سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ اس کے عقب میں کمانڈر فارس جان تھا۔ قسطینا بھاگتی ہوئی آئی اور ”شاہ زائب“ کہہ کر میرے گلے لگ گئی۔

اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کوئی جھجک نہیں رکھتی تھی اور نہ کسی کی پروا کرتی تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ کمانڈر فارس جان کی طرف بڑھایا۔ وہ بھی میرے گلے لگ گیا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”شاہ زیب صیب! آپ نے وہ کر دکھایا جس کا سپنا یہاں کا لوگ مدتوں سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک ذہنوں کو یقین نہیں ہو رہا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔“

قسطینا نے مجھ سے الگ ہو کر فوجی انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا اور اشک بار لہجے میں بولی۔ ”ایسٹرن! آخر تم کامیاب ہو گئے۔“

”میں نہیں، ہم سب کامیاب ہوئے۔“

”تم بہت زخمی ہو۔ بہت زیادہ زخمی ہو۔ ہمیں یہاں تقریباً ساری خبریں ملتی رہی ہیں۔ پھوپو نورل کی موت نے ہمیں بہت دکھ دیا ہے مگر ان کی قربانی رائگاں نہیں گئی۔ اس اسٹیٹ کے دو سب سے بڑے دشمن اسی بے مثل قربانی کی وجہ سے اپنے انجام کو پہنچے ہیں۔“

”بے شک آپ درست کہہ رہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا اور وہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔ بولی۔ ”شاہ زائب! ابھی کئی کرنے والے کام باقی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم بہت وقت پر پہنچے ہو بلکہ...... میں تو یہ کہوں گی کہ یہ سب کچھ ڈرامائی حد تک بروقت ہوا ہے۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے کمانڈر فارس کی طرف دیکھا، وہ بولا۔ ”ہاں برادر شاہ زیب! یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگر آج آپ لوگ یہاں نہ پہنچتا تو شاید...... ام مزید صبر نہ کر سکتا۔ ام سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ شاید ام لوگ سارے خوپ (خوف) ایک طرپ رکھ کر باہر ہی نکل آتا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو فارس؟“

قسطینا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”شاہ زائب...... ابراہیم کی حالت...... ٹھیک نہیں...... وہ بہت بری حالت میں ہے...... امید تو زیادہ نہیں لیکن شاید اگر وہ اسپتال پہنچ جائے تو......“ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

میں جانتا تھا کہ وہ بہت باہمت لڑکی ہے اگر وہ اس طرح ناامید تھی تو یقیناً صورتِ حال سنگین تھی، میرے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یوں لگا جیسے دل و دماغ میں کئی دنوں سے پلنے والے اندیشے درست ثابت ہو رہے ہیں۔

”کیا ہوا اسے؟ کہاں ہے وہ؟“ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

قسطینا نے پلکیں جھپک کر اپنے آنسو سنبھالنے کی کوشش کی اور رہائشی حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم ابھی تک سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ تاریک دریا کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، دیواروں پر لمبے لمبے سائے تھے۔ بن مشہد اور سنبل وغیرہ بھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ بن مشہد کافی کمزور دکھائی دیتا تھا۔ وہ طویل بخار میں مبتلا رہا تھا۔ سنبل ویسی کی ویسی تھی۔ بن مشہد نے بھی مجھ سے معانقہ کیا۔ میں نے سنبل کا کندھا تھپتھپایا۔ ہم سیڑھیاں اتر کر پتھروں کے اس قدرتی چیمبر میں پہنچے جہاں ابراہیم موجود تھا۔

میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ چیمبر میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے زینب کے رونے کی مدھم آواز آئی اور دل سینے میں سو ٹکڑے ہو گیا۔ سجاول کا سہارا لیتے ہوئے میں چیمبر میں داخل ہوا۔ نگاہیں جیسے ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔ میں سرتاپا پتھرا گیا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں میرے سامنے بستر پر ایک خالی کمبل پڑا تھا مگر کمبل خالی نہیں تھا، اس کے نیچے ابراہیم موجود تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا جو دکھائی تک نہیں دے رہا تھا۔ اس کی صورت؟ خدا کی پناہ...... یہی لگتا تھا کہ کسی انسانی کھوپڑی پر سیاہی مائل ریگ زین منڈھا ہوا ہو اور اس ریگ زین پر سرخ دھبے ہوں۔ ابراہیم کی بے نور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اور دانت دکھائی دیتے تھے۔ اگر مجھے بتایا نہ جاتا تو میں کبھی نہ پہچان سکتا کہ یہ ابراہیم ہے۔ اس کی سانس کا زیر و بم بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

زینب نے پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر اٹھی اور دلدوز انداز میں ”بھائی“ کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے وہ نوحہ کناں انداز میں پکاری۔ ”بھائی! انہوں نے خود کو ختم کر لیا۔ انہوں نے کسی کی نہیں مانی...... کسی کی نہیں۔“

بن مشہد نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہڈیوں کے ڈھانچے کی نبض ٹٹولی۔ اس کے سینے پر کان رکھ کر دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ پھر دکھی لہجے میں بولا۔ ”وائٹل سائنز ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو شاید ہی ڈاکٹرز بھی کچھ کر

سکیں۔“

میں نے دل کڑا کر کے ابراہیم کے ناقابلِ شناخت چہرے کو چھوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ میں نے اس کی پیشانی چومی۔ اس دوران میں قسطینا اسٹریچر منگوا چکی تھی اور چاق و چوبند فوجیوں کو اسٹینڈ بائی کر دیا تھا۔

میں نے سرنگ سے باہر کرنل احرار کو ہدایت کی کہ وہ ایک ہیلی کاپٹر فوراً منگوائے۔ ایک مریض کی حالت بہت نازک ہے اور اسے فوراً جاماجی کے اسپتال پہنچانا ہے۔

ابراہیم کو اسٹریچر پر لٹا کر باہر لے جانے کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اسے ابھی تک اپنی ساس بیگم نورل کی موت کے بارے میں پتا نہیں تھا ورنہ اس کے دکھ میں اضافہ ہوتا۔

اسی دوران میں میری نگاہ اس زیرِزمین تاریک دریا کی طرف اٹھ گئی۔ گیس لیمپس اور بجلی کے قمقموں میں اس کا ایک کنارہ نیم روشن دکھائی دیتا تھا۔ وسیع و عریض زیرِزمین خلا کی چھت سے عجیب وضع کے حشرات لڑیوں کی صورت میں جھولتے تھے اور ان کے اندر سے قدرتی روشنی پھوٹتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں اس پانی کے کنارے، فارس جان کو خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ پھر میں اس کی ذاتی ڈائری تک پہنچا تھا جو ایک ناقابلِ فہم زبان میں لکھی گئی تھی۔ زبان شناس انیق نے اس ڈائری کو پڑھا تھا اور ہم پر فارس جان کے اس خاموش عشق کا انکشاف ہوا تھا جو وہ اپنی کمانڈر قسطینا سے رکھتا تھا۔ سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے۔ میں فارس اور قسطینا سے کئی باتیں پوچھنا چاہ رہا تھا مگر ابراہیم کی حالت نے کسی اور ”گفتگو“ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔

☆☆☆

قسطینا کی واپسی نے جاماجی میں جوش و خروش کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ جاماجی کے بیشتر باشندے تو پہلے ہی سڑکوں پر تھے اب ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ہزار [illegible] کی تعداد میں ڈی پیلس کے اندر اور باہر جمع تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ ان کی سپریم کمانڈر ان سے خطاب کرے۔ وہ جانتے نہیں تھے کہ قسطینا اس وقت ڈی پیلس میں نہیں ملٹری اسپتال میں ہے۔ اس کی اور ہم سب کی تشویش عروج پر تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح ابراہیم زندگی کی طرف لوٹ سکے۔ میں جانتا تھا، ایک کزن کی حیثیت سے قسطینا...... ابراہیم سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ اسے ”چھوٹے بھائی“ کہہ کر بلاتی تھی اور ریان فردوس سے اختلافات رکھنے کے باوجود ابراہیم کی بات کو اہمیت دیتی تھی۔ اب بھی وہ مسلسل فون پر مصروف تھی۔ اس نے جزیرے پر موجود بہترین ڈاکٹروں کو ملٹری اسپتال میں جمع کر لیا تھا، ان میں دو غیر ملکی بھی تھے۔

اسی اثنا میں نیلی آنکھوں والا دراز قد پال اندر داخل ہوا۔ اس کے زخمی کندھے پر ابھی تک ڈریسنگ موجود تھی۔ ایک امریکی کو اپنے سامنے دیکھ کر قسطینا چونکی اور اس کے چہرے پر تردد نمودار ہوا۔ میں نے کہا۔ ”قسطینا! یہ پال کورنی ہیں۔ انہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے۔ ہر جگہ انہوں نے ہمارے کندھے سے کندھا ملائے رکھا ہے۔ شاید آپ نے نیوز میں بھی ان کا تذکرہ سنا ہو۔“

پال کورنی نے مسکرا کر قسطینا سے مصافحہ کیا پھر بولا۔ ”یور ہائی نس! ہم دیکھ رہے ہیں کہ بچے (ابراہیم) کی حالت واقعی تشویشناک ہے مگر ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ نیویارک کے بہترین نیوروفزیشن ڈاکٹر بوشر وائٹ میرے دوستوں میں ہیں۔ میں نے انہیں پہلی دستیاب فلائٹ سے برونائی پہنچنے کے لیے کہا ہے۔“

”شکریہ۔“ قسطینا نے کہا۔ ”یہ نام تو شاید میں نے بھی سنا ہوا ہے۔“

اسی دوران میں پال کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اندازہ ہوا کہ یہ اسی نامور ڈاکٹر کی کال ہے۔ ڈاکٹر چاہ رہا تھا کہ ابراہیم کی کچھ خاص رپورٹس نیٹ کے ذریعے اسے ارسال کر دی جائیں تاکہ وہ سفر کے دوران میں انہیں دیکھ سکے۔

پال، بات کرتا ہوا ڈاکٹرز روم کی طرف چلا گیا۔ قسطینا بے دم ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے پر اور کوریڈور میں درجنوں مسلح محافظ چوکس کھڑے تھے۔ میں نے کہا۔ ”قسطینا! آخر ابراہیم اس حالت تک کیسے پہنچا، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ سب کچھ ہو گیا؟“

”وہ کسی کی نہیں سنتا تھا شاہ زائب! NEUROTIC کی خاصی مقدار اس کے پاس موجود تھی...... اور وہ اسے معمول کے مطابق استعمال کر سکتا تھا مگر وہ نہیں کرتا تھا۔ جب میں یا فارس اس پر زور دیتے تھے تو وہ ایک دم جھنجلا جاتا تھا۔ مجھے تو کسی وقت ڈر لگتا تھا کہ وہ خود کو کچھ کر ہی نہ لے۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

”آپ لوگ اسے کسی طرح سلا کر یا بے ہوش کر کے NEUROTIC اس کے جسم میں داخل کر سکتے تھے۔“

”ہم نے اس بارے میں سوچا تھا مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اسے بے ہوش کرنے کی کوشش اس کی جان کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔“ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے ایک آہ کھینچی اور بولی۔ ”اس کے دماغ میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی...... مر جائے گا یا پھر اس زہر سے چھٹکارا حاصل کر لے گا۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ اگر وہ ایسا کرنا ہی چاہتا ہے تو پھر کم از کم اس جگہ تو نہ کرے۔ جب ہم یہاں سے نکل کر شہر پہنچ جائیں اور طبی سہولتیں موجود ہوں تو پھر وہ یہ کوشش کر دیکھے مگر وہ کچھ ماننا ہی نہیں تھا۔“

”زینب کی ہر بات تو سنتا تھا وہ۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“ قسطینا نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب وہ اس کی بھی نہیں سنتا تھا بلکہ کئی دفعہ اس سے جھگڑ پڑا اور بے چاری کو گھنٹوں تک رونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ وہ جو کچھ کر رہا تھا، اسی کے لیے کر رہا تھا...... اپنی حالت بگڑنے کے بعد اس نے دو چار بار تمہارا نام بھی لیا شاید تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔“

پھر قسطینا نے میرے سراپا... پر نگاہ دوڑائی اور نم لہجے میں بولی۔ ”تم کیسے ہو شاہ زائب!“

”آپ کے سامنے ہوں...... آپ کو میرے کندھے کی بہت فکر رہتی تھی نا؟ اب کندھا بالکل درست ہے۔“ میں نے اسے بازو ہلا کر دکھایا۔

وہ بولی۔ ”کندھا تو درست ہے لیکن اور بہت کچھ درست نہیں ہے۔ تمہارے جسم کے جو حصے لباس سے باہر نظر آرہے ہیں ان پر زخم ہیں۔ تمہارا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تم اس وقت بھی شدید بخار میں پھنک رہے ہو۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”یہ باتیں زیادہ اہم نہیں ہیں قسطینا! اہم یہ ہے کہ ہم ایجنسی اور اس کے کٹھ پتلی رائے زل کو شکست فاش دے چکے ہیں...... اور اہم یہ ہے کہ آپ کے ڈی پیلس پر پھر سے جاماجی کا پرچم لہرا رہا ہے اور یہ بھی اہم ہے کہ آپ پھر سے ہمارے درمیان ہیں۔ باقی رہے یہ زخم...... تو اب ان کو بہت جلد ٹھیک ہو جانا ہے۔“

”میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں شاہ زائب؟“

”اگر ضروری ہے، تو پھر اسی منہ سے کر دیں...... اور اسی منہ سے اپنے لوگوں سے آپ کا ایک خطاب بھی بہت

ایک رومانوی جملہ

”میں رات بھر تمہارے فراق میں جاگتا رہتا ہوں اور رات بھر اپنے خوابوں میں تمہیں ہی دیکھتا رہتا ہوں۔“

دریافت طلب بات صرف اتنی ہے کہ رات بھر جاگنے والا رات بھر کسی کو خواب میں کس طرح دیکھ سکتا ہے؟

☆☆☆

جج: ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے تین راتوں تک ایک ہی دکان میں بار بار نقب کیوں لگائی؟“

ملزم: ”بات یہ ہے، جناب عالی کہ میں نے اس دکان سے اپنی بیوی کے لیے ایک لباس چرایا تھا جو اسے پسند نہیں آیا اور مجھے دوبارا اسے تبدیل کرنے جانا پڑا۔“

☆☆☆

ڈاکٹر: ”کہیے جناب، دل کے آپریشن کے بعد اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

مریض: ”کچھ یوں لگتا ہے ڈاکٹر صاحب جیسے میرے سینے میں ایک کے بجائے دو دل دھڑک رہے ہوں۔“

ڈاکٹر: ”اوہو، اب پتا چلا میں سوچ رہا تھا کہ اپنی رسٹ واچ کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں؟“

☆☆☆

ہاکی منیجر: ”الفت حسین، تم نے آج کے میچ میں بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔“

الفت حسین: ”نہیں جناب، میں سمجھتا ہوں کہ آج تو مجھ سے بالکل کھیلا ہی نہیں گیا۔“

منیجر: ”لیکن تم نے اپنے کھیل سے مخالف ٹیم کی جو مدد کی ہے اسے عرصۂ دراز تک یاد رکھا جائے گا۔“

☆☆☆

کسی محاورے کا اس سے بہتر استعمال ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب، ہمارے پڑوس کی ایک خاتون سے کہہ رہے تھے۔ ”یہ تو درست ہے کہ آج صبح ہی آپ میرے پاس معائنہ کرانے آئی تھیں لیکن اس وقت مجھے آپ کے گھر کے قریب رہنے والے مسٹر شاہد کو دیکھنے آنا پڑا تو میں نے سوچا کہ چلو، آپ کو بھی دیکھتا چلوں تاکہ ایک ہی تیر سے دو شکار کیے جاسکیں۔“

کوہاٹ سے ندیم احمد علی شاہ کا کھیل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ضروری ہے۔ وہ آپ کو سننے کے لیے بے چین ہیں۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ وہ تمہیں سننے کے لیے بے چین ہوں گے۔ تم یہاں کے لوگوں کے لیے بہت اہمیت اختیار کر چکے ہو شاہ زائب!...... شاید مجھ سے بھی زیادہ......اور مجھے اس کی خوشی ہے۔“

”آپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا قسطینا! آپ نے جو طویل جدوجہد کی، میں نے تو بس اس کا آخری فقرہ لکھا ہے......اور شاید یہ آخری بھی نہیں ہے۔ ابھی اور کئی چھوٹے موٹے مسائل کا سامنا آپ کو کرنا پڑے گا...... اور مجھے پوری اُمید ہے کہ اب آپ آسانی سے کرلیں گی۔ آپ کو فارس جان جیسے جاں نثار کمانڈروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں پھیرلیں۔

ہم اس ”آئی سی یو“ کے قریب ہی موجود تھے جہاں مقامی اور غیر ملکی ڈاکٹرز ابراہیم کی نبضیں بحال کرنے کی سرتوڑ کوشش کررہے تھے۔ انہوں نے اگلے تین چار گھنٹے اہم ترین قرار دیے تھے۔ جب کوئی ڈاکٹر شیشے کی دیوار کے سامنے سے گزرتا تھا، ہماری نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگتی تھیں۔ ہم اس کے تاثرات سے جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ صورتِ حال کیا ہے؟

شدید تشویش سے دھیان ہٹانے کے لیے قسطینا نے جاماجی کی صورتِ حال کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ اس نے عارفہ خاتون، بیگم نورل اور پھر رائے زل کے آخری وقت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے مختصراً جواب دیے۔ جب میں نے محترم ذکری سے ملاقات اور ان کی بے مثل رہنمائی کا ذکر کیا تو قسطینا کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس نے اس حوالے سے بھی کئی سوال پوچھے۔ گفتگو کے ایک مرحلے میں ازمیر طیب کی پالتو لوسی کا ذکر بھی آیا۔ اس نے جو کچھ کیا، وہ سب کے لیے حیران کن اور بہت سنسنی خیز تھا۔ میں نے قسطینا کو بتایا کہ لوسی کی وحشت اب کم ہو چکی ہے۔ اسے پنجرے سے نکال دیا گیا ہے۔

لڑائی کے متعلق ایک سوال کا جواب، میری طرح قسطینا کے لیے بھی ایک پہیلی جیسا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ”شاہ زائب! جب تم لوگ ڈی پیلس کے سامنے پہنچ گئے......اور لوگوں نے ”آوٹ آف کنٹرول“ ہو کر خاردار تاریں پھلانگیں اور مورچوں پر قبضہ کرلیا تو ڈی پیلس کا مین گیٹ بند ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ کیوں کھلا رہا؟“

”کہا جارہا ہے کہ اس میں کوئی تکنیکی خرابی ہوگئی تھی مگر نوے فیصد امکان اسی بات کا ہے کہ یہ خرابی اتفاقاً نہیں تھی۔ پیدا کی گئی تھی۔“

”کوئی ہمارا اندر کا ہمدرد؟“ قسطینا نے پوچھا۔

”ممکن ہے......اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موقع پر موجود آپریٹر نے ہی یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔“

”لیکن میری اطلاع کے مطابق، اس مرکزی گیٹ پر کم از کم دو آپریٹر موجود ہوتے تھے جو آٹومیٹک سسٹم کو کنٹرول کرتے تھے۔ اکثر ایک سینئر انجینئر بھی اس کی معاونت کے لیے موجود ہوتا تھا۔ وہ جگہ سخت سیکورٹی میں رہتی تھی۔“

”بہرحال جو کچھ بھی ہوا قسطینا! ایک غیبی مدد کی طرح تھا۔ مشتعل ہجوم نے اور رضا کار دستوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور ڈی پیلس میں گھس گئے۔“

”آقا جان اب کہاں ہے؟“ قسطینا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”جیل میں......اسے سخت سیکورٹی میں رکھا گیا ہے۔ گرین فورس کے کچھ افسران بہت مشتعل تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ آقا جان کو ٹمپریچر سیل میں رکھا جائے......اور اسے اس اذیت کا تھوڑا سا مزہ چکھایا جائے جو اس نے مجھ پر روا رکھی۔ لیکن میں نے منع کر دیا ہے۔“

”تم پر کیا جانے والا ستم واقعی دل کو چیر ڈالتا ہے۔ تم بہت بڑے ایم ایم اے فائٹر ہو لیکن تم نے یہ لڑائی فائٹ کر کے نہیں اپنی غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کر کے جیتی ہے۔ ہم سنتے آرہے تھے کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں کچھ چیزیں اچانک ”وائرل“ ہو جاتی ہیں اور آناً فاناً ہزارہا لوگ ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہمیں تمہاری ”ٹارچر سیل والی تصویر“ سے ملا ہے۔“

”بس جو کچھ ہوا خود بخود ہی ہوا۔ کہتے ہیں نا کہ بندے کی اپنی پلاننگ ہوتی ہے اور قدرت کی اپنی پلاننگ۔“

اس نے ذرا چونک کر میری جانب دیکھا۔ پھر ہولے سے بولی۔ ”تم تو قدرت اور خدا کا ذکر کم کم ہی کیا کرتے ہو...... مجھے تم کچھ بدلے بدلے نظر آرہے ہو۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”کہتے ہیں نا کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ میں نے بھی ان گزرے ہوئے دنوں میں بہت کچھ دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔“

’’ہماری بات دوسری طرف نکل گئی۔ ہم آقا جان کا ذکر کر رہے تھے۔ اس کے بارے میں کیا سوچ ہے تمہاری؟‘‘ (آقا جان کو قسطینا کبھی بڑے احترام سے انکل آقا کہا کرتی تھی)

میں نے کہا۔ ’’جو آپ کی رائے ہوگی، وہی میری ہو گی۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ اس شخص نے ایک بدترین غدار کا کردار ادا کیا ہے۔ اسے معاف نہیں کیا جانا چاہیے۔‘‘

قسطینا حسبِ عادت اپنے کان کی لو مسل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ جھلک رہی تھی۔

میں نے دیکھا ’’آئی سی یو‘‘ کی طرف سے پال کورنی ہماری طرف آرہا تھا۔ اس کے قدموں میں ایک تشویش آمیز تیزی تھی۔ ہم اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ پال نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ’’بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے، لیکن...... امید کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر وائٹ نیویارک ائرپورٹ سے روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ اس وقت فضا میں ہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے۔‘‘ اس کی آواز کچھ بھرّا گئی۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

تو کیا ابراہیم جا رہا تھا؟ کیا زینب اور ابراہیم کرشماتی طور پر ملنے کے بعد پھر جدا ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی حالات کی نہایت خوشگوار کروٹیں بھی نصیب کو بدل نہیں سکتیں۔ زینب کی قبر بن چکی تھی لیکن پھر کرشمہ ہوا تھا اور وہ زندہ سلامت ابراہیم کے سامنے آگئی تھی لیکن اب حالات کی بدترین سنگینی پھر اس کرشمے کی چمک کو دھندلاتی چلی جارہی تھی۔

پال نے کہا تھا کہ ابراہیم کے لیے دعا کریں۔ اس بے چارے کے لیے زینب سے زیادہ کس کی دعا قبول ہو سکتی تھی۔ وہ یتیم بے سہارا بچی جو دوسروں کے حکم پر اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر ہزاروں میل دور اس پردیس میں آبسی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں پر زور دیا اور بمشکل اٹھ کر چند قدم آگے گیا۔ ساتھ والے کیبن میں زینب موجود تھی۔ وہ شفاف فرش پر مصلیٰ بچھائے سجدے میں گری ہوئی تھی۔

☆☆☆

چند گھنٹے پہلے ڈاکٹر بوشر وائٹ یہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ برونائی سے بذریعہ ہیلی کاپٹر یہاں آیا تھا اور آتے ساتھ ہی ڈاکٹروں کی اس ٹیم میں شامل ہو گیا تھا جو ابراہیم کو کومے کی سی کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے مسیحا صفت ڈاکٹر وائٹ کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں کمال کا اعتماد تھا۔ خدا کی بخشی ہوئی عقل ہی تھی جس سے وہ مردوں میں جان ڈالتا تھا۔ تاہم بڑے سے بڑا مسیحا بھی یہی کہا کرتا ہے کہ موت کے سوا ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔

رات گئے ایک اچھی خبر ملی اور وہ یہ تھی کہ NERVOUS رسپانس کر رہے ہیں اور ابراہیم کی نبض میں کچھ بہتری آئی ہے۔ بہر طور اس کی زندگی مسلسل خطرے میں تھی۔

رات تین بجے کے لگ بھگ میں ڈی پیلس واپس آگیا۔ میرے ڈاکٹرز کا شدید اصرار تھا کہ میں چند گھنٹے کے لیے مکمل آرام کروں۔ میں ڈی پیلس کے مین گیٹ کے قریب پہنچا تو میری حفاظتی گاڑیوں کو رکنا پڑا۔ گیٹ پر رات کے اس پہر بھی لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ میرے پوچھنے پر کرنل احرار نے بتایا۔ ’’آقا جان اور اس کے دو قریبی ساتھی اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں۔‘‘

کل سہ پہر ہی فوجی عدالت نے آقا جان کی قسمت کا فیصلہ کر ڈالا تھا...... اور سپریم کمانڈر کی حیثیت سے قسطینا نے اس فیصلے کی توثیق بھی کر دی تھی۔ جاماجی کے لاکھوں لوگ اپنے اس بدترین غدار کو جلد از جلد تختۂ دار پر دیکھنا چاہتے تھے۔

گرین فوجیوں نے بمشکل راستہ بنایا اور ہماری گاڑیاں ڈی پیلس کے اندر چلی گئیں۔ میرا دل چاہا کہ میں اپنی آنکھوں سے اس شخص کو کیفرِ کردار تک پہنچتے دیکھوں۔ کرنل احرار، کمانڈر زمان اور جاسم وغیرہ بھی یہی چاہتے تھے۔ ہم ایک لفٹ کے ذریعے ڈی پیلس کی بیرونی فصیل پر پہنچے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی مگر یہاں ابھی تک بڑے بڑے پلیٹ فارمز پر مارٹر گنز، بوفر گنز اور ایم آر ایل وغیرہ نظر آرہے تھے۔ ہم فصیل کے اوپر ایک نگراں پوسٹ کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

پھانسی کا وقت ہو چکا تھا۔ فضا میں ہیلی کاپٹرز چکرا رہے تھے اور دیگر حفاظتی انتظامات بھی مکمل تھے۔ چند منٹ بعد ہی آقا جان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو عارضی پھانسی گھاٹ تک پہنچا دیا گیا۔ یہی وہ پھانسی گھاٹ تھا جہاں ہردلعزیز عبدالکریم اور اس جیسے سیکڑوں حریت پسندوں کو بے رحمی سے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا...... آج آقا جان کی باری تھی۔ بے شک یہ جاماجی کی کہانی نہیں تھی، یہ کشمیر، فلسطین، برما، افغانستان اور لیبیا جیسے ہر خطے کی کہانی تھی۔

ہم نے دیکھا کمانڈر فارس جان کی نگرانی میں آقا

جان اور اس کے دونوں ساتھی نمودار ہوئے۔ آقا جان سیاہ لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر وہ سخت مزاحمت کررہا تھا۔ سپاہیوں کی گرفت سے نکل نکل جارہا تھا۔ پھر عجیب منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ اس موقع پر بھی گالیاں بک رہا تھا۔ ہم بلندی پر تھے اس کے باوجود اس کی آواز ہم تک پہنچ رہی تھی۔

سخت دھینگا مشتی کے عالم میں اس کا سیاہ ٹراؤزر نیچے کھسک کر گھٹنوں تک پہنچ گیا جسے اہلکاروں نے بمشکل کھینچ کر اوپر کیا۔

یکا یک اس نے لہجہ بدلا اور منت سماجت میں مصروف ہوگیا۔ وہ سپریم کمانڈر قسطینا کا نام لے رہا تھا۔ ”قسطینا کو یہاں لاؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں......بس ایک بار اس سے بات کرنا چاہتا ہوں......“

پھر وہ سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف مڑا اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ شور کے سبب اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچی۔ بس فون...... بھیجی...... غلط فہمی جیسے الفاظ ہی سمجھ میں آئے۔ سپرنٹنڈنٹ اپنا کام اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر آقا جان کو پھانسی گھاٹ کی چوبی سیڑھیوں کی طرف جانے پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا تو اس کے اشارے پر اہلکاروں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور چبوترے پر پہنچا دیا۔ یہاں اس کے دو ساتھی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ آقا جان ایک بار پھر اشتعال میں آیا اور دائیں بائیں زور مارنے لگا۔ اتنے فاصلے سے مجھے نظر نہیں آرہا تھا مگر یقیناً اس کی ناک کا بل بہت موٹا ہوچکا تھا، وہی منحوس بل جس کے نتیجے میں جاناں، زینب اور عبدالکریم جیسے لوگوں پر آفتوں کی یلغار ہوتی تھی۔ اس کے منہ پر سیاہ نقاب چڑھا کر پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ پاؤں کے نیچے سے تختہ نکلنے تک وہ اہلکاروں کے ہاتھوں میں تڑپتا پھڑکتا رہا۔ تینوں جسم خلا میں جھولے تو ڈی پیلس کے درودیوار پُرجوش نعروں سے گونج اٹھے پھر کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔ جاماجی کے سارے موسم بدل رہے تھے۔

☆☆☆

قسطینا، بن مشہد اور دیگر ساتھیوں کو ٹاپو کی زیرِزمین پناہ گاہ سے باہر نکلے آج تیسرا روز تھا۔ غیر رسمی طور پر قسطینا کو جاماجی میں کلیدی فیصلوں کا اختیار دے دیا گیا تھا۔ وہ بڑی فہم و فراست سے صورتِ حال کو کنٹرول کررہی تھی۔ عوام کے شدید اصرار پر اس نے ڈی پیلس کی بیرونی بالکونی سے لاکھوں کے مجمع سے خطاب بھی کیا تھا۔

محترم ذکری کے مشورے کے عین مطابق نیوسٹی پر یلغار نہیں کی گئی تھی اور صرف بارڈر کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر کے فائر بندی کردی گئی تھی۔ نجانے کیوں محترم حاذق ذکری کو یقین تھا کہ بہت جلد خونریزی کے بغیر نیوسٹی کے لوگ ڈی پیلس کو مرکز و محور مان لیں گے۔ ہاناوانی کے بارے میں یہی خبریں تھیں کہ وہ نیوسٹی میں ہے اور اس نے قسطینا کے حملے کی صورت میں نیوسٹی کا دفاع کرنے کا اعلان کیا ہے (یہ بات اب ثابت ہوچکی تھی کہ حملے کے روز وہ اسپتال کے ساؤنڈ پروف کمرے سے ایک گرین آفیسر کے تعاون سے فرار ہوئی تھی۔ کہا یہی جارہا تھا کہ وہ آفیسر...... ہاناوانی میں موجود ہپناٹزم کی غیر معمولی صلاحیتوں کا شکار ہوا ہے۔ یہ بات مجھے کچھ عرصہ پہلے بتائی جاتی تو شاید میں نہ مانتا...... لیکن اب تو میں اس حوالے سے ذاتی تجربے...... بلکہ تجربوں کا حامل تھا۔ سیاہ عینک کے پیچھے چھپی ہوئی خطرناک کشش......وہ ست رنگا بھنور......اور اس بھنور کے سامنے بے جان ہوتے ہوئے ہاتھ پاؤں، مجھے سب یاد تھا۔

کئی دنوں سے یہ سوال حل طلب تھا کہ حملے کے وقت ڈی پیلس کا مرکزی گیٹ کیسے خراب ہوا تھا۔ مار دھاڑ اور دستی بموں کے دھماکوں میں وہ سی سی ٹی وی کیمرے بھی برباد ہوئے تھے جو گیٹ کے اردگرد کے مناظر کو ریکارڈ کررہے تھے۔ جو ایک دو فوٹیج ملی تھیں وہ بیکار تھیں۔ ان میں صرف جنگی صورتِ حال ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ بات اب ثابت ہوچکی تھی کہ دیوہیکل گیٹ کے میکنزم کو جان بوجھ کر خراب کیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ موقع پر موجود ایک یا دو سی ٹی وی کیمروں میں سے فوٹیج نکال لی گئی ہے یا پھر ان میں میموری کارڈ ہی موجود نہیں۔

اسی طرح کا ایک اور سوال بھی تھا۔ وہ ڈاکٹر ماریہ اور اس کے بچے کے حوالے سے تھا۔ انیق اور جاسم کی کوشش کے باوجود ابھی تک ڈاکٹر کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اب یہ تکلیف دہ سوچ ذہن میں آرہی تھی کہ کیا وہ دونوں بھی ان بہت سے لوگوں میں شامل ہیں جو اس لڑائی میں لقمۂ اجل بنے ہیں۔

ان دونوں سوالات کا جواب مجھے تقریباً ایک ساتھ ہی ملا۔ میں بیٹھا تھا کہ انیق سر کھجاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے پاس ایک لیپ ٹاپ بھی تھا، وہ بولا۔

''لو جی، اپنی سراغ رسانی مکمل ہو گئی، ڈاکٹر ماریہ کا کھوج لگ گیا۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ایک سو ایک فیصد اور آپ کے لیے ایک اور بڑا انکشاف بھی ہے۔ ہم پچھلے تین روز سے اپنے اس محسن کو ڈھونڈ رہے ہیں جس نے ہمارے لیے ڈی پیلس کا دروازہ کھولا۔ آپ کو پتا ہے، وہ کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''اس کو اس فوٹیج میں دیکھ سکتے ہیں جو میں ساتھ لایا ہوں۔ یہ اس لڑائی کی اہم ترین فوٹیج ہے اور یہ آپ کے اس خاکسار نے آج ہی حاصل کی ہے۔''

اس نے لیپ ٹاپ کے ''کی بورڈ'' کو استعمال کیا اور چند سیکنڈ بعد سی ٹی وی کی ایک فوٹیج اسکرین پر پلے ہونے لگی۔ یہ کافی صاف فوٹیج تھی۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اسی خونی سہ پہر کی ہے جب ہم ڈی پیلس پر ہلا بول رہے تھے۔ اسکرین پر مین گیٹ کے کنٹرول روم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ ایک کیمرے نے ایک جواں سال عورت کو عقب سے دکھایا جو سیکیورٹی اہلکاروں سے بات کر رہی تھی اور انہیں اپنا کارڈ دکھا رہی تھی۔ رائے زل کی فورس کے ان مسلح اہلکاروں نے اسے آگے جانے دیا۔

جب دوسرے کیمرے نے عورت کو دکھایا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ ڈاکٹر ماریہ تھی۔ وہ کنٹرول روم کے خاص حصے میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ جب اس نے دروازہ بولٹ کیا، گیٹ کو کنٹرول کرنے والے دو آپریٹرز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے اپنے سفید کوٹ کے اندر سے ایک سائلنسر لگا بریٹا پسٹل نکالا۔ اس سے پہلے کہ آپریٹرز کچھ سمجھ پاتے، ڈاکٹر ماریہ نے تین فائر کیے اور دونوں گیٹ آپریٹرز اپنی کرسیوں سے لڑھک گئے۔ کنٹرول پینل کے اوپر لگی دو اسکرینز پر گیٹ سے باہر کے دھندلے مناظر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی تہلکہ خیز لمحات تھے جب کسی جانب سے گولی چلی تھی اور پھر سب کچھ کنٹرول سے باہر ہو گیا تھا۔ ہزاروں افراد مورچوں پر چڑھ دوڑے تھے۔ ہم نے فوٹیج میں دیکھا کہ کنٹرول پینل کے سامنے کھڑی ڈاکٹر ماریہ زخمی شیرنی کی طرح نظر آ رہی ہے۔ وہ کنٹرول پینل پر جھپٹی...... اور اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گیٹ کے سسٹم کو کس طرح نقصان پہنچائے۔ پھر اس نے آہنی ٹانگوں والی ایک چھوٹی کرسی اٹھائی اور اسے دیوانہ وار کنٹرول پینل پر مارنا شروع کر دیا۔ پینل میں سے جو اسپارکس نکل رہے تھے وہ بھی فوٹیج میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کئی تار کھینچ کر توڑ ڈالے اور پھر سی ٹی وی کیمرے کے فریم سے نکل گئی۔

میں ششدر تھا۔ انیق نے کہا۔ ''دیکھا جائے تو ڈاکٹر ماریہ نے اپنے ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیکڑوں لوگوں کی جانیں اس کے اس دلیرانہ اقدام سے بچ گئی ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ڈاکٹر ماریہ اب خود کہاں ہے؟'' میرے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''آپ کے خیال میں اسے کہاں ہونا چاہیے؟''

''میرے خیال میں اسے زندہ ہونا چاہیے۔ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔''

''ڈاکٹر ماریہ زندہ ہے اور میری اطلاعات کے مطابق وہ کل رات تک جاماجی میں ہی تھی۔ اس نے کسی کو فون کیا تھا اور اس فون کے ذریعے ہم اسے ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو گھنٹے میں وہ ہمارے سامنے ہو۔''

میں نے ایک بار پھر وہی فوٹیج دیکھی جس میں ماریہ آٹومیٹک گیٹ کے کنٹرول کو تباہ کرتی نظر آتی تھی۔ یہ سنسنی خیز مناظر تھے۔ ان میں ایک ایسی عورت کا ردِعمل نظر آتا تھا جسے ایک بااختیار شخص نے بلیک میل کر کے اپنے بیڈروم کی زینت بنایا تھا۔ اسے روندا تھا۔ اسے اَن گنت لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و رسوا کیا تھا...... اور مسلسل کیا تھا۔ ان مناظر میں اس عورت نے اپنا بدلہ لے لیا تھا اور نہ صرف بدلہ لیا تھا بلکہ اپنے لاکھوں ہم وطنوں کے لیے پیش قدمی اور فتح کی راہ ہموار کی تھی۔

میں نے کہا۔ ''انیق، تم نے ابھی ایک فون کی بات کی ہے۔ ڈاکٹر ماریہ نے کس کو کیا ہے فون؟''

''آپ نے ابھی تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اس اہم فوٹیج تک کیسے پہنچا ہوں؟''

''تم کچھ بتاؤ تو پھر ہے ناں، تم تو ہر وقت لٹھ لے کر سسپنس کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔''

''سسپنس ہی تو کہانی کی جان ہوتا ہے جی۔ آپ نے کبھی کرنل حمیدی فریدی، علی عمران اور میجر پرمود وغیرہ کو پڑھا ہے؟ نہیں پڑھا ناں۔ اسی لیے آپ کو سسپنس کا پتا نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے فلمساز گجر بادشاہ

جیسی فلموں پر روپیا برباد کرنے کے بجائے ان کرداروں پر کوئی ڈھنگ کی فلم بنادیں تو کروڑوں میں کھیلیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو، ابھی تم نے لات کا ذکر کیا تھا، اور لات تمہیں پڑنے والی ہے۔"

وہ جلدی سے پٹری پر آگیا اور بولا۔ "ڈاکٹر ماریہ نے کل وہ فون اپنے ایک مریض کی بیوہ کو کیا ہے اور مریض کے وفات پانے پر اسے تسلی تشفی دی ہے۔"

"مریض کون تھا؟"

"ڈی پیلس کی نگرانی کے ڈپارٹمنٹ کا ایک چالیس سالہ ٹیکنیشن شکور آصفی، وہ پرسوں شام ایک بارودی سرنگ کے پھٹنے سے مارا گیا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے دو سی سی... ٹی وی کیمروں سے ڈاکٹر ماریہ کی فوٹیج نکالی....."

انیق نے اس حوالے سے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا...... معمولی حیثیت کا مالک شکور ہیپاٹائٹس سی کا پرانا مریض تھا۔ ڈاکٹر ماریہ نے طویل عرصے تک بلا معاوضہ اس کا علاج کر کے اسے اس بیماری سے چھٹکارا دلایا تھا۔ اس بنا پر وہ ڈاکٹر ماریہ کا بے حد احسان مند تھا۔ پرسوں سہ پہر حملے کے وقت جب ڈاکٹر ماریہ کنٹرول روم میں گھسی اور اس نے دو افراد کو ہلاک کر کے گیٹ کا میکنزم جام کیا تو شکور نے دیکھ لیا۔ تب تک کچھ پتا نہیں تھا کہ اس لڑائی میں ایجنسی اور گرے فورس کو کامیابی ملتی ہے یا گرین فورس کو۔ اس خیال سے کہ ان سی سی ٹی وی کیمروں کی وجہ سے ڈاکٹر ماریہ پر کوئی مصیبت نہ آئے، شکور آصفی نے بڑی مہارت اور تیزی سے دونوں کیمروں کے ریکارڈنگ باکس کھولے، ان میں سے میموری کارڈز نکالے اور اپنے گھر لے گیا مگر ایک دو گھنٹے بعد اسی شام شکور کی زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔ ڈی پیلس کے قریب بارودی سرنگ کے ایک دھماکے میں تین شہری جاں بحق ہوئے ان میں سے ایک ٹیکنیشن شکور بھی تھا۔ نیوز میں اس کی تصویر بھی آئی تھی۔ اسی دوران میں انیق ایک مقامی سراغ رساں کے ہمراہ گمشدہ میموری کارڈز کا کھوج لگاتا ہوا شکور کے گھر جا پہنچا، جہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ شکور کی بیوہ بے چاری کو کچھ پتا نہیں تھا کہ گھر کی ایک الماری میں جو الیکٹرونکس کی اشیا پڑی ہیں وہ کس قدر اہم ہیں۔ انیق نے وہ ایس ڈی میموری کارڈز، آج صبح ہی شکور کی بیوہ سے حاصل کر لیے۔ شکور کی بیوہ نے انیق اور مقامی سراغ رساں کو بتایا تھا کہ اس کے لیے ڈاکٹر ماریہ کا تعزیتی فون بھی آیا ہے۔ اب انیق، مقامی سراغ رساں کے ساتھ مل کر اسی فون نمبر کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب قسطینا کا پرسنل سیکریٹری اندر داخل ہوا اور مجھے سیلوٹ کرنے کے بعد بولا۔ "جناب! ہرہائی نس تشریف لا رہی ہیں۔"

میں نیم دراز تھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سیکریٹری سے کہا کہ وہ آجائیں۔

قریباً پانچ منٹ بعد قسطینا تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ یونیفارم ایک بار پھر اس کے جسم پر نظر آرہی تھی۔ (یہ وہی فوجی یونیفارم تھی جسے ایک موقع پر قسطینا نے مایوسی کے عالم میں خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا)

"ہیلو شاہ زائب! تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"میں اب بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔ انیق اسے سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ اسے جاتے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "یہ تمہارا دوست بھی بہت انوکھی چیز ہے۔ دیکھو تو ایک عام سا بے وقوف لڑکا نظر آتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وقت پڑنے پر یہ کتنا خاص الخاص اور اپنے دشمن کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"شاید "چھپا رستم" کا لفظ ایسے ہی لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں قسطینا! اس کی یادداشت فوٹو اسٹیٹ کی طرح ہے۔ آپ کو بتایا تھا ناں کہ یہ دنیا کی بہت سی زبانیں جانتا ہے، کوئی نئی زبان سیکھنا بھی اس کے لیے ہفتوں کی بات ہوتی ہے۔ اس کی یہی صلاحیت ہے جس کی وجہ سے ہمیں کمانڈر فارس جان کے دل کا حال بھی معلوم ہوا...... میرا مطلب ہے کہ ہم اس کی ڈائری پڑھ پائے۔"

قسطینا کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ اس سرخی میں رومانیت کی ہلکی سی جھلک تھی۔ وہ جلدی سے سنجیدہ ہو گئی اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ ابھی میں تمہیں ایک خاص اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں۔"

"خیریت کی اطلاع ہے؟"

"ہاں۔" اس نے کہا اور اپنے موبائل فون پر آیا ہوا ایک طویل ٹیکسٹ میسج میرے سامنے کر دیا۔

یہ میسج ڈاکٹر ماریہ کی طرف سے تھا۔ اس نے قسطینا کو مخاطب کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ "پیاری

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com
http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

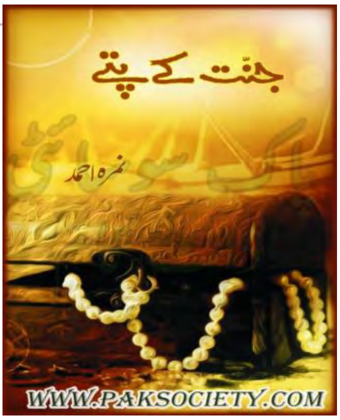
جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

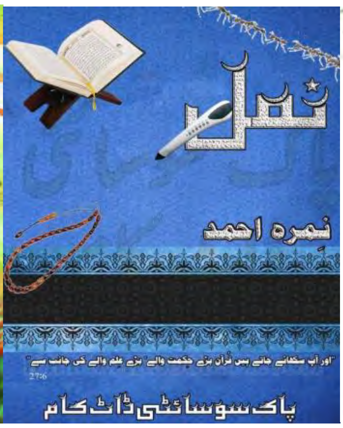
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

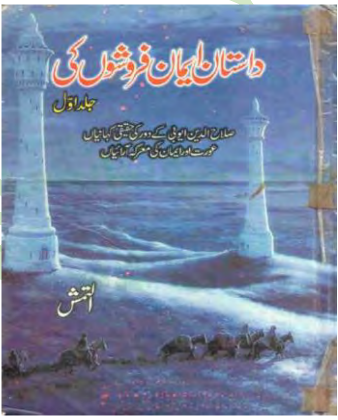
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

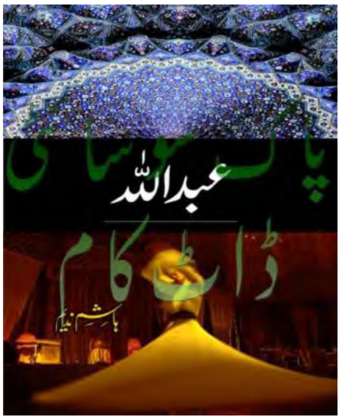
عبداللہ
ہاشم ندیم

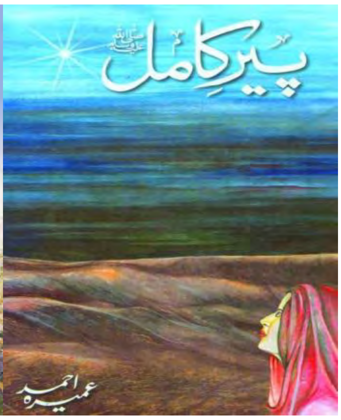
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

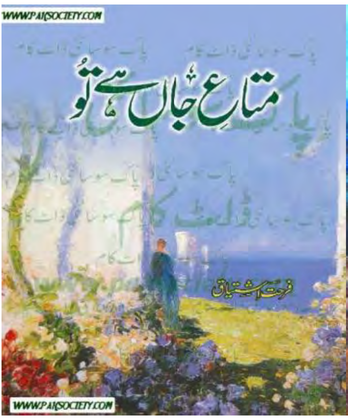
WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

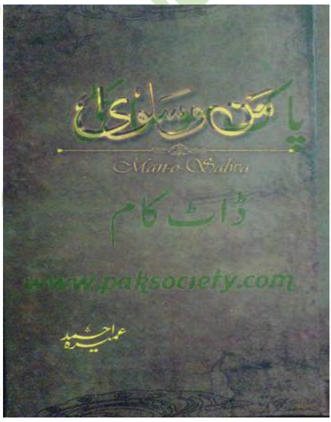
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

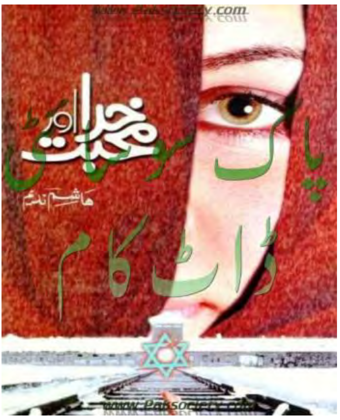
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

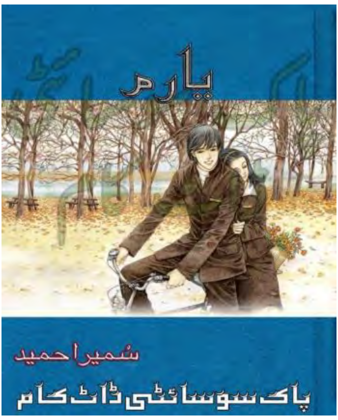
شمیر احمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

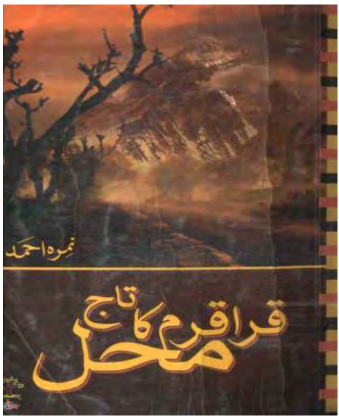
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

قسطینا! یہاں میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد میرا یہاں سے چلے جانا ہی بنتا ہے لیکن وقتِ رخصت مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ..... جاماجی کے لوگوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا کرنے والا جنس زدہ خبیث (رائے زل) اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ میں جانتی ہوں انیکسی کی چھت پر اس کے کٹے ہوئے سر کو فٹ بال کی طرح لڑھکایا گیا ہے۔ وہ اس سے بھی بڑی سزا کا مستحق تھا۔ اس نے ڈی پیلس میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں جو شرمناک کھیل کھیلے ہیں بہت سی خواتین اس کی گواہ ہیں۔

میری پیاری دوست! میں اپنے بچے کو اپنی گود میں سمیٹ کر یہاں سے دور جا رہی ہوں۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس کی ماں کے ساتھ ہونے والا سلوک ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے اور وہ ایک باوقار زندگی جی سکے۔ مجھے معاف کرنا۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے..... لیکن ایک دوسرے کی یادیں تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ آخر میں ایک بات اور...... مجھے تھوڑی سی خوشی بھی ہے کہ رائے زل اور ہاناوانی کی شکست میں تھوڑا سا کردار میں نے بھی ادا کیا ہے۔ تمہاری بڑی بڑی قربانیوں کے مقابلے میں یہ ایک چھوٹی سی کوشش تھی لیکن...... خدا نے اسے کامیاب کیا۔ حملے کے وقت میں اس کنٹرول روم میں چلی گئی جہاں سے ڈی پیلس کا مین گیٹ کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ جب گیٹ کھلا ہوا تھا میں نے اس کے کنٹرول سسٹم کو توڑ پھوڑ دیا۔

پیاری قسطینا! مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہیں میسج کرنے کے بعد میں یہ سیل فون بھی سمندر میں پھینک رہی ہوں...... تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو فتح مبارک۔ آئندہ زندگی میں اللہ تمہیں بڑی کامیابیوں سے نوازے۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہاری دوست ماریہ۔"

میسج پڑھ کر میں قسطینا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔ ہم ماریہ کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ قسطینا بولی۔ "یہ بھی ایک انکشاف ہے کہ مین گیٹ کے سسٹم کو جام کرنے والی ڈاکٹر ماریہ تھی۔ پتا نہیں وہ کس طرح اور کیسے اس جگہ گھسی؟"

"میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ وہ کس طرح اور کیسے گھسی۔" قسطینا سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "میرے پاس ایک فوٹیج ہے جس میں سب کچھ نظر آتا ہے۔"

"فوٹیج...... کیسی فوٹیج؟"

"ان سی سی ٹی وی کیمروں کی فوٹیج جو کنٹرول روم میں تھے...... اور یہ فوٹیج اسی "چھپے رستم" نے حاصل کی ہے۔ آپ ابھی جس کا ذکر کر رہی تھیں۔"

میں نے فوٹیج دکھانے کے لیے لیپ ٹاپ آن کر دیا۔ قسطینا کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ حیرت کی پرچھائیاں گہری ہونے لگیں۔

☆☆☆

رائے زل کی مسخ لاش ایک تابوت میں ڈال کر نیوسٹی کے سرحدی محافظوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ عارفہ خاتون اور ناظم باذان کی تدفین ہو چکی تھی۔ بیگم نورل کی میت ڈی پیلس میں رکھ دی گئی تھی۔ جاماجی کے ہزاروں لوگ اس کا دیدار کر چکے تھے۔ اگلے روز بیگم نورل کی آخری رسومات میں شرکت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی۔ قریبی ممالک سے بھی کئی اہم شخصیات نے اس میں شرکت کی۔ مقامی میڈیا کہہ رہا تھا کہ جاماجی کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ محترم حاذق ذکری نے خود یہ نمازِ جنازہ پڑھائی۔

بیگم نورل کی آخری رسومات میں، میں نے بھی شرکت کی مگر وہیل چیئر پر...... میرے پاؤں، پنڈلیوں اور ٹانگوں کے زخم، مجھے ابھی تک بہ آسانی چلنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ کلائیوں اور پسلیوں کی جلد والے زخم اب بہتر تھے۔ ابراہیم کا علاج بڑی تندہی سے ہو رہا تھا۔ اس کی حالت کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاجور بھی ڈی پیلس میں تھی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ ہم جنگ کی حالت سے نکل آئے ہیں مگر میری تسلی کے باوجود یہ بات اسے پریشان کرتی تھی کہ ہم جلد از جلد پاکستان روانہ کیوں نہیں ہوتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ زینب کے پاس اسپتال گئی تھی جہاں ابراہیم زیرِ علاج تھا۔

آخری رسومات میں شرکت کے بعد میں تھکا تھکا سا کمرے میں بیٹھا تھا کہ انیق آ دھمکا۔ کسی حالت میں بھی اس کی خوش گفتاری پر منفی اثر نہیں پڑتا تھا، بولا۔ "اتنا شاندار جنازہ دیکھ کر تو میرا اپنا دل مرنے کو چاہ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری یہ خواہش جلد ہی پوری ہو جانی ہے۔ سجاول سے تمہارے تعلقات ٹھیک نہیں اور اس کا آخری نتیجہ بہرحال تمہاری رحلت کی شکل میں نکلنا ہے۔ ویسے...... حیرانی کی بات ہے...... لڑائی میں تم دونوں نے کندھے سے کندھا ملائے رکھا تھا؟"

''وہ مجبوری تھی جی، جس کی وجہ سے شیر اور بکری نے ایک گھاٹ پانی پیا ہے۔ دشمنی اسی جگہ پر ہے اور اس کا ثبوت میری کمر کا یہ زخم بھی ہے جس کی وجہ سے میری ساری دلیری مشکوک ہوگئی ہے۔ بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں لڑائی میں کسی موقع پر بھاگا ہوں۔''

''سجاول سے اس کا کیا تعلق ہے؟''

''مجھے پورا شبہ ہے جی کہ یہ زخم دستی بم کے دھماکے میں نہیں آیا۔ موقع تاک کر آپ کے امریش پوری نے ہی اپنی کرپان وغیرہ ماری ہے۔ اس قسم کی عیاریاں وہ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ اب دیکھیں کہ خورسنہ صاحبہ کو نرس کے لباس میں دیکھ کر اس نے اپنی ران بھی تو زخمی کر ہی لی تھی نا۔''

''کبھی کبھی بالکل کوئی لڑاکی سوکن لگتے ہو۔ اگر بدگمانیوں کا مقابلہ ہو تو تم ضرور عالمی ٹائٹل جیت جاؤ۔''

''آپ کو تو کبھی یقین نہیں آئے گا۔ اب آپ دیکھ لیں اس کی کوئی عمر ہے عشق لڑانے کی؟ کل قُل رگڑ کر شیو کی ہے اس نے اور مونچھیں بھی چھوٹی کی ہیں اور یہ سب کچھ خورسنہ کی فرمائش پر ہوا ہے۔ میں بھی اڑتے کوّے کے پَر گن لیتا ہوں۔ وہ کیا زبردست محاورہ کہا کرتے ہیں پہلوان حشمت صاحب، بوڑھی گھوڑی اور شہتیروں کو چھپے۔''

میں نے کہا۔ ''اتنی زیادہ عمر بھی نہیں اس کی اور طاقت بھی چھ بندوں جتنی ہے۔''

''ہاں اس بات سے تو میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔''

''یعنی تم مانتے ہو کہ طاقت چھ بندوں جتنی ہے؟''

''اوہ...... آپ طاقت کہہ رہے ہیں؟...... میں سمجھا خباثت کہہ رہے ہیں۔'' پھر منہ بنا کر بولا...... ''یہ بہت کھوچل ہے جناب! ایسے بندے بکری میں سے بھینس جتنا دودھ نکال لیتے ہیں۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوگی اگر خورسنہ جیسی معقول خاتون اس نامعقولیے کے ساتھ پاکستان جانے کو بھی تیار ہو جائے۔''

ہم بہت دنوں بعد ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر بہار کی ایک چمکیلی شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ مگر قدرت کو شاید ابھی ہماری مسلسل مشکلات میں خوشی کا کوئی طویل دورانیہ منظور نہیں تھا۔ ہمیں باتیں کرتے ہوئے دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ بن مشہد دھواں دھواں چہرے کے ساتھ ہمارے پاس پہنچا۔ دھیان فوراً ابراہیم کی طرف گیا۔ ''کیا ہوا ابنِ مشہد؟'' میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

''چھوٹے صاحب...... ابراہیم...... کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کے دل کی حرکت کسی بھی وقت بند ہو سکتی ہے۔''

مجھے لگا کہ میری رگوں میں خون جم رہا ہے...... تو کیا وہ برا وقت آگیا تھا جس کے اندیشے ہمیں دن رات ڈرا رہے تھے۔ کیا ابراہیم...... نیک دل، سادہ مزاج، نرم خو ابراہیم...... موت سے اپنی جنگ ہار رہا تھا؟

یہی وقت تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بھی بجنے لگی۔ دوسری طرف تاجور تھی۔ وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''شاہ زیب! کہاں ہیں آپ...... کیا آپ اسپتال نہیں آسکتے؟ مم...... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ ابراہیم کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔ زینب نے رو رو کر بُرا حال کر لیا ہے۔ وہ آپ کو بُلا رہی ہے۔ کہیں اس کو بھی کچھ ہو نہ جائے۔''

پھر ایک دم پس منظر میں رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ زینب کی آوازیں ہیں۔ مزید کچھ سننا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں نے فون آف کر دیا۔

''کیا ہوا بھائی؟'' انیق نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''انیق! مجھے اسپتال لے چلو...... ابھی اسی وقت...... ابراہیم کی حالت ٹھیک نہیں۔''

''لل...... لیکن آپ تو......''

''چلو، جلدی کرو۔'' میں دہاڑ کر بولا۔

انیق نے وہیل چیئر کو ٹیکسی کے بیرونی دروازے کی طرف حرکت دی۔ اسی دوران میں سیل فون پر پھر کال آئی۔ اس مرتبہ قسطینا تھی مگر اب کال ریسیو کرتے ہوئے میرا دل لرز رہا تھا۔ میں کوئی کال سننا نہیں چاہتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے پانی کی چادر سی تھی...... موت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ وہ ایک پرچھائیں کی طرح آتی ہے...... اور آنسوؤں، آہوں، دعاؤں اور التجاؤں کے درمیان سے اپنے شکار کو اچک کر لے جاتی ہے۔ کیا اب بھی وہ ایسا ہی کرنے والی تھی؟

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

قاتل تکون

محمد یاسر اعوان

اُن مجرموں کا قصہ جنہیں طویل قید کاٹنی تھی... مگر شاہراہِ حیات پر آزادانہ گھومنے کی خواہش نے انہیں فرار پر مجبور کر دیا... شہر کی سڑکیں تھیں اور کہیں جائے اماں نہ تھی... وہ بدباطن ایک ایسے گھر میں داخل ہو گئے... جو معصوم اور بے ضرر مکینوں کا آشیانہ تھا...

سفاک قاتلوں کی تکون...... جو مفاد کی ڈور سے بندھے تھے......

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی کار انتہائی تیز رفتاری سے شہر کے بارونق بازاروں سے گزر رہی تھی۔ ڈرائیور کی نشست پر گہرے سیاہ رنگ کی شرٹ پہنے بیٹھا شخص چہرے سے عادی مجرم دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے دائیں رخسار پر گہرے زخم کا نشان تھا۔ اس کا ایک کان کٹا ہوا تھا اور ہونٹ سیاہی مائل تھے۔ غصے سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو مسلسل گالیاں بک رہا تھا۔

ساتھ والی سیٹ پر بیس بائیس سال کا ایک نوجوان

بیٹھا تھا جو شکل وصورت سے معصوم نظر آتا تھا۔ وہ شہر کے اس چھٹے ہوئے بدمعاش کرسٹن کا چھوٹا بھائی تھامسن تھا۔ تھامسن اپنے بڑے بھائی سے بے حد خوف کھاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ذاتی طور پر جرم سے نفرت کرنے کے باوجود چار سال پیشتر اسے ایک شخص کو قتل کرنے میں کرسٹن کی مدد کرنا پڑی۔ بدقسمتی سے دونوں بھائی موقعِ واردات ہی پر گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور عدالت نے انہیں دس دس سال قیدِ بامشقت کی سزا سنا دی۔

پچھلے تین سال سے وہ بوسٹر کے تنگ و تاریک قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر آج انہیں موقع مل ہی گیا اور وہ پہرے دار کا گلا گھونٹنے کے بعد کوٹھری سے بھاگ نکلے۔

اس کوٹھری میں ان کے ساتھ رچرڈ نامی ایک مجرم بھی تھا جو اس صفائی سے پیٹ میں چھرا گھونپتا کہ مقتول کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی، وہ بھرے بازار میں اپنے دشمن کا پیٹ پھاڑنے کے بعد صاف بچ نکلتا۔ فرار ہوتے وقت وہ بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ تھا۔ عملے اور قیدیوں کی نظروں سے چھپتے چھپاتے وہ تینوں قید خانے کی عمارت سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔ گیارہ بجے تک قید خانے کے عملے کو ان کے فرار کی خبر نہیں ہوتی کیونکہ اس سے پہلے ان کی کوٹھری میں کوئی نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس فرار ہونے کے لیے صرف آدھا گھنٹا تھا۔

جیل سے باہر نکلتے ہی کرسٹن کی نظر دیہاتی طرز کے ایک قلعہ نما مکان پر پڑی جس کے آنگن میں خشک گھاس کے بڑے بڑے گٹھڑ پڑے تھے۔ کچھ دیر بعد سامنے سڑک پر ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ انہوں نے ایک جست لگائی اور خشک گھاس میں جا چھپے...... مکان سے باہر دور دور تک جیل کی زمین تھی جس میں قیدی کاشت کیا کرتے تھے۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ یہاں آ چکے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ قید خانے کی بیرونی چار دیواری پر پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے کھڑا رہتا ہے۔

ابھی وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھے کہ... انہیں دو آدمیوں کی گفتگو سنائی دی۔ کرسٹن نے گھاس کے پشتے میں سے سر نکال کر دیکھا کہ جیل کا سرخ و سفید ڈاکٹر اپنے ڈرائیور سے باتیں کر رہا ہے۔ گیراج کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئے۔ اب ان کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ایک بجے میٹنگ میں جانا ہے، تم فوراً گاڑی لے جاؤ اور اسکول سے بچوں کو لے آؤ۔“

”بہتر جناب۔“ ڈرائیور نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ اسی وقت ایک خیال بجلی کی طرح کرسٹن کے ذہن میں کوندا...... ”اگر کسی طرح یہ گاڑی مل جائے تو......“ اس نے جلدی سے اپنے ساتھیوں کو منصوبہ سمجھایا اور تینوں پنجوں کے بل چلتے ہوئے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی کار گیراج سے باہر نکلی۔ جونہی وہ پھاٹک پر پہنچی، کرسٹن نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکوا لیا۔ اگلے ہی لمحے رچرڈ ڈرائیور کے سر پر تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور کے منہ سے کوئی آواز نکلتی، رچرڈ اس کا گلا دبا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سرکاری ڈاکٹر کی کار میں مزے سے بیٹھے تھے۔ کرسٹن دھول سے اٹی ہوئی کچی سڑک پر انتہائی تیز رفتاری سے کار چلا رہا تھا۔ بیرونی پھاٹک سے گزرتے وقت اس نے کار کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اس طرح پہرے دار کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی شکل نہ دیکھ سکے۔ ویسے بھی ڈاکٹر کی گاڑی دیکھ کر وہ ایک طرف کو ہٹ گئے تھے۔

ابھی وہ بڑی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں پیچھے سے سیٹیاں سنائی دیں۔ تھامسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پولیس کی ایک جیپ ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ خوف سے اس کی رگوں میں خون جمنے لگا، اس نے چلّا کر کرسٹن سے کہا۔ ”پولیس ہمارا پیچھا کر رہی ہے، جلدی چلو۔“

”اب صرف ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ——“ کرسٹن نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر انتہائی پھرتی سے کار سڑک سے ہٹا کر ایک تنگ گلی میں ڈال دی۔

☆☆☆

جیل سے ان کے فرار کی خبر ہر جگہ پہنچ گئی تھی۔ پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر مارٹن، فون پر شہر سے باہر نکلنے والے تمام راستوں کی ناکابندی کا حکم دے چکا تھا۔ اب وہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے تینوں قیدیوں کی تصویریں طلب کر رہا تھا تاکہ شام کے اخبارات میں شائع کرائی جا سکیں۔ ٹریفک پولیس کے عملے کو کار کا رنگ اور نمبر بتایا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کی گاڑیاں شہر کے مختلف علاقوں میں سرخ رنگ کی کار کو تلاش کر رہی تھیں۔ شہر کے تمام ہوٹلوں کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ اگر اس حلیے کے تین آدمی ان کے پاس آئیں تو وہ قریبی پولیس اسٹیشن کو فوراً اطلاع کریں۔ مارٹن کا خیال تھا کہ جلد سے جلد کار سے نجات پانے کے لیے وہ کسی ویران جگہ کا انتخاب کریں گے۔ اس نے پولیس کی تمام چوکیوں میں فون کر دیا کہ اپنے اپنے علاقے میں جتنے زیادہ سپاہی ممکن ہوں،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس سرکاری ڈاکٹر کی کار کی تلاش میں بھیج دیے جائیں۔

ان سب انتظامات سے مطمئن ہو کر وہ کرسی پر بیٹھا مزے سے پائپ پی رہا تھا جب بھی فون کی گھنٹی بجتی تو وہ قیدیوں کے پکڑے جانے کی خبر سننے کی خواہش لیے فوراً ریسیور اٹھاتا۔ وہ اپنے انتظامات سے بہت خوش تھا، اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ تین مجرم اس کے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔

☆☆☆

ڈیوڈ ہاؤس میں اس وقت دوپہر کا کھانا پک رہا تھا۔ مسز ڈیوڈ کچن میں تھی۔ اس کا دس سالہ بچہ جوزف چولھے کے پاس بیٹھا تھا۔ جوزف کے بال سنہرے اور گھنگریالے تھے اور آنکھیں بھوری۔ عام حالات میں وہ بے حد شرارتی لڑکا تھا اور کبھی ٹک کے نہیں بیٹھتا تھا لیکن اس وقت اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے کھانا پکنے کا انتظار کر رہا تھا۔

مسٹر ڈیوڈ حسبِ معمول ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ وہ پانچ چھ بجے کے قریب گھر پہنچتے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ ہاں البتہ ایک لڑکی ملازمہ تھی جو ہفتے میں دو بار آتی تھی کیونکہ تمام محلے کے برتن دھونا اسی کی ذمے داری تھی۔ اس کا نام جوزی تھا اور وہ بڑی ہنس مکھ اور موٹی تازی تھی۔ جوزف کے علاوہ ان کی ایک بیٹی جین تھی جس کی عمر انیس سال تھی اور وہ ایک فرم میں ٹائپسٹ تھی۔ وہ بھی پانچ بجے کے بعد ہی گھر آیا کرتی۔ مسٹر ڈیوڈ ایک اسٹور چلاتے تھے۔ اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ باپ، بیٹی کے پاس اپنی اپنی گاڑی تھی۔ ڈیوڈ گھرانے کی ایک نمایاں خصوصیت افرادِ خانہ کے مابین بے انتہا محبت تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ کسی شام ڈیوڈ کو ذرا سی دیر ہو جاتی تو سارا گھر اس کے انتظار میں کھانا نہ کھاتا۔

اس روز دوپہر کافی سرد تھی۔ باہر دھند پھیلی ہوئی تھی۔ بارہ بجے کے قریب مسز ڈیوڈ (روزی ڈیوڈ) کو باہر کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت ڈیوڈ یا جین کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو ایک سرخ رنگ کی کار گیراج میں داخل ہو رہی تھی۔ ”یہ کون ہو سکتا ہے؟“ روزی ڈیوڈ نے سوچا۔ اگر یہ کوئی مہمان ہوتا تو کار کو گیراج میں بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اسے سوچنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ باہر دروازے پر کوئی زور زور سے بیل بجا رہا تھا۔ جوزف دروازے کی طرف بھاگا۔ روزی اس خیال سے اس کے پیچھے چل دی کہ شاید وہ مہمانوں کو پہچان نہ سکے۔ جوزف نے دروازہ کھولا، تو اس کے سامنے ایک کٹے کان والا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔

”فرمائیے۔“ چھوٹے جوزف نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔ لمبے آدمی نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔

”دیکھیے، مسٹر ڈیوڈ گھر میں موجود نہیں ہیں، آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“ روزی نے نو وارد سے پوچھا۔

”جہنم سے، اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو میں اِسے گولی مار دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پستول کا رخ جوزف کی طرف کر دیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر گھس آئے، دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔

”خاتون آپ اپنا کام کیجیے۔ یہ بچہ ہمارے پاس موجود رہے گا۔ اگر آپ نے گھر کے کسی فرد کو خبردار کرنے کی کوشش کی تو ہم اِسے ختم کر دیں گے۔“

”گھر میں اس وقت کوئی موجود نہیں ہے۔“ روزی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“

روزی ڈیوڈ خاموش کھڑی رہی۔ لمبے آدمی نے باقی دونوں کو سارے گھر کی تلاشی لینے کے لیے اوپر بھیج دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈیوڈ کی شکاری بندوق اور پستول لے کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ لمبے آدمی نے ڈیوڈ کا پستول پکڑتے ہوئے اپنا پستول زمین پر پھینک دیا اور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”اس نقلی پستول نے خوب کام دیا۔ خیر، اب تو ہمیں اصلی پستول مل گیا ہے۔“

روزی ابھی تک دروازے میں کھڑی حیرت سے ان اجنبیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو دن دہاڑے اس کے گھر میں گھس آئے تھے۔ لمبے آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تھامسن! تم بندوق لے کر اوپر والی منزل پر چلے جاؤ اور جونہی کوئی شخص مکان میں داخل ہو، ہمیں اطلاع دو۔ رچرڈ تم کچن سے چاقو لے کر سیڑھیوں میں بیٹھ جاؤ، اگر تمہاری ضرورت پڑی، تو میں سیٹی بجا دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور خوف زدہ روزی سے مخاطب ہوا۔

”کیا آپ ہمیں کھانا کھلا سکتی ہیں؟“

”جی، جی ہاں۔“ روزی لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لیکن یہ سب کیا ہے، آپ چوروں کی طرح میرے گھر میں گھس آئے ہیں؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر گئی۔

”بکواس بند کرو اور جس طرح ہم کہتے ہیں، ویسا ہی کرو، ورنہ پچھتاؤ گی۔ اطمینان رکھو، ہم مال و دولت کے بھوکے نہیں، ہمیں صرف ایک رات آرام کرنے کے لیے بستر چاہئیں۔ صبح ہوتے ہی ہم رخصت ہو جائیں گے۔ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو اپنے بچے سے ہاتھ دھو بیٹھوں گی لیکن اگر تم نے خلوصِ دل سے ہماری خدمت کی، تو ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔“

متفکر روزی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اوپر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی تینوں قیدی کھانا کھا رہے تھے۔

ننھا جوزف سیڑھیوں پر بیٹھا حیرانی سے ان اجنبیوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے آپ کو اس گھر کا مالک سمجھ رہے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر کرسٹن نے روزی سے ڈیوڈ اور جین کے بارے میں چند سوالات کیے اور پھر خاموشی سے صوفے پر دراز ہو گیا۔

شام ساڑھے پانچ بجے جین کی سفید رنگ کی چھوٹی سی کار پھاٹک سے اندر آتی دکھائی دی۔ سب سے پہلے رچرڈ نے اس کی آمد کی اطلاع دی۔ کرسٹن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اٹھارہ، انیس سال کی ایک خوش شکل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

”مسز ڈیوڈ! جین کو ایک طرف لے جا کر سب کچھ سمجھا دو۔“ کرسٹن نے حکم جھاڑا۔

روزی نے حیرت زدہ جین کا بازو پکڑا اور ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ اچانک چھت سے رچرڈ کی آواز سنائی دی۔

”کرسٹن! خبردار ہو جاؤ، شاید مالک مکان آ رہا ہے۔“ کرسٹن نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔ ایک لمبی سی کار مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ گیراج کے سامنے پہنچ کر کار رک گئی اور پینتالیس چھیالیس برس کا ایک خوش پوش مرد دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ کرسٹن نے سانس روک لی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ پکے فرش پر ڈیوڈ کے فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ کھلے دروازے میں مالک مکان مسٹر ڈیوڈ کھڑا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔

سب سے پہلے اس کی نظر روزی پر پڑی، جس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ پھر اس نے جین کو دیکھا جو تپائی پر دیوار کی طرف منہ کیے چپ سادھے بیٹھی تھی۔ ان کے علاوہ اسے کالا، کلوٹا اور خوفناک مونچھوں والا کرسٹن دکھائی دیا جو پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کیے مسکرا رہا تھا۔ سیڑھیوں پر ایک اور نوجوان بندوق لیے کھڑا تھا۔

ایک لمحے کے لیے ڈیوڈ کے سوچنے سمجھنے کی طاقت جواب دے گئی۔ اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا اور پھر اچانک ساری بات اسے سمجھ آ گئی۔ شام کے اخبار میں جیل سے بھاگے ہوئے تین قیدیوں کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئیں۔ اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر بڑی متانت سے بولا۔ ”مسٹر کرسٹن! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم پستول رکھ دو ورنہ......“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر قریبی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ نیچے پڑوس کا مکان نظر آ رہا تھا۔ بیگم گراہم صحن میں دانہ چگتی مرغیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کا چھ سالہ بچہ جنگلی لکڑی کے گھوڑے پر سواری کر رہا تھا۔ قریب ہی مسٹر گراہم دھوپ میں کرسی ڈالے شام کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

”انہیں بلانا زیادہ مشکل نہیں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

کرسٹن نے آگے بڑھ کر پستول کی نال جین کی کنپٹی پر رکھ دی اور غراتے ہوئے بولا۔ ”بڑے شوق سے پڑوسیوں کو بلائیے لیکن یاد رکھیے کہ ان کے آنے سے پہلے آپ کی لاڈلی بیٹی کا جسم فرش پر تڑپ رہا ہو گا۔“

روزی نے ایک جھرجھری لی اور بے تاب ہو کر ڈیوڈ کی طرف دوڑی اور بولی۔ ”خدا کے لیے ڈیوڈ! ایسی حماقت نہ کرنا، ورنہ یہ ظالم میری بچی کو مار ڈالیں گے۔“

ڈیوڈ کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے کھڑکی بند کر دی اور دھم سے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”ہم صرف ایک رات گزارنا چاہتے ہیں۔ ہاں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ رقم ملتے ہی یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔“

”کون سی رقم؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”ابھی بتاتا ہوں، تمہارے ہاں فون ہے؟“

”ہاں، وہ رہا۔“

کرسٹن ڈائریکٹری پر جھکا ہوا تھا اور ڈیوڈ خاموشی سے پاس بیٹھا تھا۔ آخر کرسٹن مطلوبہ فون نمبر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

”لو بھائی صاحب [illegible] اب تم اس نمبر پر ایک فون کرا دو۔ ابھی سارا معاملہ طے ہو جاتا ہے۔“

”تم یہ کام خود کیوں نہیں کرتے؟“ ڈیوڈ نے ناگواری

سے کہا۔

”زیادہ باتیں مت بناؤ، ورنہ ہم سختی کرنے پر مجبور ہوں گے۔“ یہ کہہ کر کرسٹن نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھامسن کو آواز دی۔

”تھامسن! ذرا اِس چھوکرے کو یہاں لے آؤ۔“

تھامسن ننھے جوزف کا بازو پکڑے کمرے میں آدھمکا۔ ڈیوڈ نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر کرسٹن نے ایک جست لگا کر اسے دبوچ لیا اور تھامسن، جوزف کا بازو مروڑنے لگا۔ جوزف درد کے مارے بری طرح چیخ رہا تھا۔

”میں فون کرنے کے لیے تیار ہوں، تم جوزف کو چھوڑ دو۔“ ڈیوڈ کی بات سن کر تھامسن نے جوزف کو چھوڑ دیا۔

☆☆☆

سات بجے کے قریب انہوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے بستر میں دبک گئے۔ کرسٹن پستول ہاتھ میں لیے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رچرڈ اور تھامسن کمبل لے کر فرش پر لیٹ گے۔ ڈیوڈ دوسری منزل پر اپنے پلنگ پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ ساتھ والے پلنگ پر روزی تکیے میں منہ چھپائے آنسو بہارہی تھی۔ ”ہائے میرا جوزف، اس کا کیا بنے گا؟“

”اطمینان رکھو روزی! وہ اسے نہیں ماریں گے، وہ جانتے ہیں کہ اُسے مارنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ انہوں نے جوزف کو اپنے پاس اس لیے رکھا ہے کہ ہم پولیس کو اطلاع نہ کرسکیں۔“

”انہوں نے ٹیلی فون والے کمرے کو تالا لگا کر چابی اپنے پاس رکھ لی ہے۔“

”کوئی بات نہیں روزی، تم اتنی متفکر کیوں ہو۔ صبح اُن کی رقم پہنچ جائے گی اور وہ یہاں سے دفع ہوجائیں گے۔“

مگر روزی مطمئن نہیں تھی۔ اس کا بچہ جوزف نیچے ڈرائنگ روم میں سو رہا تھا جہاں تینوں بدمعاش آپس میں کھسر پھسر کررہے تھے۔ اچانک اسے جین کی چیخ سنائی دی، وہ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ وہ فوراً ڈیوڈ کے ساتھ جین کی خواب گاہ میں پہنچی۔ خواب گاہ میں رچرڈ، جین کے ساتھ گتھم گتھا تھا۔ ڈیوڈ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جست لگائی اور رچرڈ کو فرش پر گرادیا۔ دونوں ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتے رہے۔ ڈیوڈ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی لیکن رچرڈ جیسے پیشہ ور بدمعاش سے لڑنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ رچرڈ کے سامنے چاروں شانے چت فرش پر پڑا تھا۔

اگلے لمحے اس نے رچرڈ کو جیب سے تیز دھار چاقو نکالتے دیکھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پیٹ میں لگے ہوئے گھونسے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکا۔ رچرڈ کا چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، ڈیوڈ نے آنکھیں بند کرلیں۔ روزی اس منظر کی تاب نہ لاسکی اور چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ اسی اثنا میں جین کے اوسان بحال ہوچکے تھے۔ اس نے لکڑی کی تپائی اٹھا کر پوری قوت سے رچرڈ کے سر پردے ماری۔ رچرڈ کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلی، اس نے چاقو کا رخ جین کی طرف پھیر دیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جین کو قتل کرکے دم لے گا۔ مارے خوف کے جین کا جسم سن ہوگیا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ عین اس وقت دروازہ کھلا اور کرسٹن ہاتھ میں پستول لیے اندر آیا۔

”دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ تمہیں گولی ماردوں گا۔“ کرسٹن کا یہ کہنا تھا کہ رچرڈ نے چاقو زمین پر پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھالیے۔

”میں نے تمہیں اس لیے اوپر نہیں بھیجا تھا کہ تم عورتوں پر ہاتھ اٹھانے لگو۔“ کرسٹن غرایا۔

”تمہیں میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں کرسٹن۔“ رچرڈ نے غصے سے کہا۔

”بکواس بند کرو اور سیدھی طرح نیچے چلو، تمہاری ذرا سی بے احتیاطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ یہ مت بھولو کہ سختی سے تنگ آکر یہ لوگ تمہیں گرفتار کروانے پر تل جائیں گے، خواہ ان میں سے ایک آدھ کو مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں۔“ کرسٹن نے معذرت خواہ لہجے میں ڈیوڈ سے کہا۔

”مسٹر کرسٹن، میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں لیکن میری عزت پر حملہ کرکے تم لوگ کچھ عقل مندی کا ثبوت نہیں دے رہے۔ اس قسم کی بدتمیزی دوبارہ ہوئی تو میں ہر قیمت پر پولیس کو اطلاع کردوں گا خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔“

”مسٹر ڈیوڈ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، آپ لوگ صبح تک نیچے ڈرائنگ روم میں رہ سکتے ہیں لیکن اگر آپ کی طرف سے دوبارہ کوئی شرارت ہوئی تو یہ آپ لوگوں کے لیے بہتر نہیں ہوگا۔“ ڈیوڈ نے حتمی لہجے میں بات ختم کی۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

رات سرد اور نم آلود تھی۔ یخ بستہ ہوا کھڑکیوں سے ٹکراتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی سیٹیاں بجا رہا ہو۔

ڈیوڈ ہاؤس میں باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں اور روشن دان مضبوطی سے بند کر دیے گئے اور ان پر گہرے نیلے رنگ کے پردے گرا دیے گئے۔ سات بجے کے قریب ایک ٹرک بیرونی پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ چالیس سالہ ہنس مکھ پیٹر ماسٹر دروازہ کھول کر باہر نکلا اور دودھ کی بوتل پھاٹک کے اندر لڑھکاتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔ ”یار! ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔ کتنا جاڑا پڑ رہا ہے اور ہم کتّوں کی طرح مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ادھر دیکھو، ڈیوڈ کیا مزے سے سو رہا ہے، ہاہا کیا مزے کا آدمی ہے۔“ اس نے اونگھتے ہوئے ڈرائیور پر ایک نظر ڈالی اور پھر خفا ہو کر بولا۔ ”یار سو گئے کیا، عجیب احمق سے پالا پڑا ہے۔“

اس دوران میں ڈیوڈ ہاؤس کے کونے کونے میں زندگی بیدار ہو چکی تھی۔ کرسٹن، تھامسن اور رچرڈ اپنی اپنی جگہ پر مستعد تھے۔ روزی پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھے چلی جا رہی تھی۔ آخر ڈیوڈ نے مہرِ سکوت توڑی اور دھیرے سے بولا۔

”پیٹر دودھ والا ہے، فکر نہ کرو، وہ اندر نہیں آئے گا۔“

”عین ممکن ہے، وہ بل وصول کرنے اندر چلا آئے؟“ روزی نے فوراً جواب دیا۔

”کچھ بھی ہو، ہم اسے سنبھال لیں گے۔“ کرسٹن نے غراتے ہوئے کہا۔ لیکن ان کا یہ خوف جلد ہی دور ہو گیا۔ ٹرک کے بھاری انجن کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر رات کے بیکراں سکوت میں گم ہو گئی۔ عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، وہ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ گھنٹی دوبارہ بجی اور دیر تک بجتی رہی۔ آخر جین نے ریسیور اٹھا لیا۔

”کون؟ جانسن، ہاں میں جین بول رہی ہوں۔ نہیں، اس وقت نہیں، ہاں میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ نہیں، نہیں تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک نظر اپنے باپ کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”ڈاکٹر، ہاں میں ڈاکٹر سے دوا لے چکی ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ اب میں آرام کروں۔ نہیں، تم ہرگز نہ آنا، تمہارے آنے سے پہلے میں سو چکی ہوں گی۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے، صبح ملیں گے، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

”شاباش لڑکی! تم نے بڑی خوبی سے اپنا کردار ادا کیا، میں تم سے بہت خوش ہوں، کس کا فون تھا؟“ کرسٹن نے اپنے بھدے اور میلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پوچھا۔

جین خاموش رہی، البتہ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔

”یہ جانسن تھا، جین کا منگیتر۔“ جین کی ماں نے بتایا۔

”اچھا، اچھا۔“

اچانک جوزف نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا اور زور زور سے رونے لگا۔ روزی نے جلدی سے اسے گود میں اٹھا لیا اور چمکارتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہوا جوزی بیٹا؟“

جوزف.... جواب دینے کے بجائے اور زور شور سے رونے لگا اور اب تو وہ چیخ بھی رہا تھا۔ روزی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئی۔

”مسٹر ڈیوڈ! آپ ذرا اس بچے کو خاموش رہنے کی نصیحت کریں، اگر اس کی وجہ سے ہمارا کام بگڑ گیا تو......“ کرسٹن نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈیوڈ کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا جوزف کے کمرے میں چلا گیا۔ جوزف ابھی تک پوری قوت سے چیخ رہا تھا اور روزی دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈیوڈ کو دیکھتے ہی جوزف خاموش ہو گیا اور بڑی رازداری سے بولا۔

”کیوں ابو! کیسی رہی؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہی کہ میں اس وقت تک چیختا رہوں گا، جب تک اڑوس پڑوس کے سب لوگ یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ جب بہت سے لوگ یہاں آ جائیں گے، تو وہ ان بدمعاشوں کو ہمارے گھر سے مار بھگائیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”بکواس بند کرو۔ جوزف، کیا تم چاہتے ہو تمہاری بہن تمہاری آنکھوں کے سامنے گولیوں سے بھون دی جائے؟ کیا تم پسند کرو گے کہ وہ لمبا تڑنگا آدمی تمہاری امی کے پیٹ میں چاقو گھونپ دے؟ اگر تم یہ سب کچھ چاہتے ہو تو ٹھیک ہے جو جی میں آئے کرو، لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہ لوگ جو اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، آٹھ آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں۔ ان کے لیے کسی شخص کو قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے تمہارے لیے تتلی کے پر مروڑ دینا۔“

جوزف سسکیاں بھرتے ہوئے باپ کی گود میں آ گرا۔ ڈیوڈ نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور تھپکیاں دے کر سلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جوزف گہری نیند سو گیا۔ ڈیوڈ نے

آہستگی سے اسے بستر پر لٹایا اور روزی کو اس کے پاس چھوڑ کر خود نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

جب دیوار پر لگے ہوئے گھڑیال نے نو بجائے تو کرسٹن کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ دس بجے کے قریب صدر دروازے کی بیل بجی، ڈیو جلدی سے اٹھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے، اس نے سوچا اور شب خوابی کا لباس پہن کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ تھامسن اور رچرڈ اٹھ بیٹھے تھے اور آنکھیں مل رہے تھے۔ کرسٹن ابھی تک دروازے پر پہرا دے رہا تھا۔ ڈیوڈ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”لگتا ہے تم سے کوئی حماقت سرزد ہو گئی ہے، ورنہ اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے۔“

گھنٹی دوبارہ بجی اور دیر تک بجتی رہی۔

”ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔“ ڈیوڈ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا، اس لیے چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صدر دروازے پر لگے بلب کی روشنی میں اس نے ایک سائے کو دیکھا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ وہ سایہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ ”انکل! جینِ کیسی ہے؟“ یہ جانسن تھا۔

”اچھی ہے، اب تو بالکل اچھی ہے اور سو رہی ہے۔“ ڈیوڈ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

”میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ سوچا جین کا پتا کر آؤں۔ ممکن ہے کہ آپ لوگوں کو میری مدد کی ضرورت ہو۔“

”لیکن تم اس وقت کیوں چلے آئے، فون کر لیا ہوتا؟“ ڈیوڈ بولا۔

”اصل میں، میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔“ جانسن بے قراری میں لگ رہا تھا۔

ڈیوڈ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے بڑی بے چارگی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا جو رات کے دس بجے اپنی منگیتر کو دیکھنے چلا آیا تھا۔

”تم پیدل آئے ہو، تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“ اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”گاڑی میں پیٹرول نہیں تھا۔ میں ٹیکسی پر آیا ہوں۔ اب تو شاید واپس بھی نہ جا سکوں۔ کوئی بات نہیں، میں یہیں سو رہوں گا صبح یہیں سے دفتر چلا جاؤں گا۔“

ڈیوڈ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پہلے تو وہ اسے اندر جانے سے روکنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ نہیں، نہیں وہ اندر نہیں جا سکتا۔ اسے اندر نہیں جانا چاہیے، ورنہ سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔ ابھی وہ اُدھیڑبن میں تھا کہ جانسن بولا۔

”انکل! آپ کس سوچ میں پڑ گئے شاید آپ میرے لیے کمرا تیار کرانے کی فکر میں ہیں۔ میں کوئی غیر ہوں، کسی انتظام کی ضرورت نہیں۔ بس میں جین کو ایک نظر دیکھ کر ڈرائنگ روم میں صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔“

ڈیوڈ کی آنکھوں کے سامنے ڈرائنگ روم لہرا گیا۔ تین بدمعاش، ایک بندوق، ایک پستول اور ایک تیز دھار چاقو۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے سوچا۔ ایک اور خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں آیا، اس نے جانسن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔

”جین کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“

”اچھی نہیں، لیکن آپ تو کہہ رہے تھے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔“

”میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن تم اب آ گئے ہو، تو اچھا ہوا، میری اپنی طبیعت ناساز ہے، ورنہ میں خود اسے اسپتال لے جاتا۔ دو تین مرتبہ ڈاکٹر کو فون کر چکا ہوں مگر وہ شاید کہیں باہر گیا ہے۔ میں نے اسے نیند کی گولیاں دی تھیں، اب اس کی آنکھ کھلی ہے اگر تم برا محسوس نہ کرو، تو اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“

”اس میں برا محسوس کرنے والی کیا بات ہے انکل ڈیوڈ، آپ بھی غضب ڈھا رہے ہیں۔ آپ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ چلیے میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھا، ڈیوڈ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس وقت اسے روکنا اس کے بس سے باہر تھا اور اندر ڈرائنگ روم میں تین خونی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”جانسن! ذرا میری بات تو سنو۔“ جانسن رک گیا۔ ڈیوڈ نے قریب جا کر کہا۔ ”تم قریبی چوک سے ٹیکسی لے آؤ، میں اتنی دیر میں جین کو نیچے لے آتا ہوں۔“

”ٹیکسی؟ اس کی کیا ضرورت ہے، میں جین کی کار لے جاتا ہوں۔“

”اس کی چھت نہیں ہے اور اس حالت میں جین کا کھلی چھت کی گاڑی میں جانا مناسب نہیں۔ میرا مطلب ہے، سردی بہت ہے مبادا اُسے نمونیا ہو جائے۔“

”تو میں آپ کی کار لے جاتا ہوں۔“ جانسن بولا۔

”میری کار کے انجن میں کچھ خرابی ہے۔ آج راستے میں مجھے دو دفعہ رکنا پڑا۔ چلتے چلتے اس کا انجن بند ہو جاتا ہے، ایسا نہ ہو کہ راستے میں دھوکا دے جائے۔“

”ٹھیک ہے، آپ جین کو تیار کریں، میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ ڈیوڈ کی جان میں جان آئی۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں آ گیا اور ایک سانس میں کرسٹن سے سب کچھ کہہ ڈالا پھر اس نے اوپر جا کر روزی کو صورتِ حال بتائی اور ساتھ لے جا کر جلدی سے جین کو جگایا اور سارا منصوبہ سمجھا کر اسے شب خوابی کے لباس ہی میں نیچے لے آیا۔

”تم کہنا میرے پیٹ میں سخت درد ہے اور ہاں، رات وہیں اسپتال میں رک جانا، واپس نہ آنا، ورنہ جانسن بھی تمہارے ساتھ آئے گا۔ جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جانسن ٹیکسی لے آئے۔“

”لیکن ابو، میں جوتا تو پہن لوں۔“

”نہیں بیٹی، اس طرح دیر ہو جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے، ننگے پاؤں چلی جاؤ اور ہاں دیکھو، جانسن سے کچھ نہ کہنا۔ میرا مقصد ہے کہ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہمارے گھر میں کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ دیکھنا تمہاری امی اور بھائی کی جانیں تمہارے ہاتھ میں ہیں اگر تم نے احتیاط سے کام نہ لیا تو......“

”دیکھو لڑکی! ہم نے پہلے کافی قتل کیے ہیں، تین اور سہی۔ اگر تم نے اپنے منگیتر کو سب کچھ بتا دیا تو یہ بہت برا ہو گا۔ خواہ پچاس سپاہی ساتھ لے کر آؤ۔ ان کے آنے سے پہلے ہم تمہارے ماں، باپ اور بھائی کو ختم کر دیں گے۔“ کرسٹن نے جین کو سمجھایا۔

جین کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ اپنے آپ پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مجھے امی، ابا اور بھائی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔“

”صبح ہوتے ہی دفتر چلی جانا اور دیکھو! کل عین وقت پر گھر پہنچ جانا، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس گھر کے تمام کام حسبِ معمول ہوتے رہیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔“

باہر سے ٹیکسی کی آواز سنائی دی۔ روزی اور ڈیوڈ نے جین کو پکڑ لیا اور باہر لے گئے۔ جانسن نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور جین کو اندر لٹا دیا۔ جین بڑے غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ بار بار اس کا سر دائیں بائیں ڈھلک جاتا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ ہم نے اسے نیند کی گولیاں دی تھیں۔“ ڈیوڈ نے وضاحت کی۔

روزی نے اسے کمبل اوڑھا دیا۔ اچانک جانسن کی نظر اس کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ ”یہ کیا؟ اس نے جوتا بھی نہیں پہن رکھا، آپ اسے پکڑ کر رکھیں، میں بھاگ کر اس کا جوتا اٹھا لاؤں۔ اس کے پاؤں کو سردی لگ گئی تو اچھا نہ ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ڈرائنگ روم کی طرف لپکا لیکن جین کی ایک لمبی چیخ نے اسے واپس بلا لیا۔ وہ اپنا سر اگلی نشست پر پٹخ رہی تھی۔ ”دیر نہ کرو جانسن، اسے فوراً اسپتال لے جاؤ۔“

”ہائے میری بیٹی۔“ روزی نے گھگیا کر کہا۔

جانسن نے فوراً تعمیل کی اور ٹیکسی چل دی۔ ڈیوڈ اور روزی کچھ دیر تک دھند میں غائب ہوتی ہوئی سرخ بتیوں کو دیکھتے رہے اور پھر بوجھل قدموں سے واپس آ گئے۔

ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے کرسٹن نے اُن سے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، آپ لوگ مطمئن رہیں، وہ صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔“

☆☆☆

گیارہ بجے کے قریب ڈیوڈ دوبارہ بستر پر لیٹا مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار اس کا خیال ڈرائنگ روم میں بیٹھے ان تین بدمعاشوں کی طرف چلا جاتا، جنہوں نے شام سے گھر میں آفت مچا رکھی تھی۔ ڈیوڈ کو جرم سے سخت نفرت تھی، وہ ایک سیدھا، سادہ تاجر تھا۔ یہ احساس اسے بار بار تکلیف دے رہا تھا کہ اس نے انصاف کا ساتھ دینے کے بجائے تین خطرناک مجرموں کو پناہ دے رکھی ہے۔ ہر بار وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا کہ صبح ہوتے ہی وہ چل دیں گے مگر ندامت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ وہ دوبارہ اسی مسئلے پر غور کرنے لگتا...... اچانک اس کے ذہن میں ان سے بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت رچرڈ اور کرسٹن سو رہے تھے اور تھامسن پہرا دے رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے تھامسن کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ اُسے چت کرنا باقی دو مجرموں سے زیادہ آسان ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا...... سیڑھیاں اترتے ہی اگر وہ تھامسن کو اوپر بلا لے، تو وہ فوراً چلا آئے گا۔ بالائی برآمدے میں پہنچ کر وہ بڑی آسانی سے اس کی بندوق چھین سکتا ہے۔ بندوق پاس ہو تو نیند میں ڈوبے ہوئے دو قاتلوں کو کسی کمرے میں بند کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں...... اس کے بعد پولیس اسٹیشن کو ایک فون کرنا ہو گا اور سارا مسئلہ حل ہو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

جائے گا۔ ذرا سی دیر میں علاقے کا انسپکٹر مارٹن دس بارہ سپاہیوں کے ساتھ آجائے گا۔ چشم تصور سے اس نے تینوں مجرموں کو انسپکٹر کے ہاتھوں گرفتار ہوتے دیکھا اور مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اترتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔ کرسٹن صوفے پر دراز تھا اور رچرڈ فرش پر چاروں شانے چت سو رہا تھا۔ تھامسن بندوق کندھے سے لٹکائے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ نیند سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کا سر بار بار آگے کی طرف ڈھلک جاتا۔

”تھامسن ذرا اِدھر آنا۔“ ڈیوڈ نے آہستہ سے کہا۔

تھامسن ہڑبڑا کر اٹھا اور بغیر سوچے سمجھے اوپر کی طرف چل دیا۔

”کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ؟“

”میں نے پھاٹک پر کسی شخص کا سایہ دیکھا ہے، سوچا تمہیں بلا لوں۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔

وہ جنگلے کے قریب جا کر رک گئے اور جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ ڈیوڈ نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس لیں اور پوری قوت سے تھامسن کی جھکی ہوئی کمر پر ضرب لگائی۔ ایک لمحے کے لیے تھامسن لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرتا، ڈیوڈ نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو مروڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے بندوق کندھے سے اتار لی۔ اسے بندوق چلائے دس بارہ سال ہو چکے تھے۔ جوانی میں وہ شکار کا بے حد شوقین تھا لیکن یہاں بندوق چلانا درکار بھی نہیں تھا۔

تھامسن نے اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ ڈیوڈ نے اسے اسٹور روم میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا کر دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا تو اس نے سوچا کہ کرسٹن کے پاس ایک پستول بھی ہے لیکن اس خیال نے اسے تقویت دی کہ وہ اس وقت سو رہا ہوگا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک نظر رچرڈ کی طرف دیکھا وہ اسی طرح مدہوش پڑا تھا۔ اس کے بعد اس کی نظر صوفے کی طرف اٹھ گئی جہاں کرسٹن سو رہا تھا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔ اس نے کرسٹن کے منہ سے کمبل ہٹایا ہی تھا کہ خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے نمودار ہو گئے اور بندوق پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ کمبل کے نیچے گول تکیہ پڑا تھا۔ کرسٹن غائب تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی گردن پر پستول کی ٹھنڈی نال کی چبھن محسوس کی۔

”بندوق پھینک دو مسٹر ڈیوڈ۔“ کرسٹن کی غصے بھری آواز سنائی دی۔

ڈیوڈ نے بندوق پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

”تھامسن کہاں ہے؟“

”اوپر کمرے میں۔“

”اوپر چلو۔“ وہ خاموشی سے اٹھا اور کرسٹن کے حکم کی تعمیل میں آگے آگے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تھامسن سمیت دوبارہ نیچے پہنچ گئے۔

”مسٹر ڈیوڈ! تم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب ہمیں تم پر اعتبار نہیں رہا۔ تھامسن! تم اوپر جا کر بیگم صاحبہ اور اس کے بیٹے کو لے آؤ۔ ہمیں تو موت کے گھاٹ اترنا ہی ہے لیکن انہیں ذرا مزہ چکھا لیں اور دیکھو رچرڈ کو جگا دو تاکہ وہ اپنا چاقو تیار کرے، فائر سے آواز پیدا ہوگی۔“

ڈیوڈ کی آنکھوں کے سامنے روزی اور جوزف کی لاشیں لہرا گئیں۔ ”خدا کے لیے اوپر مت جاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”تم نے پہلے بھی تو وعدہ کیا تھا۔“ کرسٹن نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”اس مرتبہ میں اپنے بچّے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی غلطی دوبارہ نہیں ہوگی، پلیز مجھے معاف کر دو۔“ ڈیوڈ نے کرسٹن کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ٹھیک ہے، ہم تمہیں ایک آخری موقع دے رہے ہیں۔ اگر تم نے اس دفعہ بھی ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو ہم سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“

☆☆☆

صبح بڑی حسین اور چمکیلی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں ڈیوڈ ہاؤس میں کھلے ہوئے پھولوں سے کھیل رہی تھیں۔ پانچ بجے کے قریب ڈیوڈ بستر سے اٹھا۔ رات بھر وہ سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن سو نہ سکا۔ شب بیداری کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نیچے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھائی تھی۔ اس نے بستر سے نکل کر روزی کے کمرے کا رخ کیا، وہ بستر پر نہیں تھی۔ وہ بھاگم بھاگ کچن میں پہنچا، یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ روزی وہاں موجود تھی، لیکن اس حالت میں کہ ٹھنڈے فرش پر اس کا جسم ساکت و جامد پڑا تھا۔ ڈیوڈ نے اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے

مارے، تب کہیں اُسے ہوش آیا۔ ’’چائے تیار کرنے لگی تھی کہ گر پڑی۔‘‘ اس نے کمزور لہجے میں وضاحت کی۔

ڈیوڈ نے ایک نظر اس کے زرد چہرے پر ڈالی۔ ایک ہی رات میں وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ رخسار زرد اور پچکے ہوئے دکھائی دینے لگے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔ ڈیوڈ نے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور سیڑھیاں اترنے لگا...... ڈرائنگ روم میں زندگی کے آثار بیدار ہو چکے تھے۔ کرسٹن اور تھامسن ایک دوسرے سے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ رچرڈ البتہ ابھی تک فرش پر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

ڈیوڈ کے اندر آتے ہی کرسٹن بولا۔ ’’مسٹر ڈیوڈ! اچھا ہوا آپ آ گئے، ہم چاہتے ہیں ذرا تفصیل سے منصوبے پر غور کر لیں۔ سب سے پہلے آپ یہ بتائیے کہ اب اس گھر میں کون کون آئے گا؟‘‘

’’پہلے دودھ والا آئے گا، اس کے بعد شاید ملازمہ آجائے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، آپ باہر کھڑے ہو جائیے اور یہ ظاہر کیجیے کہ صحن میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ جونہی دودھ والا آئے، اس سے دودھ لیجیے۔ اسے کسی قیمت پر اندر نہ آنے دیا جائے۔ روزی سے کہہ دو کہ وہ بھی صحن میں آجائے اور اگر ملازمہ آئے تو اسے باہر ہی سے واپس بھیج دے۔‘‘

’’بہت بہتر۔‘‘ ڈیوڈ نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

’’جین واپس آجائے تو اسے دفتر بھیج دیجیے، اپنے معمولات جاری رکھیے، آپ کی کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے اور ہاں، جوزف کو اسکول نہ بھیجیے۔ وہ ابھی بچہ ہے، ممکن ہے کسی سے کہہ دے لیکن اس کے اسکول چھٹی کی درخواست ضرور بھجوا دیں تاکہ اس کے دوست یا استاد وغیرہ متفکر ہو کر یہاں نہ آدھمکیں۔ درخواست میں لکھ دیں کہ اسے بخار ہے اس لیے آج حاضر نہیں ہو سکے گا۔ اسے باہر کھیلنے کے لیے بھی نہ جانے دیجیے ورنہ ہمسایوں تک ضرور بات پہنچا دے گا۔ آج آپ کو ڈاک سے ایک رجسٹری ملے گی، اسے احتیاط سے وصول کر لینا اور شام کو واپس، آتے ہوئے بحفاظت یہاں تک لے آنا۔ رجسٹری ملتے ہی گھر کا رخ نہ کیجیے گا، ورنہ لوگوں کو خواہ مخواہ کا شک ہو جائے گا۔‘‘

ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور صحن میں نکل آیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دودھ والا جلد آپہنچا۔ اس نے دودھ کی بوتلیں لے کر رکھ لیں اور اسے باہر ہی سے رخصت کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ بھی آپہنچی۔ روزی نے اسے باہر ہی روک لیا۔ ’’جوزی! آج ہم سب سیر و تفریح کرنے جا رہے ہیں، اس لیے گھر میں کوئی کام نہیں، آج تم آرام کرو۔‘‘

اس کام سے فارغ ہو کر ڈیوڈ نے ناشتا کیا۔ اسپتال میں جین کو فون کیا کہ گھر آنے کے بجائے سیدھی دفتر پہنچ جائے۔ جوزف کے اسکول میں اس کی فرضی بیماری کی اطلاع دی اور پھر دفتر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر مارٹن اپنے ماتحتوں پر غضب ناک ہو رہا تھا۔ ’’میں کہتا ہوں وہ سب کہاں مر گئے۔ وہ شہر سے باہر نہیں نکلے، گاڑی ان کی نہیں مل رہی، آخر ایک کار سمیت تین آدمی کہاں غائب ہو سکتے ہیں؟ میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب کو یقین دلا چکا ہوں کہ آج شام تک انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ریڈیو پر اعلان کر دو، اشتہار چھپ چکے ہوں تو انہیں شہر کے کونے کونے میں تقسیم کرا دو، دیواروں پر بڑی جسامت کے اشتہار لگوا دو، جن میں ان تینوں مجرموں کی تصویریں بھی ہوں۔ شہر سے باہر نکلنے والی سڑکوں پر پہرا سخت کر دو، شہر کے ہر پل پر اچانک چھاپے مارو، ریلوے اسٹیشن پر مقررہ سفید پوش سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کر دو۔ میں ہر قیمت پر انہیں آج شام تک گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

☆☆☆

گیارہ بجے کے قریب پہلی ڈاک موصول ہوئی۔ ڈیوڈ نے کلرک کے بجائے خود ڈاکیے سے بات کی لیکن اس میں رجسٹرڈ لفافے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے فون پر روزی کو اطلاع کر دی اور خود دونوں ہاتھوں سے سر تھامے آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ بارہ بجے جین اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ عام طور پر وہ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا کرتے تھے مگر آج اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ ’’ابو مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے۔‘‘ جین نے کہا۔

’’کیا؟‘‘ ڈیوڈ نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’ہم ان لوگوں سے پوچھیں کہ انہیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اور انہیں خود ہی یہ رقم دے دیں۔ اس طرح یہ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔‘‘ ڈیوڈ کچھ دیر سوچتا رہا، تجویز معقول تھی۔ گھر میں اس طرح قاتلوں کو چھپائے رکھنے سے بہتر تھا کہ کچھ رقم دے کر اپنی جانیں محفوظ کر لی جائیں۔

’’ٹھیک ہے۔ آج گھر چل کر اُن سے بات کریں

گے۔“

ٹھیک دن کے ایک بجے ڈیوڈ ہاؤس کے بیرونی پھاٹک کی گھنٹی بجی۔ رچرڈ نے جنگلے سے جھانک کر دیکھا۔ تیس بتیس برس کی ایک عورت چشمہ لگائے اور ہاتھ میں چند کتابیں لیے باہر کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور کرسٹن کو اس کی اطلاع کر دی۔

”مسز ڈیوڈ، ہم خواب گاہ میں چھپ جاتے ہیں، آپ اس خاتون کو اندر بلا لیجیے، لیکن دیکھنا، کہیں جوزف اس سے سب کچھ نہ کہہ دے۔“

ذرا ہی دیر بعد مس ٹینا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”مجھے پتا چلا تھا کہ جوزف کی طبیعت خراب ہے، اب چھٹی ہوئی تو سوچا، اسے ایک نظر دیکھتی چلوں۔“ کچھ دیر تک وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر جوزف کے کمرے کی طرف چل دی۔ جوزف بستر میں لیٹا تھا، صبح سے اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ استانی کو دیکھ کر اس کا چہرہ کِھل اٹھا۔ اس اثنا میں روزی، کرسٹن کی خواب گاہ میں یہ بتانے گئی کہ ملاقاتی خاتون جوزف کی ٹیچر ہے۔ جب وہ واپس آئی تو مس ٹینا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں، اجازت دیجیے۔“

مسز ڈیوڈ اُسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ جوزف کے پاس اوپر پہنچیں تو وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

”کیا ہوا جوزف، دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟“

”کچھ نہیں امی۔“

لیکن ذرا سی دیر بعد بیگم ڈیوڈ کو پتا چل گیا کہ جوزف کے وحشیانہ قہقہوں کا مطلب کیا تھا۔ اچانک دروازے پر دوبارہ گھنٹی بجی اور مس ٹینا گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

”مسز ڈیوڈ، معلوم ہوتا ہے کہ جوزف کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”یہ دیکھو نا، اس نے میرے پرس میں یہ خط لکھ کر رکھا ہے۔ لکھا ہے۔ ”ہمارے گھر میں تین قیدی چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں پولیس کو اطلاع کرنے نہیں دیتے۔ آپ یہ خط پولیس اسٹیشن پہنچا دیں، مہربانی ہوگی۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ ایسی باتیں کوئی صحیح الدماغ بچہ لکھ سکتا ہے؟“

روزی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

مس ٹینا نے خط اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اپنی بڑی بہن کے پاس جانا ہے، ورنہ میں خود آپ کے ساتھ چلتی۔ میری رائے میں آپ اسے فوراً اسپتال لے جائیں۔ کل تک تو اچھا بھلا تھا، شاید بخار کی وجہ سے دماغ پر بُرا اثر ہوا ہے۔“

”جی بہتر، میں ابھی اسے لے کر جاتی ہوں۔“ روزی نے جواب دیا۔

دروازہ بند ہو گیا تو مسز ڈیوڈ کو کچھ سکون ہوا اور وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

پانچ بجے جین اور ڈیوڈ گھر پہنچے۔ کرسٹن کو علیٰحدہ کمرے میں لے جا کر ڈیوڈ نے اپنی تجویز پیش کی لیکن اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

”مسٹر ڈیوڈ! رقم وصول کیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جا سکتے اور پھر آپ اتنی رقم ادا بھی تو نہیں کر سکتے۔ لائیے، اگر آپ کے پاس ایک لاکھ ڈالر ہیں، تو ہمارے حوالے کیجیے۔“ کرسٹن نے دوٹوک کہہ دیا۔

شام تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ جانسن نے دو تین مرتبہ فون کیا اور ہر دفعہ جین نے خود اسے تسلی دی کہ اس کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ 8 بجے کے قریب ڈیوڈ کا اکاؤنٹنٹ اس سے چند کاروباری امور کے بارے میں مشورہ لینے آیا لیکن ڈیوڈ نے اسے باہر ہی سے واپس کر دیا۔ رات کے کھانے کے بعد کرسٹن نے ڈیوڈ کو بلایا اور شام کا اخبار دکھاتے ہوئے بولا۔ ”پولیس نے سرخ رنگ کی کار کی تلاش شروع کر دی ہے۔ صبح سے سارے شہر میں چھاپے مارے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔“

”وہ کیسے؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”آپ اسی وقت بازار جائیں، برش اور رنگ کے ڈبے خرید لائیں۔ ہم سب مل کر گاڑی کا رنگ تبدیل کر دیں گے۔ اس کے بعد آپ اسے رات کی تاریکی میں باہر چھوڑ آئیں۔“ کرسٹن نے حکم کے طور پر کہا۔

”میں چھوڑ آؤں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ڈیوڈ پریشان لہجے میں بولا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، موجودہ حالات میں آپ کے سوا یہ کام اور کون انجام دے سکتا ہے؟“

”لیکن......!“

”لیکن، ویکن کچھ نہیں، مسٹر ڈیوڈ آپ خاموشی سے تعمیل کیجیے ورنہ......“ کرسٹن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈیوڈ نے ایک نظر سہمے ہوئے جوزف کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ تینوں آستین

چڑھائے کار پر گہرا سیاہ رنگ کرنے میں مصروف تھے۔

گیراج میں اندھیرا تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر لائٹ نہیں جلائی تھی کیونکہ اس طرح ہمسایوں کو شبہ ہو سکتا تھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ کار کی چمکیلی سطح پر اندھا دھند برش چلا رہے تھے۔ گیارہ بجے وہ اس کام سے فارغ ہوئے۔ اس دوران میں کرسٹن باہر پہرا دیتا رہا تھا...... گرم پانی سے غسل کرنے سے ڈیوڈ کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اس نے کپڑے بدلے اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایک انوکھی مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ اس اثنا میں کرسٹن کار کی نمبر پلیٹ اتار چکا تھا اور اب جین کی چھوٹی گاڑی کی پلیٹیں اس پر لگا رہا تھا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو جین کو اپنی گاڑی میں میرے پیچھے بھیج دیں تاکہ وہ مجھے واپس لا سکے۔'' ڈیوڈ نے کرسٹن کو مخاطب کیا۔

''نہیں، دو گاڑیوں کے آگے پیچھے چلنے سے پولیس کو شک ہو سکتا ہے۔ تمہیں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ آج ہر چوک پر سرخ رنگ کی کار کو پولیس تلاش کر رہی ہوگی۔''

باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شاید کہیں ژالہ باری ہوئی تھی۔ رات سوا بارہ بجے ڈیوڈ ہاؤس سے گہرے سیاہ رنگ کی ایک کار باہر نکلی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ تھوڑی دیر تک وہ گنجان آبادی سے باہر نکل آیا۔ اب صرف اِکّا دُکّا مکان نظر آ رہے تھے۔ دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ چراگاہیں اور باغات کے ساتھ ساتھ کھلے میدان تھے جو ہلکی چاندنی میں بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔

پولیس چوکی سے پہلے ڈیوڈ نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور چشم زدن میں وہ آخری خطرناک مقام بھی عبور کر گیا۔ ایک بجے وہ دریا کے پل پر پہنچا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک دریا کے بیچ میں اترتی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور اسے کچی سڑک پر چلانے لگا۔ ایک دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں سڑک کے ساتھ ہی پانی شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ارد گرد گھنے درخت تھے، اس لیے دن کے وقت بھی یہ جگہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔ اس نے گاڑی کا رخ دریا کی طرف کر دیا اور خود باہر نکل کر اسے پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ گہرے سیاہ رنگ کی گاڑی سوکھی شاخوں اور گھاس کے تختوں کو پھلانگتی ہوئی دریا کے گہرے پانی میں غائب ہو گئی۔ ڈیوڈ نے جیب سے برقی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں دریا کی طرف دیکھا، وہاں کار کا نام و نشان نہ تھا۔ صبح سات بجے جب وہ دس میل کا فاصلہ طے کر کے گھر پہنچا تو اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

تیسرے دن آٹھ بجے ڈیوڈ تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ رات بھر جاگتے رہنے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور نو دس میل کی پیدل کی مسافت سے اس کا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا لیکن دفتر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ آج کرسٹن کی رقم پہنچنے کی قوی امید تھی اور ویسے بھی کرسٹن چاہتا تھا کہ ہر کام حسب معمول ہو۔ دس بجے کے قریب جب گھر میں تینوں مجرموں کے علاوہ صرف روزی اور جوزف رہ گئے تو مس جوزی، ملازمہ، پھاٹک سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ موٹی تازی لڑکی بہت سے گھروں میں برتن وغیرہ دھونے کا کام کرتی تھی۔

''ہیلو مسز ڈیوڈ! کیسی ہو؟'' وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ چونکہ وہ سالہا سال سے گھر میں کام کر رہی تھی اس لیے بائیں دروازے سے داخل ہو گئی جو اتفاق سے اس وقت کھلا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرسٹن اور اس کے ساتھی سنبھل سکتے، وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

اس نے ایک نظر تینوں مجرموں پر ڈالی اور دہشت زدہ ہو کر واپس مڑنے لگی۔ کرسٹن نے اسے زبردستی کھینچتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے، تمہیں کس سے ملنا ہے؟''

''کسی سے نہیں۔'' وہ خوف زدہ ہو کر چلائی۔

اس اثنا میں روزی ... سیڑھیاں اتر کر نیچے آ چکی تھی۔

''کیا بات ہے جوزی، تم چیخ کیوں رہی ہو؟''

''کچھ نہیں، یہ لوگ کون ہیں؟'' جوزی بولی۔

''ڈیوڈ کے دوست ہیں، کیوں کیا ہوا؟'' مسز ڈیوڈ نے پوچھا۔

''آپ جلدی سے مجھے رقم دے دیں، مجھے تو ان سے خوف آ رہا ہے۔ ان کی شکلیں قاتلوں جیسی ہیں۔''

روزی نے جلدی سے چیک کاٹ کر اس کے حوالے کیا اور وہ توبہ توبہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی، اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا۔ ''مسز ڈیوڈ! بھلا دیکھیے، ان لوگوں کی شکلیں ان مجرموں سے کس قدر ملتی ہیں جو پرسوں جیل سے بھاگے تھے۔''

''میرا خیال ہے، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو ڈیوڈ کے بچپن کے دوست ہیں۔'' مسز ڈیوڈ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو مجھے اجازت دیجیے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کرسٹن نے رچرڈ کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے رچرڈ کمرے سے باہر لپکتا ہوا دکھائی دیا۔

جوزی تیزی سے کار چلا رہی تھی۔ ''اچھا تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے ہیں لیکن مسٹر ڈیوڈ کا ان سے کیا تعلق؟'' اس نے سوچا اور پھر متفکر انداز میں سر ہلانے لگی۔ ''مجھے ہر قیمت پر پولیس کو خبر دینی چاہیے۔'' یہ سوچ کر اس نے کار کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔

ڈبل روڈ کراس کرتے ہی اسے اپنی کمر پر کسی تیز چیز کی چبھن محسوس ہوئی، اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اسٹیئرنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ کار سڑک پر کنارے کھڑے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرانے والی تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر کار آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ایک ویران جگہ پر رک گئی۔ رچرڈ نے دروازہ کھولا اور پھرتی سے باہر نکل کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

بارہ بجے انسپکٹر مارٹن، اسپتال میں جوزی کی لاش پر جھکا اظہارِ افسوس کر رہا تھا۔

''جناب جب اِسے اسپتال لایا گیا تو یہ بے ہوش تھی۔ ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ''مجرم تینوں مجرم'' اور پھر یہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا ہے۔'' ڈاکٹر بتا رہا تھا اور انسپکٹر مارٹن کا چہرہ حیرت سے متغیر ہو رہا تھا۔

''کیا اس کی تلاشی لی گئی ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں، یہ چیزیں اس کی جیب سے برآمد ہوئی ہیں۔'' ڈاکٹر نے وہ چیزیں انسپکٹر کے حوالے کر دیں۔

پچھلی شام کے تہ کردہ اخبار کے علاوہ کوآپریٹو بینک کا ایک چیک انسپکٹر مارٹن کے سامنے پڑا تھا جس پر مسز ڈیوڈ کے دستخط تھے۔

اچانک انسپکٹر کا چہرہ چمک اٹھا۔ مطلب یہ کہ آخری بار یہ مسز ڈیوڈ سے ملی تھی۔ ''میرا خیال ہے یہ نام میں نے سن رکھا ہے۔ سارجنٹ! تم فوراً کوآپریٹو بینک جاؤ اور مسز ڈیوڈ کا پورا نام اور پتا لے کر میرے پاس پہنچو۔''

''بہت بہتر جناب......'' سارجنٹ نے سیلوٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔

مارٹن اپنی میز پر بیٹھا واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور سارجنٹ بر کلے دوڑتا ہوا اندر آیا۔

''جناب! مسٹر ڈیوڈ چیلن چوک میں ایک بڑے اسٹور کا مالک ہے اور اوپل روڈ پر رہتا ہے۔ روزی مسٹر ڈیوڈ کی بیوی ہے۔ چیک پر اسی کے دستخط ہیں۔ بینک میں اس گھرانے کے چار افراد کے نام کچھ رقم جمع ہے۔ مسٹر ڈیوڈ، مسز روزی، جین ڈیوڈ اور جوزف ڈیوڈ۔ جین اور جوزف مسٹر ڈیوڈ کے بچے ہیں۔ جین انیس سالہ لڑکی ہے اور ایک دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ جوزف کی عمر بینک کے کاغذات میں نو سال لکھی ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی اسکول میں پڑھتا ہوگا۔''

''ان سب کے پتے لائے ہو؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں، یہ لیجیے۔'' سارجنٹ نے کاغذ انسپکٹر مارٹن کے حوالے کر دیا۔

''ٹھیک ہے، تم یہیں بیٹھو اور جونہی کوئی تازہ خبر ملے مجھے اطلاع کر دینا۔ میں باری باری ان پتوں پر لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

انسپکٹر مارٹن نے اپنی مہم پر نکلنے سے پہلے پولیس کی وردی اتار کر سادہ کپڑے پہن لیے۔ سب سے پہلے اس نے ڈیوڈ اسٹور کا رخ کیا۔ وہاں اس وقت منیجر اور کاؤنٹر کلرک کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

''کیا ڈیوڈ چلا گیا ہے؟'' مارٹن نے اُن سے پوچھا۔

''جی ہاں، وہ پانچ بجے گھر چلے جاتے ہیں۔'' منیجر نے ان کی بے تکلفی سے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''اب طبیعت کیسی ہے اُس کی؟ معاف کیجیے گا، وہ میرا بہت پرانا دوست ہے اس لیے میں اسے اسی طرح بلاتا ہوں۔ کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔'' مارٹن نے اداکاری کی۔

''جی ہاں، دو تین دن سے اُن کی طبیعت واقعی ناساز ہے۔ دن بھر کھوئے کھوئے رہتے ہیں، بات بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔ آج تو انہوں نے کمال کر دیا، کہنے لگے۔ صبح کی ڈاک میں خود دیکھوں گا، کچھ دیر بعد اپنے کمرے سے نکلے تو میں نے انہیں بلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے میری طرف ذرہ برابر توجہ نہیں دی بس جھٹکے سے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے باہر نکل گئے، جناب! ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا......''

''اچھا تو مجھے اجازت دیجیے، میں اُس سے گھر پر ہی مل لوں گا۔''

یہاں سے نکل کر اس نے جین کے دفتر کا رخ کیا۔ جین بھی گھر جا چکی تھی لیکن جو لڑکی اس کی جگہ کام کر رہی تھی، اس سے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کا لُبِ لباب یہ تھا کہ آج کل جین کسی تفریحی پروگرام میں شرکت نہیں کرتی اور

سیدھا گھر کا رخ کرتی ہے۔“

”کمال ہے جناب، کل میں اس کے ساتھ چوک تک گئی تو وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔ ”سیلی بہن! تمہارے پاس پستول ہے؟ سچ جانیے، میں تو اس بات سے ڈر گئی تھی۔ بھلا اسے پستول کی ضرورت کیوں پڑ گئی لیکن اس نے بات بناتے ہوئے کہا کہ وہ مذاق کر رہی تھی۔ مجھے تو یقین نہیں آیا، عجیب لڑکی ہے، صاحب......“

جوزف کا اسکول بند تھا اس لیے مارٹن کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ ایک بار پھر غور و فکر میں ڈوب گیا۔ واقعات گواہی دے رہے تھے کہ مجرم ڈیوڈ کے ہاں چھپے ہوئے ہیں لیکن ان سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ آخر وہ کس بنا پر اسے بلیک میل کر رہے تھے۔ اس کے دماغ میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ سارجنٹ برکلے کمرے میں داخل ہوا۔

”سارجنٹ، میں مسٹر ڈیوڈ سے ملنا چاہتا ہوں، تم اسے کسی بہانے اسٹور میں بلا سکتے ہو؟ ابھی اور اسی وقت؟“

”جی سر! میں کوشش کرتا ہوں۔“ سارجنٹ برکلے نے جواب دیا۔

ڈیوڈ ہاؤس میں فون کی گھنٹی بجی تو ڈیوڈ نے خود ہی ریسیور اٹھایا۔ ”کون صاحب ہیں؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”میں اسٹور سے بول رہا ہوں، سیلز ٹیکس والے اچانک آپہنچے ہیں، آپ فوراً اسٹور پہنچ جایئے۔“

”بہت بہتر، میں ابھی آرہا ہوں، آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”جی میں صفائی کرنے والا۔ جی ہاں منیجر صاحب ان سے بات کر رہے ہیں۔“

دس منٹ بعد ڈیوڈ اسٹور میں داخل ہوا۔ عقبی کمرے میں مارٹن اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

”انسپکٹر صاحب، آپ“ ڈیوڈ نے گھبرا کر کہا۔ چونکہ وہ اس کے علاقے کا تھانے دار تھا اس لیے دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

”ہاں میں، مسٹر ڈیوڈ، تشریف رکھیے، میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”فرمایئے۔“ ڈیوڈ ہکلاتے ہوئے بولا۔ مارٹن نے جیب سے ایک اشتہار نکالا اور میز پر پھیلا دیا۔ ”آپ اِن مجرموں کو جانتے ہیں؟“

”جی، جی نہیں، مجھے ان سے کیا سروکار۔“

”کمال ہے بھئی، آپ اپنے مہمانوں کو نہیں پہچان سکتے۔“ ڈیوڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پھر بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر ساری بات بتا دی۔ مارٹن خاموشی سے سنتا رہا اور پھر بولا۔

”ابھی تک ان کی رقم نہیں پہنچی؟“

”نہیں، لیکن صبح بارہ بجے تک رقم ملنے کا قوی امکان ہے۔“

”کیا آپ اپنے گھر کا نقشہ بتا سکتے ہیں؟“

ڈیوڈ نے کاغذ پر مکان کا نقشہ بنایا۔ دو اطراف خالی تھیں اور دو جانب مکانات تھے۔ مارٹن کچھ دیر سوچتا رہا پھر ڈیوڈ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، کل بیس آدمی آپ کے پاس پہنچ جائیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ پچاس آدمی مکان سے کچھ دور چاروں طرف گھیرا ڈالیں گے تاکہ مجرموں کو بھاگنے نہ دیں۔ میں خود اندر رہوں گا۔ عین سات بجے ہم دھاوا بول دیں گے۔ آپ پونے سات بجے کسی بہانے سب گھر والوں کو باورچی خانے میں لے جا کر بند کر دیجیے گا۔ میں دودھ والے کے روپ میں ہوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے بھی پہچان نہ سکیں۔ اچھا اب خدا حافظ، یہ باتیں کسی سے نہ کہنا، اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ صبح سات بجے ملاقات ہو گی۔“ انسپکٹر نے اسے تمام باتیں سمجھا دی تھیں۔

انسپکٹر مارٹن پولیس اسٹیشن میں موجود تھا اور بڑا پُرجوش تھا۔ ”سارجنٹ! میں ڈیوڈ ہاؤس کا خود جائزہ لے چکا ہوں، اس کے مشرقی کونے پر بجلی کا ایک کھمبا ہے۔ صبح ساڑھے چھ بجے سے مزدور اس کھمبے پر کام کر رہے ہوں گے۔ دیکھو! ہوشیار آدمی چننا پورے سات بجے دس اور مزدور، ایک نیا کھمبا، ہاتھ گاڑی پر رکھے یہاں پہنچیں گے، پانچ مسلح سپاہی سادہ کپڑوں میں ڈیوڈ ہاؤس کی مغربی دیوار کے نیچے ہوں گے اور پانچ شمالی دیوار کے نیچے۔ اس کے علاوہ دونوں طرف ہمسایوں کے ہاں بھی بجلی درست کرنے والے پہنچ جانے چاہئیں۔ رات تین بجے آپ اس علاقے کے بجلی گھر جائیں اور پورے علاقے کی بجلی بند کرا دیں۔ چار بجے ڈیوڈ ہاؤس کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کی طرف سے شکایات درج ہونی چاہئیں اور چھ مزدوروں کو موقع پر پہنچ جانا چاہیے۔ سادہ لباس میں تیس مسلح سپاہی چاروں طرف موجود رہیں گے۔ دس راہ گیروں کی شکل میں اور باقی اِکّا دُکّا اِدھر اُدھر پھرتے رہیں گے۔ ٹھیک سات بجے میں دودھ والا بن کر مکان میں داخل ہوں گا۔ عین اسی وقت

کھمبے کے نیچے کھڑے ہوئے پانچ مزدور بھی گھر میں داخل ہوں گے تاکہ بجلی درست کرسکیں۔ اس کے علاوہ پانچ آدمی اور تیار کرو جو اس وقت ڈیوڈ ہاؤس جائیں اور مکان کا جائزہ لے کر کہیں نہ کہیں چھپ جائیں۔ دیکھو، ایک آدمی گیراج میں چھپ سکتا ہے، دوسرا اسٹور روم میں، تیسرا دوسری منزل کے ان کمروں میں جو اکثر خالی رہتے ہیں۔ باقی دو بھی اِدھر اُدھر چھپ جائیں، یہ لوگ مسلح ہونے چاہئیں۔‘‘

’’بہت بہتر جناب۔‘‘ سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

صبح جب مسز ڈیوڈ بستر سے اٹھی تو اس کے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ کام کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن ناشتا تیار کرنا ضروری تھا۔ اپنے لیے نہ سہی، ان ’’مہمانوں‘‘ کے لیے جو ناشتے میں ذرا سی دیر پر آگ بگولا ہو جاتے تھے۔

اس نے جوزف کو اٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس وقت تھامسن اور رچرڈ اوپر خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ بندوق اُن کے سرہانے رکھی تھی اور کرسٹن ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز تھا۔ پستول اس کی جیب میں تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا اور اب نہانے کا سوچ رہا تھا۔

اچانک اُسے باہر کچھ شور سنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔ آٹھ سے دس مزدور بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑے تھے۔ ایک شخص رسی کی سیڑھی کے ذریعے کھمبے پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے بتی جلا کر دیکھی تو بجلی غائب تھی۔ اس نے صبح کا اخبار اٹھایا اور کل والے قتل کی رُوداد پڑھنے لگا۔ ساڑھے چھ بجے ڈیوڈ نیچے آیا۔ کرسٹن اسے دیکھتے ہی بولا۔ ’’مسٹر ڈیوڈ! ان دونوں پوستیوں کو جگاؤ، آخر کب تک وہ سوتے رہیں گے؟‘‘

’’میں...... میں نے جگایا تھا لیکن رچرڈ بگڑ گیا اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔‘‘

’’عجیب احمق آدمی ہے، خیر سونے دو، اٹھ کر وہ کون سا قلعہ فتح کرلیں گے۔ ناشتے سے پہلے میں ذرا نہالوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

ٹھیک سات بجے باہر شور سنائی دیا۔ کرسٹن نہا دھو کر کرسی پر بیٹھا بال بنا رہا تھا۔ اس نے باہر جھانکا۔ بہت سے مزدور دو پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی دھکیل کر لا رہے تھے، جس پر بجلی کا ایک کھمبا رکھا ہوا تھا۔

اچانک دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ کرسٹن نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے پانچ سات مزدور ہاتھوں میں اوزار لیے کھڑے تھے۔ ایک نے کرسٹن سے پوچھا۔

’’مین سوئچ کہاں ہے؟‘‘

کرسٹن نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ اسی وقت دودھ والا بڑبڑاتا ہوا اندر آگیا۔

کرسٹن اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور درشتی سے بولا۔ ’’کیا بات ہے؟ اندر کیوں گھسے چلے آرہے ہو؟‘‘

’’بھائی صاحب! مجھے آپ یہ بتائیں کہ میں نے آپ کو کب گندہ دودھ دیا تھا؟ آپ کو مجھ سے کیا دشمنی تھی جو آپ نے ایجنسی سے میری شکایت کر دی، یہ دیکھیے۔‘‘ اس نے شکایت نامہ کرسٹن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی انسپکٹر کی عقابی نظروں نے بھانپ لیا کہ پستول کرسٹن کی دائیں جیب میں ہے۔ کرسٹن نے بائیں ہاتھ سے کاغذ پکڑا، اس کا دایاں ہاتھ بدستور جیب میں تھا۔ ابھی وہ کاغذ کی طرف دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ انسپکٹر مارٹن اس پر پل پڑا گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور بے شمار لوگوں کے قدموں کی آواز بھی، جو اس طرف دوڑے چلے آرہے تھے۔ مارٹن کا ہاتھ کرسٹن کی جیب میں پڑے ہوئے پستول پر تھا اور اس کی گرفت اس پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ پستول پر قابو پاچکا تھا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور چھ سات مزدور ہاتھوں میں اسلحہ لیے اندر داخل ہوئے۔

’’ہاتھ اوپر اٹھالو اور پستول پھینک دو۔‘‘ انہوں نے یک آواز ہو کر کہا۔

تین چار سپاہیوں نے کرسٹن کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ باقی دس مارٹن کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ گولی چلنے کی آواز سے خواب گاہ میں تھامسن اور رچرڈ بیدار ہو چکے تھے۔ لیکن پہلے سے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق ڈیوڈ رات کے وقت ان کی بندوق میں سے ساری گولیاں نکال چکا تھا۔ انہوں نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی لیکن کئی سپاہیوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

چند منٹوں میں ہی پولیس تینوں مجرم مہمانوں کو جیپ میں بٹھائے پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی اور ڈیوڈ گھر کے تمام افراد کے ساتھ دروازے میں کھڑا انہیں الوداع کہہ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ان خطرناک و خوفناک مجرموں سے چھٹکارا پاچکا ہے۔

دامِ صیاد

سلیم انور

ناگہانی کبھی اطلاع دے کر نہیں آتی... اچانک... دبے پاؤں بنا آہٹ کے حملہ آور ہوتی ہے... سوچوں کی لہروں نے اسے سبک اور رواں منصوبے کی جانب دھکیل دیا تھا... شاندار منصوبے کے بعد عمل کی گھڑیاں بھی آگئیں... مگر پھر وہ کچھ ہو گیا جو سوچا تھا... نہ طے شدہ تھا...

اپنے ہی جال میں الجھ کر گر جانے والے صیاد کا دل دوز انجام......

سراغ رساں شرمین‘ سارجنٹ ولسن کے آرام دہ لیکن بے ترتیب دفتر میں اس کے ہمراہ موجود تھا۔ سارجنٹ ولسن قتل کے ایک کیس کا جائزہ لے رہا تھا جسے وہ پہلے ہی حل کر چکا تھا۔ وہ میڈیا کو اس سلسلے میں ایک پریس ریلیز جاری کرنے سے قبل یہ یقین کر لینا چاہ رہا تھا کہ اس بیان میں کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہ رہ جائے۔

اتنے میں قیمتی لباس پہنے ہوئے ایک نوجوان عورت اس کے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی اور پوچھنے لگی۔

’’ایکسکیوز می، کیا تم ہی سارجنٹ ولسن ہو؟‘‘

سارجنٹ ولسن نے سر اٹھا کر اس عورت کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’میں اپنے شوہر کو ملنے والی ایک دھمکی کے بارے میں رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں۔‘‘ اس عورت نے کہا۔

’’میرا نام امینڈا سائمنڈ ہے۔ میرے شوہر کا نام جون سائمنڈ ہے۔ وہ غیر منقولہ جائداد کی ایک معروف شخصیت ہے اور کیپٹل سٹی کے ڈاؤن ٹاؤن ڈسٹرکٹ کے متعدد بلاک کا مالک ہے۔‘‘

سراغ رساں شرمین بھی توجہ سے اس عورت کی بات سن رہا تھا۔

’’کل یہ ہمیں ڈاک سے موصول ہوا ہے۔‘‘ امینڈا نے یہ کہتے ہوئے ایک کاغذ سارجنٹ کی جانب بڑھا دیا جس پر حروف کاٹ کر چسپاں کیے گئے تھے۔ پیغام کچھ یوں تھا۔ ’’تم موٹے سڑیل دوسروں پر بوجھ بنے ہوئے بڈھے، مرنے کے لیے تیار رہو......دھم دھماد ھم!‘‘

’’پیغام قدرے ناشائستہ ہے۔‘‘ سراغ رساں شرمین نے پیغام پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

سارجنٹ ولسن نے وہ کاغذ واپس امینڈا کی جانب کھسکا دیا اور اسے قطعی بے ضرر قرار دیتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارے شوہر جیسے آدمی کو ہر وقت اس قسم کی دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔‘‘

یہ سن کر امینڈا ششدر رہ گئی۔ ’’نہیں، یہ ایک سیریس دھمکی ہے۔ آج صبح جب میں اپنے کچن کی کھڑکی کے پاس کھڑی کپ میں کافی انڈیل رہی تھی۔ گیراج کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو مجھے وہاں اندر کوئی دکھائی دیا جو ادھر ادھر منڈلاتا پھر رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی جون کے بھتیجے کو وہاں بھیجا کہ دیکھو کون ہے۔ جب تک وہ گیراج میں پہنچا تو جو کوئی بھی وہاں دکھائی دیا تھا، اس وقت تک وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ میرے شوہر کی زندگی حقیقت میں خطرے میں ہے۔‘‘

’’کیا تم نے اپنے شوہر کے لیے کوئی باڈی گارڈ رکھنے کے بارے میں سوچا؟‘‘ سراغ رساں شرمین نے پوچھا۔

’’جون نے باڈی گارڈ رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا ہے۔‘‘ امینڈا نے بتایا۔

سارجنٹ ولسن نے امینڈا سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر اس کا شوہر دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا ہے تو پھر پولیس اس بارے میں کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ اس نے امینڈا کو اس وارننگ کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور اگر اسے کوئی بھی عجیب بات دکھائی دے تو پولیس کو فون کر دے۔

چند گھنٹوں کے بعد ایک فون کال ضرور آئی لیکن وہ امینڈا کی جانب سے نہیں تھی۔ یہ فون کال ایک ایمبولینس ٹیم کی جانب سے تھی جو جون سائمنڈ کی رہائش گاہ کے باہر موجود تھی۔ ’’یہاں ایک کار بم کا دھماکا ہوا ہے۔‘‘ ایمرجنسی

ورکر نے فون پر انہیں بتایا۔ ''مسٹر جون اور مسز جون دونوں ہی اس بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔''

سارجنٹ ولسن اور سراغ رساں شرمین دونوں ہی فوراً جائے حادثہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

جون سائمنڈ کی حویلی کا گیراج جل کر کھنڈر ہو چکا تھا اور ملبے سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ کار میں موجود دونوں میاں بیوی کو بچ نکلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

ایمرجنسی میڈیکل سروس کا ایک ورکر سارجنٹ ولسن کے پاس آ گیا۔ ''دھماکے سے قبل ہمیں مسٹر جون سائمنڈ کا فون موصول ہوا تھا۔ ان کی بیوی سیڑھیوں پر سے لڑھک کر نیچے گر گئی تھی اور بے ہوش ہو گئی تھی۔ انہوں نے فون پر بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں اور انتظار کریں، ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ رہے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے۔''

سارجنٹ ولسن نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''سو اس نے اپنی بے ہوش بیوی کو کار میں ڈالا، کار اسٹارٹ کی اور دھڑام...... دھماکا ہو گیا! جو کوئی بھی جون سائمنڈ کو مار ڈالنا چاہتا تھا، اس نے دونوں میاں بیوی کو ہلاک کر دیا۔''

جب کرائم سین انویسٹی گیشن کا عملہ آ گیا تو سارجنٹ ولسن اور سراغ رساں شرمین انہیں جائے حادثہ پر چھوڑ کر حویلی کے اندر چلے گئے۔ جون سائمنڈ کا بھتیجا کونراڈ انہیں کوٹھی کے عقب میں بنے ہوئے کچن میں مل گیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ تمام دن گھر ہی میں موجود رہا ہے۔ اس نے ڈاک میں موصول ہونے والے دھمکی آمیز پیغام اور گیراج میں نامعلوم شخص کی چوری چھپے آمد اور امینڈا کے اس سلسلے میں خوف اور ڈر کی تصدیق کی۔

''یہ کار آخری بار کب استعمال میں لائی گئی تھی؟'' سارجنٹ ولسن نے کونراڈ سے پوچھا۔

''وہ کار جس میں دھماکا ہوا ہے؟'' کونراڈ نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

گو گیراج کا ملبا وہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن کارنر کے اطراف میں دھواں اب بھی اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ ''یہ ان کی واحد کار تھی۔ دوسری بننے کے لیے ورکشاپ گئی ہوئی ہے۔ امینڈا نے صبح پولیس میں رپورٹ درج کرانے کے لیے کار استعمال کی تھی۔ اس کے بعد سے اسے کسی استعمال میں نہیں لایا گیا تھا۔'' کونراڈ نے بتایا۔

''جب امینڈا سیڑھیوں پر سے گری تھی تو کیا تم یہاں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

موجود تھے؟'' سارجنٹ ولسن نے پوچھا۔

''ہاں۔'' کونراڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ میں نے انکل جون سے کہا کہ وہ ایمبولینس کے آنے کا انتظار کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے امینڈا کو کار تک پہنچانے میں انکل کی مدد کی تھی۔ میں اس وقت گیراج کے عین باہر کھڑا ہوا تھا جب کار میں دھماکا ہوا۔'' کونراڈ کے منہ پر ابھی تک دھوئیں کی کالک موجود تھی اور اس کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں نمایاں تھیں۔

سارجنٹ ولسن اپنے دوست سراغ رساں شرمین کو ایک طرف لے گیا۔ ''مجھے بڑی خجالت ہو رہی ہے۔ وہ عورت تحفظ کے لیے ہمارے پاس آئی تھی اور میں نے اسے گھر بھیج دیا اور وہ ہلاک ہوگئی۔''

''مجھے معلوم نہیں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا۔'' شرمین نے کہا۔ ''لیکن مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ اس میں کون ملوث تھا۔ تم اس واقعے کو رونما ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔''

''مجھے امینڈا کی بات سن لینی چاہیے تھی۔'' سارجنٹ ولسن نے خود کو کوستے ہوئے کہا۔ ''لیکن انہیں جو دھمکی موصول ہوئی تھی وہ ایسی تھی کہ قائل نہیں کر رہی تھی۔''

''وہ واقعی قائل نہیں کر رہی تھی۔'' سراغ رساں شرمین نے سارجنٹ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کہ وہ اسی نے تیار کی تھی۔''

''کس نے؟'' سارجنٹ ولسن چونک پڑا۔

''میرا خیال ہے کہ امینڈا جون اپنے شوہر جون سائمنڈ کو قتل کرنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔ اس نے وہ تحریری پیغام اور گیراج میں کسی کے چوری چھپے داخل ہونے اور دیکھے جانے کے بارے میں داستان خود تیار کی تھی۔ جب اس کا شوہر بم دھماکے میں مارا جاتا تو ہمیں یہ یقین کرنا پڑتا کہ یہ حرکت اس کے کسی دشمن کی تھی۔''

سارجنٹ ولسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن امینڈا تو خود بھی اس دھماکے میں ماری گئی ہے۔''

''تو پھر؟''

''اگر بم دھماکے کی پلاننگ اسی کی تھی تو اس نے خود کو دھماکے سے ہلاک ہونے سے بچایا کیوں نہیں؟''

''یہ یاد رہے کہ دھماکے سے قبل وہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ اپنے شوہر کو باز نہیں رکھ سکتی تھی کہ وہ اسے کار میں نہ ڈالے۔ اس کے شوہر کو علم نہیں تھا کہ اس کی کار میں بم لگا ہوا ہے جو کار کو اسٹارٹ کرنے سے پھٹ جائے گا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ امینڈا کی موت اپنے ہی بم سے واقع ہوگئی۔''

سارجنٹ ولسن یہ سن کر گنگ رہ گیا۔

''اس معاملے میں امینڈا کا کوئی ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔'' سراغ رساں شرمین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس پہلو کو بھی چیک کرنا ہوگا۔''

''اور تمہیں کس بات نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ امینڈا جون نے گیراج میں کسی اجنبی کی موجودی اور دیکھے جانے کے بارے میں کہانی خود گھڑی تھی؟'' سارجنٹ ولسن نے جاننا چاہا۔

''سیدھی اور سامنے کی بات ہے۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ وہ اپنے کچن کی کھڑکی کے پاس کھڑی کپ میں کافی انڈیل رہی تھی اور گیراج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس وقت اس نے کسی کو گیراج میں ادھر ادھر منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا اور جون کے بھتیجے کونراڈ کو فوراً ہی صورت حال معلوم کرنے کے لیے وہاں بھیج دیا تھا۔''

سارجنٹ ولسن نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''لیکن ایسا ناممکن تھا۔'' شرمین نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''ان کی حویلی کا گیراج کچن کی کھڑکی سے خاصے فاصلے پر کارنر سے گھوم کر پڑتا ہے۔ کچن سے گیراج میں نگاہ پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

☆☆☆

بعدازاں سراغ رساں شرمین کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

''اس سازش میں امینڈا اور کونراڈ دونوں ہی شامل تھے۔ ان کا ارادہ جون سائمنڈ کے مرنے کے بعد اس کی دولت آپس میں بانٹنے کا تھا لیکن اتفاق سے امینڈا سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہوگئی اور کونراڈ نے اپنے انکل کو اس بات سے نہیں روکا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی کار میں ڈال کر اسپتال نہ لے جائے بلکہ ایمبولینس کے آنے تک انتظار کرے۔ اسے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا بہترین موقع مل رہا تھا۔ جون سائمنڈ کی تمام دولت اس کے ہاتھ آجاتی اور وہ تن تنہا تمام دولت اور جائداد کا مالک بن جاتا۔'' سارجنٹ ولسن نے شرمین کو بتایا۔

''کونراڈ نے سب کچھ اگل دیا ہے اور اب وہ حوالات میں ہے۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پہچان

جمال دستی

جنگ زدہ ماحول کسی بھی انسان کو ذہنی مریض بنا سکتا ہے... وہ طویل عرصے تک عسکری خدمات دیتا رہا تھا... آزاد ماحول میں آتے ہی اسے اپنی پہچان اور شناخت کے مسائل درکار تھے... جو عرصے تک اس کی نظروں سے پوشیدہ رہے تھے... ذہن ودل کی حالت میں تغیرات کی یلغار کا فسانۂ عبرت...

اپنی ذات کے اسرار کھوج لینے والے فوجی کا ماجرا.....

میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا میرا باپ مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ والدین اپنی اولاد سے نفرت کریں۔ خدا ہی جانتا ہے لیکن اس کے پاس مجھ سے نفرت کرنے کا جواز تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے میں خاصا خودسر اور بدتمیز ہو چکا تھا۔ اسکول سے میری شکایتیں آنے لگیں اور میں قانون شکنی کا مرتکب بھی ہوا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ جب میری ماں کا انتقال ہوا تو بھی میں بچوں کی حوالات میں بند تھا اور ماں کی تدفین میں

شرکت کے لیے ڈیڈی کو میری ضمانت کروانا پڑی۔ ہمارے درمیان امن قائم ہونے کا یہ آخری موقع تھا جو ماں کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

میں اسی ہفتے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میری بنیادی تربیت ٹیکساس میں ہوئی پھر مجھے افغانستان بھیج دیا گیا۔ اب میں ایک ناراض اور مایوس نوجوان کے بجائے ایک سخت گیر فوجی بن چکا تھا جو اپنے دشمنوں سے کوئی رعایت نہیں کرتا تھا۔ تین مرتبہ پہاڑیوں کا طویل سفر کرنے اور دہشت گردوں سے لڑنے کے بعد میں نے دنیا کو بالکل مختلف انداز سے دیکھنا شروع کر دیا بلکہ اب مجھے اپنا باپ بھی پہلے سے مختلف نظر آنے لگا تھا لیکن یہ بات میں تے اسے پہلے کبھی نہیں بتائی۔ اس دوران میں چند مرتبہ چھٹیوں پر گھر آیا لیکن وہ اپنا ٹرک لے کر کسی دور دراز سفر پر گیا ہوا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مجھے نظر انداز کر رہا ہو۔

میں اسے الزام نہیں دیتا اور نہ ہی مجھے اس بارے میں کوئی پریشانی تھی۔ جوانی میں ہر کوئی اپنے آپ کو صحیح سمجھتا ہے لیکن آنے والے وقت کا کسی کو پتا نہیں ہوتا۔ مجھے بھی اس کی موت کی اطلاع چار دن بعد ملی۔ منگل کی شب مشی گن ہائی وے پر میرے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوا اور جمعے کی صبح یہ خبر مجھ تک پہنچی۔ میں افغانستان کے صوبہ ہلمند میں ایک پہاڑ کی چوٹی میں چھپا ہوا ایک طالبان کمانڈر کا انتظار کر رہا تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ مجھے وہاں سے فوراً واپس آنے کا حکم مل گیا۔

سارجنٹ بیرک کے باہر ہی میرا انتظار کر رہا تھا اور اس کے چہرے سے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ پہلے تو میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا خبر ہو سکتی ہے لیکن جب اس نے انتقال کا لفظ استعمال کیا تو میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ تمہارے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ سارجنٹ ووجوسکی نے مجھے ایک اخبار کا تراشہ دکھایا جس میں جلا ہوا ٹرک ایک طرف الٹا پڑا ہوا تھا۔

میرے لیے اس خبر کو سننا بہت مشکل تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ پر قابو پا لیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا ہدف عموماً رات کے وقت اپنی بیویوں سے ملنے اور سودا سلف دینے اپنے گاؤں آیا کرتا تھا۔ اس کی آمد دو دن بعد متوقع تھی اور مجھے اس کا انتظار کرنے کے لیے اپنی تیاری کرنا تھی۔

ووجوسکی میرے پیچھے آیا اور مجھ پر اس طرح ناراض ہونے لگا جیسے کبھی ماضی میں میری اسکول ٹیچر ہوا کرتی تھی۔ وہ تین مختلف براعظموں میں لڑ چکا تھا اور کئی لحاظ سے میرے لیے باپ جیسا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈیڈی کے مرنے کے باوجود مجھے اپنا کام پورا کرنا ہو گا۔ میں ووجوسکی کے الفاظ یاد کر کے اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ ڈیڈی کا وقت پورا ہو چکا تھا لیکن دنیا کے کام تو نہیں رک سکتے تھے۔

ووجو نے وہ مسکراہٹ دیکھ لی۔ اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں فوراً گھر جانا چاہیے، وہاں تمہاری ضرورت ہے۔“

”میں جا کر کیا کروں گا؟“ میں نے کہا۔

”وہی جو اس موقع پر ایک بیٹا کرتا ہے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ میرے لیے زیادہ اہم یہ تھا کہ اپنے ہدف کے آنے سے پہلے واپس پہاڑوں پر چلا جاؤں لیکن ووجو مجھ سے متفق نہیں تھا۔

”یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ بیو ماؤنٹ۔ میں نے پہلے ہی تمہاری جگہ دوسرا آدمی بھیج دیا ہے۔ اپنا سامان باندھو اور روانہ ہو جاؤ۔ تم سے ایک ماہ بعد ملاقات ہو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی نہ ہو۔“

مجھے مجبوراً اس کا حکم ماننا پڑا۔ سامان باندھا اور ایک طویل سفر طے کر کے اپنے آبائی شہر ایلکوما پہنچ گیا۔ ائرپورٹ دیکھنے میں پہلے سے دگنا اور کافی مصروف لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی بہن کو ای میل کے ذریعے اطلاع کر دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی لیکن وہ وہاں نہیں تھی بلکہ میں نے اپنے کسی جاننے والے کو بھی نہیں دیکھا لیکن ایک چہرہ مجھے جانتا تھا۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس، سیاہ چشمہ لگائے، سیاہ بالوں والی ایک دبلی پتلی عورت تھی۔ جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا وہ میری طرف لپکتی ہوئی آئی۔

”سارجنٹ بیو ماؤنٹ۔ میں بیورلی ڈیوس ہوں۔“ اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا تعلق کیمپ مینارڈ کے پرسنل سیکشن سے ہے۔ ہمیں تمہارے باپ کی موت پر بہت افسوس ہوا۔ کیا تمہارے ساتھ کچھ سامان ہے؟“

”نہیں صرف یہی ہے۔“ میں نے اپنے شولڈر بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”ان حالات میں واپس آنے والے سپاہیوں کو ہماری طرف سے مدد فراہم کی جاتی ہے۔“ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”ان دنوں یہی طریقۂ کار ہے لیکن مجھے

خدشہ ہے کہ کچھ دوسرے مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔“

”کیسے مسائل؟“

”ابتدا میں بتایا گیا کہ تمہارے باپ کی موت ایک حادثہ تھی لیکن اب یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات تھی جو ناکام ہو گئی۔ اس صورت میں پولیس تم سے بھی پوچھ گچھ کر سکتی ہے۔“

”کیسی پوچھ گچھ؟ میں تو یہاں موجود نہیں تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”بہرحال تم ایک ناخوشگوار صورتِ حال میں گھر واپس آئے ہو اور میں یہاں تمہاری مدد کے لیے موجود ہوں۔“

”کیسی مدد؟“

وہ اس سوال پر حیران ہو گئی۔ ”باپ کی موت بہت بڑا صدمہ ہے اور تمہیں اسے برداشت کرنا ہے۔“

”دیکھو خاتون، مجھے اپنے باپ سے بات کیے ہوئے کئی برس ہو گئے۔ مجھے اس کی تدفین میں شرکت کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس لیے آ گیا لیکن شاید اس کے فوراً بعد ہی واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے کسی نگہبان کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن تمہیں ایک ڈرائیور کی ضرورت تو ہو گی۔ تم نے زیادہ وقت محاذ پر گزارا ہے سارجنٹ اور تمہارے لائسنس کی میعاد گزشتہ سال ختم ہو چکی ہے۔ تم کرائے پر بھی گاڑی حاصل نہیں کر سکتے جبکہ تھوڑی دیر بعد تمہارے باپ کی آخری رسومات شروع ہونے والی ہیں۔ کیا تم لباس تبدیل کرنا چاہو گے؟“

”وہ کس لیے؟“

”شاید وہ موقع کی مناسبت سے زیادہ موزوں ہو۔“ اس نے خود بھی ماتمی لباس یعنی سیاہ اسکرٹ اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی جبکہ میرے جسم پر چمڑے کی جیکٹ اور جینز تھی۔

”میرا باپ ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے سیاہ سوٹ اور ٹائی کہاں نصیب ہو گی؟“

الگوما میں تجہیز و تکفین کے دو مراکز تھے۔ دریا کے دونوں کناروں پر رہنے والوں کے ایک ایک مرکز مخصوص تھے۔ ہماری طرف والے کا کرایہ کم تھا اور میرے ڈیڈی وہیں تھے۔ یا کم از کم میں نے یہی فرض کر لیا تھا۔ تابوت بند تھا۔ اس میں کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے باکس پر ہاتھ رکھا اور کسی جذبے کے محسوس ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک عمر رسیدہ اور بھاری بھرکم شخص سیاہ سوٹ میں ملبوس میرے پاس آیا اور میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہو لڑکے؟ شاید تم نے مجھے نہیں پہچانا؟“

میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ”سڈ کیلس۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں بعض اوقات تمہارے ڈیڈی کو میٹنگوں میں لے جاتا تھا۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”پھر تو تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے جو ایک طرح سے ٹھیک نہیں۔“

”وہ کیوں؟“

”کیونکہ مقامی لوگوں کے لیے یہ بہت آسان ہو جائے گا اگر تم چند چیزیں بھول جاؤ۔ جیسا کہ تمہارے باپ نے گزشتہ چند ماہ میں تمہیں بتایا ہو گا۔ وہ کتنا خطرناک کام کر رہا تھا۔“

”خطرناک کام؟“

”تم نے زیادہ عرصے ملک سے باہر گزارا لیکن یہیں پلے بڑھے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بہت سے لوگوں کا گزارا کس طرح ہوتا ہے۔“

میں نے سر ہلا دیا۔ مشی گن میں کینیڈا کی سرحد کا زیادہ حصہ ایک تصوراتی لائن پر مشتمل تھا جو جھیل کی تہ میں کھینچی گئی تھی جبکہ خشکی پر سرحد عبور کرنے کے کئی راستے تھے جہاں نہ کوئی چیک پوسٹ تھی اور نہ ہی کوئی کاغذی کارروائی ہوتی تھی۔

”کیا پاپا سرحد کے پار جاتے تھے؟“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہی اس سوال کا جواب ہے اگر کوئی تم سے اس بارے میں پوچھے تو لاعلمی ظاہر کرنا۔“

”بالکل۔“ میں نے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ڈیڈی کیا کر رہے تھے۔ لیکن میرا ارادہ اس بارے میں جاننے کا تھا۔ کیلس اپنے کچھ دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ باتیں کرنے کے دوران ان میں سے دو نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا جیسے میرا چہرہ یاد کر رہے ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ انہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

میں کمرے کے عقبی حصے میں کھڑے ہو کر لوگوں کو دیکھنے لگا۔ ان کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ غالباً تیس چالیس لوگ تو ہوں گے۔ زیادہ تر نے فلالین کی قمیصیں اور جینز پہن رکھی تھیں جبکہ کچھ بوڑھے ڈھیلے ڈھالے سوٹوں میں ملبوس تھے۔ میں ان میں سے چند ایک کو ہی پہچانتا تھا جبکہ زیادہ تر چہرے اجنبی تھے۔ بہت سے لوگوں کو میں بھی یاد نہیں تھا یا پھر وہ میرے اور ڈیڈی کے اختلافات کے بارے میں جانتے

تھے۔ ان میں سے چند ایک نے آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور اظہارِ ہمدردی کیا۔ لیکن کسی نے بھی زیادہ بات نہیں کی اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کون تھے۔

’’جوش۔‘‘ ایک نوجوان عورت مجمع سے نکل کر میرے پاس آئی۔ مجھے اسے پہچاننے میں بالکل دیر نہیں لگی۔ وہ ہو بہو میری ماں کی ہم شکل تھی۔

’’جولین۔‘‘ میں نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ’’کیسی ہو بہن؟‘‘

’’میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم وقت پر پہنچ گئے اور تھوڑی سی حیرانی بھی۔ تمہیں دیکھے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا۔ کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟‘‘

’’ایک شریکِ کار۔‘‘ مس بیورلی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’بیورلی ڈیوس۔ میرا تعلق کیمپ مینارڈ سے ہے۔ مجھے تمہارے نقصان پر بہت افسوس ہے۔‘‘

’’مجھ سے زیادہ بھائی کا نقصان ہوا۔‘‘ وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ’’تم نے تو مجھے پہچانا بھی نہیں۔‘‘

’’کافی عرصہ ہو گیا۔‘‘ میں نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم بڑی ہو گئی ہو۔‘‘

’’ہم نے چار سال سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ میری شادی ہو چکی ہے اور دو بچے بھی ہیں۔ میں نے تمہیں خط بھی لکھا تھا۔‘‘

’’مجھے تمہارا خط مل گیا تھا۔ میں نے تمہیں ایک چیک بھی بھیجا تھا۔‘‘

’’ہاں، اور میں نے تمہیں شکریے کا خط لکھا لیکن وہ تم تک نہیں پہنچ سکا اور واپس آ گیا۔‘‘

’’دنیا کے ہر خطے میں ڈاک کا اِدھر اُدھر ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔‘‘ ڈیوس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

’’کیا میں یقین کر لوں کہ تم دونوں شادی شدہ نہیں ہو؟‘‘ جولین نے پوچھا۔ ’’تم میرے بھائی کی طرف سے بول رہی ہو جبکہ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو۔‘‘ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ’’جوش! کیا ہم اکیلے میں بات کر سکتے ہیں؟‘‘

’’اس طرف ایک عبادت گاہ ہے۔‘‘ ڈیوس نے کہا۔

ہم اس کے ہمراہ ہال عبور کر کے برابر والے کمرے میں پہنچے۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سامنے ایک روسٹرم اور کرسیوں کی چھ قطاریں تھیں اور روسٹرم پر ایک صلیب بنی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

’’کیا ہوا؟ کیا تم نے کوئی دلچسپ منظر دیکھ لیا؟‘‘ جولین نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’دراصل مجھے چرچ گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔‘‘

’’ہاں، کافی عرصے تک تمہاری کوئی خبر نہیں ملی۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اور شاید اگلی بار تم اس سے بھی زیادہ عرصے کے لیے غائب ہو جاؤ۔ اس لیے میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک چیک بک نکالی اور مجھے پکڑا دی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ساٹھ ہزار ڈالر سے زیادہ رقم موجود تھی۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’پاپا کی بچت۔‘‘ جولین نے جواب دیا۔ ’’جو کچھ تم بھیجتے رہے۔ وہ سب انہوں نے تمہارے لیے بچا کر رکھا تاکہ جب تم گھر واپس آؤ تو تمہیں ایک معقول رقم مل جائے۔‘‘

’’دفع کرو جولین۔ میں نے یہ پیسے اس لیے بھیجے تھے کہ تم لوگ ایک بہتر زندگی گزار سکو، تمہارے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے رہیں اور......‘‘

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ’’ہمیں تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی جوش۔ تمہارا بھیجا ہوا ایک خط اس چیک سے زیادہ اہم تھا اور تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ مجھے سرکاری وظیفہ مل گیا تھا اور میں دو سال پہلے اعزازی نمبروں سے گریجویشن کر چکی ہوں لیکن تمہیں یہ بات بھی معلوم نہیں ہو گی کیونکہ تم رابطے میں نہیں تھے۔‘‘

’’تمہارے بھائی کو فرائض کے سلسلے میں اکثر دور دراز علاقوں میں جانا پڑتا تھا جہاں رابطہ بہت مشکل تھا۔‘‘ ڈیوس نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

’’بھائی سے رابطہ اس وقت بھی مشکل تھا جب ہم ایک کمرے میں رہتے تھے۔‘‘ جولین نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ’’کیونکہ تم اسے نہیں جانتیں۔ اس لیے خاموش رہو اور ہمیں بات پوری کرنے دو۔ جوش! تم نے کتنے عرصے سے پاپا کو نہیں دیکھا تھا؟‘‘

’’کئی سال ہو گئے۔‘‘ میں نے اعتراف کیا۔

دراصل مجھے اپنے باپ سے ملے ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ پچھلی مرتبہ جب میں گھر آیا تو وہ ایک ہفتے کے لیے مانٹریال جا رہے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن اس وقت بھی ہمارے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ ہم نے ہاتھ بھی ملایا تھا یا

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج
صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم
عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی
اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایت اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیم الحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

نہیں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ بغل گیر نہیں ہوئے تھے۔

’’کیا تم نے ان چند برسوں میں پاپا کو کوئی خط لکھا یا نیک خواہشات کا کارڈ بھیجا؟ وہ بیمار تھے۔ کیا تمہیں یہ معلوم تھا؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’انہیں لبلبے کا سرطان تھا اور ان کا مرض آخری اسٹیج میں داخل ہو چکا تھا۔ اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تب بھی وہ موت کے قریب پہنچ چکے تھے۔‘‘

میں نے وہ چیک بک اس کے ہاتھ پر رکھی اور کہا۔ ’’میں نے یہ رقم بچت کے لیے نہیں بھیجی تھی جولین بلکہ میں گھر والوں کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔‘‘

’’ہم فیملی نہیں ہیں جوش، گھر والے رابطے میں رہتے ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ ہماری فیملی تو ختم ہو چکی۔ اس گھرانے کا سربراہ برابر والے کمرے میں کفن دفن پہنے لیٹا ہوا ہے۔ میں یہ رقم تم سے اگلی ملاقات ہونے تک اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ تمہارا قیام کہاں پر ہے؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ اپنے گھر پر ہی رہوں گا۔‘‘

’’اس کے لیے تمہیں پولیس کے پاس جانا ہوگا۔ انہوں نے اسے سیل کر دیا ہے۔ پورے گھر کی تلاشی لی۔ ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔‘‘

’’کیوں؟ وہ کیا ڈھونڈ رہے تھے؟‘‘

’’میں نہیں جانتی۔‘‘ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ’’شاید انہیں کوئی ثبوت چاہیے، کیا تم ایک مہربانی کرو گے؟‘‘

’’بالکل، کہو کیا بات ہے؟‘‘

’’کیا تم یہاں ہونے والے واقعات سے نمٹ سکتے ہو۔ میرا شوہر ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں اپنے بچوں کو پڑوس میں چھوڑ کر آئی ہوں اور......‘‘

یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔ اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ میں اسے تسلی دینا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں پڑی۔ نہ جانے اس کا ردِعمل کیا ہوتا۔

’’ہم یہاں کے معاملات دیکھ لیں گے۔‘‘ ڈیوس نے کہا۔ ’’تم گھر جاؤ جولین۔ بچوں کے پاس۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ جولین نے کہا۔ ’’جب یہاں سے فارغ ہو جاؤ تو جیری اور اپنے بھانجوں سے ملنے ضرور آنا۔ اب ہم ہی تمہارے اپنے ہیں۔‘‘

’’یقیناً۔‘‘ میں نے کہا۔ اس نے میرا ماتھا چوما اور ایک کارڈ دیتے ہوئے بولی۔ ’’اس پر میرا نیا پتا اور فون نمبر موجود ہے۔ وقت مل جائے تو فون کرنا۔‘‘

’’ضرور۔ یہ میرا وعدہ ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’میں تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔‘‘

وہ عبادت گاہ سے باہر نکلی اور تیزی سے ان پولیس والوں کے پاس سے گزرتی ہوئی چلی گئی جو اسی وقت اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ دونوں یونیفارم میں اور مسلح تھے۔ ان میں سے بڑے کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا منہ شکاری کتے جیسا تھا جبکہ دوسرا دبلا پتلا اور کم عمر تھا۔

’’مسٹر بیوماؤنٹ۔‘‘ بڑی عمر والے نے کہا۔ ’’میرا نام کیپٹن اسنیڈر ہے اور یہ میرا ساتھی کارپورل بلیک تھرون ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مناسب وقت نہیں ہے لیکن ہم تم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’کس بارے میں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’تمہارے ڈیڈی اور ان کے حالات......‘‘

’’اور ان کے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں بھی۔‘‘ چھوٹے نے لقمہ دیا۔

’’اگر تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چل سکو۔‘‘ اسنیڈر نے کہا۔ ’’اس میں صرف چند منٹ ہی لگیں گے......‘‘

’’اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘ بیورلی ہمارے درمیان آتے ہوئے بولی۔ ’’سارجنٹ بیوماؤنٹ امریکی فوج کا حاضر سروس رکن ہے اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ سول حکام کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے اپنے وکیل سے قانونی مشاورت کرے۔‘‘

’’خاتون، اس معاملے میں فوج کو گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’کیپٹن، میرا عہدہ میجر کا ہے۔‘‘ ڈیوس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا اور اپنا شناختی کارڈ اس کے سامنے لہرا دیا۔ ’’میجر بیورلی ڈیوس۔ آرمی سی آئی ڈی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سارجنٹ بیوماؤنٹ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر گھر آیا ہے اور......‘‘

’’رک جاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ فوجی معاملہ نہیں اور نہ ہی میں تمہارا ماتحت ہوں۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا اسنیڈر لیکن مفت میں نہیں۔ ہمیں ایک سودا کرنا ہوگا۔ تم مجھے بتاؤ گے کہ میرے باپ کے ساتھ واقعتاً کیا ہوا پھر میں وہ سب کچھ بتا دوں گا جو اس کے بارے میں جانتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اسنیڈر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’تمہیں کیا بتایا گیا ہے؟‘‘

"مجھے افغانستان میں بتایا گیا کہ میرے ڈیڈی کا ایک حادثے میں انتقال ہوا لیکن یہاں میجر کا کہنا ہے کہ یہ ایک ڈکیتی بھی ہوسکتی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ حقیقت میں کیا ہوا تھا؟"

"سب سے پہلے کاؤنٹی کا ایک عہدیدار وہاں پہنچا اور اسے ایک حادثہ قرار دے دیا۔" اسنیڈر نے کہا۔ "یہ واقعہ بیک کاؤنٹی میں پیش آیا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک درخت پہلے سے سڑک کے درمیان۔۔۔ پڑا ہوا تھا۔ تمہارے ڈیڈی نے اس سے بچنا چاہا لیکن کنٹرول کھو بیٹھے۔ جس کے نتیجے میں ٹرک ایک کھمبے سے ٹکرایا اور اس میں آگ لگ گئی۔"

"یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟"

"ایلکوما کے شمال میں تقریباً چالیس میل دور۔ کاؤنٹی لائن کے قریب۔"

"سرحد کے نزدیک؟"

"ہاں۔ زیادہ دور نہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔

"اس کے ٹرک میں کیا سامان لدا ہوا تھا؟"

اسنیڈر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "دوائیں۔"

"لیکن اسپرین نہیں؟ تمہارا مطلب تیز دواؤں سے ہے۔ کس قسم کی دوائیں تھیں؟"

"آکسی کونٹین۔" اسنیڈر نے اعتراف کیا۔ "ہائیڈرو کوڈون اور اسی کلاس کی چند دوسری دوائیں۔"

"کیا یہ سامان بھی ٹرک کے ساتھ ہی نذرِ آتش ہو گیا؟"

"ہمیں ابھی تک اس کا یقین نہیں ہے۔ تمہارے باپ کا ٹرک پورا جل گیا۔ مقامی پولیس اس کی راکھ کا کیمیائی تجزیہ کروا رہی ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اور میرے ڈیڈی؟" میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔ "کیا وہ زندہ تھے جب ٹرک میں آگ لگی؟"

"ہم نے ابھی تک یہ معلومات کسی کو نہیں دیں۔" اسنیڈر نے کہا۔ "یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے گی۔ ٹھیک ہے؟"

"اس کا انحصار......" ڈیوس نے کہنا شروع کیا۔

"تم اس سے دور رہو میجر۔" میں نے کہا۔ "یہ ذاتی معاملہ ہے۔"

"ٹرک کے جلنے سے پہلے ہی تمہارے باپ کی موت واقع ہوگئی تھی۔" اسنیڈر نے کہا۔ "کسی نے اس کے سر میں گولی مار دی اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"مرنے کے اس سے بھی زیادہ برے طریقے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ٹرک میں ہی زندہ جل جاتا۔ کتنی گولیاں چلائی گئی تھیں؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ایک درجن یا اس کے لگ بھگ۔"

"واقعی؟"

"ہم نے جائے وقوعہ سے ہتھیار برآمد کرلیا ہے۔" بلیک تھرون نے کہا۔ "اب میں سمجھتا ہوں کہ جواب دینے کی باری تمہاری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں گزشتہ چار سال سے یہاں نہیں تھا اور میری اپنے باپ سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے بھی آتے جاتے ہم ایک دوسرے کو ہیلو یا خدا حافظ کہا کرتے تھے۔ بس میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔"

"تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے؟" بلیک تھرون ناراض ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ جہاں میں رہ چکا ہوں۔ وہاں سوکر اور بزکشی کے ساتھ ساتھ ہائی جیکنگ بھی قومی کھیل ہے۔"

"کیا کہا تم نے۔ بز......؟"

"بزکشی۔ یہ پولو کی طرح کا کھیل ہوتا ہے لیکن اس میں گھڑسوار گیند کے بجائے مری ہوئی بھیڑ کے لیے لڑتے ہیں اور وہاں سے دھواں اٹھ رہا ہوتا ہے۔ جب وہ سامان سرحد سے بیس میل دور تھا تو اسے ایک گھنٹا بعد کینیڈا بھیج دیا گیا اور تم دونوں یہ بات جانتے ہو جو تم مجھے نہیں بتا رہے؟"

"تمہارا باپ ٹرک چلاتا تھا لیکن اس کے بینک اکاؤنٹ میں ساٹھ ہزار ڈالر سے زیادہ کی رقم موجود ہے۔" اسنیڈر نے کہا۔ "کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس نے یہ رقم کہاں سے حاصل کی؟"

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اسے یہ رقم کہاں سے ملی۔ یہ اسے ایک نامعلوم ٹرسٹ کی جانب سے بھیجی گئی تھی اور یونٹ نے اسے میرے لیے جمع کیا تھا۔"

"نامعلوم ٹرسٹ کیوں؟" اسنیڈر نے پوچھا۔

"جب میں اسے نقد رقم کے چیک بھیجتا تو وہ انہیں واپس بھیج دیتا تھا۔ اس لیے اگر تم سمجھ رہے ہو کہ اس کی کوئی ناجائز کمائی تھی تو یہ غلط ہے۔ اسے رشوت لینے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے ناجائز پیسا کمایا۔ شاید اسی لیے اسے مار دیا گیا۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

’’تمہارے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے کہاں سے آئے؟‘‘ اسنیڈر نے پوچھا۔ ’’تم کس یونٹ میں تھے؟‘‘

’’سارجنٹ کو اسپیشل آپریشن دیا گیا تھا۔‘‘ ڈیوس نے کہا۔ ’’اس سے زیادہ بتانا ممکن نہیں۔ اس کے لیے تمہیں اوپر سے اجازت لینا ہوگی۔ اس کے علاوہ کچھ اور پوچھنا ہے؟‘‘

اسنیڈر اور بلیک تھرون نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اسنیڈر نے کندھے اچکا دیے پھر بلیک تھرون مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ’’سارجنٹ! ایک اور بات۔ ہم نے ایک مشتبہ شخص کو اپنی تحویل میں لیا ہے۔ اس کا نام لیچ رچرڈ ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ نام سنا ہے؟‘‘

’’میں کیوں سنوں گا؟‘‘

’’وہ چھ ماہ قبل افغانستان سے آیا ہے۔ شاید تم اسے وہاں سے جانتے ہو۔‘‘

’’ہزاروں فوجی وہاں تعینات ہیں اور وہ بہت بڑا ملک ہے۔ یہ شخص کہاں تعینات تھا؟‘‘

’’یہ اس نے نہیں بتایا۔‘‘

’’لیکن تم سمجھتے ہو کہ اس کا میرے باپ کی موت سے کوئی تعلق ہے۔‘‘ میرا لہجہ قدرے سپاٹ تھا لیکن بیورلی نے اس میں چھپی ہوئی تلخی کو محسوس کرلیا۔ وہ میرے سامنے آتے ہوئے بولی۔

’’تمہیں اس معاملے میں سوچ بچار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پولیس کا مسئلہ ہے۔ اسے ان پر چھوڑ دو۔‘‘

’’میں پریشان نہیں ہوں میجر لیکن مجھے اس بارے میں تجسس ہے۔ لیچ کی کیا کہانی ہے کیپٹن؟‘‘

’’وہ بے گھر ہے اور کئی مہینوں سے سڑکوں یا سایہ دار جگہوں پر رہ رہا ہے۔‘‘ اسنیڈر نے کہا۔ ’’دیکھنے میں بے ضرر معلوم ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ اس کا کوئی پس منظر ہو۔ وقوعہ کی شب ہم نے اسے جائے حادثہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک تباہ شدہ کار میں پایا۔ لگتا ہے کہ اس نے چرائی ہوئی نشہ آور دوا لی اور کار میں جا کر لیٹ گیا۔ ہم امید کررہے تھے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ کچھ بتائے گا۔‘‘

’’پھر اس نے کچھ بتایا؟‘‘

’’صرف اپنا نام، عہدہ اور سیریل نمبر۔‘‘ اسنیڈر نے کہا۔ ’’اس نے کیمپ مینارڈ فون کرکے وکیل کے لیے کہا تھا لیکن اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ شاید وہ اس کی تصدیق کررہے ہیں۔ شاید یہ ایک اور پاگل پن کا کیس ہے۔‘‘

’’ایک اور سے تمہاری کیا مراد ہے؟‘‘

’’کیمپ مینارڈ اب ایک اسپتال میں تبدیل ہو چکا ہے۔‘‘ اسنیڈر نے وضاحت کی۔ ’’جہاں زخمی فوجیوں اور دوسرے لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔‘‘

’’ذہنی مریض۔‘‘ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

’’شاید وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی پاگل پن کا مظاہرہ کرے۔‘‘

’’وہ ایسا کیوں کرے گا؟‘‘

’’جیسا کہ تم نے کہا کہ ہم دونوں حال ہی میں افغانستان سے آئے ہیں اور تم تو جانتے ہو کہ وہاں سے آنے والے بالعموم ذہنی مریض ہوتے ہیں۔‘‘

ایلکوما کا پولیس اسٹیشن کاؤنٹی کورٹ ہاؤس کے تہ خانے میں تھا۔ کنکریٹ کی دیواروں پر سلیٹی رنگ کیا گیا تھا۔ وہاں چند پرانی لوہے کی میزیں رکھی ہوئی تھیں اور عقبی دیوار میں چار کوٹھریاں تھیں جن میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دو کوٹھریوں میں قیدی نظر آرہے تھے ان میں سے ایک نیلے سوٹ میں ملبوس کوئی کاروباری شخص تھا۔ وہ کافی خوف زدہ اور بیمار لگ رہا تھا۔ غالباً اس پر کوئی سنجیدہ نوعیت کا الزام تھا۔ سامنے والی کوٹھری میں لیچ جینز اور ڈینیم کی جیکٹ پہنے ہوئے موجود تھا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا اور دو جگہ زخموں پر ٹانکے لگے ہوئے تھے جبکہ دائیں آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں اس کی کوٹھری کی طرف بڑھا تو اسنیڈر نے کہا۔ ’’زرد لائن سے پیچھے رہو سارجنٹ۔ اس کے قریب جانے کی ضرورت نہیں اور اونچی آواز میں بات کرو تاکہ ہم بھی سن سکیں کہ یہ کیا کہتا ہے۔‘‘

’’کوئی مسئلہ نہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اس نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟‘‘

’’لیچ رچرڈ۔‘‘ بلیک تھرون نے کہا۔ ’’میں تمہیں اس کا سیریل نمبر بھی بتا سکتا ہوں۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں۔‘‘ میں نے حوالات کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں تمہیں کس نام سے پکاروں دوست کیونکہ تم یقیناً لیچ رچرڈ نہیں ہو۔ ہمیں تربیت کے دوران ایسے ہی فرضی نام دیے جاتے ہیں۔ تمہارے ساتھی کس نام سے پکارتے تھے؟‘‘

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے لگا کہ دیوار سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

باتیں کرر ہا ہوں۔ البتہ اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

’’ٹھیک ہے۔ تم مجھ سے بات مت کرو رچرڈ، صرف میری بات سنو، جب تمہیں عقل آئے گی اور محسوس کرو کہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے بولنا ضروری ہے۔ اس وقت میرے علاوہ کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ ہم دونوں اسپیشل آپریشن میں کام کر چکے ہیں۔ اس لیے تم جانتے ہو کہ میں راز کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟‘‘

اس نے روکھے پن سے اپنا سر ہلایا اور زور سے جُھرجُھری لی جیسے وہ مجھے کچھ بتا کر کسی قانون کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس کے اس انداز نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔

’’یہ آخری موقع ہے دوست۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے کچھ بتا دو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے اپنے تک ہی رکھوں گا۔‘‘

اس نے اپنے سر کو ٹیڑھا کیا اور مجھے تجسس سے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔ وہ مجھے یا کسی اور کو کچھ نہیں بتائے گا اور اس سے پہلے ہی مر جائے گا۔

میں نے دل میں کہا کہ دفع کرو اور اپنا منہ پھیر لیا۔

’’ووف؟‘‘ اس نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

میں واپس مڑا۔ ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں ملیں اور اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔

’’یہ کیا تھا؟‘‘ اسنیڈر نے پوچھا۔ ’’اس نے کچھ کہا؟‘‘

’’میں نے کچھ نہیں سنا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’رچرڈ کیا تم نے کچھ کہا؟‘‘

لیکن وہ میرے عقب میں کھڑی ڈیوس کو غصے سے دیکھ رہا تھا پھر اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ’’میجر!‘‘

’’تم میجر سے بات کرنا چاہتے ہو؟‘‘ اسنیڈر نے پوچھا۔ ’’ہم اس کا انتظام کر سکتے ہیں۔‘‘

لیکن رچرڈ سلاخوں سے پیچھے ہٹ چکا تھا۔ وہ اپنی کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں رانوں پر رکھ کر گنگنانا شروع کر دیا۔ جب ہم واپس ہونے لگے تو اس نے ہمیں دیکھا تک نہیں۔

’’اس نے تم سے کیا کہا تھا؟‘‘ اسنیڈر نے دوبارہ پوچھا۔

’’کچھ نہیں۔‘‘

’’کیا ہم واپس چرچ چلیں؟‘‘ ڈیوس نے پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے پوچھا۔

’’کس لیے؟‘‘

’’چند منٹوں بعد رسومات شروع ہونے والی ہیں......‘‘

’’وہاں کسی کو میری کمی محسوس نہیں ہو گی۔ کم از کم ڈیڈی کو تو بالکل نہیں۔ کیا تم جانتی ہو کہ یہ حادثہ کس جگہ پیش آیا تھا؟‘‘

’’ہاں، مجھے وہ جگہ معلوم ہے۔‘‘

’’بہت اچھے۔ مجھے وہاں لے چلو۔‘‘

’’جائے وقوعہ پر، کیوں؟‘‘

میں جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہا۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئی۔

’’کیا کوئی گڑبڑ ہے سارجنٹ؟‘‘

’’لیچ نے تمہارا نام لے کر پکارا تھا۔‘‘

’’وہ واضح طور پر نا قابلِ اعتبار ہے۔‘‘

’’تمہاری عمر کتنی ہے میجر؟‘‘

’’میں کچھ سمجھی نہیں۔‘‘

’’یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے۔‘‘

’’یہ اتنا شائستہ بھی نہیں۔‘‘

’’کسی نے میرے باپ کے سر میں گولی مار دی خاتون۔ ہم شائستگی کی حدود پار کر چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تمہاری عمر تیس کے لگ بھگ ہے اور اس عہدے کے لیے تم بہت چھوٹی ہو۔ تم ابھی لیفٹیننٹ سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ تمہارے پاس ضرور کوئی اعلیٰ ڈگری ہو گی۔‘‘

’’میں نے نفسیات میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ میں فارنسک سائیکالوجسٹ ہوں۔ میں نے پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر میں اسپیشلائز کیا ہے۔‘‘

’’میں جانتا ہوں۔ ہماری یونٹ کے لوگوں کو ہر تیس دن بعد اس مرحلے سے گزرنا ہوتا تھا۔ مجھے ہمیشہ ڈیوٹی پر جانے کے لیے کلیئرنس مل گئی اور مجھ سے کبھی اس بارے میں سوالات نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ بات میرے آنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔‘‘

ڈیوس ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے تمہارا ریکارڈ دیکھ لیا تھا جو کہ مثالی ہے۔ تمہارے کپتان کا کہنا ہے کہ تم بہترین فائٹر ہو لیکن بہت زیادہ دباؤ کی کیفیت میں گھر آرہے ہو۔‘‘

’’دباؤ نہیں غم۔‘‘ میں نے تصحیح کی۔ ’’اگر کسی دوست کو

اپنے سامنے گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھیں تو وہ دباؤ ہوتا ہے۔''

''اور باپ کی موت......؟''

''یہ ایک مشکل وقت ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن حیرت ہے کہ تم شہری لباس میں ہو۔ اس کے باوجود لیچ نے تمہیں میجر کہہ کر مخاطب کیا۔ وہ تمہیں جان گیا۔ کیا وہ تمہارا مریض رہ چکا ہے؟''

''ہاں، کچھ عرصے کے لیے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''وہ بہت پہلے وہاں سے چلا گیا تھا۔''

''اور تم نے اسے جانے دیا؟''

''وہ اسپتال ہے جیل نہیں جوش۔ کچھ لوگ شہری زندگی میں ایڈجسٹ ہونے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔''

''لیچ نے اپنے آپ کو جیل کی کوٹھڑی میں ایڈجسٹ کرلیا ہے اور اسے کار کے حادثے میں چوٹیں نہیں آئیں۔ لگتا ہے کہ کسی نے اسے بُری طرح مارا ہے۔''

''پولیس؟''

''نہیں، اس کے ہاتھوں یا بازوؤں پر کوئی خراش یا زخم نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب اسے پیٹا گیا تو وہ بے ہوش تھا۔ ایسی صورت میں وہ اس کار کو نہیں چلا سکتا تھا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ اسے کسی نے ضرب لگا کر بے ہوش کیا اور اسے جائے حادثہ کے قریب پھینک دیا گیا۔ اسے پھنسایا گیا ہے میجر۔''

''پھر وہ کچھ بتا کیوں نہیں رہا؟''

''کیونکہ اس کی تربیت ہی اس طرح ہوئی ہے کہ وہ مزاحمت کرے اور یقین کرو کہ اسپیشل آپریشنز کی تربیت اس کوٹھری کے مقابلے میں کہیں مشکل ہے۔ کیا وہ اسپیشل آپریشنز میں رہ چکا ہے؟''

اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔ ''ہاں۔''

''یہ اسی تربیت کا اثر ہے کہ وہ کچھ نہیں بتا رہا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' ڈیوس نے کہا۔ ''اس نے تم سے کچھ کہا تھا۔''

''اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔''

''اس نے کتے کے بھونکنے کی آواز نکالی تھی، کیوں؟''

''جو لوگ طویل عرصے تک افغانستان جیسے محاذ پر رہتے ہیں۔ ان کے درمیان اس طرح کا مذاق چلتا ہے۔ ہم لوگ جنگ میں لڑنے والے کتوں کی طرح ہی ہیں۔''

میں کہتے کہتے رک گیا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوہ میرے خدا! تم اسی لیے میرے ساتھ ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ کہیں میں بھی بیلگائن نہ بن جاؤں۔''

''بیلگائن؟ یہ تم کس کے بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''جنگ میں استعمال ہونے والے کتے۔ یہ غیر معمولی صلاحیت اور جارحانہ مزاج رکھتے ہیں۔ ایک بار ان کے منہ کو خون لگ جائے تو یہ پاگل ہو جاتے ہیں اور انہیں اجنبیوں بالخصوص بچوں کی موجودگی میں پٹا ڈال کر رکھنا پڑتا ہے۔''

''مجھے اب تک اس کے بھونکنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کیسا مذاق تھا؟''

''بات یہ ہے کہ جب ایک کتے کو سنبھالنے والے کا کام ختم ہو جائے تو وہ واپس امریکا آجاتا ہے اور اس کا کتا کسی دوسرے سپاہی کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور ہم اس کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر کسی اور پر بھروسا نہیں کرتے۔ تم اسی لیے یہاں آئی ہو کہ کہیں میں بیلگائن نہ ہو جاؤں۔''

''تم کتے نہیں ہو سارجنٹ۔''

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کتا ہی ہوتا۔ ان کی آنکھیں بہت تیز ہوتی ہیں اور وہ ہم سے کئی گنا بہتر سنتے ہیں۔ اگر بیلگائن گولی چلا سکتے تو ہم سب گھر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے۔''

''لیکن تمہارا کوئی گھر نہیں۔''

''نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟''

''آج کل یہی طریقہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں سپاہی اٹھارہ ماہ تک محاذ پر رہے جبکہ تمہاری یونٹ دس سال سے افغانستان میں لڑ رہی ہے جس کی وجہ سے جنگ کی تھکاوٹ، لڑائی جھگڑے، گھریلو تشدد، یہاں تک کہ خودکشی جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم اسی لیے وہاں سے آنے والوں کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے ہیں جن میں بات چیت سے لے کر دواؤں کا استعمال تک شامل ہے۔ تم کیونکہ ہنگامی طور پر یہاں آئے ہو۔ اس لیے تم نے تمام حفاظتی انتظامات نظر انداز کر دیے اور تمہارے باپ کی دردناک موت کو دیکھتے ہوئے......''

''گویا تم کتے کو سنبھالنے والی ہو؟''

''بالکل نہیں...... میں صرف......''

''مدد کرنے آئی ہو۔ میں سمجھ گیا۔ یہ بتاؤ کہ اب تک میرا رویہ کیسا ہے؟''

اس نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی بلکہ پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ کوئی اہم بات ہے جو وہ مجھ سے جاننا چاہ رہی ہے۔ کار کی رفتار آہستہ ہوئی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ہم بیک کاؤنٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ میری نظر ایک درخت کے تنے پر گئی جو ایک گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جس کی تصویر میں اخبار میں دیکھ چکا تھا۔

''یہیں روک دو۔'' میں گاڑی سے اتر کر اس جانب چل دیا۔ درخت کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ زمین پر شیشے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں وہاں جا کر رک گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حادثہ پیش آیا تھا۔ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں میرے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ میں گھٹنوں کے بل جھک کر خشک گھاس پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ میرے ہاتھ میں شیشے کے چند ٹکڑے آ گئے۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' ڈیوس نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''زمین کو دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے بڑی صفائی سے کام کیا۔ پہلے درخت کا تنا سڑک کے درمیان میں رکھا اور ایک اونچی جگہ پر دوربین لگا کر بیٹھ گئے جب انہوں نے ڈیڈی کے ٹرک کو آتے ہوئے دیکھا تو ان میں سے ایک نے درخت کے تنے پر پوری لمبائی میں مٹی کا تیل چھڑک دیا اور اسے آگ لگا دی۔ اس طرح سڑک مکمل طور پر بند ہو گئی۔ ڈیڈی کو رک جانا چاہیے تھا لیکن وہ آگ اور دھوئیں سے آگے کچھ نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے کوشش کی کہ جلتے ہوئے درخت سے ہٹ کر ٹرک کو نکال لیں لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار بیٹھے ہوئے تھے۔''

میں نے نظر گھما کر دیکھا اور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس جگہ گولی چلانے والا چھپا ہوا تھا جبکہ دوسری جھاڑی میں اس کا ایک اور ساتھی بھی تیار بیٹھا تھا اگر پہلے کا نشانہ چوک جاتا تو وہ گولی چلا دیتا۔''

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟''

میں نے اپنی ہتھیلی کھول کر اسے چمکتے ہوئے شیشے کے ٹکڑے دکھائے۔ ''پولیس نے زیادہ تر ٹکڑے اکٹھے کر لیے لیکن اب بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ ایک سنگل اسپائیڈر ویب تھی، جو گولی چلائی گئی اس سے غالباً فوراً ہی ڈیڈی کی موت واقع ہو گئی کیونکہ ٹرک سڑک کے کنارے تنگ جگہ پر آگے بڑھتا گیا جہاں میدان ختم ہوتا ہے، اگر وہ ہوش میں ہوتے تو ٹرک کو واپس گھما سکتے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک طرف لڑھک جاتا۔''

''اور پھر اس میں آگ لگ گئی۔''

''نہیں، اس وقت نہیں۔ ڈیزل فوراً ہی آگ نہیں پکڑتا۔ پہلے انہوں نے ٹرک کا سامان کسی دوسرے ٹرک میں منتقل کیا جس پر کینیڈا کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی اور جو کسی شبہے کے بغیر سرحد پار کر سکے پھر انہوں نے ڈیڈی کے ٹرک کو آگ لگا دی اور بے چارے پیچ کو چند میل دور کھڑی ہوئی کار میں ڈال دیا۔''

''پولیس کا خیال ہے کہ وہ بھی اس میں شامل تھا۔ تم نے جو کچھ بتایا وہ ملٹری آپریشن جیسا لگتا ہے۔''

''یہی بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی۔ انہوں نے درخت گرانے کے لیے سی فور کا استعمال کیا پھر انہوں نے فوجی اسلحہ اور بارود استعمال کیا جس کا آسانی سے سراغ لگایا جا سکتا ہے جبکہ وہ کوئی نامعلوم شکاری بندوق بھی استعمال کر سکتے تھے۔ انہوں نے قانون کی توجہ حاصل کرنے کے لیے سرحد سے کچھ فاصلے پر ٹرک کو آگ لگائی اور آخر میں پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے پیچ کو وہاں چھوڑ دیا۔''

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ......''

''کیونکہ پیچ اسپیشل آپریشنز میں رہ چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اپنی طرف بڑھنے والے خطرے سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ اس سارے معاملے میں پیچ کو نہیں بلکہ ٹرک میں لدے ہوئے سامان کو اہمیت حاصل ہے۔ کمپنیاں اس طرح کے سامان کی پہلے سے پبلسٹی نہیں کرتیں۔ پیچ حال ہی میں افغانستان سے آیا ہے، وہ بھی نہیں جان سکتا کہ کس ٹرک میں کیا سامان جا رہا ہے یا کینیڈا کی سرحد پر کون سی گاڑی کو چیک نہیں کیا جائے گا۔ یہ کوئی مقامی شخص تھا جس کے پاس راستے اور سامان کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔''

''تمہارا خیال ہے کہ تم اسے جانتے ہو؟''

''مجھے معلوم ہے کہ کس سے پوچھنا چاہیے۔ اس کا نام مسٹر کیلس ہے اور وہ ڈیڈی کے ساتھ کام کر چکا ہے اور ہمیشہ سے ان ٹرکوں کی نقل و حرکت میں ملوث رہا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اس بارے میں نہ جانتا ہو۔ اگر وہ اس حملے میں شامل نہیں تو یہ ضرور جانتا ہو گا کہ کس نے یہ کیا ہے۔''

یہ سنتے ہی ڈیوس غصے میں آ گئی اور اس نے اپنی جیکٹ سے ایک سیل فون نکال لیا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کیپٹن اسنیڈر کو فون کر رہی ہوں۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''نہیں۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے فون چھینتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے فون نہیں کرو گی۔ اگر انہوں نے اسے پکڑ لیا تو وہ کسی وکیل کی خدمات حاصل کرے گا اور اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دے گا۔ وہ کینیڈا بھاگ جائیں گے اور چھ مہینے بعد واپس آکر اپنا کام شروع کر دیں گے لیکن اگر میں اس سے بات کروں گا تو وہ مجھے ان کے نام بتا دے گا اور یہ کہ میں انہیں کہاں تلاش کر سکتا ہوں۔''

''یہ امریکا ہے سارجنٹ، اس طرح تم یہاں لوگوں کو قتل نہیں کر سکتے۔''

''ہم نے اپنے ملک کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانے کا عہد کر رکھا ہے۔ یہ اندرونی دشمن ہے اور اس سے لڑنا جائز ہے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے میجر۔ مجھے انہی لوگوں کے خلاف لڑنے کی تربیت دی گئی ہے اور میں تمہارا مریض بھی نہیں ہوں۔''

''تم مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو اور گزشتہ آٹھ سال سے تمہارا قریب سے معائنہ کیا جا رہا ہے۔ تم نے خود ماہانہ چیک اَپ کے بارے میں بتایا تھا۔''

''شاید جنگ میں مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے میرا معائنہ ہوتا تھا ورنہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔''

''تم نہیں سمجھ سکو گے۔ تمہارا کردار غیر سماجی ہے اور تمہارا کوئی ایک عضو درست کام نہیں کر رہا۔ یہ بات پہلی بار تمہاری اسپیشل آپریشن کی تربیت کے دوران نوٹ کی گئی۔''

''یہ غلط ہے۔ میں نے وہ تربیت کامیابی سے مکمل کی تھی اور کلاس میں اول رہا اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو وہ مجھے نکال دیتے۔''

مجھے یوں لگا جیسے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تم اس کیفیت کو کوئی بھی نام دو لیکن افغانستان میں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ہمیں جنگ میں استعمال ہونے کے لیے بہتر کتے بناتی ہے۔ ہم واقعی بیلگائن ہیں جو گولی بھی چلا سکتے ہیں۔''

''مجھے افسوس ہے سارجنٹ......''

''نہیں کوئی بات نہیں۔ میں نے اس کی معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سچ سن کر مجھے سکون ملا ہے۔ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ دوسروں سے مختلف ہوں۔''

''نہیں۔'' وہ مضبوطی سے میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں طویل رخصت کی ضرورت ہے۔ میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم ایک بار پھر معمول کی زندگی گزارنے لگو گے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں چند ہفتوں کی چھٹی پر ہوں۔ کل ہی اسنیڈر کو فون کر کے بتاؤں گا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ وہ خود اسے دیکھ لے گا۔''

''یہی صحیح طریقہ ہے۔'' وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہمارا نہیں، اس کا کام ہے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا۔ اگر تم برا نہ مناؤ تو فی الحال میں کچھ وقت یہاں گزارنا چاہتا ہوں اپنے ڈیڈی کے ساتھ۔''

''میں تمہیں اس طرح یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنے ایک دوست کو فون کروں گا۔ وہ مجھے آکر لے جائے گا۔ اب میں اپنے وطن میں ہوں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔''

''میں جانتی ہوں لیکن......'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں یقین ہے کہ ٹھیک رہو گے؟''

''بالکل۔ میرا خیال رکھنے اور سچ بتانے کا شکریہ میجر کہ میں کس قسم کا کتا ہوں؟''

''تم کتے نہیں ہو......'' اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

''جانے دو میجر، میں مذاق کر رہا تھا۔''

اس نے مجھے آخری بار غور سے دیکھا اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اوبر کے لیے فون کیا تاکہ تدفین میں شرکت کر سکوں۔ کیلس ضرور یہ جاننا چاہے گا کہ پولیس نے مجھ سے کیا پوچھا۔ میں اسے تنہائی ملنے پر سب کچھ بتا دوں گا اور اسے بھی مجھے بتانا ہوگا کہ میرے باپ پر حملہ کرنے والا کون تھا اور وہ مجھے کہاں ملے گا۔ اسے اپنی زندگی بچانے کے لیے سب کچھ بتانا ہوگا۔

اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں ان لوگوں سے اپنا حساب چکانے کے بعد دوبارہ پہاڑوں پر چلا جاؤں گا۔ میجر کو ڈر تھا کہ اس نے میرے بارے میں جو سچ بولا، وہ میری زندگی برباد کر دے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھی۔ اس سچ نے مجھے آزاد کر دیا۔ میں بالآخر اٹھائیس سال کی عمر میں جان گیا ہوں کہ میں صحیح معنوں میں کیا ہوں۔ میں بیلگائن ہوں۔ جنگ میں استعمال ہونے والا کتا۔ اور اب میرا پٹا کھل گیا ہے۔ کسی نہ کسی کو تو رونا ہی پڑے گا۔ تباہی اس کا مقدر ہے۔ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ مجھے اپنے باپ کے قاتل کا پتا چل گیا ہے اور وہ کیلس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 41

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو تلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا

ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچادیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِنگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو تلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچادیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹربوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کرلے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لالچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کراکر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کی حویلی کی تلاشی لیتے ہیں مگر وہاں نہ شاہ نواز ملتا ہے نہ طلسم نور ہیرا۔ واپسی میں شہزی رینجرز کی تحویل سے فرار ہوجاتا ہے اور چھپتا چھپاتا شاہ نواز کی حویلی پہنچتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بلاشبہ اندر کا منظر میرے لیے چونکا دینے والا تھا۔

وہ کوئی سیاہ گھیر والی شلوار قمیص میں ملفوف تھا اور ہاتھ میں سیاہ پستول تھا۔ اس کی نال کا رخ صالح جان کی طرف تھا جو صوفے پر لڑھکا ہوا تھا اور اس کی پیشانی سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی جبکہ اس کا سیل فون نیچے قالین پر گرا نظر آرہا تھا۔ میری نظر پستول بدست پر جمی ہوئی تھی۔

''کون ہوسکتا تھا یہ؟'' میرے سنسناتے ہوئے ذہن میں ایک ہی سوال نے گردش کی۔

''پریل کے گروہ کا کوئی ساتھی؟''

یہ جواب میں نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہ مجھے بعید از قیاس لگا۔ اول تو اس کے گروہ کے کسی ساتھی کا میرے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا جبکہ پریل بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یوں میرا اب اس ڈاکو گروہ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہ رہا تھا، سونہڑیں اپنے باپ کے پاس پہنچا دی گئی تھی اور وہ اپنی بیٹی اور غالباً گھر والوں سمیت کہیں غائب تھا۔

''تو پھر کون تھا یہ......؟''

ایک ہی خیال سجھائی دیا کہ ضرور یہ صالح جان کا ہی کوئی دشمن ہوگا، مگر اگلے ہی لمحے میرا یہ خیال بھی از خود ہی باطل قرار پایا جب میں نے اس کی آواز سنی۔

''خبردار...... اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو...... اِدھر ہی ہلاک کر دیے جاؤ گے۔''

یہ شیرنی کی طرح غراتی ہوئی آواز شکیلہ کی تھی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی جواز میرے ذہن میں تیزی سے آئے اور نکل گئے۔

''مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔'' وہ پھر غرائی۔ ''قیدیوں کو کہاں رکھا گیا ہے؟'' شکیلہ ہلکی آواز مگر غصیلے لہجے میں مخاطب تھی مگر مجھ تک بھی اس کی آواز آ رہی تھی۔ وجہ رہی ہوگی کہ میں اس پر دھیان دیے ہوئے تھا اور دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

''قیدیوں'' سے اس کی مراد یقیناً مجھ سمیت ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے ہی ہو سکتے تھے۔

''مجھے نہیں پتا...... میں تو خود مہمان ہوں یہاں......''

بالآخر صالح جان نے جواب دیا۔ لہجے اور آواز سے ذرا بھی خوف کا شائبہ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

شکیلہ کو ہی نہیں بلکہ مجھے صالح جان کی اس چالاکی پر سخت طیش آیا تھا۔ میں تو خود صالح جان کو اسی مقصد کے لیے چھاپنے آیا تھا مگر شکیلہ خود یہاں آ پہنچی تھی اور جانے اب تک وہ کہاں گھات لگائے چپکی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا اپنا لباس نہیں تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا وہ مردانہ شلوار قمیص میں ملفوف تھی جو اس نے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ہی پہنا تھا اور یقیناً کسی سے چھینا ہوا ہی لگتا تھا۔

اب میرا یہاں زیادہ دیر دبکے رہنا مناسب نہ تھا جبکہ شکیلہ بھی ایک طرح سے آزاد ہی تھی اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی بھی ضرورت تھی، لہٰذا میں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ شکیلہ آہٹ پا کر...... بری طرح چونک کے میری طرف پلٹی اور یہی مجھ سے بھی غلطی ہو گئی کہ صالح جان نے موقع پا کر بڑی غیر معمولی اور بروقت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، صوفے پر پڑے پڑے اس کے پستول والے ہاتھ پر اپنی ٹانگ چلا دی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا پڑا۔

میری اچانک آمد پر صالح یہی سمجھا تھا کہ اس کا کوئی آدمی یا ملازم بے خیالی میں اندر گھس آیا ہے اسی لیے اس نے میری طرف گردن اور نظر اُٹھا کر دیکھا تھا مگر تب تک شکیلہ اور بعد میں صالح جان مجھے پہچان چکے تھے۔ صالح جان کے لیے تو یہ صورتِ حال یک نہ شد دو شد والی بات تھی جبکہ شکیلہ تو مجھے دیکھ کر مسرت بھرے انداز میں چونک اٹھی تھی۔

صالح جان نے دوبارہ پھرتی دکھائی اور صوفے سے چھلانگ لگا کر ایک دوسرے دروازے کی طرف لپکا۔

''شکیلہ! پکڑو اِسے...... جانے نہ پائے......'' میں چیخا۔ صالح جان کے کامیاب وار کے بعد وہ بھی اس کی جانب پلٹی تھی، لیکن تب تک صالح جان اندرونی گوشے میں کھلنے والے اس دروازے کے قریب جا پہنچا تھا جبکہ اس کی جانب چھلانگتے ہوئے میں اور شکیلہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹکرا کر قالین پر گرے تھے۔ مگر اُٹھنے میں ہم نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا۔

صالح جان اس لمحے کو موقع غنیمت جان کر اب چیختا چلاتا دوڑا تھا، تاکہ حویلی کے ملازمین وغیرہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ میں اور شکیلہ اسی دروازے سے دوسرے گوشے کی طرف نکلے تو صالح جان کو ایک موٹی سی ادھیڑ عمر عورت سے ٹکرا کر گرتے پایا۔ وہ عورت کوئی ملازمہ لگتی تھی۔ اس نے بوکھلا کر چیخ ماری اور ایک طرف کو لڑھک گئی۔ صالح جان اسے گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور اسی وقت میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس پر گرتے ہی میں اسے رگیدتا ہوا دوبارہ فرش پر لے آیا۔ وہ میرے قابو میں آ چکا تھا مگر بدقسمتی یہ ہو گئی تھی کہ اس کم بخت کے شور شرابے سے حویلی میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ حویلی میں صرف ملازمین کی فوج ہی نہیں تھی بلکہ مسلح افراد بھی تھے جو زیادہ تر باہر پہرے پر تھے مگر انہیں اندر آنے میں بھلا کتنی دیر لگنی تھی۔ مجھے ایک بات کا پچھتاوا تھا، شکیلہ کا گرا ہوا پستول نہیں اُٹھا سکا تھا اور نہ ہی شکیلہ نے اس طرف کوئی توجہ دی تھی۔ اب اگر شاہنواز خان کے مسلح آدمیوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو صورتِ حال سنگین ہو سکتی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ تھانے فون بھی کھڑکا دیا جاتا اور میں اب

تک اس بدطینت تھانہ انچارج رجب دین کو کہاں بھولا تھا۔ جو ہنوز زمیندار شاہنواز خان کی پشت پناہی کرنے میں مصروف تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب میں مغلوب صالح جان پر جھپٹا تھا، کمرے میں دو مسلح افراد گنز سیدھی کیے داخل ہوئے تھے۔ یہ دونوں خاصے قدآور اور تومند تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں اور وحشت بھری آنکھوں کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ حویلی میں اپنے دشمنوں کو اس طرح گھستے پا کر یہ دونوں غیرت وجوش میں پاگل ہو رہے تھے۔

”شکیلہ......! اس طرف ہو جاؤ......“ میں نے چلّا کر کہا۔ شکیلہ اشارہ بھانپ گئی اور میرے عقب میں ہو گئی۔ اب میں اور صالح جان ان دونوں مسلح آدمیوں کی اُٹھی ہوئی گنز کی زد میں تھے۔

”خبردار! اپنی بندوقیں پھینک دو...... ورنہ ایک ہی جھٹکے سے اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔“ میں نے غضب ناک لہجے میں ان کی طرف گھور کر کہا۔ صالح جان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہونے لگی تھیں۔ اس نے میری آہنی گرفت سے نکلنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ وہ دونوں اسلحہ پوش بھی اس گرفت کی خطرناکی سے واقف تھے، جس میں محض ایک سیکنڈ کے اندر اندر ایک ذرا جھٹکا دیتے ہی مدِمقابل کی گردن کا منکا ٹوٹ جاتا ہے۔

”چھوڑ دو اِس کو...... تم بچ کر نہیں جا سکتے۔“ ان میں سے ایک خونخوار غراہٹ سے بولا۔

”میرے سر پہ خون سوار ہے اِس وقت......“ میں پھر وحشیانہ لہجے میں غرایا۔ ”آخری بار کہہ رہا ہوں...... اس کے بعد یہ گیا۔“ کہتے ہوئے میں نے صالح جان کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ کراہا...... دونوں اسلحہ بدست قہرناک انداز میں اپنے دانت پیس کر رہ گئے، اس میں بے بسی کا عنصر غالب تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اکڑے ہوئے تھے اور وہ محض ان کی اُنگلیوں کو حرکت دے رہا تھا۔

”ہمیں بس یہاں سے نکلنے دیا جائے، ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے، باہر نکلتے ہی ہم اِسے چھوڑ دیں گے۔“ میں نے انہیں متذبذب پا کر دوبارہ کہا اور پھر صالح جان کی گردن سے گرفت ذرا ڈھیلی کی تو اس نے بھی پھنسی پھنسی آواز میں انہیں میری بات مان لینے کا حکم دیا۔

وہ دونوں اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کر ایک طرف ہو گئے۔ میں نے شکیلہ کو اشارہ کیا اور ہولے سے کچھ کہا۔ اس نے تیزی سے پہلے صالح جان کا گرا ہوا پستول اور قالین پر لڑھکا پڑا اسیل فون اُٹھا لیا۔ اس کے بعد ہم کمرے سے نکل گئے۔ میری ہدایت پر شکیلہ نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ راہداری میں چند اور لوگ بھی جمع تھے۔ میں انہیں چلّا چلّا کر راستہ چھوڑنے کا کہتا رہا اور پھر ہم حویلی سے باہر آ گئے۔ ایک جگہ کار کھڑی تھی جو مجھے اسی کی لگی تھی۔

میں نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر صالح جان کی تلاشی لی تو کار کی چابی اس کے پاس سے برآمد ہو گئی۔

میں نے بدستور صالح جان کو ڈھال بنا رکھا تھا اور میری عقابی نظریں تیزی کے ساتھ گرد و پیش میں متحرک تھیں۔ پستول شکیلہ نے تھام رکھا تھا۔ اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر قبضہ جمایا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔ میں صالح جان کو لیے عقبی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ شکیلہ نے ایک طوفانی جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

پستول شکیلہ سے میں نے لے لیا تھا۔

”کسی دور ویرانے میں لے چلو اور جب تک میں نہ کہوں، کار مت روکنا۔ بیک ویو پر نظریں ڈالتی رہنا کوئی ہمارے تعاقب میں نہ آ رہا ہو۔“ میں نے شکیلہ سے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا اور اس کے بعد صالح جان کو آزاد چھوڑ دیا۔

وہ چند ثانیے اپنی گردن سہلاتا رہا اور پھر غصے سے بولا۔ ”تمہارا کام ہو گیا ہے...... اب چھوڑ دو مجھے...... ورنہ پچھتاؤ گے بہت......“ میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا۔ اس کے ہونٹ کا کونا پھٹ گیا اور وہاں سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔ وہ کراہ کے رہ گیا۔

”اپنی زبان بند رکھو اور صرف میرے سوال کا جواب دو...... شاہنواز چوہے کی طرح کہاں چھپا ہوا ہے؟“

”بتایا تو تھا کہ وہ جامشورو گیا ہوا ہے۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بیک وقت، خوف اور پریشانی کی جھلک بھی مترشح ہونے لگی تھی۔

”تمہارا یہ جھوٹ میں رینجرز والوں کے سامنے پہلے بھی سن چکا ہوں...... لیکن اب میں تمہاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے قہرآلودہ لہجے میں کہا۔

”تم نے شاہنواز سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا شے ہے۔“ صالح جان پر ابھی تک شاہنواز کی طاقت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ میں دانت پیس کر بولا۔

”ٹکر ہم نے نہیں، اس نے ہم سے لی ہے اور یاد رکھنا معمولی لوگ ہم بھی نہیں ہیں۔ تمہارا یہ شاہنواز کوئی بڑی شے ہوتا تو اس طرح چوہے کی طرح چھپنے کے بجائے ہمارے سامنے آتا۔ اب میں صرف سچ سنوں گا، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ...... ہم شاہنواز سے خود ہی نمٹ لیں گے۔“ میں نے آخر میں سفاکی سے کہا اور شکیلہ کو ایک ویران جگہ پر کار روکنے کا کہا۔

ہمارے اطراف میں بنجر ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم آبادیوں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کسی نے ہمارے تعاقب میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر وہاں کوئی اور گاڑی موجود نہیں تھی۔ شاہنواز کی لمبی چوڑی جیپ بھی میں نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔

شکیلہ نے کار ایک ٹیکری کے قریب لے جا کر روک دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور صالح جان کو گردن سے دبوچ کر باہر نکالا اور زمین بوس کر دیا۔

دن چڑھنے لگا تھا اور گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ فضا میں حبس بھی تھا۔

”بس، صالح جان! اب جھوٹ نہیں چلے گا...... ہمیں صرف اپنی ساتھی ارم اور اس کے دونوں بچوں کی تلاش ہے...... شاہنواز سے بھی ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوگا...... بولو کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ...... یا پھر اس ویرانے میں تمہاری لاش چھوڑ کر ہم کوئی اور راستہ دیکھیں۔ میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔“

”جامشورو چلے چلو، وہاں تمہاری ملاقات میں......“ اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا، دوسرے ہی لمحے میرا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ بھربھری مٹی والی زمین پر بری طرح لڑکھڑا کر گرا، میں آگے بڑھا اور اس کی گردن پر اپنا بھاری بوٹ رکھ دیا۔

”بس صالح جان! تم نے جتنا بولنا تھا، بول لیا...... اب چھٹی کرو......“

”شکیلہ! کار کی ڈکی سے کوئی بھاری آہنی شے نکالو...... میں اس کے سر کا کچومر بنانا چاہتا ہوں، گولی میں نہیں مارنا چاہتا، اس طرح اسے موت کی اذیت کا احساس نہیں ہوگا، جلدی کرو، وقت نہیں ہے ہمارے پاس......“

شکیلہ نے ایسا ہی کیا اور پھر ایک بھاری پانا نکال لائی۔ وہ میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں، میں نے پستول پینٹ کی بیلٹ میں شرٹ کے نیچے اُڑس لیا اور پوری قوت سے بھاری پانے کی ضرب صالح جان کے سر پر رسید کرنا چاہی...... اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ وہ تیزی سے تڑپ کر ہٹا تھا۔ بھاری پانے کی زوردار ضرب زمین پر پڑی تھی۔ میں نے یہ دانستہ حرکت کی تھی کہ وہ خود کو ضرب سے بچا لے...... اور یہی ہوا تھا، میں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پانے کی ضرب اس کے سر پر رسید کرنا چاہی تو اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔

”ٹھٹ...... ٹھہرو...... مم...... میں بب...... بتاتا ہوں......“ وہ گھگیا کر بولا۔

”میں صرف سچ سنوں گا اور یاد رکھنا...... اس کی تصدیق بھی تم سے ہی کرواؤں گا۔“

”وہ...... وہ اسی گوٹھ میں ہے۔“

”اس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ یہ بتاؤ کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ...... اور کیا ہماری ساتھی لڑکی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی اسی کے قبضے میں ہیں؟“

”ہاں!“

”وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔“

”وہ...... وہ...... میری ہی رہائش گاہ پر ٹھہرا ہوا ہے......“ اس نے بتایا اور میں چونک سا گیا۔ یہ خیال میرے ذہن میں آنا چاہیے تھا۔

”وہاں اور کون کون ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”شاہنواز اور اس کے گھر والوں کے سوا اور کوئی نہیں، میرے بچے جامشورو گئے ہوئے ہیں۔“

”ہماری ساتھی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی وہیں اس کے قبضے میں ہیں؟“

”ہاں!“

”وہاں شاہنواز کے ساتھ موجود مسلح حواریوں کی تعداد بتاؤ۔“

”کوڑا خان اور بخشل کے علاوہ دو اور آدمی ہو سکتے ہیں۔“

”ہمم......“ میں نے ایک خیال انگیز ہمکاری خارج کی اور ایک بار پھر اسے تہدید کرتے ہوئے بولا۔ ”یاد رکھنا

تمہاری اس بات کی تصدیق میں خود کروں گا۔ اگر مجھے اس میں ذرا بھی جھوٹ اور غلط بیانی محسوس ہوئی تو سب سے پہلے تم میرے عتاب کا نشانہ بنو گے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں......" وہ بولا۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو! یہ جنگ خود شاہنواز نے ہم پر مسلط کی ہے اور ہم بھی نہیں چاہتے کہ کسی قسم کا خون خرابا ہو، اگرچہ شاہنواز نے اپنی طرف سے ہمارے خلاف کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی اب تک...... ہم چاہتے تو اب بھی اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں، وہ ہو گا اپنے علاقے کا تیس مار خان...... اگر وہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور بدستور یہ جنگ ہم پر مسلط رکھی تو پھر ہم بھی دشمنوں کی گردنیں اُڑانا اچھی طرح جانتے ہیں، کیونکہ اب تک ہماری جوابی جنگ صرف اپنے دفاع کی حد تک ہے۔ ہم اسے بڑھانا نہیں چاہتے۔"

میں نے ایک لمحے کی دیر نہ کی اور اس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کار بدستور شکیلہ ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ صالح جان کے مطابق اس کی رہائش گاہ ایک دوسرے قریبی گوٹھ میں تھی جو یہاں سے پندرہ سولہ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

میں نے شکیلہ سے ہیرے کے متعلق پوچھا۔ صالح جان کے بھی کان یقیناً اس سوال پر کھڑے ہوئے تھے۔

شکیلہ نے مختصر الفاظ میں اپنی اس رات والی کتھا سنا ڈالی۔ جس میں میرے لیے سب سے زیادہ پُرطمانیت بات یہ تھی کہ وہ ہیرا شاہنواز کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ اگرچہ شکیلہ انہیں اس مقام تک لے کر ضرور گئی تھی، مگر وہاں پہنچتے ہی شکیلہ نے انہیں ہاتھ دکھا دیا تھا، وہ اسے عام سے لڑکی سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے اور شکیلہ نے اسی بات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، ان پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پہلے کوڑا خان کی گن پر قبضہ جمایا، اس کے بعد وہ اسے اور اس کے ایک اور ساتھی کو زخمی کر کے فرار ہو گئی تھی۔ وہ شاہنواز کو بھی نشانہ بنانا چاہتی تھی مگر وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہیں گھات لگا کر غائب ہو گیا۔

بہرطور شکیلہ نے انہیں خوب اچھی طرح سے جُل دیا تھا۔ یہی نہیں اس نے ایک اور عقل مندی کا کام بھی کیا تھا۔ اس نے طلسم نور ہیرا وہاں سے نکال لیا تھا اور اب وہ اس کے پاس ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی شکیلہ کو مختصراً الفاظ میں کنیل دادا اور اول خیر کے بارے میں بتا دیا۔ صالح جان ہماری باتیں شاید غور سے سن رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی ہو گی کہ ہم بھی سوا سیر کا وزن رکھتے تھے۔

نصف گھنٹے کے اندر اندر ہم ایک نسبتاً چھوٹے سے قریبی قصبے میں جا پہنچے۔ ہماری کار کھیتوں کے درمیان بنے کچے دھول اُڑاتے راستے پر دوڑی جا رہی تھی، یہاں سے صالح جان کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔

اس چھوٹے سے دیہاتی قصبے میں داخل ہوتے ہی ہمیں دور نزدیک کسان اپنے کاموں میں مشغول نظر آئے۔ سامنے کھیت پار آبادی تھی اور کچے پکے مکانوں کے سلسلے اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی بے ترتیب قطاریں دور تک جاتی نظر آرہی تھیں۔ راستہ کھیتوں سے نکل کر اسی طرف جاتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق شکیلہ کار کو اسی طرف لے جا رہی تھی۔ کھیتوں سے نکلے تو اُپلے تھپی دیواروں کے جھونپڑ نما گھروں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہو گئے، ان کے درمیان سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے، وہاں ایک آٹے کی چکی بنی نظر آئی جس کی چمنی سے "پک...... پک...... پک......" کی مخصوص دیہاتی آواز کی لَے کے ساتھ دھواں اُٹھ رہا تھا۔

میں کھڑکی سے باہر کوئی مناسب جگہ تاڑنے میں لگا ہوا تھا کہ اچانک صالح جان نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے سر کی ٹکر بڑے زور سے میری ناک پہ رسید کی تھی۔ مجھے اس موٹے آدمی سے ایسی پھرتی اور "زور" کی اُمید نہیں تھی۔ ٹکر چونکہ اچانک اور زوردار تھی جس کے باعث میرا دماغ بری طرح جھنجھنا سا گیا اور تکلیف کے مارے میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ وہ مجھے لڑائی بھڑائی والا آدمی نظر تو نہیں آتا تھا تاہم نجانے کیا بات تھی کہ اس نے عین آخر میں کس بات سے مجبور ہو کر مجھ پر حملہ کر ڈالا تھا۔ مجھے ٹکر مارنے کے بعد اس نے کار سے اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کو ٹکر ماری، وہ لاک تھا۔ شکیلہ بوکھلا گئی اور بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صالح جان کو اس حرکت پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔ مجھے بھی ہوش دلانے کی غرض سے پکار رہی تھی۔

میں نے سنبھالا لینے کی غرض سے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھر صالح جان کی طرف متوجہ ہوا، جو اب دروازہ کھولنے کی کوشش سے مایوس ہو کر کھڑکی کا شیشہ نیچے کر رہا تھا اور میرے دبوچنے تک وہ اپنا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکال چکا تھا، مجھے اگر اسے دبوچنے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کسی طرح سکڑ سمٹ کر خود کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وہ اسی کوشش میں تھا کہ کسی

طرح باہر گر جائے اور بھاگنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگ بس، یہاں تک ہی حرکت کر سکتے ہیں کیونکہ باقی ’’حرکت‘‘ ان کے حواریوں کو آتی ہے، صالح اور زمیندار شاہنواز جیسوں کو نہیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بھینس جیسی ’’پھتک‘‘ کو دبوچا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ تڑپا تو میں نے اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ وہیں سیٹ پر لمبا پڑ گیا۔

’’روانہ ہوتے وقت ہمیں اسے رسی سے باندھ لینا چاہیے تھا۔‘‘ شکیلہ نے کہا۔

’’گزرے ہوئے پر پچھتانا کیسا...... تم ڈرائیونگ پر اپنا دھیان رکھو۔‘‘ میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اگلی سیٹ پر شکیلہ کے برابر آبیٹھا۔

’’اس طرف موڑ لو گاڑی۔‘‘ میں نے سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ یہ سارا اب میدانی راستہ تھا اور اس طرف نسبتاً کچھ پختہ اور بڑے مکان نظر آرہے تھے۔

’’مگر...... ہمیں صالح جان کے گھر کا راستہ نہیں معلوم......‘‘ شکیلہ نے میری توجہ دلائی۔

’’کوئی پروا نہیں...... تم چلتی رہو اور وہ دیکھ رہی ہو ایک کیکر کا درخت ہے شاید...... اس کی چھاؤں میں کار روک لینا۔‘‘

شکیلہ نے ایسا ہی کیا۔

’’کی چین میں الارم لاک ہے، ڈکی کا بٹن پُش کرو جلدی۔‘‘ میں نے شکیلہ سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُترا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں صالح جان کے بے ہوش وجود کو ڈکی میں بند کر چکا تھا۔

’’تم اِدھر ہی ٹھہرو...... میں ابھی آتا ہوں......‘‘ شکیلہ سے کہہ کر میں آگے بڑھا، جہاں کچھ ہاری (مزارعے) اجرکوں کے پگڑ باندھے ایک چھتنار پیڑ کے نیچے بیٹھے لسی وغیرہ پی رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے انہیں سلام کیا اور صالح جان کے بارے میں پوچھا۔

’’سائیں......! شہری بابو لگتے ہو......‘‘ ایک مدقوق سے ہاری نے کہا پھر سامنے بنے پختہ مکانوں کی ترتیب وار قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

’’وہ دیکھ رہے بابو سائیں......! پہلی قطار کا تیسرا مکان...... نیلے رنگ والا جس کا کالا لوہے کا گیٹ ہے، یہی صالح جان کا ہے۔‘‘ یہ بتانے کے بعد وہ اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگانے لگا۔

’’وڈی مہربانی بابا!‘‘ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس کار کی طرف پلٹا۔ مجھے اندازہ تھا کہ صالح جان جیسے آدمی کو اس چھوٹے سے قصبے میں سبھی جانتے ہوں گے۔

وہاں پہنچ کر میں نے شکیلہ کو سرکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دم برابر والی سیٹ پر جا کھسکی۔ اسٹیئرنگ میں نے سنبھال لیا اور کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا لی۔

میں نے مطلوبہ مکان کا رخ کرنے کے بجائے دوسری طرف کار لے گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ان تمام نظر آنے والے پختہ مکانوں کا عقبی حصہ تھا۔ تھوڑا اور دور لے جا کر ایک پرانی سی عمارت نظر آئی۔ کار اس کے پیچھے لے جا کر روک دی۔

’’میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔‘‘ شکیلہ نے فوراً کہا۔

’’نہیں، تم اِدھر ہی رہو گی۔ صالح جان کو اگر ہوش آ گیا تو وہ اندر سے ڈکی بجانا شروع کر دے گا۔ کوئی قریب سے گزرنے والا سارا کام خراب کر دے گا۔‘‘

’’تو کیا مجھے اسے دوبارہ بے ہوش کرنا پڑے گا؟‘‘

’’ظاہر ہے...... تم جیسے ہی محسوس کرو کہ وہ ہوش میں آ گیا ہے تو ڈکی کھول کر ایک پنچ اس کی کنپٹی پر جڑ دینا۔ خیال رہے ہتھ ہولا ہو...... مرنے نہ پائے۔ یہ شاہنواز خان کا کوئی قریبی رشتے دار ہے۔ نیا سیاپا پڑ جائے گا۔‘‘

میں پلٹا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا مطلوبہ مکان کی عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔

گرمی شدید پڑنے لگی تھی۔ دھوپ الگ تپائے دے رہی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

یہاں سارے مکان ایسے تھے کہ ان کے صحن کھلے اور گیٹ بڑے تھے، عقب میں کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ایک دو روشن دان بھی تھے، مگر وہ ’’آدم گزار‘‘ نہ تھے۔

مکان ایک ساتھ جڑے ہوئے نہ تھے جیسا کہ عموماً شہروں میں ہوتے ہیں۔ دیہاتی علاقہ تھا اور زمین بہت تھی۔ ہر مکان کے درمیان ایک گلیارا بنا ہوا تھا، میں ایک ایسے ہی گلیارے میں جا گھسا اور...... وہاں سے مجھے کچھ سیوریج کی لائنیں اُوپر تک جاتی دکھائی دیں۔

یہ مکان ایک منزلہ تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، کوئی نہ تھا اور پھر ایک پائپ کو پکڑ کر جنگلی بلے کی طرح اُوپر چڑھ گیا۔ صحن کی دیوار کی منڈیر پر پہنچ کر تھوڑا اندر جھانکا۔

صحن میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر رلی پڑی تھی۔ یہ وہی رلی تھی جو میں نے پریل کے جنگل ڈیرے والے جھونپڑ میں بھی دیکھی تھی۔ اس کے متعلق اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سندھ کا مشہور ''بچھونا'' تھا۔ چارپائی خالی تھی۔ صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں کی دیواروں میں اے سی نظر آرہے تھے۔ ایک سنگی زینہ اُوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔

میدان صاف پاکر میں اندر کود گیا اور کچھ سوچ کر زینے طے کرتا ہوا اُوپر آ گیا۔ یہاں ایک لکڑی کا دروازہ تھا جو بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چوڑی جھری سے دوسری طرف جھانکا۔ کشادہ سی جگہ پر دو کھری چارپائیاں نظر آئیں۔ یہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ کیا مکان میں کوئی نہ تھا؟ ایک خیال آیا کہ مجھے مین گیٹ کا جائزہ لینا چاہیے تھا کہ کہیں اُس پر تالا وغیرہ تو نہیں لگا ہوا تھا؟ اب تو میں اندر آ گیا تھا پلٹنے کا وقت نہ تھا۔

یہاں مجھے دو کمرے نظر آئے، ان کی دیوار پر ایک ہی اے سی لگا ہوا تھا۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔ دیہاتی طرز کے کشادہ مکان تھے جن کی طرزِ تعمیر سادہ سی نظر آتی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ آہستگی سے دھکیلا اور دبے پاؤں چلتا ہوا پہلے ایک کمرے کے دروازے کے قریب آ کر رکا، اس کے چوبی پٹ سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینا چاہی مگر خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف سرکا۔ اس کے اندر مجھے کسی کے سسکنے اور دبی دبی سی آوازیں آتی سنائی دیں، دوسری بات یہ تھی کہ اس کے دروازے پر باہر سے تالا پڑا ہوا تھا۔ یہی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کامیابی میرے قریب تھی۔ میں نے اس کی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی، اندر نیم تاریکی تھی۔ گویا اس کی کھڑکیاں اور روشن دان تک بند کیے ہوئے تھے۔

اسی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک طرف کونے میں حرماں نصیب ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے بیٹھے سسکتے ہوئے نظر آ گئے۔ جی میں تو آئی کہ اسی وقت انہیں پکار کر تسلی دے ڈالوں مگر ابھی یہ قبل از وقت ہوتا۔ کیونکہ میں کچھ اور ہی حکمتِ عملی تیار کیے بیٹھا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ تیزی سے نیچے آیا اور ابھی میں نے آخری زینہ ہی طے کیا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے باہر نکلا اور کلی کر کے پچکاری صحن میں ماری۔ میں ایک دم زینے کے نچلے خلا میں جا دبکا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، نظریں اسی شخص پر جمی ہوئی تھیں اور میں اسے پہچان گیا تھا، جوشِ اُبال سے میرا دماغ گھوم گیا۔ وہ مردود شاہنواز ہی تھا۔

''اڑے او...... بخشل!'' معاً اس نے کھرکھراتی مگر تحکمانہ انداز میں آواز دی، تو ساتھ والے کمرے سے بخشل باہر نکل آیا۔

''حاضر سائیں وڈا......!''

''اڑے! یہ صالح جان فون نہیں اُٹھا رہا ہمارا...... جا... اس کی کھیر کھیریت تو معلوم کر حویلی جا کر......'' شاہنواز نے اس سے تحکمانہ کہا۔ میں سمجھ گیا تھا، صالح جان اس کی کال ریسیو کیوں نہیں کر پا رہا تھا، کرتا بھی کیسے۔ ایک تو وہ کار کی ڈکی میں بے بس پڑا تھا، دوسرے میں نے اس کا سیل فون کسی مقصد کے تحت آف کر رکھا تھا۔

''سائیں بھوتار......! ہو سکتا ہے، موبائل چارج نہ ہو، ویسے صبح تڑکے میں نے یارو کو حویلی روانہ کیا تھا اور اپنے موبائل سے صالح صاحب سے بات کر کے کھیر کھیریت معلوم کر لی تھی۔ رینجرز والے آئے تھے، ان کے ساتھ وہ .... اُونچا لمبا چھوکرا بھی تھا، پر سائیں وہ بری طرح ناکام ہو کے واپس لوٹ گئے تھے اور کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی، لیکن صالح صاحب کا یہی مشورہ تھا کہ ابھی آج کا دن اور ادھر ہی رہا جائے تو بہتر ہے۔'' بخشل نے گویا ایک ہی سانس میں ساری صراحت بتا دی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے زمیندار شاہنواز ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ کیونکہ بخشل نے دوبارہ کہا۔

''سائیں بھوتار کے لیے ناشتے یا چاں پاڑیں کا بندوبست کیا جائے؟ یا ابھی شغل پاڑیں (شراب نوشی) فرمائیں گے؟''

''اڑے نہیں بابا! خالی پیٹ شغل پاڑیں کا بھلا کیا مزہ آئے گا، ایسا کر اُس چھوکری سے کہو فوراً ہمارے لیے دیسی انڈوں کا آملیٹ اور ایک انڈا قیمہ (خاگینہ) تیار کرے......'' شاہنواز بولا۔ ''اور...... ہاں...... سن!''

''جی سائیں حاضر......!'' بخشل نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''سچے گھی کے پراٹھے بھی بنوا لینا۔ لسی اور دہی کا بھی بندوبست کرے۔''

''برابر سائیں بھوتار...... برابر!''

''یہ اپڑاں کوڑا خان کدھر ہے؟''

''سائیں وڈا! وہ اندر سو رہا ہے۔ رات دیر تک جاگے تھے ہم دونوں۔'' بخشل نے جواب دیا۔

شاہنواز واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ... اپنی بیٹی سونہڑیں کو اس نے کہاں رکھا تھا؟ پتا نہیں یہاں تھی یا کہیں اور جگہ منتقل کر دی گئی تھی۔ تاہم اب اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا تھا مگر دکھی دل سے یہ ضرور سوچتا تھا کہ جب اس بے چاری کو یہ پتا چلے گا کہ اب اس کا محبوب پریل چانڈیو اس دنیا میں نہیں رہا ہے تو اس پر کیا بیتے گی؟

مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ شاہنواز اور اس کے دونوں مقربِ خاص یعنی کوڑا خان اور بخشل یہاں سے آج رات تک ہلنے والے نہیں، میں خاموشی سے مگر اسی احتیاط کے ساتھ واپس پلٹ گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا...... کار کے پاس آ گیا۔

”لگتا ہے کامیاب لوٹے ہو......“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی شکیلہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہاں!“ میں نے اس کی برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر براجمان ہوتے ہی فوراً صالح جان کا سیل ہاتھ میں لیا اور اسے آن کرنے کے بعد ڈی جی رینجرز میجر وسیم بھٹی سے رابطہ کیا۔ ان کا سیل نمبر تو مجھے معلوم نہ تھا البتہ ضلعی ہیڈ کوارٹر کا لینڈ لائن نمبر مجھے پتا تھا۔ کسی اور نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو رینجرز کارپس (corps) ہیڈ کوارٹر......“ دوسری جانب سے کہا گیا۔

”جناب! مجھے میجر وسیم بھٹی صاحب سے بات کرنی ہے، فوراً۔“ میں نے کہا۔

”اپنا تعارف کرواؤ اور کس سلسلے میں بات کرنی ہے؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

”اِٹس ٹاپ سیکریٹ سر! وقت کم ہے...... مجھ سے بات کرتے ہی وہ مجھے فوراً پہچان جائیں گے کہ میں کون ہوں اور اُن سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

دوسری جانب چند ثانیے کے لیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی، اس کے بعد اس نے مجھے ہولڈ کرنے کا کہا اور دوسری جانب سے قومی ترانے کی موسیقی سنائی دینے لگی۔ شاید بات کرنے والے نے انٹرلنک کال سسٹم کے ذریعے میجر صاحب سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ چند ہی سیکنڈوں بعد مجھے دوسری جانب سے میجر وسیم صاحب کی بارعب آواز سنائی دی۔

”ہیلو، کون......؟“

”جناب! میجر صاحب! میں بات کر رہا ہوں...... شش...... شہزاد احمد خان...... شہزی۔“ میں نے اپنا نام بتایا۔ فرطِ جوش سے میرا لہجہ مرتعش تھا۔

”ہم...... کیا معرکہ انجام دیا ہے اب تم نے......؟“ دوسری جانب سے میجر صاحب کی ایک گمبھیر تا سی ہمکاری کے ساتھ آواز ابھری۔ میں ان کی بات اور بالخصوص لہجے پر قدرے چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ کچھ معنی خیز سا ہی لہجہ تھا ان کا۔ میں نے سب سے پہلے ان سے اپنے فرار کی معذرت چاہی اور جب اصل بات کی صراحت بتانے لگا تو اُنہوں نے میری بات کاٹ کر فوراً کہا۔

”معذرت کی ضرورت نہیں، جو کام خود کسی سے کروانا چاہتے ہیں وہ اسی طرح ہی کرواتے ہیں......“ میں ان کی اس بات پر بری طرح چونکا۔

”تت...... تو کیا سر! آ...... آ...... آپ......“

”سمجھ گئے کافی ہے۔“ اُنہوں نے پھر میری بات کاٹی۔ ”ایسی باتیں فون پر نہیں کہی جا سکتیں۔ کمال ہے تم خود ایک پاور ایجنٹ رہ چکے ہو، کیا طریقہ کار بھول گئے ہمارا...... لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا...... ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کے لیے ایسی کڑوی گولیاں ہمیں نگلنی پڑتی ہیں...... یہ بھی مصلحت کا ایک تقاضا ہے۔“

”گریٹ سر!“ میں نے مسرت و جوش سے کہا۔ ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ مجھے رینجرز کے قبضے سے اس طرح فرار کے لیے کوئی سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے اُس رات رینجرز کی گرفت سے فرار ہونے کا یہ دانستہ موقع فراہم کیا گیا تھا کیونکہ شاید میجر وسیم کو میرے اندر کی تپش کا اندازہ ہو چکا تھا اور شاید یہ بھی کہ میں...... اس مہم کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کس قدر پُرجوش ہو رہا تھا۔

”اب کام کی باتیں کر لو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ دوسری جانب سے دوبارہ ان کی آواز اُبھری اور میں نے پھر انہیں ”کام“ کی ساری باتیں بتا دیں۔ اُنہوں نے مجھ سے میری لوکیشن پوچھی اور پھر مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے یاد تھا کہ میجر وسیم بھٹی نے مجھ سے کہا۔ اگر وہ طلسمِ نور ہیرا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انہیں میری کچھ ایسی باتوں کا بھی یقین آ جاتا جو اُن کے لیے اب تک میری طرف سے شکوک کا سبب بنی ہوئی تھیں اور اب وہ ہیرا میرے پاس (شکیلہ کے پاس) موجود تھا۔

یہ قصہ نمٹنے میں کم و بیش پون گھنٹا لگا تھا۔ رینجرز کی

بھاری تعداد نے صالح جان کے مکان پر ریڈ کیا اور وہاں سے اس بدطینت اور خود کو بڑی ”شے“ سمجھنے والے فرعون صفت وڈیرے شاہنواز خان کو اس کے قریبی ساتھیوں کے ذریعے گرفتار کرلیا۔ ساتھ ہی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی بازیاب کرالیے گئے۔ صالح جان کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ ان سب کو رینجرز ہیڈکوارٹر اور وہاں سے اسپیشل انٹروگیشن سیل میں منتقل کردیا گیا۔

کپیل دادا اور اول خیر میری اس کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں نے یہ ساری مہم بازی اپنے اُوپر ایک خطرناک رسک لے کر ہی ماری تھی۔ میری ذرا سی غلطی مجھے ہی نہیں میرے ساتھیوں کو بھی کئی قسم کی قانونی پیچیدگیوں میں پھنسا سکتی تھی۔

البتہ طلسم نور ہیرے سے متعلق تفصیلی گفت وشنید کے لیے ہم دونوں کی ایک کمرے میں ون ٹو ون سنجیدہ نوعیت کی ایک میٹنگ ہوئی۔

”مسٹر شہزاد! میں اب اس قومی امانت کے سلسلے میں تمہارا آئندہ کا پروگرام جاننا چاہوں گا۔“

”یس سر!“ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے میں اس اہم اور قومی امانت کی ذمّے داری سے بری الذمہ ہو جاؤں، یہ طلسم نور ہیرا ہمارے وطن کی ایک مقدس اور قابلِ فخر امانت ہے۔ کوشش تو میری یہی تھی کہ میں اسے آپ جیسے ہی کسی ذمّے دار، محبِ وطن افسر کے حوالے کردوں، لیکن اس کے علاوہ میرے کاندھوں پہ ایک اور اہم ذمّے داری بھی عائد ہوتی ہے، اخلاقی فرض سمجھ لیں اسے، اگر وہ بھی آپ کے توسط سے پوری ہو جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا۔“ میری بات پر میجر وسیم بولے۔

”ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس ذمّے داری کو جلد سے جلد نمٹا دیا جائے اور طلسم نور ہیرے کو بعض حکومتی افسروں کے توسط سے اسے ذمّے داران کے سپرد کر دیا جائے، کیونکہ عنقریب ملک میں ایک بڑی عظیم الشان نوادراتی نمائش لگنے والی ہے، یہ ایک بین الاقوامی سطح کی نمائش ہے جس میں بیرونِ ممالک کے مندوبین، کچھ اعلیٰ افسر اور عالمی مالیاتی فنڈ کے افسران شرکت کرنے والے ہیں۔ یہ نمائش ملک کی ترقی اور اقتصادیات میں نہایت اہم رول ادا کرے گی، ایسے میں طلسمِ نور ہیرے کی نمائش میں موجودگی ...... اس کی اہمیت اور افادیت کو دوچند کر دے گی۔ وہ اس نادر و نایاب ہیرے کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے، اس کی شہرت چار دانگ پھیلے گی، ملک کا نام روشن ہو گا۔ اس کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی تنظیمیں خطیر فنڈ دیں گی اور بھی بہت سے فائدے متوقع ہوں گے۔ لیکن اس عظیم کارنامے کا سہرا تمہارے سر ہو گا...... اور یہی نہیں ہماری مصدقہ اطلاعات اور معلومات کے مطابق تم نے کافی عرصہ پہلے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندرداس سکینہ کو بھی گرفتار کروایا تھا۔ جس پر مقدمہ چل رہا ہے اور اسے پھانسی کی سزا دی گئی ہے، یہ دو کارنامے تمہارے معمولی نوعیت کے نہیں ہیں، لہٰذا تمہیں اس نمائش میں خاص طور پر شامل ہونا پڑے گا، تاکہ وہاں تمہیں ایک بڑے اور قومی اعزاز سے بھی نوازا جائے گا۔“

”سر! یہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر محبِ وطن پاکستانی کے لیے یقیناً فخر کی بات ہوگی مگر سر جس اعزاز کی آپ بات کررہے ہیں، اس کا میں نہیں کوئی اور حق دار ہے۔“ میں خوش تو ہوا تھا مگر اصل بات بھی کی۔

”کیا مطلب؟“ میجر وسیم چونک کر بولے۔

”یس سر!“ میں نے کہا اور پھر انہیں سب سے پہلے بشام چھلگری کے بارے میں مختصراً تفصیل سے آگاہ کیا پھر اس کی بیوی ارم اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کا ذکر بھی کرتے ہوئے میجر وسیم سے بولا۔

”جناب! مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر آپ حکومت کی طرف سے اس کا کریڈٹ بشام کی بیوہ اور اس کے دونوں بچوں کے نام کردیں، انہیں تحفظ اور مالی مدد کی ضرورت ہے، دونوں بچوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے، ارم کے لیے باعزت اور اچھی نوکری کا بھی بندوبست کردیا جائے۔ بس! یہی میری آپ سے درخواست ہے۔“

میری بات پر میجر وسیم چند ثانیے کسی گہری سوچ میں مستغرق رہے، اس کے بعد میرا کاندھا تھپتھپا کے بولے۔

”ویل مسٹر شہزاد! تمہاری اس اخلاقی ہمدردی اور اقدام کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ دیکھا جائے تو اس عظیم قومی امانت کے لیے بلاشبہ بشام نے ہی اپنی جان کی قربانی دی تھی لیکن بعد میں تو تم نے اس مقدس امانت کی اپنی جان سے بھی بڑھ کر حفاظت کی اسے خطرناک بین الاقوامی گروہ اور جنگی جنونی جرنیلوں سے جان پر کھیل کر حاصل کیا۔ نام تو تمہارا بھی آئے گا اور پھر تم ہو بھی وطنِ عزیز کے ایک گمنام سپاہی تاج دین کے بیٹے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن..... مجھے اس کی ضرورت

نہیں، آپ کسی طرح ارم اور اس کے دونوں بچوں کے لیے محفوظ مستقبل کا بندوبست کرا دیں، یہی میرے لیے بہت ہو گا۔"

"لوگ اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں، برخوردار! مگر آفرین ہے تم پر کہ تم دوسروں کے لیے جیتے ہو...... انشاءاللہ میں ایسا ہی کروں گا، لیکن میں تمہیں اب رینجرز فورس کا ایک "آنریری" عہدہ تفویض کرانے کا وعدہ کرتا ہوں...... جو تمہیں پاک آرمی کی طرف سے اسپیشل طور پر دیا جائے گا۔"

میجر وسیم کی اس بات میں میرے لیے دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ کیونکہ میرے دشمنوں نے بیگم ولا اور زہرہ بانو کو اس کے ساتھیوں سمیت (جن میں، میں بھی شامل تھا) جھوٹے شواہد کے ذریعے ملتان رینجرز کو ان کے خلاف کر رکھا تھا، اس سلسلے میں یہ آنریری عہدہ جو یقینی طور پر پاور ایجنٹ کے مساوی ہو سکتا تھا، مجھے تفویض کرنا سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔

"میں تمہیں خفیہ رینجرز کمانڈو کا عہدہ دینے کی سفارش کروں گا۔" میجر صاحب نے آخر میں کہا تو میں خوشی کے دبے دبے احساس تلے بولا۔

"سر! اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری اب تک کی محنتوں کا صلہ مل گیا۔ لیکن ابھی اس میں ایک طویل پروسس کی ضرورت ہو گی، تاہم میں آپ سے ایک اسپیشل فیور کی درخواست کروں گا، چونکہ میں اب ملتان جانے کا قصد کیے ہوئے ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہاں کی رینجرز فورس جب مجھ سے کسی قسم کی باز پرس کرے تو میں اپنا کوئی کارڈ کھیل سکوں۔"

"سمجھ گیا......" وہ مسکرا کر بولے پھر مجھے ایک خصوصی ہاٹ لائن کا نمبر اور کوڈ ازبر کروایا اور بولے۔

"تم فقط یہ کوڈ اور اس نمبر پر ان کے کسی بھی بڑے افسر کو رابطے کے لیے کہہ دینا، وہ تمہیں منٹوں میں تو کیا سیکنڈوں کے اندر اندر نہایت عزت و احترام کے ساتھ چھوڑ دیں گے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ناٹ مینشنڈ! یو آر ڈیزروڈ......" وہ بارعب لہجے میں بولے اور کھڑے ہو کر مجھے سیلیوٹ کیا تو میں نے بھی اسی انداز میں ان کے سیلیوٹ کا جواب دے ڈالا۔

ایک بڑی ذمّے داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد میں خود کو بہت ہلکا پھلکا تصور کرنے لگا تھا۔ لہٰذا ہم نے پنجاب جانے والی ایک لگژری کوچ پکڑی اور ملتان کے لیے روانہ ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت ہم نے ارم اور اس کے دونوں بچوں سے بھی ملاقات کی۔ میں نے اسے سب بتا دیا تھا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے' وہ جہاں کہے گی اسے باعزت طریقے سے وہاں پہنچا دیا جائے گا اور نہ صرف یہ بلکہ حکومتی سطح پر اس کے لیے بہت کچھ کیا جانے والا تھا۔ خود میجر صاحب نے بھی اسے بیٹی کہہ کر تسلی اور اطمینان دلایا تھا۔ میں نے یہ بھی ارم سے کہا تھا کہ میں تمہارے سلسلے میں میجر وسیم بھٹی صاحب سے ٹیلی فونک رابطے میں رہوں گا اور زندگی رہی تو اپنی پیاری بہن اور دونوں بھانجوں سے ضرور کبھی ملاقات کروں گا۔

☆☆☆

ہم اسی طرح براستہ لاڑکانہ دادو سے پنجاب کی جانب محوِ سفر تھے۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور بندے کی ثابت قدمی اور بلند ہمتی کو دیکھتے ہوئے اس کی پوری مدد بھی فرماتا ہے اور ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ بندہ خود حیران ہو جاتا ہے، میں خود بھی اس وقت ان تمام حالات پر غور کر رہا تھا۔ میرا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا ہوا تھا۔ سیٹ خاصی آرام دہ تھی۔ تھوڑی دیر میں مجھے نیند نے آن لیا۔

صبح جاگا تو ملتان کے قریب تھے اور صبح ہو چکی تھی۔ میں نے دانستہ ایسے ہی وقت کا انتخاب کیا تھا کہ دن میں ہی "بیگم ولا" کا رخ کروں۔ رات میں دشمنوں کا پہرا غیر معمولی ہوتا ہے جبکہ دن میں وہ بات نہیں ہو گی۔ ایک خیال اور اندازہ تھا ورنہ تو ہمیں ہر وقت ہی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ہم ملتان کینٹ کے قریب اُتر گئے۔ اول خیر کا دل چائے کی چسکی لگانے کو چاہا تھا مگر میں نے منع کر دیا۔

"اپنے منہ اور پیٹ کو ذرا سنبھال کر رکھو...... جانتے نہیں ہو کہ یہاں ہمارے کتنے خطرناک، دیدہ و نادیدہ دشمن پھیلے ہوئے ہیں......" شکیلہ نے اسے گھور کر کہا۔ ملتان میں اس وقت سخت گرمی پڑ رہی تھی، ملتان کی خشک گرمیاں ویسے بھی بہت مشہور ہیں۔ اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان کوئی بحث پڑتی، میں نے فوراً ایک ٹیکسی والے کو روکا، ڈرائیور کو بیگم ولا کا پتا بتایا اور اس نے کرایہ...... اس کے بعد ہم چاروں اس میں سوار ہو گئے۔

ایک طویل عرصے بعد میں بیگم ولا میں قدم رکھنے والا تھا۔ میرا ذہن بہت سے احساسات اور خیالات کی آماجگاہ

بنا ہوا تھا۔ اماں جی اور ابا جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کیسے ہوں گے؟ میرے انتظار میں تو ان کی بوڑھی آنکھیں کس قدر تھک گئی ہوں گی۔ میں ان کا لختِ جگر ان کی اب تک کی رفاقت کی وہ نشانی تھا جس کی خاطر ان دونوں بوڑھوں نے اپنی پُرمصائب زندگی کو بڑا اخراج عطا کیا تھا اور بالآخر میں نے اپنی چھاؤں اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کو پایا تھا۔ زہرہ بانو تھی، جسے میری ذات میں ہر وقت لئیق شاہ کا ہی پرتو نظر آتا تھا اور وہ ایک بڑے گروہ کی سربراہ ہونے کے باوجود اسی ایک رشتے سے مجھے، اماں جی اور ابا جی کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ بعض رشتے کس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کے باوجود تاعمر قائم رہتے ہیں، نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ نبھائے بھی جاتے ہیں اور زہرہ بانو یہی کر رہی تھی۔ یہی اس کی وہ نرالی ادا تھی جس نے اس کے لیے میرے دل میں ازحد احترام پیدا کر رکھا تھا۔

انہی خیالات میں جب ہم بیگم ولا کی علاقائی حدود میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل تھا کہ بے طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ اعصابی کیفیات بھی ایک عجیب سے ارتعاش کا شکار تھیں۔

کبیل دادا اور اول خیر، کھڑکی سے بڑی گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ خود میری عقابی نظریں تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ بہ قول زہرہ بانو کے، ہمارے بہت سے دشمنوں نے اس عمارت کو اپنی کڑی اور خفیہ نگرانی میں لیے رکھا تھا۔ کون آ رہا ہے جا رہا ہے، وہ سب ان کے علم میں تھا۔ البتہ یہ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میری آمد کی خبر دشمنوں تک پہنچی تھی یا نہیں، اگر پہنچ جاتی تو ان میں تھرتھرلی مچ جانا لازمی ہوتا۔

بیگم ولا کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ہماری ٹیکسی رکی۔ کرایہ وغیرہ ادا کرنے کے دوران میں ہی گیٹ کھل چکا تھا۔ اندر بنے گارڈ کیبن سے دو افراد تیزی سے باہر کو لپکے تھے، ان کے فوراً بعد تین مسلح افراد بھی اندر سے برآمد ہوئے اور ہمارے دائیں بائیں محتاط انداز میں الرٹ کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں ہمارے بجائے تیزی سے ہمارے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اول الذکر دو محافظ ہمارا سامان سنبھال رہے تھے۔

اندر لگے خفیہ کیمروں میں شاید انہوں نے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکتے اور ہمیں اُترتے دیکھ لیا تھا۔ سب سے پہلے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ہی گیٹ سے اندر قدم رکھا تھا اور سامنے ہی مجھے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دے گئی، یوں کہ...... جیسے وہ اپنے آپ سے ہی بےگانہ رہ چکی ہو۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی اور اسی رنگ کے دوپٹے میں اس کا گورا روپ نکھرا ہوا لگتا تھا۔ وہ کچھ کمزور سی نظر آ رہی تھی، دل کش سی کشادہ آنکھوں میں جیسے کسی طویل انتظار کا عذاب تڑخے ہوئے آبگینوں کی کرچیوں میں جھلملا رہا تھا۔ گلنار سا چہرہ کسی قدر کھلا ہوا نظر آتا تھا مگر یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک عرصے سے کملایا ہوا بھی ہے۔ اس کے لبوں کا مدھم مدھم ارتعاش بہ زبانِ خاموشی ایک داستانِ غم کی کئی اَن کہی...... کہانیاں سنا رہا تھا۔ اس نے اپنے شہد رنگ بالوں کو بھی سنوارا ہوا نہ تھا، بےترتیب سے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی بہت سی لٹیں، مہتابی چہرے پر لہرا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی حیرت میں ڈوبی اس کی آواز ابھری۔

”شش...... شہزی! کک...... کیا یہ واقعی تم ہو......؟“

میرے ہونٹوں سے بے اختیار سی ایک مسکراہٹ کسی نویدِ سحر کی طرح طلوع ہوئی، جس نے گویا اُداس اور تاریک جھیل پر سویرا کر دیا۔ وہ متلاطم ہوئی، کسی طوفان کی طرح اُمڈی اور میری طرف بڑھی۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور اپنا سر جیسے میرے کشادہ سینے کے تختے پر رکھ دیا۔ وہ گھٹے گھٹے انداز میں سسک رہی تھی۔ میں نے...... آہستگی سے اسے سنبھالا دیا، ہولے سے اس کا کاندھا تھپکا اور...... بہت دھیرے سے الگ کر کے مسکراتے لہجے میں کہا۔

”دیکھ لو...... زہرہ! سارے ساتھی میرے ساتھ ہیں، تمہارے سامنے ہنستے مسکراتے کھڑے ہیں، یہ سب یقیناً ماں جی اور تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“

یہ کہہ کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔ شکیلہ، زہرہ سے لپٹ گئی، اول خیر نے سر جھکا کر زہرہ بانو کو سلام کیا تو زہرہ بھیگی بھیگی سی آنکھوں اور اشک آلودہ لہجے میں بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”اس شیطان کی مجھے زیادہ فکر تھی...... اور...... وہ کون ہے......؟ میں اسے پہچان رہی ہوں......شاید۔“

اس کا اشارہ میرے عقب میں سر جھکائے کھڑے کبیل دادا کی طرف تھا۔

ہمیں صحیح سلامت، ہنستا مسکراتا اور خوش دیکھ کر زہرہ

بانو بھی اپنا بہت کچھ ایسا بھلائے ہوئے تھی جو اس کا متاعِ جاں بھی تھا اور...... سرمایۂ حیات بھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور بذلہ سنجی کا اظہار کر رہی تھی۔

''سلام بیگم صاحبہ......!'' تب ہی کبیل دادا نے چند قدم آگے اُٹھاتے ہوئے زہرہ بانو کو سلام پیش کیا۔ میں نے دیکھا۔ زہرہ بانو نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کبیل دادا کے اُونچے لامبے کاندھے پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا۔ کبیل دادا نے سر اُٹھا کر زہرہ بانو کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ زہرہ اس کے کھردرے اور بھاری چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''مجھے اور کسی پر اتنا یقین نہیں کم از کم تم پر ضرور تھا کبیل دادا! کہ ہمیشہ کی طرح تم اپنی زندگی کو ساتھیوں کے لیے داؤ پر لگائے رکھو گے اور شہزی سمیت ان سب کو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کی ڈور سے باندھ کر ایک دن میرے سامنے لا کھڑا کرو گے، تم نے مجھ سے وعدہ جو کیا تھا۔''

''بیگم صاحبہ! میں نے آج اپنا وعدہ پورا کر دیا...... لیکن کاش! میں اپنے یار! لئیق شاہ کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ اسے بھی اسی ڈور سے باندھے رکھتا، پر وہ جھلا تو بہت جلدی میں تھا اور میں بھی اس کے لیے کچھ کرنے کا موقع ہی تلاش کرتا رہ گیا۔ یہی ایک ایسا بوجھ ہے، جو ایسے وقت میں مجھے رُلا کر رکھ دیتا ہے کہ کاش! میں اس کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ معافی چاہوں گا سب سے کہ یہ وقت ایسے موضوع کا تو نہیں، پر کیا کروں، یہ نہ بھولنے والا سانحہ بھی ایسے ہی وقت میں یاد آ کر دل و جگر کو تڑپا دیتا ہے۔'' کہتے کہتے کبیل دادا کا لہجہ رُندھ گیا، آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ بھلا اس میں کیا شک تھا کہ جیسے میں اول خیر کا یار تھا اسی طرح میرا بڑا بھائی لئیق شاہ مرحوم کبیل دادا کا تھا۔ بھلا وہ کیسے اُسے بھلا سکتا تھا۔

لئیق شاہ کے ذکر نے فضا کو ایک دم ساکت اور مغموم سا کر دیا۔ تب ہی میں نے آہستگی کے ساتھ سب سے کہا۔

''اندر آ جاؤ......''

نشست گاہ میں دو ملازم مرد عورت موجود تھے۔ سب وہاں صوفوں پر بیٹھ گئے، میں نے ماں جی اور ابا جی کے کمرے کا رخ کیا۔ بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی میرے دل و دماغ کی، ایک جذباتی کیفیت تھی، عقیدت و محبت کا ایک طوفان سا اُمڈنے کو مچل رہا تھا، اپنے بوڑھے ماں باپ کا سامنا کرنے پر، ماں جی سے تو میری باتیں ہوتی رہی تھیں، اور ان کا ساتھ بھی رہا تھا، مگر اپنے باپ کو جب میں نے بلیو ٹلکسی اور اس کے سربراہ سی جی بھجوانی کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اس وقت باپ کی یادداشت ایسی نہ تھی کہ وہ مجھے پہچان پاتا، تاہم ڈاکٹروں نے تسلی دی تھی کہ...... اب اپنوں میں وقت گزارنے کے سبب عین ممکن ہے کہ گریجولی (رفتہ رفتہ) وہ اپنی اصل یادداشتوں میں لوٹ آئیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں پھر فوراً ہی انڈیمان والے مشن پہ روانہ ہو گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا جہاں اے سی آن تھا۔ فضا کمرے کی خاصی آرام دہ اور سکون پرور ہو رہی تھی۔ میں نے بہت دھیرے سے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے کہ ماں جی اور ابا جی بڑے سے جہازی سائز کے بیڈ پر نیم دراز سے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ ان دونوں کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ بادی النظر میں وہ مجھے کوئی ملازم ہی سمجھے تھے مگر جب میں پوری طرح سے ان کے سامنے آ گیا تو ماں تو جیسے ایک ٹک مجھے دیکھتی ہی رہ گئی مگر انہیں شاید پھر بھی یقین نہیں آیا تھا، اُنہوں نے جلدی سے بیڈ سائڈ ٹیبل سے اپنا سیاہ کمانی والا چشمہ اُٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا، تب ہی وہ جیسے ایک دم سکتے میں آ گئیں، میرا اور اُن کا سامنا بلاشبہ اچانک اور غیر متوقع ہی تھا۔

''کک...... کون آیا ہے، نویدہ......؟ تُو کسے اتنے غور سے دیکھے جا رہی ہے؟'' یہ ابا جی کی آواز تھی، ان کی بینائی زیادہ متاثر تھی۔

''چچ...... چشمہ پہن تا جے......! پھر دیکھ کہ کون آیا ہے!'' ماں جی نے ابا جی سے کہا۔ میرے باپ نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اپنی عینک بھی اُٹھا لی مگر وہ پھر بھی مجھے پہچاننے سے قاصر رہے۔

''شہزی پتر...... اُوراں آ...... وہاں.... کیوں کھڑا ہے...... تُو......'' ماں نے کہا اور بیڈ سے اُترنے لگیں کہ میں انہیں اس زحمت سے بچانے کی خاطر ان کی جانب لپکا اور بیڈ کے قریب آ کر ان کے پھیلے ہوئے قدموں کے قریب جا بیٹھا اور ان سے لپٹ گیا۔ ماں جی مجھے خود سے لگا کر رو دی۔ میرا باپ ہنوز ہکا بکا سا تھا، شاید کچھ سمجھ رہا تھا کچھ نہیں۔

ماں کی ممتا بھری چھاؤں تلے آتے ہی جیسے مجھ آبلہ پا آوارہ گرد کو تپتے ریگ زار میں کوئی نخلستان میسر آ گیا ہو...... میرے نادیدہ زخموں پر جیسے مرہم رکھ دیا گیا ہو۔

''تُو بتاتی نہیں نویدہ......! کون ہے یہ......؟'' ابا جی کی کپکپاتی آواز میرے کانوں سے پھر ٹکرائی۔ کچھ اندازہ

کرنے کی وہ کوشش کر رہے تھے۔

میں دھیرے سے ماں سے الگ ہوا اور باپ کی طرف دیکھا...... جو ایک اچھا شوہر ہی نہیں، ایک پُرشفیق باپ ہی نہیں، ملک وقوم کا سچا اور بہادر سپاہی بھی تھا جسے وطنِ عزیز کے ''گمنام سپاہی'' کے اعزاز کا فخر حاصل تھا۔

''اباجی......'' میں نے دھیرے سے انہیں پکارا۔ باپ کے جھریوں زدہ چہرے پر جیسے بہت سی لکیریں کھنچ گئیں۔

''تاجے! یہ ہمارا پُتر...... شہزاد احمد خان ہے۔'' ماں کپکپاتے سے لہجے میں بتانے لگی۔

''بتایا تھا میں نے تجھے اس کے بارے میں...... یہ وہ پُتر ہے ہمارا...... جب تُو ایک برستی طوفانی رات میں اپنے وطن کی پکار پر سرحدی چوکی پر چلا گیا تھا۔ ایک پتر وہ تھا جس نے میری اُنگلی پکڑ رکھی تھی، وہ لئیق شاہ تھا...... اور یہ شہزاد احمد وہ تھا جو دنیا میں آنے والا تھا...... کتنے خوش تھے ہم دونوں...... اس کی متوقع آمد پر...... یاد نہیں، ہم نے تو اس کا نام بھی پہلے سے ہی رکھ ڈالا تھا، ہم دونوں میں لڑائی ہوئی تھی، میں چاہتی تھی لڑکی ہو، تم بیٹا چاہتے تھے، میں نے بیٹی کا نام سوچ رکھا تھا اور تم نے بیٹے کا، آخر کار تم جیت گئے تھے، پر میں تمہیں کیسے تمہاری جیت کی خبر سناتی، تم تو...... دور چلے گئے تھے۔ ہاں! تاجے! یہ وہی اپنا شہزی ہے......! یہی وہ تیرا بہادر گبرو پوت ہے جس نے تجھے دشمنوں کے چنگل سے چھڑایا تھا...... دیکھ لے آج اپنے اس کڑیل جوان پُتر کو......''

ماں یہ سب کہتے ہوئے جانے کیوں سسک پڑی۔ میرا باپ تو جیسے یک ٹک مجھے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اپنوں کے قریب رہتے ہوئے...... ان سے ماضی کی باتیں کرتے ہوئے، اس کی یادداشت کافی حد تک شاید بحال ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی اپنا چشمہ اُتارتا اور کبھی پہنتا، یہاں تک میں خود ہی اس کے پاس سرک گیا اور لپٹ گیا۔

''اوئے ٹھنڈ پے گئی کلیجے وچ...... شہزی پترے......! واہ میرے مولا!...... یہ کیسا دن دکھا رہا ہے مجھ بڈھے کو...... شکر ہے تیرا میرے مولا! میں تو جوان ہو گیا...... تت...... تُو شہزی پتر ہے ناں......؟'' اباجی کے لہجے میں فخر بھی تھا اور انبساط بھی...... ماضی کے گم گشتہ حوالے بھی تھے اور یادِ رفتگاں کے اُن بچھڑے جذبات کے ریلے بھی جنہوں نے کسی بے رحم طوفان کی صورت ہمیں بچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج برسوں بعد ملے تو جیسے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میرا باپ تو جیسے مجھ سے بچوں ہی کی طرح لپٹ گیا۔ وہ بار بار ''میرا پُتر...... میرا پُتر......'' پکارے جا رہا تھا۔ مجھے چوم رہا تھا۔ جب محبت اور شفقت کے ان جذبات کا طوفان تھما تو...... وہ اپنے دونوں بوڑھے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ لیے اماں جی سے بولا۔

''نویدہ......! دیکھ یہ ہمارے لئیق شاہ سے کتنا ملتا ہے...... کاش! کاش! وہ بھی زندہ ہوتا...... میں دونوں لختِ جگر کو اپنے بازوؤں میں سمو لیتا اور پھر سے جوان ہو جاتا۔''

''میں بھی آپ کا بازو ہوں اباجی!'' میں نے بھی رقت بھرے لہجے میں باپ سے کہا۔

''ہاں! شہزی پتر! کیوں نہیں...... تُو تو میرا بازو ہی نہیں، میرا فخر بھی ہے، میرا امان بھی۔''

اسی اثنا میں زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ بھی اندر آ گئے۔ وہ سب ابا اور اماں جی کے قریب بیٹھ گئے۔ میں اور زہرہ اباجی کو کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ کے بارے میں بتانے لگے۔ ان کی جاں نثاری اور بے جگر یاری کے قصے بھی سنائے، غرضیکہ وہ سارا دن اسی میں گزر گیا۔ اباجی کو جب یہ معلوم ہوا کہ...۔ انڈیا میں ''را'' کے ایک بڑے اور خطرناک ونگ ''بلیو تلسی'' جسے را نے خاص طور پر پاکستان میں تخریب کاری اور خفیہ سازشوں کے لیے پروان چڑھایا تھا، میں اسے اس کے سربراہ سمیت نیست و نابود کر آیا تھا۔ تو اباجی کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا اور بے اختیار اس کے بوڑھے کپکپاتے لبوں سے نکلا تھا۔

''آخر پتر کس کا ہے......''

''بے شک۔''

وہاں موجود سب کے منہ سے بیک وقت برآمد ہوا۔

ہم تھکے ہوئے تھے مگر ماں اور اباجی کے ساتھ دن بھر حتیٰ کہ رات گئے تک ایک چوپال سی ڈالے بیٹھے رہے، کھایا پیا بھی انہی کے پاس بیٹھ کر۔ بزرگوں کی محفل میں ایک عجیب روحانی سکون مل رہا تھا ہم سب کو...... رات کے دو بجے کہیں جا کر سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی اور اگلی صبح دن چڑھے سوتے رہے۔

نہا دھو کر غسل کیا۔ ناشتے کا وقت تو بیت چکا تھا، لہٰذا دوپہر کا کھانا ہی کھایا گیا جو بڑا پُرتکلف تھا۔ زہرہ بانو میری آمد پر بے حد خوش تھی۔ تاہم اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہم سے تازہ ترین حالات کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہو۔ اگرچہ ٹیلی فون پر ہماری گفتگو ہوتی رہی تھی، جب میں کراچی میں تھا مگر وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکی تھی، لہٰذا

ممکن تھا کہ تشنگی رہ گئی ہو۔ یوں بھی کچھ نئے پلان، کچھ نئی حکمتِ عملی حالاتِ دوراں کی متقاضی تھی۔

کھانے وغیرہ کے بعد ہم پانچوں ایک دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر ہم نے اصل موضوع کی طرف آنے کی غرض سے دانستہ چند ثانیوں کے لیے خاموشی اختیار کی۔ میرا خیال تھا کہ اب زہرہ بانو نوشابہ اور وزیر جان وغیرہ سے متعلق بات چھیڑے گی مگر جب اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات کا آغاز کیا تو میں حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ وہ نہایت متانت کے ساتھ اور براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

''شہزی! دشمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کا سلسلہ چلتا رہے گا، اسی لیے میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اس وقت یہاں کے تمام معاملات پسِ پشت ڈال کر ہمیں عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے آنسہ خالدہ تھی تو اور بات تھی مگر اب...... اس کی ایک قریبی ساتھی سوزی کے پچھلے دنوں ٹیلی فونک رابطے کے بعد، کہ اب اس کا بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ عابدہ کی رہائی کے لیے باقاعدہ ایک مربوط حکمتِ عملی تیار کر لینی چاہیے۔''

زہرہ بانو نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔ عابدہ کے ذکر نے سب کو مغموم سا کر دیا۔ تاہم سب نے زہرہ بانو کی رائے پر صاد کرتے ہوئے کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ میرے ساتھ بھی کر چکے تھے۔ اب اس سلسلے میں زہرہ بانو کو بھی سنجیدہ پا کر سب سے پہلے اول خیر نے زہرہ بانو سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے تو ہمارے منہ کی بات چھین لی، وڈے استاد جی (کبیل دادا)، شکیلہ اور میں نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی شہزی کو عابدہ بہن کی رہائی کے بارے میں جلد از جلد کوئی فیصلہ کن قدم اُٹھانے کے لیے زور دیا تھا، پر اسے تو پہلے یہاں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اب جبکہ آپ نے خود بھی اس اہم موضوع کو چھیڑا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت ہو جانی چاہیے۔''

شکیلہ اور کبیل دادا نے بھی زہرہ بانو کی بات کی تائید میں اول خیر کی حمایت کر دی تو زہرہ بانو ایک بار پھر سنجیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے شہزی؟ ممکن ہے سوزی کے فون کے بعد تم نے اس بارے میں کوئی لائحہ عمل تیار کر رکھا

ستمبر 2017ء کا دلفریب شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن

اور

مرزا امجد بیگ کا دبنگ انداز

ذرا سی بات

زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی بات کسی کی بھینٹ بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر **ناهید سلطانه اختر** کے قلم سے ایک پرفکر داستان

سانجه

تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے طبقات کی تفریق کیے بغیر صرف بڑے اور منفرد کام کرنے والوں کو اپنے اوراق پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی صفحات پر **علی اختر** کی ایک چونکا دینے والی دلنشین تحریر

باغی

مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی...... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان...... ایک یادگار تحفہ

وقت

اکثر لمحات پر لگا کر اڑ جاتے ہیں مگر...... کچھ سوغاتیں بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ **حسام بٹ** کے قلم کی روانی

اس کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، محمد الیاس، ثمر عباس اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com

ہو......؟"

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

"زہرہ! سچی بات تو یہ ہے کہ میں جب بھی اس بارے میں سوچتا یا غور کرتا ہوں، تو جانے کیوں میرا دماغ میرا ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔ مجھے کوئی راستہ ہی نہیں سجھائی دیتا کہ میں کیا کروں؟ کیسے عابدہ کو امریکا کی خطرناک جیل سے رہائی دلا کر یہاں پاکستان لے آؤں...... مایوسی اور بے بسی حد سے بڑھنے لگتی ہے تو میرا دماغ ماؤف اور دل بجھنے لگتا ہے۔ تب پھر میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ فقط دیواروں سے ہی سر ٹکرانے کو جی کرتا ہے... میرا...... بلکہ...... بلکہ میں تو اب خود کو عابدہ کا مجرم سمجھنے لگا ہوں...... کیا کیا ہے میں نے اب تک اس کے لیے، وہ بے چاری میری خاطر، میرے کہنے پر اس حرافہ عارفہ کے ساتھ انسانی ہمدردی کے طور پر امریکا گئی اور وہاں اسی احسان فراموش عارفہ کی وجہ سے دنیا کی بدنام زمانہ ایجنسی سی آئی اے اور باسکل ہولارڈ جیسے بھیڑیا صفت انسان کے چنگل میں جا پھنسی، یہی سوچ سوچ کر میرے ضمیر کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے اور میں بے سکون ہی رہتا ہوں......"

کہتے کہتے میری آواز رُندھ گئی، لب و لہجے میں دکھ سے زیادہ احساسِ ندامت کی کپکپاہٹ عود کر آئی۔

"ٹیک اِٹ ایزی شہزی!" زہرہ بانو نے کہتے ہوئے دھیرے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ میری کرسی اس کے صوفے کے قریب ہی دھری تھی۔

"میرا مقصد تمہیں دکھی کرنا یا تمہارے زخم ہرے کرنا نہیں تھا، میں چاہتی تھی کہ ہم سب کی توجہ اس ایک ہی نقطے پر مرکوز ہو جائے تب ہی ہم کوئی لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں اور اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہاری ٹیلی فون پر عابدہ سے متعلق گفتگو، بے قراری اور تشویش کو محسوس کر کے ہی میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس سلسلے میں، میں ہی کیوں نہ کچھ کرنے کی کوشش کروں......" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ میں نے قدرے چونکتے ہوئے اور کچھ بے قراری سے اس کی طرف دیکھا بلکہ سب کی یک ٹک سی نظریں زہرہ بانو پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا تانیے کی خاموشی کے بعد وہ پھر اسی متانت بھرے لہجے میں بولی۔

"پہلے میں اس سلسلے میں ایک امیگریشن ویزا کنسلٹنٹ سے امریکا وزٹ ویزا پروگرام کے بارے میں ڈسکس کرنا چاہتی تھی لیکن جلد ہی مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ شہزی سمیت ہمارا امریکا وزٹ ویزا ممکن ہے کہ اول تو مسترد کر دیا جائے گا، کیونکہ آج کل نائن الیون کی وجہ سے امریکی ویزا پالیسی مسلمانوں، بالخصوص پاکستانیوں کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہے، دوسری بات میرے ذہن میں یہ آئی تھی کہ اس طرح اگر وزٹ ویزا مل بھی جاتا ہے تو ہماری، بالخصوص شہزی کی اصل شناخت ظاہر ہو جاتی، جبکہ میں اس مہم کو خفیہ رکھنا چاہتی ہوں، لہٰذا میں نے امیگریشن اینڈ ویزا کنسلٹنٹ سے بات کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور اس کے متبادل کسی اور راستے پر غور کرنے لگی تو میرے ذہن میں ایک شخص زور آور خان کا نام آیا۔ وہ کسی ریکروٹنگ اینڈ ٹریولنگ ایجنسی سے وابستہ رہ چکا ہے۔ جعلی کام بھی جینوئن طریقے سے کرتا ہے، اس کا پروسس بھی شارٹ ہے، راستوں کی آسانی بھی خود ہی بتاتا ہے۔ بس، شرط یہ ہے کہ اُسے اصل قصہ کچھ بتانا پڑتا ہے، جو وہ راز میں ہی رکھتا ہے، کیونکہ اُسے کسی کے رازوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہاں! پیسے وہ منہ مانگے مانگتا ہے، پر اس کے کام میں پرفیکشن ہے۔ اگر تم لوگوں کو یہ تجویز پسند ہے تو مجھے بتاؤ میں اس سے رابطہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گی، بلکہ اُسے اِدھر ہی بلوا لوں گی۔"

زہرہ بانو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ سب میری طرف دیکھنے لگے، جبکہ میرے پاس سوچنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔

"اگر ایسا کوئی آدمی ہے جو مجھے ایک بار امریکا پہنچا دے تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ آگے میں جانوں اور میرا کام......"

"او خیر...... کاکے! تُو تو ایک دم دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگا......" اول خیر میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "یہ تو کشتیاں جلا کے آگ کے ایک ایسے سمندر میں کودنے کے مترادف ہوگا جہاں واپسی کا راستہ تو درکنار راستے ہی میں خدانخواستہ ڈوب جانے کا پورا پورا خطرہ موجود رہے گا۔"

"خطرناک کام میں خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔" زہرہ بانو نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ "اور پھر شہزی اکیلا کب ہوگا؟ ہم سب اس کے ساتھ ہوں گے۔"

"یہ ناممکن ہے، کہ سب ہی اس خطرناک مشن میں کمربستہ ہو جائیں۔" میں نے فوراً زہرہ بانو کی بات رد کر دی۔ "ابھی صرف میرے اکیلے کا ہی امریکا جانا مناسب اور نسبتاً زیادہ آسان ہوگا......" میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"زہرہ! تم آج ہی زور آور خان کو اِدھر بلوا لو......

اس سے بات تو کر کے دیکھ لیں۔"

"لیکن اس سے بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ ڈیسائڈ کر لینا چاہیے کہ اس کے ساتھ کتنے آدمیوں کی روانگی کی بات کی جائے؟" زہرہ بولی تو کبیل دادا بولا۔

"بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے کہ شہزی صحیح کہہ رہا ہے۔ یہاں بھی تو کسی کو رہنا ہوگا، اسی لیے سب کا جانا مناسب نہ ہو گا اور اس طرح کام بننے میں بھی تاخیر ہو سکتی ہے، صرف میں شہزی کے ساتھ امریکا جاؤں گا۔"

"نہیں کبیل دادا!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر انکار میں سر ہلایا۔ "تمہارا یہاں موجود رہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ بیگم صاحبہ کو تمہاری ضرورت ہوگی، انہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پھر ماں جی اور اباجی بھی ہیں۔ دشمن گھات میں اور مات دینے کی تاک میں ہیں۔ میرے ساتھ ابھی کوئی نہیں جائے گا۔ میرے اکیلے جانے کے سلسلے کے کام میں تاخیر بھی نہیں ہوگی اور میں آزادی سے اپنا کام بھی کر سکوں گا۔ یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔" اس کے بعد میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہو کے بولا۔

"زہرہ! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے عابدہ اور میرے متعلق اس طرح نیک نیتی اور پورے خلوص کے ساتھ سوچا۔ ایک احسان اور کر دو...... میرا جلد سے جلد امریکا جانے کا بندوبست کر دو...... بس! ایک بار میں امریکا پہنچ جاؤں...... عابدہ کے ساتھ ہی انشاء اللہ لوٹ کے آؤں گا۔" میرے لہجے کا استحکام میری پُرجوش آواز سے مترشح ہوتا تھا مگر میری بات پر سب پریشان ہو گئے۔ تب ہی شکیلہ نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔

"شہزی! یہ سرحد پار انڈیا کا معاملہ نہیں ہے کہ ایک پاؤں ادھر پڑا اور اپنے ملک میں آ گئے۔ یہ سات سمندر پار ایک اور براعظم جانے کا معاملہ ہے اور ملک بھی کیسا جہاں تمہارے خلاف پہلے ہی باسکل ہولارڈ، ٹائیگر ٹیگ (سی آئی اے)، اور اسپیکٹرم اور لولوش جیسے خطرناک بین الاقوامی دشمن دانت نکوسے بیٹھے ہیں۔ انہیں پورا یقین ہوگا کہ تم عابدہ کو چھڑانے کے لیے کوئی ایسا قدم ضرور اُٹھاؤ گے...... اس لیے بہتر ہوگا کہ تم کم از کم مجھے اور اول خیر کو اپنے ساتھ ضرور لے جاؤ۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے دور دراز ملک میں، صرف میرا جانا ہی زیادہ محفوظ اور مناسب رہے گا۔ اس طرح کی مہمات میں اکثر ساتھی بھی پیروں کی زنجیر بن جایا کرتے ہیں، تم سب میری اور عابدہ کی کامیابی کی دعا مانگتے رہنا...... اور بس، یہی میرے لیے تمہاری مدد بہت ہوگی۔" میں نے کہا۔

میرے فیصلے سے سب کے چہرے اُتر سے گئے، بالخصوص اول خیر اُداس ہو گیا بلکہ اس کا منہ بن گیا تھا۔

"چنگی یاریاں نبھایاں تو یارا...... ! بھلا تیرے بغیر میرا دل یہاں کیسے لگے گا۔ یہ بھی سوچا تو نے...... کاکے!"

ایک تنہا موقع پر اس نے مجھ سے گلے شکوے شروع کر دیے اور من بھر کا بوتھا سُجا لیا۔ میں نے ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگایا اور بولا۔ "یار! تو بھی جھلّا ہے بالکل...... سمجھتا نہیں ہے۔ میں اکیلا اس اہم مشن میں بہت ہلکا محسوس کروں گا، اور یہ مشن ہے بھی اسی کا متقاضی، پھر تم سب یہاں ہو گے تو مجھے بھی تسلی رہے گی، اگر خدانخواستہ میں وہاں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو تم سب لوگ ہو ناں، کیا میری مدد نہیں کرو گے......؟"

"او خیر...... کاکے! ابھی تو اتنا سیانا نہیں ہوا ہے کہ یاروں کو بہلا لے......" اول خیر اسی سوجے ہوئے منہ سے بولا۔

"مجھے پتا تھا تم اِدھر ہی ہو گے...... شہزی کی منتیں کرنے کے لیے...... بڑا شوق ہے ناں تمہیں گوریاں دیکھنے کا......"

میں اور اول خیر دونوں ہی اس آواز پر چونکے تھے، پلٹ کر دیکھا تو شکیلہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اول خیر کو اس کی طرف سے "چوٹ" پڑی تو وہ منہ بنا کر بولا۔

"دخل در معقولات کی معذرت کیے بغیر یوں اندر چلے آنا خلافِ آداب ہوتا ہے محترمہ! اور خیر سے تمہیں اخلاقیات تو چھو کر بھی نہیں گزریں...... تو اب کیا کہا جائے۔"

چڑنے کے بجائے شکیلہ نے یوں اپنا منہ ہونٹوں تلے دبایا تھا جیسے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی ہو، یہ بھی دوسرے کو چڑانے کا ایک انداز تھا۔ یہی سبب تھا کہ اول خیر کی برہمی کم نہیں ہوئی اور وہ دوبارہ بولا۔

"اور...... یہ آپ کیا فرما رہی ہو کہ میں شہزی کے ساتھ محض امریکا گوریاں دیکھنے جا رہا ہوں...... شرم آتی ہے مجھے تمہاری اس لغوگوئی پر...... اطلاعاً بتا دوں کہ امریکا گوریوں کا نہیں کالیوں کا ملک ہے۔"

"وہاں گوریاں بھی ہیں اور گورے بھی......" شکیلہ فوراً بولی۔

"تمہارے جیسی گوریاں ہوں گی، باہر سے سفید اندر

سے کالی۔'' اول خیر کہاں چپ رہنے والا تھا۔

''آؤ شکیلہ! بیٹھو...'' میں نے بڑی مشکل سے سنجیدگی کی آڑ میں اپنی ہنسی کو چھپانے کی کوشش چاہی تھی، ورنہ اول خیر ہمیشہ کی طرح شکیلہ کو سر چڑھانے کا الزام میرے سر تھوپ دیتا۔

''شکریہ شہزی!'' شکیلہ مسکرائی اور ہمارے قریب ایک صوفے پر براجمان ہوگئی۔

''اب تم ہی اِسے سمجھاؤ، بچوں کی طرح ضد کررہا ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔'' بالآخر میں نے شکیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اوخیر...... کاکے! اب ہمارے بارے میں اس کم عقل سے مشورہ لیا جائے گا۔'' اول خیر نے منہ بنایا مگر میں نے دیکھا اس بار شکیلہ بھی ذرا متانت سے بولی۔

''شہزی! میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ کم ازکم تم اول خیر اور مجھے ہی اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ آخر کو ہم نے بھی تمہارے ساتھ ہی کمانڈو ٹریننگ لے رکھی ہے پھر یہ مشن بھی اہم ہے۔ کیا تمہیں ہماری کارکردگی پر کوئی شبہ ہے؟''

شکیلہ کو یہ بات کرتے دیکھ کر اول خیر کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

میری امریکا روانگی سے متعلق میرے جاں نثار ساتھیوں کی سوئیاں ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی تھیں کہ مجھے اکیلے اتنے بڑے اور اہم مشن پر امریکا جیسی سرزمین پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

بڑی بحث کے بعد بالآخر میں انہیں اس وعدے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ...... مجھے جیسے ہی کسی ساتھی اور مدد کی ضرورت پڑے گی، میں سب سے پہلے اول خیر اور شکیلہ کو ہی بلاؤں گا۔ زہرہ بانو کے کان میں یہ بات پڑی تو اس کا پہلا مشورہ یہی تھا کہ وہ زور آور خان سے مزید دو افراد کی متوقع روانگی کے سلسلے میں بھی بات کرے گی۔

میرے ساتھیوں نے دوسرا وعدہ مجھ سے یہ لیا تھا کہ میں مناسب موقع پر اپنی خیریت سے بھی مطلع کرتا رہوں گا۔

دو روز آرام اور اسی بحث میں لگ گئے تھے، جبکہ مجھے یہاں میجر وسیم کی نصیحت کے مطابق رینجرز فورس کے ملتان کروپس (corps) ہیڈ کوارٹر جا کر لیفٹیننٹ کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ یہ میجر ریاض کی جگہ تعینات کیے گئے تھے اور انہی کی سرکردگی میں بیگم ولا میں ریڈ لگایا گیا تھا اور زہرہ بانو سے سختی کے ساتھ ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی، لیکن جب زہرہ بانو نے انہیں اصل حقیقت اور میجر ریاض کے حوالوں کے ساتھ انہیں آگاہ کیا تھا تو ان کی جان چھوٹی تھی۔ نوشابہ کی ایک حد تک انہیں ہمارے خلاف گمراہ کرنے کی سازش تو کامیاب رہی تھی، مگر یہ زیادہ دیر نہ چل سکی تھی۔ تاہم اس نے پریس کانفرنس میں ہمارے بارے میں بہت کچھ غلط کہا تھا۔ اور اخبارات نے بھی اس کی باتوں کو اچھالا تھا۔

یہ اخباری تراشے زہرہ بانو نے ایک رجسٹر میں چسپاں کر کے بہ طور ریکارڈ محفوظ کر رکھے تھے۔ یہ تراشے اور اخبارات، ان پر کالم نویسوں کے تجزیے میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے تھے۔ میں اب کہہ سکتا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیسا ''اسٹینڈ'' لینا تھا۔

امریکا جانے سے پہلے پہلے میں بیگم ولا کو خطرہ پروف بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے لیے میں نے دشمنوں کو اسی کے ہر ہتھیار سے جواب دینے کا سوچا۔ اگلے دن ہی بیگم ولا میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔

وہاں میں نے علی الاعلان طلسم نور ہیرے کا انکشاف اور اس کی بازیافت کے سلسلے میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کی کوششوں کا بھی ذکر کر دیا اور ساتھ ہی اخلاقی طور پر اس کا کریڈٹ مرحوم ہشام جھلگری کے سر کرنے کا بھی باضابطہ طور پر اعلان کیا۔ اس کے بعد میں نے آخر میں چوہدری ممتاز اور بالخصوص نوشابہ کے سابقہ بیانات کے حوالے سے بھی بات کی اور ساتھ ہی دشمنوں اور بالخصوص نوشابہ کو دھمکانے اور بے چین کرنے کی غرض سے اپنے ان عزائم کا بھی ذکر کر ڈالا کہ چوہدری ممتاز خان کسی طور پر بھی رہائی اور ضمانت کا مستحق نہیں۔ اُسے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندر داس سکینہ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بلکہ قانون نافذ کرنے والے ایک فعال ادارے نے میرے ساتھ اُسے ایک کمبائنڈ آپریشن میں رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ وزیر جان کا بھی ذکر ہوا، میجر ریاض کا بھی بعض مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کر ڈالا۔ تاہم اس میں، میں نے بلیوتلسی اور انڈیمان مہمات کا کوئی ذکر نہ کیا بجز اس کے کہ اشارتی زبان کا ہی سہارا لے کر یہ بتانے کی کوشش ضرور چاہی کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے کس طرح یہ مہم جان پر کھیل کر سر کی تھی۔ اگر نوشابہ...... نے اپنی گزشتہ کانفرنس میں میرے، زہرہ بانو، بیگم ولا اور میرے باپ کے خلاف ہرزہ سرائی نہ کی ہوتی تو میں بھی یہ جوابی کانفرنس نہ کرتا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔

بہرکیف میری یہ دھواں دھار پریس کانفرنس خاصی

نتیجہ خیز رہی۔ اس پریس کانفرنس کا فیصلہ میں نے اچانک اور مذکورہ اخباری تراشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا تھا۔ یوں اب اس کے بعد مجھے کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

سب سے پہلا فون میرے پاس خان جی کا آیا تھا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

”برخوردار! میری تو آنکھیں چندھیا گئیں تمہارے انتظار میں...... ابھی ٹی وی پر تمہاری پریس کانفرنس دیکھی تو دل خوش ہوگیا۔ تم نے آتے ہی دشمنوں کے دانت کھٹے کرنا شروع کردیے۔ تم سے کیسے ملا جائے؟“

وہ خاصے پُرجوش تھے۔ میں نے کہا۔ ”خان صاحب......“

”اُونہہ...... تو خان صاحب! میں تمہیں برخوردار کہہ رہا ہوں تم......“ اُنہوں نے میری بات کاٹی۔ ”صرف انکل کہو......“

”جی انکل! آپ کی محبت ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے کہیں ضروری کام سے منظرنامے سے غائب تھا۔“

”یہ سب جان چکے ہیں، تمہاری پریس کانفرنس میں اس کا ذکر آچکا ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ تم سے ملا کب اور کیسے جائے؟“

”میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کے پاس خود ہی حاضر ہوجاؤں گا۔“

”وعدہ......؟“

”وعدہ۔“

”جیتے رہو، میں بے چینی سے تمہارا منتظر رہوں گا۔“

چند دنوں بعد بین الاقوامی نمائش میں باضابطہ سرکاری طور پر طلسم نور ہیرے کا ذکر کردیا گیا۔ یہ نمائش اسلام آباد میں ہوئی تھی اور مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے بعد...... بیگم ولا، بیگم صاحبہ اور میری ملک گیر شہرت نے اسے ملکی احترام کا درجہ عطا کردیا تھا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ بیگم ولا اور ہماری ایسی ساکھ قائم ہوجائے جس کے بعد کسی کو ہم پر پروپیگنڈا کرنے کی جرأت تک نہ ہو سکے۔

میرے اس عمل سے زہرہ بانو بہت زیادہ مطمئن اور خوش ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے میری ذہنی فراست اور چابک دستی کی داد بھی دی۔

”شہزی! تم ایک دم پرفیکٹ آدمی ہو...... کس وقت کیا کرنا اور بعد میں کس کام کو طول دینا ہے، اس میں تو تم گویا ید طولیٰ رکھتے ہو۔“ میں کیا جواب دیتا، بس مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

زور آور خان...... زہرہ بانو کی ایک ہی ٹیلی فونک کال پہ بیگم ولا آگیا تھا۔

وہ ایک عمر رسیدہ اور چرب زبان آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور جسم فربہی مائل تھا۔ منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی، تھیلا نما پتلون اور اسی طرح کی شیکنی کلر شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ آدھا سر گنجا تھا اور باقی نصف پر جو بال تھے وہ ازراہِ زحمت ہی نظر آتے تھے۔ یعنی اُڑے اُڑے اور خشک سے۔ اس کی بائیں کلائی پر سنہری گھڑی تھی جو خاصی قیمتی نظر آتی تھی۔ گلے میں طلائی چین تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا، گاڑی کی چابیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا اور ہم سب ہی وہاں موجود تھے۔ چائے وغیرہ کی ٹرالی درمیان میں سجی تھی اور وہ بسکٹ اور نمکو چبانے کے بعد چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

بظاہر تو مجھے اسے دیکھ کر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ خود اس نے مشکل سے ہی کراچی کا سمندر دیکھا ہوگا نجانے دوسروں کو کس طرح اس نے سات سمندر پار لگایا ہوگا۔

زہرہ بانو نے اس دوران میں اسے میری ”ٹرم اینڈ کنڈیشن“ کے طور پر بتا دیا تھا کہ میں نہ تو مستقل طور پر امریکا رہائش اختیار کرنے کے مقصد سے جا رہا تھا نہ ہی گھومنے پھرنے کے لیے...... بس ایک ضروری کام نمٹانا تھا اور کسی کو تلاش کرکے اسے لے کر واپس لوٹنا تھا۔

”ہا...... ہاہا......“ اس نے یہ سب سننے کے بعد اپنے حلق سے ایک بے ہنگم سا قہقہہ اُگلا۔ ”سیدھی طرح کہو ناں بیگم صاحبہ! مال کھپانا ہے اور ڈالر جیب میں رکھ کے لوٹ آنا ہے۔“

”تمہارا خیال ہے ہم تمہیں اسمگلر نظر آتے ہیں؟“ زہرہ بانو نے اسے گھورا...... تو وہ ایک دم خفیف سا ہوگیا پھر کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”آپ تو سنجیدہ ہوگئیں بیگم صاحبہ! میں تو مذاق کر رہا تھا، ویسے کھیپی کو اسمگلر نہیں کہتے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، اب تم ذرا سنجیدہ ہوجاؤ تو کام کی بات کرلی جائے۔“ زہرہ بانو نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ وہ خاصا منسوڑ تھا اور زہرہ بانو کا منہ چڑھا بھی۔ نجانے زہرہ بانو نے ایسے اور کتنے عجوبے اپنی پٹاری میں بند کر

رکھے تھے۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ’’کتنے دانے پار لگانے ہیں؟‘‘

’’تین۔‘‘ زہرہ بانو نے بتایا اور میں چونکا مگر چپ رہا۔ اول خیر وغیرہ بھی ضرور زہرہ بانو کے اس جواب پر چونکے ہوں گے۔

’’لگ جائیں گے۔‘‘

’’کام محفوظ اور خفیہ طریقے سے ہونا چاہیے۔‘‘

’’یہ کام ہے ہی ایسا کہ اسی طرح کیا جائے۔‘‘ اس نے کہا اور سگریٹ کا ایک اور کش لگا کر چٹکی بجائی۔ وہ سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر پینے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

’’آدمی کم یا زیادہ بھی ہو سکتے ہیں مگر ویزا کم از کم سال سے چھ ماہ کا ہونا چاہیے۔‘‘ زہرہ بانو نے کہا اور کچھ سمجھ کر میرے حلق سے ایک ہلکی سی ہمکاری خارج ہوئی تھی۔

’’سال بہت ہے، چھ ماہ کا ویزا حاصل کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا، ترنت کام چاہیے تو تین ماہ......‘‘ وہ ٹھیٹ لین دین والے لہجے میں بولا۔

’’تین ماہ تو بہت کم ہیں......‘‘ زہرہ بانو نے قدرے تفکر سے دیکھا۔

’’ارے بیگم صاحبہ! تین ماہ کا بھی مل جائے تو ڈھول نفیریاں بجانا۔ کیا سمجھتی ہو، امریکا کا ویزا اور تین ماہ، یہاں تو لوگ کہتے ہیں کہ پندرہ دن کا بھی مل جائے تو بہت ہے، بس ایک بار باہر نکل جائیں، آگے سو بہانے مل جاتے ہیں پاؤں ٹکانے کے......‘‘

’’ہم ایسا کچھ نہیں کرنے جارہے ہیں۔‘‘ زہرہ بانو نے کہا۔ ’’ہمیں جانا ہے اور اپنا کام نمٹا کر لوٹ آنا ہے اور بس......‘‘

’’فی دانہ......پچیس لاکھ ہوگا، تین آدمی مانو، پچھتر لاکھ، بیچ کا خرچہ بھی تمہارے ذمّے...... آدھی رقم ایڈوانس لوں گا، باقی یہاں سے فلائی کرتے ہی......‘‘ وہ فوراً اپنے مقصد کی بات پر آگیا۔

’’فی آدمی پچیس لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔‘‘ زہرہ بانو نے کہا۔ ’’یہ تو تم اُن لوگوں کا ریٹ بتا رہے ہو، جنہوں نے واپس لوٹنا ہی نہیں ہوتا۔‘‘

’’لوٹ آؤ یا وہیں رہو، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔‘‘ وہ سگریٹ دبی مٹھی کا سوٹا بھرتے ہوئے بولا۔ ’’ہاں! پھر فی دانہ پانچ لاکھ دے دو اور تینوں کو کنٹینر میں ڈال کر روانہ کردوں گا، پندرہ لاکھ، کام پکا۔‘‘

کنٹینر کے ذکر پر مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔ کیونکہ پرانے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایسی اندوہناک خبر بھی میری نظروں سے گزری تھی کہ ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ لوگ کنٹینر کے ذریعے بیرونِ ملک سپلائی کیے گئے تھے مگر بدقسمتی سے راستے ہی میں حبسِ دم کا شکار ہو کر بڑی بے بسی اور اذیت ناک موت کا شکار ہوگئے تھے۔

’’ہرگز نہیں......‘‘ زہرہ بانو نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا۔ ’’پیسے تمہیں پورے مل جائیں گے مگر کام پکا ہونا چاہیے...... پلان کیا ہوگا تمہارا......؟‘‘

’’اب کی ناں آپ نے سمجھداری والی بات۔‘‘ وہ چہک کر بولا۔ ’’آپ سے میری...جمعہ جمعہ آٹھ دن کی واقف کاری تو نہیں ہے ناں...... بیگم صاحبہ! میرے پلان کا بھی آپ کو اندازہ ہے اور کام کا بھی...... بڑے سچل طریقے سے کام کرتا ہوں...... سنو گی تو چہک اُٹھو گی۔ اب بتاؤ، ان میں سے کون سے وہ دانے ہیں، جنہیں پار لگانا ہے تو پھر میں آپ کو اپنا پلان بتاتا ہوں......‘‘ کہتے ہوئے وہ ہماری طرف باری باری گھورنے لگا۔

اس کا لہجہ مجھے ہی نہیں اول خیر وغیرہ کے لیے بھی سخت ذہنی کوفت کا باعث بن رہا تھا، مگر اس کی عادت اور اپنی مجبوری جان کر ہم برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

’’یہ تینوں ہیں۔‘‘ زہرہ بانو نے شکیلہ، اول خیر اور میری طرف اشارہ کیا۔

وہ ہماری طرف تھوڑی دیر تک گھورتا رہا پھر مسکرا دیا۔ ہم سنجیدہ ہی رہے۔

وہ پھر زہرہ بانو سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’تو پھر ڈن......؟‘‘

’’پلان بتاؤ......؟‘‘

اس نے جواباً ایک لمبی سانس کھینچی، سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔ اس کے بعد بولا۔ ’’ان تینوں کا گیٹ اَپ چینج کرنا پڑے گا۔ میرے پاس تین جینوئن افراد کے پاسپورٹ اور ویزے تیار ہیں مگر وہ تینوں بھارتی نژاد ہندو ہیں۔ دو میاں بیوی اور ایک...... فلاپ شدہ اداکار ہوگا۔ وہ تنہا تھائی لینڈ کے راستے نکلے گا، اور ہالی ووڈ قسمت آزمائی کے لیے جائے گا۔ چاہے کیسا ہی رول مل جائے۔ جبکہ میاں بیوی دبئی کے راستے روانہ ہوں گے، اپنے ایک عزیز کی اسپانسر شپ پر جو سان ڈیاگو کی ایک ساحلی بستی کے کنارے آباد ہیں۔ اب آپ بتائیں، کیا زیادہ ہیں فی دانہ پچیس لاکھ بیگم صاحبہ؟ بالکل تیار اور سمجھو تو طے شدہ کام ہے۔‘‘

اس کے منصوبے کو چند لفظوں میں سن کر ایک لمحے کو میں خود بھی متحیر رہ گیا۔ آدمی مجھے واقعی چلتا پرزہ لگا تھا۔

’’آج کل کے حالات کا تو آپ سب کو علم ہوگا ہی کہ نائن الیون کے بعد امریکا کو ایک آسیب کھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ویزا پالیسی کس قدر مشکل کر دی گئی ہے، مسلم تو ایک طرف، پاکستانی تک کے ذکر پر ہی...... سو طرح کے آبجیکشن لگا کر کیس ریجیکٹ کر دیا جاتا ہے۔ میں نے ان ساری باتوں کو دیکھ کر ہی منصوبہ پلان کیا ہے، یعنی جعل سازی کی آڑ میں جینوئن کام...... اور جینوئن کام بھی کیسا......‘‘ وہ چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے آگے بولا۔ ’’یہ تینوں مذکورہ افراد مر چکے ہیں، مگر ان کا نہ کوئی ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے نہ ہی کوئی اور ایسی دستاویز یا ثبوت......‘‘

’’لیکن...... بھیس بھرنے کا یہ عمل پکڑوا سکتا ہے۔‘‘ میں نے اعتراض اُٹھایا۔ ’’اسکیننگ ہو سکتی ہے ہمارے چہروں کی......‘‘

’’ارے بھائی! میں کیا تمہارے چہروں پہ...... عورتوں یا بیوٹی پالروں والا میک اَپ کروں گا......‘‘ زور آور خان ہنس کر بولا۔ ’’اس کام میں، میں اکیلا نہیں ہوں...... میرے ساتھ ہر قسم کے ایکسپرٹیز کی پوری ٹیم موجود ہے، پورا ٹیم ورک ہوتا ہے ہمارا...... اسی لیے تو یہ کہانی ہزاروں کے بجائے لاکھوں پر ہوتی ہے...... ڈاکٹرز، پلاسٹک سرجن، دیگر ماہرین...... اور بولو...... ہاں! یہ میک اَپ جتنا جاندار ہوگا اُتنا ہی ناپائیدار بھی...... جو سچی بات تھی، میں نے کہہ دی۔‘‘

میں نے بھویں سکیڑ لیں۔ زہرہ بانو نے بھی چونک کر پوچھا۔

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’صاف بات ہے، میک اَپ اپنا کام ایک محدود حد تک کرے گا، اس کے بعد یہ خود ہی صاف ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ ماسک اور فیشل میک اَپ ہوگا۔ سپر فیشل......‘‘

’’گویا یہ میک اَپ چند دنوں بعد خود ہی صاف ہو جائے گا؟‘‘

’’ہاں!‘‘ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

’’لیکن...... تم اسی شکل اور نام کے ساتھ دوبارہ ریڈی میڈ میک اَپ کر سکتے ہو......، تب تک تم امریکا کی سرزمین میں قدم رکھ چکے ہوگے، پھر کیا پروا ہوگی...... آگے تمہارا مسئلہ ہے...... میرا کام تم تینوں کو وہاں پہنچا دینا ہے۔ اب تم یہ کہو کہ وہاں دال روٹی کا بھی میں ہی بندوبست کروں تو یہ ناممکن ہے۔‘‘

میں اور زہرہ بانو، سوچتی نگاہوں سے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ہمیں ایک پُرسوچ سی اُلجھن آمیز سوچ میں نگاہیں ملاتے دیکھ کر زور آور خان ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ ’’ہر کام میں رسک تو ہوتا ہی ہے، کوئی کام پرفیکٹ نہیں ہوتا دنیا میں، تمہیں چیک کرنے والے بھی پرفیکٹ نہیں ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کل سخت چیکنگ صرف مسلم اور پاکستانی مسلم کے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہے، عام لوگ اس سے مبرا ہیں...... بالخصوص انڈین ہندو...... اور تم تینوں ہندوؤں کے بھیس میں جاؤ گے تمہیں تمہارے جعلی ہندو نام بھی بتا دیے جائیں گے...... بس! اب اس سے زیادہ میں تمہیں مطمئن نہیں کر سکتا، سودا پھینکو اور بات آگے بڑھے......‘‘ وہ آخر میں ٹھیٹ کاروباری لہجے میں بول کر چپ ہو گیا۔

اس کی بات میں کافی وزن تھا۔

’’ہم......‘‘ زہرہ بانو نے ایک خیال انگیز سی ہمکاری خارج کی اور اسی انداز میں میری طرف ایک ذرا نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر زور آور خان سے مخاطب ہو کر بولی۔

’’تمہیں کب تک فائنل جواب چاہیے؟‘‘ زور آور نے اپنی گولڈن کلر کی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور بولا۔ ’’ابھی چھ بج رہے ہیں...... یہ شام اور رات کافی ہے سوچنے کے لیے، صبح تک مجھے ڈن کر کے بتا دو...... تاکہ میں کل سے ہی کام کی ابتدا کر دوں، اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اس لیے نصف ایڈوانس رقم آپ کے فائنل جواب کے ساتھ مجھے چاہیے......‘‘ اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

’’ٹھیک ہے...... کل صبح تک تمہیں فائنل جواب کے ساتھ رقم کا چیک بھی مل جائے گا۔‘‘

’’سوری بیگم صاحبہ! چیک نہیں، ڈائریکٹ کیش چلے گا......‘‘ اس نے شہادت کی اُنگلی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

’’لیکن ایک دم اتنی رقم...... بینک والے......‘‘ زہرہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ’’ٹھیک ہے، منیجر سے میری واقفیت تو ہے، ممکن ہے کام ہو جائے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ دو ایک روز اُوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔‘‘ زور آور بولا۔

اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

’’ی ی...... یہ دونوں کب میرے ساتھ جا رہے

ہیں......؟'' میں نے گویا چھوٹتے ہی زہرہ بانو سے کہا۔ میرے چہرے پر حیرت آمیز پریشانی کے آثار تھے جبکہ شکیلہ اور اول خیر خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے، خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زہرہ بانو...... کیا واقعی...... ان دونوں کو بھی میرے ساتھ روانگی کے لیے تیار کرنا چاہتی تھی یا یونہی اس نے کہہ دیا تھا۔

''شہزی! تمہاری یہی بحث تھی ناں کہ ایک آدمی کا کام نسبتاً آسان اور اس سے زائد کا مشکل ہوسکتا ہے، دیکھ لو...... تم تینوں کا کام پکا ہے۔''

''مگر......'' میں نے کہنا چاہا۔

''دیکھو شہزی......'' زہرہ بانو نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے اور کبیل دادا نے ہی بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ...... اگر تینوں کا کام آسان ہورہا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں...... اول خیر اور شکیلہ تمہارے ٹریننگ پارٹنر بھی رہ چکے ہیں...... تم تینوں کمانڈو ایجنٹ ہو...... امریکا میں تم عابدہ کا کوئی قانونی یا عدالتی کیس لڑنے نہیں بلکہ فائٹ کرنے جارہے ہو...... وہ بھی عام لوگوں سے نہیں...... سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ''ٹائیگر ٹیک'' سے فائٹ لڑنے...... کورکوران کی جیل، بین الاقوامی دشمنوں کی کچھار میں گھس کر تمہیں ان سے نبردآزما ہونا بھی پڑے گا۔ تنہا اتنا بڑا رسک غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا، جس میں ناکامی کی صورت میں...... عابدہ کی جان اور اس کے تحفظات کو مزید خطرات لاحق ہوجائیں گے......'' وہ ایک ثانیے کے لیے سانس لینے کو رکی پھر دوبارہ بولی۔

''پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہارے جاتے ہی، خاموشی سے اول خیر اور شکیلہ کو بھی بھیج دوں...... جس طرح میں نے تمہاری انڈیا والی مہم میں کیا تھا، مگر اس بار بات اور تھی...... پلیز...... شہزی! یہ ضروری ہے...... وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ ایک سے دو بھلے......''

میں نے سر جھکادیا۔ اول خیر نے خوشی سے نعرہ بلند کیا تھا۔ شکیلہ بھی خوش تھی۔

زہرہ بانو میرا امزاج اور طبیعت کو سمجھنے لگی تھی۔ میں جو کہتا یا جس بات پر اڑ جاتا، وہ بظاہر اثبات میں اپنا سر ہلا کر خاموش ہوجاتی تھی مگر کرتی وہی تھی جو اس کی مرضی اور میرے مفاد میں ہوتا تھا۔ نجانے پھر کیا ہوتا کہ میں بھی انکار نہیں کرپاتا تھا۔

زورآور خان کو صبح تک بتادیا گیا تو اس نے کچھ طبع شدہ فارم بھجوادیے جنہیں ہم تینوں نے ضروری خانہ پُری کر کے اس کے آدمی کو دے کر روانہ کردیے جو ساتھ لایا تھا۔ اس نے دو سے چار ہفتوں کا وقت مانگا تھا۔ کام تیار ہونے کے باوجود یہ ایک بڑا عرصہ تھا مگر ہم کیا کرسکتے تھے، سوائے انتظار کے۔

اگلے روز میں، شکیلہ اور اول خیر، کرنل ریاض کی رہائش گاہ پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم خوش ہوگئے اور بڑے پُرتپاک انداز میں ملے۔ وہ عام سی گھریلو شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ واقعی مکمل طور پر ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں ایک آرام دہ اور خوب صورت نشست گاہ میں بٹھایا، ان کا وہ بیٹا بھی ہم سے ملا تھا جو اَب ماشاء اللہ کافی بڑا ہوگیا تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا، جسے میں نے دشمنوں کے نرغے سے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال میں حملے کے بعد اپنی جان پہ کھیل کر بچایا تھا۔ ان کی بیگم بھی ہم سے ملیں۔

ریاض صاحب نے سب سے پہلے تو میری پریس کانفرنس اور مجھے ملنے والے ملکی اعزاز کے بارے میں توصیفی کلمات سے نوازا۔ اس کے بعد مجھ سے بھارتی مہم جوئی اور بلیوتلسی کے خاتمے وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں انڈیمان تک سارے سنسنی خیز حالات و واقعات بتادیے۔ جسے سن کر وہ بہت حیران اور ششدر ہوئے۔

''کاش! شہزی! میں تمہیں پاک آرمی میں کوئی اچھا اور بڑا عہدہ دلوادیتا۔ آرمی میں ایسے عہدے موجود ہیں جو محض اس طرح کی کارکردگی کی بنیاد پر بھی آنریری تفویض کردیے جاتے ہیں۔'' اُنہوں نے کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

''جی ہاں! میری اور میرے ان دونوں ساتھیوں کی پاور ایجنٹ کی حیثیت سے شمولیت اس کی مثال ہے۔'' میرا اشارہ اول خیر اور شکیلہ کی طرف تھا۔

''کاش! یہ ڈراپ نہ ہوتی۔'' اُنہوں نے ایک حسرت زدہ سی سانس خارج کی۔

''مجھے عہدے کا کوئی لالچ نہیں سر!'' میں نے کہا۔ ''میں اب بھی خود کو وطنِ عزیز کا ایک ادنیٰ سپاہی سمجھتا ہوں......''

''آخر ایک گمنام سرفروش سپاہی کے بیٹے جو ہوئے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ان کے لہجے میں فخر تھا۔ میں بھی مسکرادیا۔

''سر! آپ سے چوہدری ممتاز کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔'' بالآخر میں اصل موضوع کی طرف آتے

ہوئے بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے رہائی کیسے مل گئی۔"

"مجھے تم سے اسی سوال کی توقع تھی۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولے۔

"سر! آپ خود اندازہ لگائیں، ہم سب نے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر اسے گرفت میں لیا تھا جبکہ وزیر جان کے کامیاب فرار پر مجھے آج بھی افسوس ہوتا ہے۔ تو یہ سب کیسے ہوگیا؟"

"بالکل اسی طرح برخوردار! جیسے پاور جیسے ونگ کو مصلحتاً ختم کرنا پڑا۔"

"میں سمجھا نہیں سر! وہ تو ایک دوسرا معاملہ تھا۔ ہم اسے خفیہ نہ رکھ سکے تھے اور اس ونگ کی بنیاد ہی اسی پر تھی جو قائم نہ رہ پائی اور......" میں...... دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ کر فوراً بعد دوبارہ بولا۔ "...... چوہدری ممتاز والا معاملہ اور تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں......"

"شہزی!" ریاض صاحب نے میری بات کاٹی اور میں خاموش ہوکر ان کا چہرہ تکنے لگا۔

"گندی مکھی جب بھی گندگی پر بیٹھتی ہے تو اپنا ایک پَر بچا کے بیٹھتی ہے۔ اسی طرح ممتاز خان جیسے سیاست دان کرتے ہیں، وہ چاہے جتنا بھی گندگی میں لتھڑ جائیں، اپنا ایک پہلو ہمیشہ بچا کر رکھتے ہیں اور وہ ہوتا ہے ان کا دوسرا چہرہ...... جو سامنے ہوتا ہے، ہمارے آگے نہیں، اپنی اس عوام کے آگے جنہیں یہ بے وقوف بناتے ہیں اور پھر انہی کے کاندھوں پر بندوق رکھ کے گولی چلاتے ہیں۔ ان کے سامنے مظلوم بنتے ہیں' دوہائیاں دیتے ہیں، فریادیں کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ووٹ لینے کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں، بڑے بڑے ملکی مسائل کو حکومت میں آنے کے بعد ہفتوں میں بلکہ چٹکیوں میں حل کرنے کے سنہری باغ دکھاتے ہیں۔ یہ بے وقوف عوام صرف اتنا سوچ لیا کریں کہ...... چوہدری ممتاز خان جیسے سیاسی اور فصلی بٹیرے، کتنی بار حکومتوں میں آئے، ان کے ذاتی اثاثے کہاں سے کہاں جا پہنچے لیکن ملک کے لیے انہوں نے کیا کیا......؟ ان کے اثاثوں کا گراف تو ہر دور میں اُوپر جاتا رہا مگر ملک کی ترقی کا گراف مسلسل نیچے آتا رہا، کیا کرتے رہے یہ ملک و قوم اور اس کی عوام کے لیے؟ کہ آج عام طبقہ پانی اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں تک سے محروم ہے۔ مگر افسوس کہ یہی لوگ انہیں بچاتے ہیں۔ اپنی عوامی طاقت کو ایک غلط آدمی کے تحفظ اور اسے بچانے کے لیے صرف کرتے رہتے ہیں۔ پھر چاہے جتنی بھی عدالتیں بن جائیں، احتسابی کمیٹیاں قائم کردی جائیں، تحقیقی اور تفتیشی جوڈیشنل اکیڈمیاں بن جائیں، حد تو یہ کہ انہیں سزا بھی مل جائے مگر اصل احتساب وہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت بھی واپس لینی چاہیے۔ بس! سمجھو یہی معاملہ چوہدری ممتاز کے ساتھ روا رکھا گیا...... تاہم اس کی رہائی مشروط اور کچھ قدغنوں پر رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے پندرہ سال تک علیحدہ اور ہر طرح سے غیر فعال رہے گا اور کسی بھی حوالے سے کہیں بھی اس کا نام تک نہیں آئے گا۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئے۔ میں نے کہا۔ "وزیر جان کے سلسلے میں کیا حکمتِ عملی جوڑی گئی تھی؟"

"ایک اشتہاری مجرم کی تلاش......"

"کیا اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی؟"

"ہاں! جب تک میں اپنے عہدے پر رہا، میں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ انہی دنوں مجھے کچھ ایسے شواہد ملے تھے کہ وہ ملک سے فرار ہوچکا ہے۔"

"آپ کی ریٹائرمنٹ ایڈمنسٹریشن گراؤنڈ میں کی گئی تھی یا جبری تھی......؟" میں نے پوچھا۔ وہ میرے سوال پر ہولے سے مسکرا دیے۔

"مجھے تم سے اس سوال کی پوری اُمید تھی۔ بس! جانے دو اس بات کو...... منہ کھلے گا تو بہت کچھ کھل جائے گا۔ یہاں پھر وہی مصلحت کوشی کی بات آجاتی ہے کہ ایسی کڑوی گولیاں نگلنی پڑتی ہے۔"

"لیکن...... میں وزیر جان کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اسپیکٹرم کا ایک زونل چیف ہے۔ مقامی سطح پر وہ اسپیکٹرم کو پھر سے فعال کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہی نوشابہ کی پشت پناہی اور اسے ہر طرح سے سپورٹ کر رہا ہے۔ چہرہ بدل گیا ہے، باقی سب وہی چل رہا ہے سر......! مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" مجھے ایک دم جوش سا آگیا۔

"میں اب بھی ایک پاور ایجنٹ ہوں...... اور کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر ایسے ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کرتا رہوں گا...... چاہے پردۂ زنگاری کے پیچھے ہی سہی......"

ریاض صاحب میری طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم وہاں سے نکل آئے۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟" اول خیر نے پوچھا۔ وہ کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ شکیلہ عقبی سیٹ پر

براجمان تھی۔

’’نیلی کوٹھی چلو......‘‘ میں نے کہا۔

’’اوخیر......‘‘ وہ زیرلب بولا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

’’کیا ہوا......؟ جاں ورکھنا اور نیلی یاد آ گئے......؟‘‘

’’اوخیر...... کاکے! بڑا سیانا ہے، بندے کے چہرے کے تاثرات بھانپ لینا خوب جانتا ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’یہ کوئی بڑی بات نہیں۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کسرِ نفسی سے کہا۔ ’’خان جی کا جب بھی ذکر آئے تو یہ دونوں کردار ازخود ذہنوں میں آتے رہیں گے۔‘‘ میں نے کہا اور پھر دفعتاً مجھے ایک خیال آیا۔ میرا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

’’اول خیر......! گاڑی موڑ لو......‘‘ میرے اچانک یہ کہنے پر وہ ذرا گڑبڑا گیا پھر بولا۔

’’اوخیر...... کاکے! کیا ہوا......؟ ارادہ بدل لیا خان جی کے ہاں جانے کا......؟‘‘

’’فی الحال تم عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف چلو......‘‘

’’ہم......‘‘ اول خیر کے منہ سے نکلا اور اس نے اسٹیئرنگ موڑ کر راستہ بدل دیا۔

دن خوب چڑھا ہوا اور گرم تھا۔ کار میں اے سی لگا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری کار عارفہ کی رہائش گاہ کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اول خیر کو ہدایت کی تھی وہ کار گیٹ کے بالکل قریب لے جا کر روک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا، میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ کار رکتے ہی، اندر بنے گارڈ کیبن کے چوکور خانے سے کسی نے کار کو اتنا قریب رکتے دیکھا اور فوراً ماؤزر ہاتھ میں تھامے گیٹ کے بغلی دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے فوراً بعد اسی طرح کا دوسرا گن بردار بھی باہر برآمد ہوا۔ دونوں ہٹے کٹے ’’دربان‘‘ تھے اور میرے لیے نئے تھے۔

’’اوئے...... یہ کیا حرکت ہے؟ گاڑی اتنے قریب گیٹ کے کیوں روک دی ہے......؟ پیچھے کرو......؟‘‘ وہ کوئی بدتمیز سا گارڈ تھا۔ یا پھر اسے کچھ زیادہ ہی ’’بااختیار‘‘ رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔

’’اوخیر......‘‘ اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس ناہنجار اور بدتمیز گارڈ سے تلخ لہجے میں کہا۔

’’کیا تم ہر آنے جانے والے مہمان سے اسی طرح پیش آتے ہو؟‘‘

’’مہمان گیا بھاڑ میں......‘‘ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ’’پہلے اپنی گاڑی پیچھے کرو اور پھر کار سے نیچے اُتر کر بات کرو......‘‘ میں نے ایک سرد نظر اس پر ڈالی۔ اس کا دوسرا ساتھی اس کے پیچھے نہایت محتاط انداز میں کھڑا ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل گن تھی۔

میں نے اول خیر کو کار تھوڑا پیچھے سرکانے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریورس گیئر ڈالا اور کار چند گز پیچھے ہو گئی۔

’’اور...... پیچھے کرو......‘‘ وہ بدتمیز سا گارڈ پھر کڑک دار لہجے میں بولا۔ میں تب تک بھنائے ہوئے انداز میں کار کا دروازہ کھول کر باہر اُتر آیا اور اس تنومند گارڈ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

’’بس! اب بہت ہو گیا...... جتنی تمہاری اوقات ہے اُتنا ہی پھیلو...... اندر میرا ایک بھتیجا اور بھتیجی رہتے ہیں پنکی اور دانی، ان سے کہو تمہارا چچا آیا ہے......‘‘

میرے جارحانہ انداز اور بارعب لہجے نے اُسے تھوڑا خفیف کر دیا پھر چچا اور بھتیجے کے ذکر پر بھی وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ تاہم اس کی اکڑ پھر بھی کم نہ ہوئی۔ وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

’’اپنا تعارف کرواؤ...... پہلے کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا گیا ہے......‘‘

’’بچوں سے کہو تمہارا شہزی انکل آیا ہے...... وہ دونوں بھاگتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔‘‘

’’شہزی......؟‘‘ وہ چونکا۔ میرا نام اس طرح زیرلب دہرانے پر میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا کہ اسے ’’شہزی‘‘ سے متعلق پہلے سے ہی کچھ بریفنگ دی جا چکی تھی۔ کیونکہ میری عقابی نگاہوں نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ دونوں روایتی قسم کے خان ٹائپ ڈنڈا بردار چوکیدار نہیں، بلکہ پروفیشنل گارڈز بھی نہ تھے۔ ان سے مجھے ’’کارپردازی‘‘ کی بُو آ رہی تھی۔

میری آبزرویشن درست ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ چند قدم پیچھے ہٹے اور اپنے ماؤزر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولے۔

’’شہزاد احمد خان ہو......؟‘‘

’’ہاں......!‘‘

’’تب پھر اُلٹے پیروں واپس لوٹ جاؤ......‘‘ اس کا

لہجہ پل کے پل جارحانہ ہو گیا۔ تب تک اول خیر بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر چکا تھا۔ وہ میری طرف سے اشارے کا منتظر تھا۔

"کیوں......؟" میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

"ستار! فوراً پولیس کو مطلع کرو......"

ستار نامی اس کا ساتھی...... پلٹا۔

"اس کی ضرورت نہیں......" میں نے پل کے پل سوچتے ذہن کے ساتھ کہا۔

"چلو......" میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ ستار نامی وہ آدمی بھی جاتے جاتے رک کر پلٹا۔

اگلے چند سیکنڈوں میں ہم دوسری شاہراہ پر تھے۔

"اوخیر...... کچھ گڑبڑ لگتی ہے کاکے!" اول خیر نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم بولا۔

"کسی ایزی لوڈ والے کے پاس کار روکو......" اول خیر نے ایسا ہی کیا۔

پی سی اوز کا رواج آج کل نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ورنہ گلی گلی میں پی سی او نظر آیا کرتے تھے۔ ایزی لوڈ والوں کے پاس یہ سہولت کبھی کبھار دستیاب ہو جاتی تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ میں نے چونکہ بیگم ولا کے لینڈ لائن سے فون کیا تھا اسی لیے کسی نے جان بوجھ کر نہیں اُٹھایا جس کا صاف مطلب تھا کہ اندر ان دونوں بچوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے "کارپرداز" مقرر کیے گئے ہوں گے، جنھیں خاص طور پر میرے سلسلے میں "بریفنگ" دی گئی ہوگی۔

ایزی لوڈ والے نے مجھے نمبر ملا کر دیا۔ ان لوگوں کے پاس الگ تھلگ بات کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ بس، وہیں کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے بات کرنا ہوتی تھی۔

دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ نمبر اجنبی تھا اور یہی میں چاہتا تھا اسی لیے اُمید تھی کہ کال دوسری جانب سے ضرور ریسیو کی جاتی...... تیسری بیل پر مجھے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو......" میرا محتاط ذہن اس کی آواز اور لہجے سے کچھ "اخذ" کرنے لگا۔

"ہیلو، مجھے دانی سے بات کرنی ہے۔"

مجھے کچھ ٹھیک اندازہ نہ تھا کہ گیٹ پر موجود اُن دونوں گارڈ نما کارپردازوں نے ابھی میرے بارے میں اندر مطلع کیا تھا یا نہیں۔

"آپ کون ہو؟" دوسری طرف سے اسی خاتون نے پوچھا۔ لہجہ سرد و سپاٹ تھا۔ یہ سب مجھے باہر سے اندر تک کے کارپرداز ایک ہی "کلیبر" کے لگے۔ یعنی ہدایت یافتہ۔

"میں ان کا انکل شہزی بول رہا ہوں......"

"شٹ اَپ! آئندہ فون مت کرنا۔" خاتون نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میرا دماغ بھنا گیا۔ جی تو چاہا کہ اسی وقت درانہ وار عارفہ کی کوٹھی میں جا گھسوں اور گارڈ سمیت اس بدتمیز خاتون کو سبق سکھا دوں۔

"بھائی صاحب! بات کر لی آپ نے......؟" مجھے اس طرح خالی فون تھامے دیکھ کر دکاندار نے کہا۔

"جی، جی ہاں! شکریہ بھائی!" میں نے قدرے چونک کر کہا۔ اسے پیسے دیے اور دکان سے نیچے اُترا، اول خیر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"خان جی کے ہاں چلو......" میں نے اسے فون والی خاتون کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

"اوخیر...... کاکے! یہ بھی کوئی لمبی کھیڈ معلوم ہوتی ہے۔" اس نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کھیڈ کیا ہوگی اول خیر......!" میں نے ایک گہری ہمکاری لیتے ہوئے کہا۔

"عارفہ اپنے دونوں بچوں کو کرائے کے ٹٹو کے حوالے کر گئی ہے۔ انہیں سبق سکھانا کون سی معمولی بات ہے۔"

"اوخیر...... کاکے! ذرا ہتھ ہولا رکھ...... ایک آئیڈیا ذہن میں آیا ہے میرے......" وہ پُرخیال سے لہجے میں بولا۔

"بولو......"

"آج خان جی کے ہاں جانے کا پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "پہلے اس حرافہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا جائے اور پتا لگایا جائے آخر اندر وہ کون لوگ ہیں جو دونوں بچوں کے سرپرست بنے بیٹھے ہیں؟"

"کیا فرق پڑے گا اس سے......؟" میں نے بے پروا انداز میں کہا۔

"ایک بات کہوں شہزی کاکے! مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔" اول خیر کی بات پر ہی نہیں اس کے لہجے نے بھی جانے کیوں مجھے لحہ بھر کو چونکا دیا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اول خیر، شکیلہ کی

طرح ہی کبھی کبھی دور کی کوڑی لاتا تھا۔

”تم ایک فضول مہم جوئی میں وقت برباد کرنے کی بات کر رہے ہو اول خیر......!“ پچھلی سیٹ پر کافی دیر سے خاموش بیٹھی شکیلہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”یہ کام بعد میں بھی ہوسکتا ہے اور اتنا ضروری بھی نہیں۔ پہلے ہمیں خان جی سے مل لینا چاہیے۔ ممکن ہے نوشابہ وغیرہ سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آئے۔“ اس کا مشورہ بھی غلط نہ تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے اول خیر کی دال میں کالا ہے والی بات نے شبہے میں ڈال دیا تھا۔

”شکیلہ! اول خیر کی بات نے مجھے واقعی ایک بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب پہلے اسی بات کا کھوج لگاتے ہیں۔“

”یہ خیرا تو ہے ہی ایک بے چین روح......“ شکیلہ نے ہنس کر کہا۔ وہ اسے ’خیرا‘ ہی کہتی تھی، اور اول خیرا اسے ’نازکی بیگم‘ یعنی نازک بیگم۔

”جی نازکی بیگم! میں بے چین روح ہوں تو آپ کیا ہیں محترمہ! ایک چڑیل......“

”چڑیل تو خیر میں نہیں ہوں، تم ایک بدروح ضرور دکھائی دیتے ہو۔“ وہ بولی۔

”اول خیر! گاڑی روک دو......“ میں نے فوراً کہا۔

ہم کوٹھی سے دور آ گئے تھے۔ یہاں ایک مختصر سا چوراہا تھا۔ میں نے دونوں سے کہا۔

”ایک کام تم دونوں کے سپرد کر رہا ہوں، بہت توجہ اور ہوشیاری سے انجام دینا ہوگا۔ کوٹھی کی خفیہ نگرانی کرو اس وقت تک جب تک کہ کوئی اندر سے گارڈ کے علاوہ برآمد نہ ہو...... اس کی تصویر اتارنا اور اس کا پیچھا کرنا، مزید اس سلسلے میں جو کر سکو کر کے مجھے بیگم ولا آ کر رپورٹ دو......“

”مگر تم......؟“ شکیلہ بولی۔

”میں ٹیکسی لے لوں گا اور خان جی سے ملاقات کر کے بیگم ولا پہنچ رہا ہوں......“

”او خیر......!“

کار سے اُترتے ہی مجھے اول خیر کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ٹیکسی کروائی اور اسے مین شاہراہ پر آنے کا کہہ کر جیب سے سیل فون نکالا جو زہرہ بانو نے مجھے عارضی استعمال کے لیے دیا تھا۔ میں نے خان جی سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں مل سکتے ہیں؟ شکر تھا کہ وہ اپنی جاگیر کھلاں والی کے بجائے نیلی کوٹھی میں ہی تھے۔ (مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیلی کو طلاق دینے کے بعد اب اس کوٹھی کا اُنہوں نے کیا نام رکھا تھا)

اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک اہم پارٹی اجلاس کے سلسلے میں نیلی کوٹھی میں مقیم ہیں۔

ڈرائیور تب تک ٹیکسی کو مین شاہراہ پر لے آیا تھا۔

تب ہی میں نے اسے ملتان روڈ پر واقع نیلی کوٹھی کے علاقے کا پتا بتایا اور اس نے رفتار بڑھا دی۔

قریباً نصف گھنٹے بعد ٹیکسی نے مجھے نیلی کوٹھی کے پاس اُتار دیا۔ میں نے کرایہ دے کر اسے فارغ کیا اور دیکھا کہ کوٹھی کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔ جہاں پہلے نیلی کوٹھی کے الفاظ کندہ ہوتے تھے وہاں اب کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں خان جی کی تصویر کے ساتھ پارٹی بینرز آویزاں نظر آ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ خان جی پوری شدومد کے ساتھ دوبارہ سیاست میں اپنی انٹری دے چکے تھے اور اپنی سیاسی مہم جوئی کا گڑھ اب شاید مستقل طور پر اسی جگہ کو بنا لیا تھا۔ وہاں مسلح گارڈ کے علاوہ پارٹی ورکرز کی بھی چہل پہل دیکھنے میں آ رہی تھی۔ عام انتخابات قریب تھے اور اسی لیے یہ سارا جوش نظر آتا تھا۔

لیکن...... اچانک مجھے چونکنا پڑا...... کچھ دوسرے زاویے سے مجھے چند ایک اور بھی پارٹی بینرز لگے دکھائی دیے جن پر دیگر پارٹی عہدے داروں کی بھی تصاویر نظر آتی تھیں، انہی میں مجھے ایک شناسا چہرہ بھی دکھائی دیا تھا اور مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ میں ذرا اور قریب جا کے بغور دیکھنے لگا کہ کہیں یہ میری نظروں کا دھوکا نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا جو میں دیکھ رہا تھا، وہ سچ تھا۔

یہ ایک خاتون کا پُرجوش اور دھواں دھار تقریر کرتا ہوا چہرہ تھا۔ میں اس چہرے کو بھلا کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ اس چہرے کے ساتھ تو میری بہت سی بھیانک اور جاں گسل یادیں وابستہ تھیں۔ صرف یادیں ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک اور...... مظلوم چہرہ بھی وابستہ تھا، اور اصل حوالہ وہی مظلوم چہرہ تھا۔ وہ بدنصیب آسیہ کا تھا۔ جو ہر سے مجھ سے سوال پوچھتا محسوس ہوتا تھا کہ......”شہزی! میں ظلم و جبر کی تاریک بھیانک راتوں میں بڑی بیدردی کے ساتھ روندھ دی گئی، مار دی گئی...... اور میرا قاتل چوہدری ممتاز ابھی تک زندہ ہے، اور...... تم بھی زندہ ہو......“ بس! فقط یہی ایک سوال ہوتا اس بدنصیب کے نظر آنے والے چہرے پر۔

جس خاتون کی تصویر میں نے بینر پر دیکھی تھی، وہ آسیہ کی باجی یعنی اس کی بڑی بہن ایڈووکیٹ خانم شاہ کی

تھی۔

’’ہم...... تو گویا اس نے خان جی کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔‘‘ میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ جس پر مجھے حیرت تھی اور اُتنی ہی اُلجھن بھی کہ خانم شاہ کی تو ماضی میں خان صاحب سے اچھی خاصی مخاصمت چلی آ رہی تھی بلکہ وہ تو اس کے آدمیوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر اسپتال بھی جا پہنچی تھی۔ اس لڑائی کی وجہ بھی اگرچہ میں ہی تھا جب خانم شاہ اپنے مفاد کی خاطر مجھے پولیس کو رضا کارانہ گرفتاری کے لیے بہ ضد تھی مگر خان جی اور میں نے اس کی تجویز ٹھکرا دی تھی۔ وہ بھی اپنی ہٹ پر قائم تھی اور اس نے دھمکی دے ڈالی تھی وہ پولیس کو بتا دے گی کہ میں خان جی کی رہائش گاہ پر چھپا بیٹھا ہوں جس پر خان جی تپ گئے تھے اور یوں خانم شاہ لڑائی میں زخمی ہو گئی تھی تب بھی میں نے ہی اس کی جان بچائی تھی۔ مگر...... اب اسے خان جی کی پارٹی میں ایک عہدے دار کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے شدید حیرت آمیز اُلجھن ہوئی تھی۔ ایک ہی جواب اس کا میرے ذہن میں آتا تھا کہ کیا...... خانم شاہ اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے...... کسی سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کو محسوس کر رہی تھی؟

مجھے گیٹ پر ہی شناخت کے لیے روک لیا گیا تو میں نے خان جی کے پرسنل نمبر پر اُن سے رابطہ کر کے اپنے بارے میں بتایا تو انہوں نے فوراً ہی اندر سے اپنا کوئی خاص بندہ باہر بھیج دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈ فوراً دائیں بائیں ہٹ گئے۔ وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے ملا اور اندر لے گیا۔

ایک طرف پارٹی ورکرز کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا جا رہا تھا جہاں عارضی چولہے بنا کر دیگیں چڑھا رکھی تھیں۔ مجھے لانے والا ایک دبلا پتلا مگر خاصا پُرجوش سا میری ہی عمر کا ایک گورا چٹا خوبرو نوجوان تھا۔ جس نے مجھے اپنا نام فرید بتایا تھا۔ وہ مجھے اندر ایک آرام دہ کمرے میں لے آیا۔ میں اس کمرے کو پہچانتا تھا، یہ نشست گاہ سے ملحقہ کمرا تھا۔ اس طرف سے مجھے لوگوں کے شور اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ خان جی نے مجھے اس کمرے میں کیوں بٹھایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک درمیانی عمر کا شخص ٹرالی دھکیلے اندر داخل ہوا۔ مجھے صرف چائے کی طلب ہو رہی تھی اسی لیے میں نے اس سے یہی فرمائش کر ڈالی، اس نے چائے بنا کر ایک نفیس کپ میں نہایت احترام کے ساتھ مجھے تھما دی۔ یہ وہ کمرا تھا جہاں خان جی اپنے خاص مہمانوں سے ہی ملاقات کرتے تھے۔ اسی اثنا میں فرید مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

’’شہزی صاحب! خان جی ابھی تھوڑی دیر میں تشریف لاتے ہیں، آپ جب تک چائے پئیں۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ میں نے مختصراً کہا۔ وہ لوٹ گیا۔ چائے ختم کر لی میں نے تو خان جی بھی آ گئے۔ میں انہیں دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے پہلے سے خاصے کمزور نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو پھیلائے میری طرف بڑھے اور میں ان کی طرف...... ایک گرمجوش معانقہ ہمارے درمیان ہوا تھا جس کا دورانیہ کئی منٹوں تک رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لگا ان کا وجود ایک جذباتی سے ارتعاش تلے محسوس ہوتا رہا تھا۔

’’کہاں چلے گئے تھے یار...... تم......؟ کتنا انتظار تھا مجھے تمہارا...... بیٹھو......‘‘ وہ مجھ سے الگ ہو کے میرے دونوں بازوؤں کو تھام کر محبت سے بولے۔ میں جب بھی اسے اپنے ساتھ اس طرح کے پیار بھرے جوشیلے انداز میں ملتے دیکھتا تھا تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ وہ کبھی ایک جوان بیٹے کا باپ ہوا کرتا تھا۔ شفقت راجہ کے اندوہناک قتل کے بعد یہ میرا جانی دشمن بن گیا تھا مگر آفرین ہے اس شخص پر کہ اس نے انتقام میں اندھا اور جوش و جذبات سے کام لینے کے بجائے ہوش و حواس سے جلد ہی یہ پتا چلا لیا تھا کہ یہ محض اس کی غلط فہمی تھی، اس کے بیٹے کا قاتل میں نہیں بلکہ چوہدری ممتاز اور اس کے حواری تھے۔ تب اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس وقت کے بعد سے وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔

’’میں نے تمہاری پریس کانفرنس سنی اور دیکھی تھی۔ بہت بڑے کارنامے انجام دے کر آئے ہو تم...... خاص کر طلسم نور ہیرا...... اور نوشابہ اور اس کے باپ چوہدری ممتاز کے خلاف اور اسے دوبارہ سزا تلے لانے کا عزم...... واہ بھئی واہ...... دل خوش کر دیا۔ اُن دونوں باپ بیٹی کو تو بے چینی کھا گئی ہوگی......‘‘

ان کی بات پر میں مسکرا کر رہ گیا۔

’’ارے تم نے کچھ کھایا ہی نہیں......؟‘‘ وہ چونک کر بولے۔

’’بس! چائے کا ہی دل چاہا تھا، مجھے ذرا جلدی بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہے۔ بس! ابھی آپ کو سلام کرنے آیا تھا، پھر کبھی تفصیلی ملاقات ہوگی……“ میں نے رخصت ہونے والے انداز میں کہا تو وہ پریشان سے ہوگئے، بولے۔

”ارے…… رے…… نہیں بھئی، تم اب کچھ روز اِدھر ہی رہو گے…… دیکھ نہیں رہے ہو…… کیسی ہنگامہ خیزی پال رکھی ہے میں نے…… کیسے کیسے لوگ میری پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے لگے ہیں…… سیاست میں یہی ہوتا ہے، کسی کی مخالفت میں کسی کا فائدہ…… سمجھو تو یہی فائدہ ہم اُٹھا رہے ہیں…… ہمیں سپورٹ بھی ہے……“ آخر میں اُنہوں نے مجھے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری تھی اور میں تھوڑا چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ذہن میں ہنوز خانم شاہ کا نام گردش کررہا تھا۔

”میں تو تمہیں بھی اپنی پارٹی میں ایک بڑا عہدہ دے کر شامل کرنا چاہتا ہوں…… تمہاری انٹری بڑی دبنگ اور دشمنوں کی نیندیں اُڑا دینے کے لیے کافی ہوگی اور اگلے الیکشن میں ہماری جیت یقینی کی ضمانت بھی……“

نجانے کیا بات تھی آج زبیر خان المعروف خان جی مجھے اور ہی روپ میں نظر آرہے تھے۔ آخر انہیں کس کی سپورٹ حاصل ہوگئی تھی؟ یہ اتنے پُراُمید اور پُرجوش کیوں تھے؟ میری اور چوہدری ممتاز بہ شمول اس کی بیٹی نوشابہ کی دشمنی سے یہ کس قسم کا فائدہ اُٹھانے کی سوچ ہوئے تھے؟ میں ایک دم محتاط ہوگیا اور بولا۔

”خان صاحب!“

”اُونہہ…… نو خان صاحب! کتنی بار کہا ہے، مجھے صرف انکل کہو……“ وہ ہنسے۔

”معافی چاہتا ہوں، انکل! میں سیاست بازی سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں، یہ میرے قبیل میں ہے نہ ہی بس میں……“ میں نے جواب دیتے ہوئے فوراً موضوع بدلا اور خانم شاہ کا ذکر کرڈالا۔ وہ ہنسے۔

”تو تم نے اس کی باہر بینر پر لگی تصویر دیکھ ہی لی…… اس نے حال ہی میں ہماری پارٹی جوائن کی ہے……“

”بہت اچھی بات ہے……“ میں نے کہا۔ ”لیکن…… حیرت ہوئی…… خانم شاہ تو آپ کو اپنے دشمنوں کی قطار میں سمجھتی آرہی تھی اور آپ پر کیس کرنے کی تیاری میں تھی۔“

”اُسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوگیا تھا۔“

”اچھی بات ہے، خوشی ہوئی یہ سن کر……“ میں نے ہولے سے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے مگر میں پھر کبھی آنے کا وعدہ کرکے لوٹ آیا۔ انہیں حیرت تھی کہ میں ٹیکسی میں آیا تھا۔ دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئے تو انہیں یہ پتا چلا تھا۔

”کمال ہے، کیا زہرہ بیگم کے پاس گاڑیوں کی کمی ہو گئی ہے؟“

”ایسی بات نہیں، انکل!“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ کچھ ساتھی تھے، انہیں اچانک کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا، گاڑی وہ لے گئے تھے، میں ٹیکسی میں آ گیا۔“

خان جی نے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت مجھے دے دی مگر میں نے معذرت کرلی۔

”کیا بات ہے، بہت غیریت برتنے لگے ہو……“ وہ شکایتی لہجے میں بولے۔ میں مسکرایا اور رسان سے بولا۔

”ایسی بات تو نہیں انکل! دراصل مجھے دو ایک اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔ بلاوجہ فکر رہے گی، ٹیکسی کرادیں یہی بہت ہے۔“

اُنہوں نے ٹیکسی کروا دی اور ڈبل کرایہ ٹیکسی والے کو دے دیا کہ میں اسے جہاں کہوں وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا اور ان سے رخصت ہوکے چلا آیا۔

میری توقع کے خلاف خان جی سے ملاقات بہت مختصر رہی۔ شاید ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ اپنی انتخابی مہم میں مصروف تھے اور میں نے بھی ان کا زیادہ وقت لینا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ خاص باتیں نہیں بتائی تھیں جن کی میں توقع کیے ہوئے تھا۔ ان کی نالج میں سب

خالہ

خاتون گود میں بچہ لیے فارمیسی میں آئیں۔ وہ بچّے کا وزن کرنا چاہتی تھیں۔ سیلز مین نے بتایا کہ بچوں کا وزن کرنے کی مشین مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ بڑی مشین پر ماں اور بچے کا وزن کرکے اس میں صرف ماں کا وزن گھٹا دیا جائے تو آسانی سے بچے کا وزن معلوم ہو جائے گا۔

خاتون نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بے کار ہے…… کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میں بچے کی ماں نہیں، خالہ ہوں۔“

کراچی سے میمونہ عزیز کا عذر

کچھ وہی تھا جو میں بھی جانتا تھا، جبکہ ایڈووکیٹ خانم شاہ کی ان کی پارٹی میں شمولیت نے مجھے جانے کیوں ایک نامعلوم سی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خان جی نے کسی ”سپورٹر“ کا ذکر کیا تھا اور اس بارے میں خود میں بھی تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بات بری لگی تھی کہ خان جی نے میرے استفسار کے باوجود مجھے اس کا نام بتانے سے گریز کیا تھا۔ وہ آخر اپنے سپورٹر کا نام مجھ سے کیوں مخفی رکھنا چاہتے تھے؟ کم از کم مجھے تو بتا دینا ہی چاہیے تھا جبکہ ہم نے پہلے کبھی بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

پتا نہیں اب یہاں کون سی نئی کھچڑی پکنے لگی تھی، میں اپنے ذہن کو زیادہ اُلجھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کس وقت میرا امریکا روانگی کا پروانہ جاری ہونے والا تھا۔ میں کسی نئے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کم از کم خان جی کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ میں نے اول خیر اور شکیلہ کے متعلق اندازہ قائم کرنا چاہا کہ انہوں نے اب تک اپنے حصے کا کتنا کام نمٹایا ہو گا۔ میرا انہیں خیال تھا کہ وہاں سے کوئی خاص پیش رفت ہوئی ہو گی۔ کیونکہ مجھے انہیں عارفہ کی کوٹھی کے قریب چھوڑے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو عارفہ کی کوٹھی کے علاقے کا نام بتا دیا۔

اس نے رفتار بڑھا دی۔

آدھے گھنٹے بعد میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ ٹیکسی والے کو میں نے روانہ کر دیا اور خود مٹر گشت کے انداز میں چلتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں میں نے ان دونوں کو کار سمیت چھوڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ کار سمیت دونوں ہی وہاں سے غائب تھے جس کا صاف مطلب تھا انہوں نے یقیناً عارفہ کی کوٹھی سے کسی مشکوک شخص کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ ضرور ان کے تعاقب میں گئے ہوں گے، لہٰذا اب وہ اپنا ”کام“ نمٹانے کے بعد سیدھا بیگم ولا کا ہی رخ کریں گے۔

میرا اب یہاں کھڑے رہنے کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار مجھے نظر آئی، اس کا رخ عارفہ کی رہائش کی طرف جانے والے راستے پر ہی تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس میں دو افراد سوار تھے۔ میری عقابی نظروں نے فوراً انہیں تاڑنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی ہنڈا اسٹی تھی۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر شاید اے سی آن تھا۔ ایک تو ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر میں کوئی سوٹ پوش شخص بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بھاری اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں، رنگ سانولا تھا، میرے لیے دونوں ہی کی صورتیں اجنبی تھیں۔ کار ایک موڑ پر غائب ہو چکی تھی۔

میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف کو گیا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کار عارفہ کی کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہ گیا کہ یہ دو افراد کون تھے؟ آخر عارفہ کی کوٹھی میں...... اس کی غیر موجودگی میں کیا گل کھلایا جا رہا تھا؟ مجھے نامعلوم سے تجسس نے بے چین کر دیا اور میں نے سردست بیگم ولا جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

مجھے جانے کیوں دانی اور پنکی کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ دانی اور پنکی سے میرا رشتہ بڑا جذباتی تھا۔ وہ دونوں بھی مجھ سے ایسا ہی لگاؤ رکھتے تھے۔ جبکہ سرمد بابا (سیٹھ منظور وڑائچ) کے الفاظ بھی مجھے یاد تھے کہ ”شہزی بیٹا! میرے ان دونوں بچوں (پوتے پوتی) کا خیال رکھنا، جب تک عارفہ جیسی ناگن اور نوید سانچے والا جیسا سانپ زندہ ہے، یہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں......“ اور میں نے سرمد بابا سے وعدہ کیا تھا۔

یہ تو خیر حقیقت ہی تھی کہ عارفہ کبھی اپنے بچوں کا بُرا نہیں سوچے گی مگر نوید سانچے والا ایک زہریلا سانپ تھا۔ بہ قول سرمد بابا مرحوم کہ، وہ بدبخت ان کی بیوہ بہو عارفہ کو بہکائے ہوئے تھا اور وہ اس کے بہکاوے میں آئی ہوئی تھی۔ جبکہ تنہائی کی ماری ہوئی عارفہ کی آنکھوں پر بھی جذباتیت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مکار نوید اس کی اسی کمزوری سے کھیل رہا تھا۔

کار اندر داخل ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کیا کروں......؟ بالآخر میرے اندر کی بے چینی نے مجھے دھکیلا کہ چاہے کچھ بھی ہو...... اندر جا کر دیکھنا چاہیے کہ یہ سارا معاملہ کیا تھا؟ آخر عارفہ اپنے دونوں ٹین ایجز بچوں کو کن لوگوں کے حوالے کر کے اپنے نئے شوہر کے ساتھ بیرونِ ملک ہنی مون کے لیے گئی تھی؟

یہ تہیہ کرنے کے بعد میں ابھی اپنی پیش قدمی کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک میں چونکا۔ گیٹ سے وہی کار دوبارہ برآمد ہو رہی تھی۔ اتنی جلدی اس کی واپسی کی مجھے توقع نہ تھی، میں ایک اور بنگلے کی دیوار کے سرے پر کھڑا تھا۔ پوش علاقہ ہونے کے باعث اطراف میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کار میں وہی ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی جہاں میں نے اس سوٹ پوش موچھیل کو براجمان دیکھا تھا۔ البتہ عقبی سیٹ پر میں پنکی کو بیٹھے دیکھ کر بری طرح چونکا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''یہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟'' ایک دم میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں سوالیہ نشان اُبھرا۔ میں بے چین ہوگیا۔ کار مین شاہراہ کی طرف جا رہی تھی، میں راستہ کاٹ کر دوڑا...... اور ایک ٹیکسی والے سے بات کر کے اسے ایک متوقع راستے پر پہنچنے کا کہا۔ وہ حیران اور پریشان ہوا کہ نجانے یہ کیا معاملہ تھا، مگر میں نے اپنا کارڈ شو کر کے اس سے کہہ دیا کہ میں خفیہ پولیس کا مخبر ہوں، وہ بے فکر رہے اسے منہ مانگا کرایہ ملے گا۔ وہ بھی کوئی من موجی سا آدمی تھا، بولا۔

''او جی...... سیدھا کرایہ ہی مل جائے، یہی بہت ہے۔'' وہ شاید پولیس والوں سے نالاں نظر آتا تھا۔

''ملے گا...... چلو۔'' میں نے فوراً کہا اور اسی وقت متوقع راستے پر میں نے اسی ہنڈا کار کو نمودار ہوتے دیکھا۔

''وہ دیکھو، سیاہ ہنڈا...... اسی کا بڑی ہوشیاری سے تعاقب کرنا ہے جہاں یہ رکے وہاں ذرا فاصلے سے مجھے بھی اُتار دینا، پھر تم فارغ......'' میں نے اس سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

کار مین روڈ پر آ کر فراٹے بھرنے لگی۔ روڈ میں ٹریفک بھی تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اس کار کو کھو نہ دے مگر وہ بھی ہوشیار آدمی تھا۔ ہنڈا کا تعاقب کرتا رہا۔ ایک دو بار تو کار نظروں سے اوجھل بھی ہوگئی مگر ڈرائیور نے اسے جلدی ہی جا لیا تھا۔ یہ سفر کم و بیش پندرہ سے بیس منٹ جاری رہا اور جب میں نے دیکھا کہ کار ایک کوچنگ سینٹر کے سامنے رک گئی ہے تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ گویا پنکی کی کوچنگ کی کلاس تھی۔ میں نے ٹیکسی روکنے کا کہا اور ڈرائیور کا شکریے کے ساتھ کرایہ ادا کر کے اسے چلتا کر دیا۔ وہاں اور بھی گاڑیاں موجود تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ پنکی کار سے اُتری۔ اس کے کاندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ وہ اندر چلی گئی تو کار حرکت میں آگئی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں آگے بڑھا اور کوچنگ سینٹر میں داخل ہو گیا۔ یہ خاصا مہنگا اور مشہور کوچنگ سینٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمارت بڑی اور جدید اسٹائل کی بنی تھی۔

ایڈمنسٹریشن کے کمرے میں پہنچ کر میں نے سعدیہ سے ملنے کی درخواست کی۔ پہلے تو مجھ سے میرا نام اور پنکی (سعدیہ) سے میرا تعلق پوچھا گیا۔ پھر کہا گیا کہ ہم اسے اطلاع دے دیں گے۔ اگر اس نے آپ کو پہچان لیا تو ٹھیک ہے ورنہ...... آپ جا سکتے ہیں۔

وہ پرنسپل یا منتظم ٹائپ کا کوئی شخص نظر آتا تھا۔ تاہم اس نے آخر میں یہ کہا تھا کہ ابھی تو کلاس ہو رہی ہے، ایک گھنٹے بعد بریک ہوگی تو دیکھا جائے گا۔

مجھے منتظم کا رویہ کچھ روکھا سا محسوس ہوا۔ وہ ایک بھاری جسامت کا عمر رسیدہ شخص تھا۔ کرخت مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر جانے کا کہا کہ آپ باہر کہیں کھڑے ہو کر انتظار کر لیں۔ مجھے غصہ تو آیا مگر میں پی گیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل کر باہر جانے کے بجائے دائیں جانب بنے کوریڈور کی طرف گھوم گیا، یہاں ٹھنڈے پانی کے واٹر ڈسپنسر رکھے تھے، میں بظاہر پانی پینے کے بہانے اس طرف مڑا تھا مگر مقصد میرا اس کھڑکی کے قریب آنا تھا جو منتظم کے کمرے میں کھلتی تھی۔ جس کا نظارہ میں اندر سے کر چکا تھا۔ درحقیقت مجھے اس کے رویے نے چونکا دیا تھا۔ کچھ شبہے کی بُو مجھے آئی تھی یا کوئی ایسی کھٹک جاگی تھی کہ یہ مجھے اپنے کمرے سے اس طرح روانہ کرنے کے بعد کیا کرتا ہے؟

''ہیلو، باہر ایک لمبا چوڑا اور اسمارٹ سا نوجوان کھڑا ملے گا تمہیں...... جس نے سیاہ جینز اور میرون کلر کی چست پینٹ پہن رکھی ہے۔ اس پر نظر رکھنا۔'' میں نے کھڑکی کے قریب سرک کر اس کی باتیں سنیں اور مجھے سانپ سونگھ گیا۔

''ہاں...... ہاں! ابھی نظر آجائے گا، ابھی تو میں نے روانہ کیا ہے اسے اپنے کمرے سے......'' منتظم بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔

''ہیلو، ہاں، راٹھور صاحب! ابھی ابھی ایک مشکوک سا شخص سعدیہ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ اپنا نام صرف شہزاد ہی بتایا ہے۔ مگر میں نے اسے نہیں ملنے دیا ہے ابھی تک...... جی ٹھیک ہے آپ آجایئے، مگر خیال رکھیے گا کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہو...... آپ کی ہدایت تھی اسی لیے آپ کو اطلاع کر دی...... ساکھ کا معاملہ ہے یہ...... جی جی! بہت بہت شکریہ...... آپ کی مہربانی ہے۔''

اس کی باچھیں پھیلتی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کسی راٹھور نامی شخص نے اسے پنکی سے متعلق محتاط کر رکھا تھا اور اس میں یقیناً اس نے انعام کا بھی لالچ رکھا ہوگا۔ گویا میری بھنک کوٹھی سے نکل کر چار دانگ پھیل گئی تھی۔ راٹھور نامی شخص کون ہو سکتا تھا؟ غالباً یہ نوید یا عارفہ کا ہی رکھا ہوا آدمی ہو گا۔ جو دونوں بچوں کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہو گا۔ مگر کیوں......؟ ایسی کیا بات ہوگئی تھی کہ انہیں یہ قدم اُٹھانا پڑا۔ ایک اور خیال ذہن میں آتا تھا کہ کیا خبر یہ عارفہ کے بجائے صرف سیٹھ نوید سانچے والا کی ہی کارستانی ہو مگر کیوں......؟ اس کیوں کا جواب خاصا اسرار بھرا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اس راٹھور نامی شخص کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش چاہی، کہیں یہ وہی سوٹ بوٹ اور موچھیل سا شخص تو نہ تھا جسے اسی کار میں، میں نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا؟

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور پھر جلدی سے پانی پینے کے لیے ایک واٹر ڈسپنسر کی طرف بڑھا۔ کیونکہ میں نے وہاں ایک نیلی وردی والے چوکیدار کو دیکھا تھا جو اسی طرف آرہا تھا۔ وہ مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف بڑھ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، سمجھ نہیں آرہا تھا مجھے اب کیا کرنا چاہیے، یہاں بھی دال گلتی نظر نہیں آرہی تھی۔ تب ہی میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پلٹ کر تیزی سے زینے چڑھتا چلا گیا، جہاں کلاس روم کے طور پر مستعمل کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں اب ایک ایک کمرے میں کھڑکی کے راستے جھانکنے لگا۔ کلاس ہو رہی تھی۔ میں اسی طرح کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک ایک کلاس میں جھانکتا رہا اور دفعتاً چونکا۔ کھڑکی سے دو بینچیں چھوڑ کر میں نے پنکی کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ ڈیسک ٹیبل پر جھکی کچھ لکھنے میں محو تھی۔ لیکچر ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار سر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ لے جا کر ہولے سے اسے آواز دی۔ چند ایک اسٹوڈنٹس نے میری طرف دیکھ کر منہ بنایا۔ پنکی پہلے تو مجھے پہچان ہی نہ سکی۔ پھر جب پہچانی تو اس کا منہ یکلخت حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں نے اسے کلاس روم سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور دور ہٹ گیا۔

مجھے جلدی تھی۔ کسی وقت بھی راٹھور نامی وہ آدمی یہاں پہنچنے والا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ انتظامیہ کا کوئی آدمی بھی یہاں نکل آتا۔

شکر ہوا کہ ذرا ہی دیر میں...... پنکی باہر آگئی۔ وہ بے اختیار ’’شہزی انکل‘‘ کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

’’شہزی انکل آپ کہاں چلے گئے تھے، میں اور دانی بھائی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔‘‘ وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ’’ماما! بہت گندی ہیں، اُنہوں نے ہماری ناراضی کے باوجود اس گندے آدمی سے شادی کر لی ہے۔‘‘ وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

میں نے اُسے پیار کیا اور دھیرے سے الگ کر کے بولا۔

’’پنکی بیٹا! پریشان مت ہونا، اب میں آگیا ہوں ناں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، میں نے تمہارے گھر آنے کی کوشش بھی کی تھی مگر مجھے نہیں آنے دیا گیا۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے انکل!‘‘ وہ نمناک آنکھوں سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

’’انکل! ماما اور اس گندے آدمی نوید نے ہماری حفاظت کے نام پر بدمعاش لوگوں کو ہماری نگرانی پر رکھا ہوا ہے، یہ بات مجھے اور دانی کو بالکل بھی پسند نہیں۔ دانی تو جوشیلا ہے وہ ان سے لڑ بھی پڑتا ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں، مت ان کے منہ لگے لیکن شہزی انکل! مجھے ایک بات پر بڑی تشویش ہے۔‘‘ اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا جس پر میں چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

پنکی مجھے کافی سمجھ دار نظر آرہی تھی۔ وہ اب بچپنے سے لڑکپن...... میں داخل ہو رہی تھی۔ بالکل ایک پیاری سی اور سمجھ دار ٹین ایجر لڑکی کے روپ میں نظر آرہی تھی۔

’’شہزی انکل! بھائی تو نہیں البتہ میں ان لوگوں کی باتیں چھپ کر سنتی رہتی ہوں، چاہتی تھی کہ کاش کوئی ہماری مدد کو آجائے...... آپ تو اس برے وقت میں بہت یاد آتے تھے ہمیں...... مگر میں نے یہ بات دانی بھیا کو نہیں بتائی ہے، کیونکہ وہ غصے والا ہے اور مجھے ڈر ہے کہیں جوش میں منہ نہ کھول دے، اس لیے میں نے یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھی تھی۔

’’کیسی بات......؟ جلدی بتاؤ مجھے...... وقت کم ہے بے بی!‘‘ میں نے بے چینی سے کہا۔ میں نے دیکھا اس کا معصوم سا چہرہ متفکر اور سراسیمہ سا نظر آنے لگا جیسے وہ یہ بات بتاتے ہوئے بھی خوف زدہ ہو، تاہم اٹک اٹک کر بولی۔

’’شہ...... شہزی انکل! وہ...... مم...... ماما کی جان سخت خطرے میں ہے......‘‘

’’کیا......؟‘‘ میری دونوں بھویں سکڑ گئیں...... ٹھیک اسی وقت پنکی کے حلق سے دبی دبی چیخ سی خارج ہو گئی، میں چونکا۔ اس کی آنکھوں میں پل کے پل خوف اُتر آیا تھا اور وہ میرے عقب میں نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

کوریڈور کے سرے پر جہاں زینہ تھا، وہی سوٹ بوٹ والا موچھیل شخص کھڑا ہماری طرف زہر خند نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہمراہ نیلی وردی میں ایک گارڈ بھی کھڑا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت ہماری طرف بڑھے تھے......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

اگاتھا کرسٹی نے کہیں لکھا تھا کہ قتل کرنا بہت آسان ہے جب تک کہ کسی کو آپ پر شبہ نہ ہو۔ واقعی یہ بہت آسان تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں نے انہیں قتل کر دیا ہے اور یہ معاملہ ختم ہوگیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس خوب صورت چٹان سے دور ہو کر اس راستے پر چلنا شروع کر دیا جو سینٹ بیز کی طرف جاتا تھا۔ وہ ایک الگ تھلگ جگہ تھی۔ اگر میں کوشش کرتی تو بھی ایسی جگہ کا انتخاب نہیں کر سکتی تھی جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس

جرم کی انوکھی کہانیوں میں سے ایک منفرد سوغات……

چاہت… محبت… وارفتگی… چاہے جانے والے شخص کے لیے قدرت کا تحفہ ہوتی ہے… جذبات کی یہ فراوانی کسی کسی شخص کے حصے میں آتی ہے… محبت… عقیدت اور چاہت سے لبریز دل ربا کی کیفیات… وہ جس کا پرستار تھا… وہ کسی اور کی اسیر تھی… جرم اور محبت کا سنگین امتزاج…

پرستار

سیرینا راض

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وقت میرے دل میں شدت سے خواہش اُبھری کہ زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ مجھے لگا کہ میں نے اپنے عقب میں کوئی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز سنی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ ایک بار پھر میرا قہقہے لگانے کو دل چاہا۔

تھوڑی دیر بعد رات شروع ہو جائے گی اور پھر لاشیں ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میرا دل خوشی سے جھوم رہا ہے۔ میں یہی چاہتی تھی اور مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی مایوسی کے اندھیرے چھٹ گئے۔ ناامیدی اور بے عزتی کا احساس دور ہو گیا۔ اب میں دوبارہ کبھی نہیں جان سکوں گی کہ اگر غصہ آئے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ میں یہاں علاج کے لیے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے چہل قدمی کرنے اور خوب صورت نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ ماحول کی تبدیلی میرے لیے خوشگوار ثابت ہوگی۔

ہوٹل پہنچی تو میرا موڈ ایک دم بدل گیا۔ یوں لگا جیسے میں رونا چاہ رہی ہوں۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے کتنی آسانی سے انہیں قتل کر دیا بلکہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کی عادی ہو گئی تو کیا ہوگا۔ 'احمقانہ سوچ ہے' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مجھے کسی اور بارے میں سوچنا چاہیے، میں کل ہیرو گیٹ جا رہی ہوں جہاں کوئی بھی نہیں جان پائے گا کہ میں نے کیا کیا ہے۔

☆☆☆

یہ دو دن بعد کی بات ہے۔

مینٹل پیس پر لگے کلاک نے تین بجائے۔ انٹونیا کو توقع تھی کہ اولڈ سوان ہوٹل کے لاؤنج میں چائے پینے والوں کا جم غفیر ہوگا لیکن وہ تقریباً خالی تھا۔ یہ ہوٹل بھی ہیرو گیٹ ہائیڈرو کہلاتا تھا۔ یہ پرانے طرز کی جگہ تھی جہاں پام کے گملے، لیس لگے کپڑے سے ڈھکی ہوئی گول میزیں، پرانے طرز کے آتش دان اور ایک سفید رنگ کا پیانو رکھا ہوا تھا۔ دراصل اسے جان بوجھ کر پرانے طرز کا بنایا گیا تھا۔ ویٹرس 1930ء کی وردی پہنتی تھیں اور وہاں آنے والے پرانے گاہک ہی نہیں بلکہ امریکی اور جاپانی سیاح بھی یہی توقع کرتے تھے۔ اس وقت ایک نوجوان پیانو نواز چشمہ اور بوٹائی لگائے پیانو بجا رہا تھا۔

انٹونیا نے نظریں گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ان کے قریب والی میز پر ایک عمر رسیدہ جوڑا بیٹھا تھا۔ عورت کا چہرہ بلڈاگ کی طرح خوفناک تھا اور اس نے اپنے نارنجی لباس پر تین عدد بروچ لگا رکھے تھے جبکہ اس کا شوہر بلیزر کوٹ پہنے ہوئے کافی نمایاں لگ رہا تھا۔ اس کی نفاست سے ترشی ہوئی مونچھیں دیکھ کر انتھونی ایڈن کی شکل ذہن میں ابھرتی تھی۔

ایک طویل قامت عورت سلک کا لباس پہنے کھڑکی کے پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جسے انٹونیا نے فوراً پہچان لیا۔ وہ اگاتھا کرسٹی کی کتاب تھی جو ہوٹل کی لائبریری سے پڑھنے کے لیے لی گئی تھی۔ اس کے برابر میں ایک دبلی پتلی عورت سفید لباس پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بالوں پر ہیئر بینڈ لگا رکھا تھا اور کہنیوں تک دستانے پہن رکھے تھے۔ ان میں ایک سرخ اور دوسرا سیاہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں چمڑے کے کور میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی۔ غالباً آئی پیڈ یا کوئی ڈائری۔ وہ مسلسل اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔

ایک گنجا شخص بھی اکیلا بیٹھا ہوا تھا اور عجیب وغریب انداز میں مسکرا رہا تھا۔ نہ جانے اسے وہاں کون سی دلچسپ چیز نظر آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس لڑکی کے بارے میں بھی اس کی رائے ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی وجہ صرف دستانے نہیں تھے ممکن ہے کہ اس نے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے دو رنگ کے دستانے پہن رکھے ہوں بلکہ اس لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت پر اپنی نظریں مسلسل جما رکھی تھیں جو بہت دلچسپ بات تھی اور انٹونیا اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی نوٹ بک اٹھائی اور اپنا قلم نکالتے ہوئے بولی۔

”معاف کرنا ہوگ، اب میں صبر نہیں کر سکتی۔ تمہیں ایک ایسی عورت سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی جو سراغ رسانی پر کہانیاں لکھتی ہے۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے کام کا کتنا دلدادہ ہوں اور پہلے سے ہی اس کہانی کو پڑھنے کے لیے تیار ہوں جو بالآخر منظرِ عام پر آنے والی ہے۔“ میجر پائن عاشقانہ انداز میں بولا۔ ”اس بار تمہارا نمونہ کیا ہوگا؟“

وہ ہفتے کی سہ پہر تھی۔ وہ دونوں جمعرات کی شام ویک اینڈ گزارنے نے ہیرو گیٹ ہائیڈرو پہنچے تھے، دونوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلاح کرنے کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا لیکن انٹونیا کے دماغ میں یہ بات تھی کہ اس جگہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سے اسے ایک جاسوسی کہانی لکھنے کی تحریک مل سکتی ہے جو 1926ء میں اگاتھا کرسٹی کی گمشدگی کے دوران اس کی پناہ گاہ تھی۔

''ابھی میں نے کوئی نمونہ منتخب نہیں کیا لیکن میرے ذہن میں کچھ عجیب باتیں آرہی ہیں۔''

''تمہاری کہانیاں ہمیشہ اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔ ٹھہرو مجھے اندازہ لگانے دو۔ وہ لڑکی جس نے دستانے پہن رکھے ہیں یا وہ شخص جو چائے پی رہا ہے۔'' پائن کا اشارہ اس شخص کی جانب تھا جس کے چہرے پر کوئی شکن نہیں تھی۔

''وہ کس طرح چائے پی رہا ہے؟''

''ایک ہی گھونٹ میں اس نے پیالی خالی کردی۔ جس طرح کوئی جنگجو زہر کا پیالہ پیتا ہے۔''

''یہ جنگجو کی طرح نہیں دکھائی دیتا؟''

''نہیں لیکن شاید یہ کسی وجہ سے اپنے آپ کو مارنا چاہ رہا ہو۔''

''لیکن وہ ایسا کیوں چاہے گا؟''

''یہ شخص لوگوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہورہا ہے اس لیے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان حالات میں خودکشی ہی بہترین طریقہ ہے۔''

''وہ ابھی مرا نہیں ہے۔'' انٹونیا نے اس شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر اسے اپنے آپ کو مارنا ہوتا تو وہ کوئی اور سریع الاثر طریقہ استعمال کرتا۔''

''شاید وہ اپنے آپ کو اسی اذیت کا مستحق سمجھتا ہو۔ نہیں، یہ وہ نہیں ہے بلکہ وہ پیانو نواز ہے جو لوگوں کا گلا گھونٹتا ہے۔ میں ان لوگوں پر بالکل اعتبار نہیں کرتا جو بوٹائی لگاتے ہیں۔ پیانو نواز ہی گلا گھونٹنے والا شخص ہے جو اس مقصد کے لیے اپنی بوٹائی استعمال کرتا ہے۔''

''اوہ میرے خدا! میں تو اس کے بارے میں بالکل ہی بھول گئی۔'' انٹونیا نے کہا۔ ''ہیروگیٹ میں ایسا ہی ایک فرد موجود ہے۔ گزشتہ روز اس کے بارے میں اخبار میں کچھ شائع ہوا تھا۔ قتل، حقیقی قتل، اس میں کیا ایسی بات ہے جو ہمارے لیے کشش کا باعث ہو؟''

''تم یہ سوال پہلے بھی پوچھ چکی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔ ہمارے لیے اس قتل میں کوئی کشش نہیں۔'' پائن نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''لیکن تم نے اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ ہم جہاں جاتے ہیں، ہمارا واسطہ کسی نہ کسی قتل کی واردات سے پڑ جاتا ہے۔''

پائن نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس عورت کی طرف دیکھا جو کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ''میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پیانو نواز، عورتوں سے فلرٹ کرنے کا ماہر ہے۔ اس عورت کو دیکھو، بالکل شہزادی کے مانند لگتی ہے۔''

انہوں نے برابر والی میز سے کسی کے کھڑکھڑانے اور پھر طوفانی خراٹے لینے کی آواز سنی۔ یہ وہی بلڈاگ جیسے چہرے والی عمر رسیدہ عورت تھی اور محدب عدسے کی مدد سے ہیروگیٹ ایوننگ کلارین کا صبح شائع ہونے والا ایڈیشن پڑھ رہی تھی۔

''ہمیں کسی دوسرے سیارے پر چلے جانا چاہیے۔'' وہ مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''انگلستان اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ عجیب عجیب واقعات ہورہے ہیں۔ مسٹر اور مسز گلبرٹ نے خودکشی کے لیے ایک دلکش جگہ کا انتخاب کیا تو دوسری جانب ایک ایسے شخص کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ عورتوں کا گلا گھونٹتا ہے اور ابھی تک پکڑا نہیں گیا۔''

اس کے شوہر نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ صرف عورتوں کو قتل کرتا ہے؟''

''اب تک اس نے ایک ہی قتل کیا ہے۔''

''کیا اس نے اس عورت کے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی؟''

''اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ وہ اس کی سابقہ آیا تھی۔ شاید وہ دوبارہ حملہ آور ہو۔ زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ انہیں اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے دوسرا قتل بھی کر کے لاش کہیں چھپا دی ہو۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے؟''

''اخبار نے کچھ بتایا کہ تحقیقات کرنے والے پولیس افسر کا نام کیا ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا تم اس پر لکھنا چاہ رہے ہو؟'' اس عورت نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس کا نام انسپکٹر گوڈیس ہے۔ نہیں کوئی تصویر نہیں ہے۔ یہ صرف ڈرامے کے مرکزی اداکاروں کے نام دیتے ہیں۔ انسپکٹر گوڈیس اور گلا گھونٹنے والے کا نام ہے فیلون۔''

''مجھے یاد ہے کہ اسکول میں اس نام کا ایک لڑکا میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ وہی ہے؟''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ زیادہ امکان بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہے کہ شاید تمہارا فیلون مر چکا ہے، اس شخص کی عمر صرف تینتیس برس ہے۔" عمر رسیدہ عورت نے کہا۔ "اس کا کہنا ہے کہ اس کی نینی نے آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں بُری باتیں بٹھادیں اور اس کی زندگی تباہ کر دی۔ وہ اپنے والدین کو بھی الزام دیتا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ انہوں نے بھی نینی کا ساتھ دیا۔"

"کون سی بُری عادتیں؟"

"اس بارے میں کچھ نہیں لکھا۔" عمر رسیدہ عورت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب تک یہی معلوم ہو سکا ہے کہ اس شخص کا تعلق ایک امیر اور عجیب خاندان سے ہے جو ذو معنی باتوں کی طرف رجحان رکھتا ہے۔ اسے ایک ماڈل مریض کے طور پر رکھا گیا لیکن اس نے اپنے پاگل ہونے کا بالکل بھی تاثر نہیں دیا۔ اسے اکثر مواقع پر پیارا، دغاباز، معتدل مزاج، ذہن پر چھا جانے والا، جوڑتوڑ کا ماہر، آرٹسٹک اور بہت خطرناک کہا جاتا تھا۔"

"بلاشبہ اسے بہروپیا کہا جا سکتا ہے۔"

"انہوں نے یہ نہیں لکھا لیکن مجھے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ انہیں اس کی تصویر چھاپنی چاہیے تھی۔ یہ جاننا لوگوں کا حق ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ وہ کہیں اور کوئی بھی ہو سکتا ہے کیا پتا یہ وہی پیانو نواز ہو۔ مجھے یہ کچھ مشکوک لگتا ہے۔ ویٹرس کا کہنا ہے کہ اسے ایک ہفتہ پہلے ہی ملازمت پر رکھا گیا ہے۔ اس کا انٹرویو بھی برائے نام ہی ہوا۔ یہاں تک کہ اس سے کوئی حوالہ بھی نہیں پوچھا گیا جس پر عملے کے لوگ کافی ناراض ہیں۔"

"شاید وہ کوئی مناسب بندہ نہ ملنے کی وجہ سے نا امید ہو گئے ہوں گے۔"

"تم نے اخبار میں یہ تصویر دیکھی؟" بوڑھی عورت نے کہا۔

یہ سن کر انٹونیا چونک گئی۔ اس نے سوچا کہ اسے بھی یہ تصویر دیکھنی چاہیے۔ وہ اخبار مانگنے کے لیے اس کی جانب مڑی ہی تھی کہ دو رنگ کے دستانوں والی لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت کی جانب بڑھنے لگی۔ اس دوران میں پیانو نواز اپنی دھن ختم کر چکا تھا اور خاموشی ہونے کی وجہ سے وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو واضح طور پر سن سکتے تھے۔

"میں دوبارہ زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔" لڑکی نے کہا۔ "کیا میں تم سے بات کر سکتی ہوں؟"

اس عورت نے کتاب نیچے کی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "بالکل لیکن دوبارہ سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ہمارے درمیان اس سے پہلے کبھی کوئی گفتگو ہوئی ہے۔ کم از کم مجھے تو یاد نہیں۔"

"ہاں لیکن میں تمہیں تنگ کرتی رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہماری گزشتہ ملاقات کے بعد تم نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا ہوگا۔"

"کون سی آخری ملاقات؟ مجھے شک ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"نہیں، کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔"

"پیاری لڑکی، مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ تم کون ہو۔"

"میرا نام ایریکا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"بہت پیارا نام ہے لیکن میں تم سے پہلے کبھی نہیں ملی۔"

"ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ البتہ غلط وقت اور غلط جگہ پر ہوئی تھی۔ وہ بہت مختلف حالات تھے۔ تم اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھیں اور تمہاری حالت کافی خراب تھی۔ تم نے مجھے آٹوگراف دینے سے منع کر دیا اور جب میں نے تمہیں اپنی سوسائٹی کے بارے میں بتایا تو......"

انٹونیا نے دیکھا کہ اس پُروقار عورت کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کے چہرے کے تاثرات یک لخت تبدیل ہو گئے جیسے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا ہو۔ اس نے لحہ بھر کے لیے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس لڑکی کو دیکھا پھر اس کے ہونٹوں سے ایک سرگوشی ابھری۔ "اوہ میرے خدا! یہ تم ہو۔" پھر وہ دفعتاً اپنی کرسی سے یوں کھڑی ہوئی کہ میز پر رکھے ہوئے چائے کے برتن کھڑکھڑانے لگے اور کتاب زمین پر گر گئی۔

اب تمام نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ لوگوں نے اسے لڑکھڑاتے ہوئے لاؤنج سے جاتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کندھے جھٹکے اور لاؤنج پار کر کے شیشے والے دروازوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ لوگوں کی توجہ حاصل کرنا چاہ رہی ہو۔ پیانو نواز دوبارہ نمودار ہوا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ وہ لڑکی اس کے پاس رکی اور فلرٹ کرنے کے انداز میں مسکرائی۔ اس نے بھی رسماً جھک کر تعظیم دی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میجر پائن بڑبڑایا۔

بوڑھی عورت نے انٹونیا ہوگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے کہ میں اس بارے میں کچھ نہ بتا سکوں لیکن اس عورت کی شناخت ضرور ظاہر کر سکتی ہوں۔ اگر تم اس میں کوئی دلچسپی رکھتے ہو۔“

وہ دونوں ہی اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی کرسیاں بوڑھی عورت کی جانب کر لیں۔ اس جوڑے کا نام آرنلڈ اور ڈیبورا کارٹ تھا۔ بوڑھی عورت نے کہنا شروع کیا۔

”وہ اپنے آپ کو لیڈی پینٹ کہتی ہے لیکن سر لائل پینٹ سے شادی سے پہلے وہ ایک اداکارہ ہوا کرتی تھی۔ یہ شادی دو سال قبل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ چھ شادیاں کر چکی تھی لیکن جب چھٹا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ صدمے سے پاگل ہو گئی۔ اس کا نام سولیون تھا اور وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اس صدمے سے باہر نہ آ سکی اور اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اس کا علاج ہوا، اور جب وہ اس نفسیاتی بیماری سے صحت یاب ہوئی تو اسے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس نے کرنل لائل پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔ وہ عمر میں اس سے بڑا تھا اور اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ میرا شوہر اور کرنل لائل پرانے دوست ہیں اس لیے ہمیں بھی اس شادی میں مدعو کیا گیا۔“

”سر لائل اور میرا تعلق لندن کے ایک ہی کلب سے ہے۔“ آرنلڈ نے وضاحت کی۔ ”ہم ٹکٹ جمع کیا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے عمر میں تھوڑا بڑا ہے۔ اس کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی یادداشت متاثر ہوئی ہے۔ جب ہم ملتے ہیں تو وہ کبھی مجھے ڈیولن اور کبھی ڈیورز کہتا ہے۔ یہ اس کے ملازموں کے نام ہیں جو سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں تاکہ اس کی توجہ حاصل کر سکیں۔“

”سر لائل بوڑھا ہو چکا ہے اور بہت امیر ہے۔ اس نے پہلے ہی اپنی وصیت میں سب کچھ اس کے نام کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ شادی کے وقت وہ حقیقت سے بے خبر نہیں تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔“

”لگتا ہے کہ وہ اسے بہت چاہتی ہے۔“

”اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو بہت بے وقوف ہو۔“

”میں نے خود اس کی وارفتگی دیکھی ہے جب وہ دونوں اکٹھے ہوتے ہیں۔“

”میں نے بھی دیکھی ہے لیکن میں اسے اداکاری کہتی ہوں، تم یہ کیوں بھول جاتے ہو آرنلڈ کہ وہ ایک اداکارہ ہے۔ سر لائل اور وہ سال میں دو مرتبہ ہیروگیٹ آتے ہیں۔ ہمیشہ وہ پہلے آتی ہے۔ بعد میں سر لائل اپنے دونوں ملازموں کے ہمراہ آتا ہے۔ اس کا رویہ میرے ساتھ غیر دوستانہ ہے گو کہ ہمارا تعارف ہے لیکن وہ یہی ظاہر کرتی ہے کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔“

”اس کا اصل نام کیا ہے؟“ انٹونیا نے پوچھا۔

”سر لائل سے شادی کرنے سے پہلے وہ سمیرا مس مار کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ پہلے اس نے ایک دو برطانوی فلموں میں معمولی کردار کیے تھے پھر وہ روم آ گئی اور اس نے ٹی وی کے تاریخی ڈراموں میں کام شروع کر دیا۔“

”تم اس کے بارے میں اتنا زیادہ کیسے جانتی ہو؟“ میجر پائن نے پوچھا۔

”جب اس کی شادی سر لائل سے ہوئی تو مجھے اس بے جوڑ تعلق پر تجسس ہوا اور میں نے انٹرنیٹ پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ دراصل میں اس کی ایک فلم یوٹیوب پر دیکھ رہی تھی۔ جس میں اس نے میڈم بیری کا رول پہلے کیا تھا۔ فلم کا آخری حصہ بہت دلچسپ تھا۔ جب اس کا سر قلم کر کے مشتعل ہجوم کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں زندگی میں کبھی اتنا نہیں ہنسی۔ وہ اب بھی چھوٹے یورپی ملکوں میں مشہور ہے جہاں اطالوی فلمیں پسند کی جاتی ہیں اور رومانیہ میں تو اس کا چہرہ صابن کے اشتہار میں بھی استعمال ہو رہا ہے۔“

”لگتا ہے کہ یہ لڑکی اس کی کوئی پرستار ہے۔ اس نے صرف آٹوگراف ہی نہیں مانگا بلکہ مداحوں کی کسی سوسائٹی کا بھی ذکر کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا لہجہ بھی غیر ملکیوں جیسا تھا۔“ آرنلڈ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

انٹونیا کو یاد آیا کہ اس لڑکی نے اپنا نام ایریکا بتایا تھا اور لیڈی پینٹ کے تاثرات سے یوں لگا کہ جیسے اس نے اسے پہچان لیا ہو۔ ڈیبورا نے اس کی سوچ پڑھ لی اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں بتاؤں کہ کیا سوچ رہی ہوں۔ یہ لڑکی اس کی بیٹی ہے جس سے اس نے پیدائش بعد قطع تعلق کر لیا تھا اور اب وہ اپنا حق لینے آ گئی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس لہجے میں بات کر رہی تھی۔ جیسے بلیک میل کر رہی ہو۔“

چائے ختم ہونے کے بعد میجر پائن نے شہر میں گھومنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے اس معمر جوڑے کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن ڈیبورا نے یہ کہہ کر معذرت کر لی

کہ اسے ایک ضروری خط لکھنا ہے جبکہ آرنلڈ سہ پہر میں سونے کا عادی تھا۔ انٹونیا اور پائن نے خوش دلی سے ان کی معذرت قبول کی اور گھومنے نکل گئے۔ باہر آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پہلے انہوں نے گرجا میں جھانکا پھر نیو بائی ہال میں چلے گئے جو اندرونی طور پر اٹھارویں صدی کی طرزِ آرائش سے مزین تھا۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکے کیونکہ ہال بند ہونے کا وقت قریب ہو رہا تھا۔ وہ تیرہ فروری کی سہ پہر تھی اور ویلنٹائن ڈے کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ دکانوں پر دل کی شکل کے کیک، پھول اور دیگر تحائف خوب صورتی سے سجائے گئے تھے۔ اچانک ہی بارش شروع ہوگئی اور آسمان بادلوں سے سیاہ ہوگیا۔ انہوں نے ہوٹل واپسی کی راہ لی۔ راستے میں وہ ایک اسٹال کے پاس سے گزرے جہاں ہیروگیٹ ایوننگ کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا اور اس کے صفحۂ اول پر سرخی تھی۔ ”گلا گھونٹنے والا فیلون کی تصویریں پہلی بار۔“

انٹونیا نے اخبار خریدا۔ وہ تصویریں صفحہ تین پر تھیں۔ ابھی وہ انہیں دیکھنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ تیز بارش شروع ہوگئی۔ انٹونیا نے فوراً اخبار اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ پائن نے چھتری کھولی اور وہ تیزی سے ہوٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس کے دماغ میں ایک نئی جستجو اُبھری۔ کچھ عرصہ قبل گلبرٹ نام کا ایک جوڑا خودکشی کر کے ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ کہیں وہ لیڈی پیغٹ کا چھیتا شوہر گلبرٹ تو نہیں تھا جس سے وہ بہت زیادہ محبت کرتی تھی اور جس کے چلے جانے سے وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوگئی۔ گوکہ یہ بات ابھی تک ثابت یا ظاہر نہیں ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں انٹونیا اس بارے میں اندازہ لگانے پر مجبور ہوگئی۔

استقبالیہ ڈیسک پر پہنچ کر پائن نے چھتری بند کی۔ وہاں بھی اخبار کا تازہ شمارہ رکھا ہوا تھا اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”بارش زوروں پر ہے۔ لگتا ہے رات بھر ہوتی رہے گی۔“

انٹونیا نے مسکراتے ہوئے استقبالیہ کلرک سے کہا۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں میڈم۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔ ”بہت خراب موسم ہے لیکن کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھایا اور دراز میں ڈال دیا۔

منیجر کے کمرے سے ایک غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تمہاری آنکھیں نہیں ہیں جو تم یہ تصویر نہیں دیکھ سکے؟“

”مجھے افسوس ہے جناب۔ میں نے یہ تصویر نہیں دیکھی۔“ ایک نوجوان کی آواز سنائی دی۔

”تم نے دیکھے بغیر ہی یہ اخبار ہر کمرے میں دے دیا۔ بولو کیا تم نے ایسا نہیں کیا؟“

”جی جناب، ہمیشہ میں ہی کمروں میں اخبار دیتا ہوں۔“

”معلوم ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے ہمیں تباہ کر دیا۔“

”یہ میرے فرائض میں شامل ہے کہ ہر کمرے میں شام کا اخبار پہنچا دیں۔“

”تمہیں یہ احساس ہی نہیں کہ کیا کر بیٹھے ہو۔ میرا فون مسلسل بج رہا ہے اور میں لوگوں سے یہی کہہ رہا ہوں کہ کوئی غلطی ہوئی ہے گوکہ کوئی میری بات پر یقین نہیں کر رہا۔ تین جوڑے ہوٹل چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ میں انہیں الزام نہیں دوں گا۔ ان کی پریشانی قدرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بستر میں قتل ہونا نہیں چاہتے۔ میرے گاہک جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں اس کا احساس ہے۔ کیوں نہ تمہیں ملازمت سے نکال دیا جائے؟“

”یہ بہت ناجائز ہوگا۔“ پائن نے لفٹ میں سوار ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر مقامی اخبار نے اس گلا گھونٹنے والے کی تصویر شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو اس میں بیل بوائے کا کیا قصور ہے۔ منیجر کی چیخ و پکار سے لگتا ہے کہ اس قاتل کا کسی نہ کسی طرح اس ہوٹل سے کوئی تعلق ہے۔ وہ یہاں تھا یا اب بھی ہے اور کہیں چھپا ہوا ہے۔“

”کیا شاندار سوچ ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہمارے کمرے میں نہیں چھپا ہوا ہے۔“ انٹونیا نے ہینڈ بیگ کھول کر اخبار نکالا لیکن اسے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے نہیں کھولا۔

صفحہ تین پر تین تصویریں تھیں۔ پہلی ایک دبلے چہرے والے کی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر گوڈیس، دوسری ایک معصوم صورت لڑکے کی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ رکی فیلون۔ دس سال کی عمر میں اور تیسری تصویر گلا گھونٹنے والے فیلون کی تھی۔

”اوہ میرے خدا۔“ انٹونیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

پائن اس کے برابر میں کھڑا تھا، وہ بولا۔ ”میں نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وہی قاتل ہے۔"

"ہاں، تم نے کہا تھا لیکن یہ محض تمہارا اندازہ تھا۔"

"اس نے سادہ شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا جس سے مجھے یہ شبہ ہوا۔"

یہ تصویر بتا رہی تھی کہ پیانو نواز ہی قاتل فیلون ہے۔ انٹونیا نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ممکن ہوگا۔

☆☆☆

"وہ غائب ہوگیا ہے۔ اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ روزانہ مختلف رنگ کی بُو لگاتا اور اپنے آپ کو اسٹاف کے دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتا تھا۔" مسز کارٹ نے انکشاف کیا۔ "منیجر نے اس کے بارے میں تحقیق کیے بغیر اسے ملازمت دے دی لیکن اب وہ غائب ہے، یہ میرے مخبر نے بتایا ہے۔"

"گویا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔" انٹونیا نے کہا۔ "یہ پریشانی کی بات ہے۔"

"لگتا یہی ہے کہ وہ غائب ہوگیا۔" ڈیبورا نے کہا۔ اس وقت لوگ بار میں بیٹھے ہوئے تھے جس وقت شام کے اخبار کی کاپیاں ہوٹل میں تقسیم ہو رہی تھیں تو ایک میڈ نے اسے عقبی دروازے سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے مخبر نے یہی بتایا ہے۔"

"اس جوڑے نے کہاں خودکشی کی تھی؟" انٹونیا نے موضوع بدلتے ہوئے ڈیبورا سے پوچھا۔

"تم کس جوڑے کی بات کر رہی ہو؟"

"مسٹر اور مسز گلبرٹ۔ جن کا تذکرہ تم سہ پہر میں کر رہی تھیں۔"

"اوہ ہاں۔" ڈیبورا نے جواب دیا۔ "وہ جگہ ڈسٹرکٹ لیک میں ہے اور سینٹ بیز کہلاتی ہے۔ وہ دراصل ایک چھوٹا سا خوش نما گاؤں ہے۔ انہوں نے پانچ سو فٹ اونچی ایک چٹان سے چھلانگ لگائی تھی۔"

"یہ کیسے معلوم ہوا کہ انہوں نے خودکشی کی تھی؟"

"کہا جاتا ہے کہ اس کی جیب سے ایک خط ملا تھا۔ دراصل مسز گلبرٹ کو سرطان تھا اور وہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اس خط میں کچھ اسی طرح کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔"

"جب ہم نیچے آ رہے تھے تو ہم نے ایک پولیس والے کو استقبالیہ پر دیکھا تھا۔" آرنلڈ نے کہا۔

"شاید اسے ہمارے تحفظ کے لیے بھیجا گیا ہو۔" انٹونیا نے ازراہِ مذاق کہا۔ وہ اس وقت سینٹ بیز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ڈیبورا نے کہا۔ "وہ پولیس والا تقریباً پندرہ منٹ وہاں موجود رہا اور اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ قاتل کی موجودگی کا سراغ لگانے میں ناکام رہا ہو۔"

"بلکہ وہ ڈپٹی منیجر اور استقبالیہ کلرک سے باتیں کر رہا تھا۔" آرنلڈ نے کہا۔ "پھر میں نے دیکھا کہ استقبالیہ کلرک نے بیل بوائز کو بلایا اور ہر ایک کو چند ہدایات دیں۔"

"ہم نہیں سن سکے کہ وہ ہدایات کس بارے میں تھیں۔" ڈیبورا تاسف سے بولی۔

آرنلڈ نے اعلان کیا کہ اسے اندازہ ہے۔ استقبالیہ کلرک نے لڑکوں کو کیا ہدایات دی ہوں گی۔

"اس نے ان سے کہا ہوگا کہ ہر کمرے میں جا کر دیکھیں کہ عورتیں محفوظ ہیں۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس نے بھاگنے سے پہلے ہی عورت کا گلا گھونٹ دیا ہے؟"

"یہ بات سمجھ میں آتی ہے اگر تم اس پر غور کرو...... یہ شور کیسا ہے؟"

لابی سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ گلاس ہاتھوں میں لیے اٹھے اور لابی کی جانب چل دیے۔

یہ آواز کچھوے جیسی شکل کے ایک بہت ہی بوڑھے شخص کی تھی جو استقبالیہ ڈیسک کے ساتھ ہی وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فان کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو افراد کھڑے تھے جنہوں نے سیاہ رنگ کے کوٹ اور دستانے پہن رکھے تھے۔

"بہت خوب، یہ تو سر لائل ہے۔" آرنلڈ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اور یہ پولیس والا بھی ابھی تک یہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا کہ میری بیوی فون کا جواب نہیں دے رہی؟ میں کیسے مان لوں کہ وہ کمرے میں نہیں ہے؟" سر لائل اونچی آواز میں استقبالیہ سے بات کر رہا تھا۔ "اس نے تو کہا تھا کہ وہ ہوٹل کی لابی میں میرا انتظار کرے گی اور اگر مجھے ٹھیک طرح سے یاد ہے تو یہ لابی ہی ہے۔ میری بیوی کو پیغام میں ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ لائبریری میں میرا انتظار کرے۔ ممکن ہے کہ میں پرانے وقتوں کا آدمی ہوں لیکن مجھے ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد اپنی بیوی کی جانب سے استقبال کی توقع تھی اور سمیرا یہ بات اچھی طرح جانتی ہے۔"

"کیا تم نے اسے پیغام نہیں بھیجا تھا، ڈیولین؟" وہ اپنے ایک خدمت گار کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔

اس کے بجائے دوسرے خدمت گار نے جواب دیا۔ ”میں نے پیغام بھیج دیا تھا۔ ڈیولین میں ہوں۔ میں نے موبائل فون کے ذریعے پیغام بھیجا تھا۔“

”تم نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ سات بجے ہوٹل کی لابی میں میرا انتظار کرے پھر وہ کہاں چلی گئی؟“ سر لائل نے استقبالیہ کلرک کو گھورتے ہوئے کہا۔

”سر ممکن ہے کہ وہ......“

”کیا ممکن ہے؟ یہ بات اپنے دماغ سے نکال دو کہ وہ میری حکم عدولی کر سکتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ وہ بار یا لائبریری میں بھی نہیں ہے۔ وہ ہوٹل کے پول پر تیراکی کرنے یا مساج کروانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جبکہ اسے معلوم ہے کہ میں آ رہا ہوں پھر وہ موبائل پر جواب کیوں نہیں دے رہی۔ ایک بار پھر اس کا نمبر ملاؤ ڈیورس۔ صرف اس طرح کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آ گیا ہو۔ لہٰذا مجھے یہ مت بتانا کہ شاید وہ چہل قدمی کے لیے گئی ہو۔“

”ممکن ہے کہ لیڈی پینٹ سو رہی ہوں۔ میں کسی کو دیکھنے کے لیے بھیجتا ہوں۔“

”کیا احمقانہ بات ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا پھر اس کی نگاہ کارٹ پر گئی۔ ”آہ میرے دوست! تم بھی یہیں ہو؟“ اس نے خیر مقدمی انداز میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہو رہی ہے اور یہ تمہاری بیوی ہے ڈیبورا۔ تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو مائی ڈیئر، ہم بعد میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے لیکن پہلے مجھے اپنی بیوی کو تلاش کرنا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت فکر مند ہوں۔“

پھر وہ استقبالیہ کلرک سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیڈی پینٹ کبھی نہیں سو سکتی جبکہ اسے معلوم تھا کہ میں آ رہا ہوں۔“ اس نے اپنی چھڑی کا رخ کلرک کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی کہاں ہے؟ تم نے اسے کہاں غائب کر دیا؟“

استقبالیہ کلرک نے بے بسی سے پولیس والے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک بیل بوائے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا اور بدحواسی کے عالم میں بولا۔ ”اوپر ایک لاش موجود ہے کمرا نمبر ایک سو بائیس یا ایک سو چوبیس۔ ایک عورت...... مردہ حالت میں...... اس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔“

”ایک سو بیس...... لیکن یہ تو میری بیوی کے کمرے کا نمبر ہے۔“ لائل نے کہا۔

انٹونیا یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ پولیس والے نے اپنے پیچھے آنے والوں کو سیڑھیوں پر روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی شاید اس کی وجہ اس کی نوجوانی اور ناتجربہ کاری تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے پولیس میں آئے ہوئے صرف ایک مہینا ہوا تھا۔

بیل بوائے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”پہلی منزل۔“

اس دوران استقبالیہ کلرک ایمبولینس کے لیے فون کر چکا تھا۔ پولیس والا سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے میجر پائن اور انٹونیا تھے اور یہ واردات کمرا نمبر ایک سو بائیس میں ہوئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بہت مہیب لگ رہا تھا اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ انٹونیا نے جھک کر لاش کا تفصیلی سے معائنہ کیا۔ اس کی گردن کے گرد رسی کے بجائے دو عدد بو ٹائی بندھی ہوئی تھیں۔ جنہیں آپس میں جوڑ کر گلا گھونٹنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

پائن نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جانے سے پہلے ایک اور مقتول کا اضافہ کر گیا۔“

انہوں نے پولیس والے کو واکی ٹاکی پر بولتے ہوئے سنا۔ ”ایک عورت کی لاش۔ لگتا ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ کمرا نمبر ایک سو بائیس۔ غالباً اس کا نام لیڈی پینٹ ہے۔ اس کا شوہر نیچے لابی میں شور مچا رہا ہے۔“

”نہیں، لیڈی پینٹ نہیں۔“ میجر پائن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے افسران کو بتاؤ کہ مرنے والی کا نام ایریکا ہے۔“

انٹونیا کی آنکھیں لاش پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ پولیس انسپکٹر اور اس کے ماہرین کی ٹیم یہاں آ گئی تو اسے اور میجر پائن کو ایک سیکنڈ کے لیے بھی جائے وقوعہ پر نہیں برداشت کیا جائے گا۔ اس نے تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ ایریکا کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں۔ چہرے پر فل میک اپ تھا اور گردن کے گرد لپٹی ہوئی بو ٹائیوں نے ٹھوڑی کے نیچے گڑھا ڈال دیا تھا۔

تو یہ بات ہے۔ انٹونیا نے سوچا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایریکا کی ٹھوڑی کے نیچے نشان کو چھوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کا خیال درست تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کانسٹیبل

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

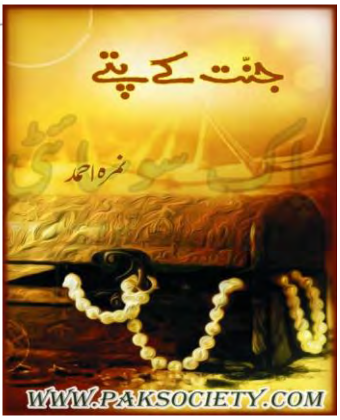
جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

مصحف
نمرہ احمد
www.Paksociety.com

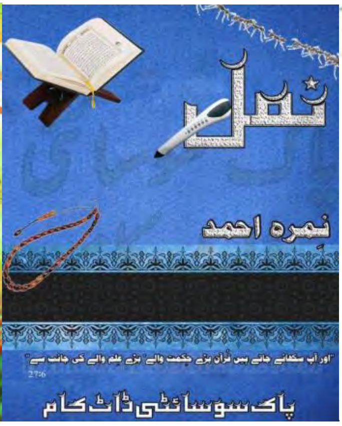
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آبِ حیات
عُمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم سفر
فرحت اشتیاق
http://www.paksociety.com

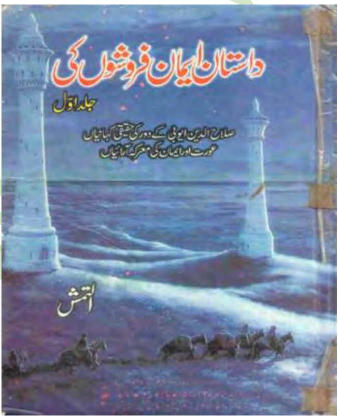
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش

بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com

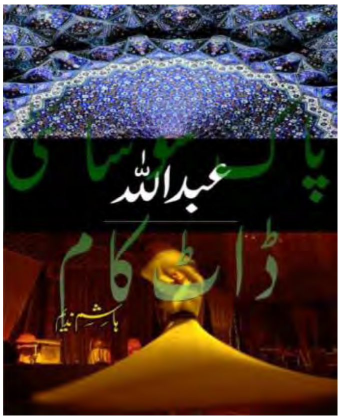
عبداللہ
ہاشم ندیم

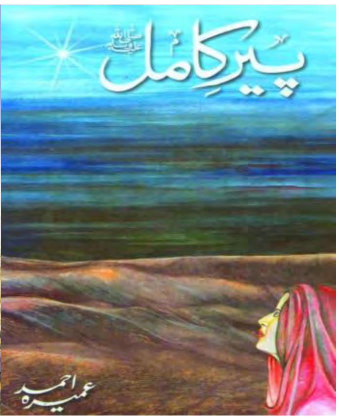
پیرِ کامل
عمیرہ احمد

WWW.PAKSOCIETY.COM
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

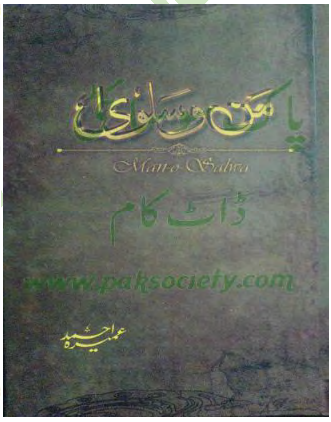
منّ و سلویٰ
Man-o-Salwa
www.paksociety.com
عمیرہ احمد

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM

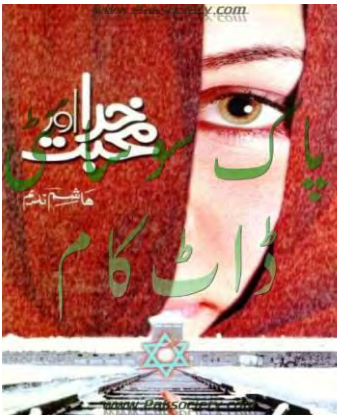
خدا اور محبت
ہاشم ندیم

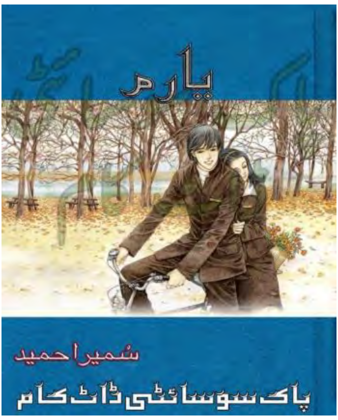
بارش
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

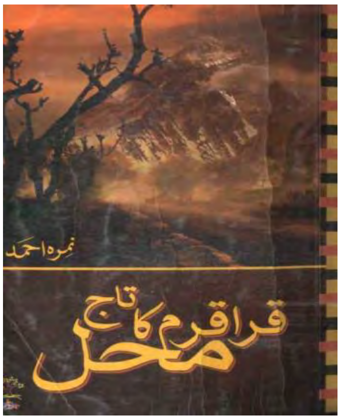
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک فون پر باتیں کر رہا تھا اور اس کی پشت انٹونیا کی طرف تھی۔ پھر اس نے سوالیہ انداز میں اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”کیا تم اس میں زندگی کی رمق تلاش کر رہی ہو؟“

”نہیں اپنا شبہ دور کر رہی ہوں جو یقین میں بدل گیا ہے۔“ انٹونیا نے نیچی آواز میں کہا۔

”یہ بات میرے دماغ میں بھی آئی تھی لیکن میں نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ گو کہ ساری علامات موجود تھیں۔ مثلاً میک اَپ تھیٹریکل انداز میں کیا گیا تھا۔ لباس بھی عجیب سا تھا جیسے نسوانیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے بہت ہی بھونڈے انداز میں پیانو نواز سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی۔“

”میں جان گئی ہوں کہ وہ ایک مرد ہے۔“ انٹونیا بولی۔ ”اور مجھے اس کا نام بھی معلوم ہے۔“

☆☆☆

لیڈی پینٹ کمرے میں داخل ہوئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ”ڈارلنگ! مجھے بہت افسوس ہے۔“

”تم اب تک کہاں غائب تھیں؟“ سر لائل نے پوچھا۔ ”ہم تو سمجھے کہ تم مر گئیں۔ ڈیولین کا خیال تھا کہ تمہیں اغوا کر لیا گیا ہے اور ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ تاوان کا مطالبہ جلد ہی آنے والا ہے۔ اس کے دماغ میں ایسی ہی سنسنی خیز باتیں آتی ہیں۔ شاید مجھے اسے نکال دینا چاہیے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید تمہیں دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔“

”میں باہر گئی تھی۔ تمہارے لیے ویلنٹائن کا تحفہ خریدنے۔“ وہ ایک پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہاں کیا ہو رہا ہے؟ برابر والے دروازے پر اتنے لوگ کیوں جمع ہیں؟“

”کوئی عورت مردہ پائی گئی ہے۔ اگلی مرتبہ میں تمہارے گلے میں پٹا ڈال کر رکھوں گا۔“ سر لائل نے کہا۔ ”مجھے تم پر بھروسا نہیں رہا۔“

”ڈارلنگ۔“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”یہ بُو کیسی آ رہی ہے؟ ہوٹل اب پہلے جیسا نہیں رہا اور میری بوٹائیاں کہاں گئیں؟ ان میں سے دو گم ہیں۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ وہ بولی۔ ”شاید ڈیورز رکھنا بھول گیا ہو۔“

☆☆☆

اس سے پہلے کہ انٹونیا اس مردہ شخص کی شناخت کرتی۔ دروازہ کھلا اور انسپکٹر گوڈیس اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک باوردی سارجنٹ بھی تھا۔ گو کہ اس نے چشمہ نہیں لگا رکھا تھا لیکن اس کی شکل پیانو نواز سے بہت مل رہی تھی جسے ہوٹل سے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ انٹونیا کو اسے دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی البتہ میجر پائن کم از کم ایک منٹ کے لیے حیران رہ گیا پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف یہ فرض کر سکتا ہوں کہ تمہاری تصویر کے نیچے غلط کیپشن لگ گیا۔“

انسپکٹر نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل ایسا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہی ہوا تھا۔ انہوں نے انتہائی نااہلی دکھائی گو کہ بعد میں میرے افسران نے ایڈیٹر کو سخت سست کہا لیکن جو ہونا تھا، وہ ہو گیا صرف ہوٹل کا منیجر ہی میری اصل شناخت سے واقف تھا لیکن اس وقت وہ بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا لہٰذا جیسے ہی اخبار کا تازہ شمارہ آیا، میں تیزی سے وہاں سے نکل گیا تاکہ ہوٹل میں کھلبلی نہ پھیلے۔''

''بدقسمتی سے اس کے باوجود وہاں کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تم کسی الماری میں یا بستر کے نیچے چھپے ہوئے ہو اسی لیے بہت سے لوگ ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے۔''

انسپکٹر نے میجر پائن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ تمہارے ساتھ یہ عورت کون ہے؟''

''یہ میری بیوی انٹونیا ہے اور میں میجر پائن ہوں۔''

''تم بہت اچھا پیانو بجاتے ہو اور آج تم نے گلبرٹ اور سولیون کی جو دھن سنائی، اس نے اس پُراسرار قاتل کے معمے کا سراغ دے دیا جو اس کے حل کی جانب جاتا ہے۔''

گوڈیس ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''حل؟ کیسا حل؟''

انٹونیا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ تم نے اس ہوٹل میں پیانو نواز کا روپ دھارنے کا فیصلہ اس وقت کیا جب تمہیں کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ فیلون اس ہوٹل میں آ رہا ہے؟''

گوڈیس نے اسے متجسس انداز میں دیکھا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ فیلون گزشتہ تین برس سے سابقہ اداکارہ سمیرامس پر فریفتہ ہے جو اب لیڈی پیجٹ کہلاتی ہے۔ ہم نے اس کی انٹرنیٹ ہسٹری دیکھی۔ اس نے یوٹیوب پر دستیاب اس کی ساری فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔ اسے وِکی پیڈیا سے معلوم ہو گیا کہ اس اداکارہ نے سرلائل پیجٹ سے شادی کر لی ہے اور ایک ویب سائٹ سے اس کا موجودہ پتا بھی معلوم ہو گیا۔ فیلون نے انٹرنیٹ کے ذریعے اس کے دوسرے پرستاروں سے پیغام رسانی جاری رکھی جو زیادہ تر امریکا، اٹلی اور مشرقی یورپ میں رہتے ہیں۔ اس نے متعدد بار سمیرامس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اداکارہ نے اس کے کسی پیغام کا جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے نام پر ایک ستائشی سوسائٹی بنانا چاہ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کی سرپرست بن جائے۔''

''یہ سب اس نے اپنی آیا کا گلا گھونٹنے کے بعد کیا؟''

''ہاں، اسے گرفتار کرنے کے بعد نفسیاتی معائنہ کروایا گیا۔ وہ شیزوفیرینیا کا مریض تھا۔ اس نے اپنی آیا پر بری عادتوں کی طرف راغب کرنے کا الزام لگایا گو کہ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کیا عادتیں تھیں۔ اس کا خاندان خاصا امیر اور بااثر ہے۔ انہوں نے اسے ایک ایسے کلینک میں داخل کرا دیا جو نفسیاتی مجرموں کے لیے مخصوص تھا۔ وہ ہمپشائر میں کسی جگہ پر واقع ہے۔ ڈاکٹر اور نرسوں کی نظر میں وہ ایک ماڈل مریض تھا۔ وہ ان کے ساتھ بڑے اخلاق اور متاثر کن انداز میں پیش آتا اور اکثر کہا کرتا کہ اسے اپنے کیے پر افسوس ہے اور اس کے آنسو بہنے لگتے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ قتل دماغی خلل کی وجہ سے ہوا۔ اس وقت اس کا ذہن بالکل تاریک ہو چکا تھا۔''

''پھر وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔''

''ہاں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ کلینک کے حفاظتی انتظامات انتہائی ناقص تھے۔'' انسپکٹر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اسے صرف ڈاکٹر کا کوٹ پہننا پڑا اور مصنوعی مونچھیں لگا لیں پھر وہ بڑے آرام سے کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ایک کزن نے اسے عارضی پناہ، جعلی شناختی کاغذات اور کچھ رقم دینے کا اعتراف کر لیا۔ پھر کی فیلون نے ویلا کورٹ... فون کر کے اپنے آپ کو سمیرامس کا ایجنٹ ظاہر کیا اور کہا کہ وہ اس سے فوری طور پر بات کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ اس کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بٹلر نے بتایا کہ سمیرامس لیک ڈسٹرکٹ کے گاؤں سینٹ بیز گئی ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے کسی صحت افزا مقام پر چہل قدمی کرنے کا مشورہ دیا تھا اس کے بعد وہ سرلائل کے ساتھ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منانے ہیروگیٹ جائے گی۔ سرلائل اور لیڈی پیجٹ ہمیشہ اولڈ سوان ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔''

میجر پائن بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب تم نے یہاں آنے اور اس پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا؟''

''ہاں، میں نے سوچا کہ میں بہت اچھا پیانو بجاتا ہوں تو کیوں نا اس کا صحیح استعمال کیا جائے۔ میرے افسران کو اس اسکیم پر شبہ تھا لیکن بعد میں وہ اس پر متفق ہو گئے لیکن ہمارا نشانہ خطا ہو گیا۔''

''اس میں تمہاری غلطی نہیں تھی۔'' انٹونیا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم نے اپنی تفتیش میں لیڈی پیجٹ کو شامل کیوں نہیں کیا؟ کیا ایسا کرنا ٹھیک نہ ہوتا؟''

''ہم اسے شاملِ تفتیش کرنا چاہ رہے تھے لیکن اس کے ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ انتہائی نازک جذباتی کیفیت میں ہے اور لگتا یہ ہے کہ دو سال پہلے اسے جو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا ابھی تک اس کے اثرات باقی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ

خوب! تو صاحب زادے کیبل کار میں
پہاڑوں کی سیر کو گئے تھے!

وہ ابھی تک دوائی لے رہی ہے۔ اس لیے ہم اسے یہ بتا کر مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے کہ ایک قاتل اس کا پیچھا کر رہا ہے جو عورتوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں بہت ہوشیاری سے کھیل رہا ہوں لیکن سب غلط ہو گیا اور میری اسکیم دھری رہ گئی اور ہم واپس پرانی جگہ پر آئے۔‘‘ انسپکٹر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ’’خدا ہی جانتا ہے کہ فیلون کہاں ہے اور میں یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔‘‘

’’فیلون یہیں ہے اور وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔‘‘ انٹونیا نے کہا۔ ’’یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب اسے کسی علاج کی ضرورت نہیں رہی۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟ وہ یہاں؟‘‘

اس نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’فیلون مر چکا ہے۔‘‘

☆☆☆

دو دن بعد وہ چاروں یعنی انٹونیا، میجر پائن، مسٹر کارٹ اور ڈیبورا ئی شاپ میں کافی پی رہے تھے۔ ڈیبورا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ’’تو تم سراغ رسانی پر مبنی کہانیاں لکھتی ہو اور کسی حد تک خود بھی سراغ رساں ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ اب تک میں نے تمہاری کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ میں یقیناً تمہاری کتابیں ضرور پڑھوں گی۔‘‘

’’تمہیں یقیناً انٹونیا کی کہانیاں پسند آئیں گی۔‘‘ پائن نے کہا۔

’’کیا انسپکٹر نہیں جانتا تھا کہ فیلون دہری شخصیت کا مالک ہے؟ کیا یہ ایک جانی پہچانی حقیقت نہیں تھی؟ ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہتیں۔‘‘

’’نہیں، فیلون نے کبھی لڑکی کا روپ نہیں دھارا۔‘‘ انٹونیا نے کہا۔ ’’اس وقت بھی نہیں جب اس نے اپنی آپا کو قتل کیا۔ اس کے کزن نے انسپکٹر کو یہی بتایا کہ فیلون اس کا ذمے دار اپنی آپا کو سمجھتا تھا۔ اسی نے اس میں لڑکیوں والی عادتیں ڈالیں جب وہ ایک چھوٹا لڑکا تھا تو آپا اس کے بال نہیں کاٹتی تھی۔ اسے لڑکیوں والے کپڑے پہناتی اور انہی کی طرح اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سکھاتی۔

’’فیلون کے والدین اس کے پاس نہیں تھے۔ ویسے بھی انہوں نے ہمیشہ لڑکی ہی کی خواہش کی تھی۔ اس لیے انہوں نے رکی میں ہونے والی تبدیلیوں پر اعتراض نہیں کیا بلکہ وہ اسے زنانہ کپڑے پہنے دیکھ کر خوش ہوتے اور اس سے رقص کی فرمائش کرتے۔ جوان ہونے تک رکی فیلون کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی۔ بظاہر وہ مرد تھا لیکن اس کی تمام عادات نسوانی تھیں۔ آپا کو قتل کر کے وہ ذہنی طور پر مریض بن گیا۔ اس نے رکی سے جان چھڑائی اور ایریکا بننے کی طرف مائل ہو گیا۔‘‘

’’لیکن جب اس نے پہلی بار لیڈی پینٹ سے بات کی تو اس وقت وہ مرد تھا۔‘‘ آرنلڈ نے پوچھا۔

’’ہاں وہ مرد کے روپ میں ہی سینٹ بیز گیا تھا۔‘‘ انٹونیا نے کہا۔ ’’اس نے اسی ہوٹل میں کمرا بک کروایا جہاں لیڈی پینٹ ٹھہری ہوئی تھی اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ اپنے آئی پیڈ کے ذریعے اس کی تصویریں لیتا رہا اور یہ کام اس نے اتنی ہوشیاری سے کیا کہ لیڈی پینٹ کو پتا بھی نہیں چلا۔ وہ اس کا سایہ بن کر رہ گیا۔ وہ گلبرٹ اور اس کی دوسری بیوی کے قتل کا عینی شاہد تھا کیونکہ وہ چہل قدمی کے دوران اس کا پیچھا کیا کرتا۔‘‘

’’لیڈی پینٹ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا سابق شوہر دوسری بیوی کے ساتھ سینٹ بیز میں ہی ہے جس کی خاطر اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔‘‘

’’اس طرح کے واقعات کتابوں میں ملتے ہیں لیکن بعض اوقات حقیقت میں بھی ایسا ہو جاتا ہے۔‘‘ میجر پائن نے کہا۔ ’’لیڈی پینٹ کو بھی اس کا علم چہل قدمی کے دوران ہوا۔ اس نے ان دونوں کو ایک چٹان پر کھڑے دیکھا اور سمجھی کہ وہ سورج ڈوبنے کا نظارہ کر رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ خودکشی کرنے والے تھے جیسا کہ بعد میں گلبرٹ کی جیب سے ملنے والے خط سے ظاہر ہوا۔ گلبرٹ کی دوسری بیوی کو کینسر تھا اور وہ اس کے بغیر نہیں رہنا چاہتا تھا چنانچہ انہوں نے خودکشی کا فیصلہ کیا۔ لیڈی پینٹ کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس نے گلبرٹ کو کبھی معاف نہیں کیا۔ وہ اس سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اب بھی محبت کرتی تھی حالانکہ وہ خود بھی سرلائل سے شادی کر چکی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی۔''

''وہ ایک الگ تھلگ جگہ تھی اور اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ فیلون ایک درخت کے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ وہ دبے قدموں وہاں تک پہنچی اور دونوں میاں بیوی کو اس چٹان سے دھکا دے دیا جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے پھر وہ سینٹ بیز کی جانب چل دی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔''

''کیا وہ ہوٹل واپس آئی؟''

''ہاں اس نے فوراً ہی اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔'' انٹونیا نے کہا۔ ''اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ایک اجنبی وجوان شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کا بہت بڑا پرستار ہے اور آٹوگراف کی فرمائش کی لیکن لیڈی نے انکار کر دیا۔ اس نوجوان نے کہا وہ چاہتا ہے کہ وہ اس سوسائٹی کی سرپرست بن جائے جو وہ اس کی تعریف کے لیے قائم کر رہا ہے۔ لیڈی نے اسے کمرے سے جانے کے لیے کہا جس پر وہ نوجوان بولا کہ وہ اس بارے میں سوچے وہ اس سے رابطے میں رہے گا۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اسے دہرا قتل کرتے ہوئے دیکھ چکا ہے؟''

''نہیں، اس وقت نہیں۔'' پائن نے کہا۔ ''مت بھولو کہ وہ اس پر فریفتہ تھا اور دیکھ سکتا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ وہ تعظیماً جھکا اور چلا گیا۔ تاکہ اولڈ سوان ہوٹل میں ایک مختلف روپ میں سامنے آئے۔ ہم سب نے انہیں اس ہوٹل میں گفتگو کرتے دیکھا۔ لیڈی پیٹنٹ نے اسے پہچان لیا اور خوف زدہ ہو گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس قتل کے بارے میں جانتا ہے۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو مجرم محسوس کر رہی ہو؟'' ڈیبورا نے کہا۔

''ہاں یہ بھی ممکن ہے بعد میں اس شخص نے لیڈی کو لائبریری میں بیٹھا ہوا دیکھا اور اس سے اپنے فیصلے پر نظرثانی کے لیے کہا۔ لیڈی نے ایک بار پھر انکار کر دیا جس پر اس شخص نے کہا کہ وہ اس کے جرم سے واقف ہے۔ یہ رکی فیلون اپنی نارمل آواز میں بول رہا تھا اور اسے بلیک میل کر رہا تھا پھر اس نے لیڈی سے کہا کہ وہ اس کے آئی پیڈ پر تصویریں دیکھ سکتی ہے جن میں سے ایک میں وہ گلبرٹ جوڑے کی طرف جا رہی ہے اور دوسری میں وہ خالی چٹان سے واپس آ رہی ہے۔''

میجر پائن نے کہا۔ ''اس کے خلاف تقریباً واقعاتی ثبوت ہیں۔ سینٹ بیز ہوٹل کے منیجر نے تصدیق کی کہ لیڈی پیٹنٹ اور فیلون ایک ہی وقت میں اس کے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس نے فیلون کی تصویر بھی پہچان لی۔ اس نے فیلون کو لیڈی کا پیچھا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا تاہم لیڈی نے جو قتل کیے، اس کی شہادت کوئی نہیں اور نہ ہی وہ آئی پیڈ مل سکا جس میں تصویریں تھیں۔''

''اب اس کے پاس اعترافِ جرم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ جسے وہ قاتل سمجھ رہی تھی، وہ دراصل پولیس انسپکٹر تھا۔'' انٹونیا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ اسے بلیک میلر سے جان چھڑانے کا خیال اس وقت آیا جب شام کا اخبار تقسیم کیا جا رہا تھا اور اس نے قاتل کی تصویر دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ ہوٹل کا پیانو نواز ہے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تصویروں پر غلط کیپشن لگ گئے تھے، اس نے سوچا کہ یہی سمجھا جائے گا کہ اسی قاتل نے ایریکا کو بھی ہلاک کیا ہے۔

''اس کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایریکا ہی فیلون تھی؟'' آرنلڈ نے پوچھا۔

''ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ وہ اس کے کمرے میں گئی اور کہا کہ وہ اس کی بات ماننے پر تیار ہے۔ وہ اسے آٹوگراف بھی دے گی اور اس کی سوسائٹی کی سرپرست بھی بن جائے گی جب وہ اپنی آٹوگراف بک اٹھانے کے لیے مڑا تو اس نے بوٹائی کی مدد سے اس کا گلا گھونٹ دیا جو سر لائل کی تھیں اور اس کے سامان میں پہلے ہی ہوٹل پہنچ چکی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ فوری طور پر یہی سمجھا جائے گا کہ یہ بو ٹائیاں پیانو نواز کی تھیں۔''

''پھر اس نے فیلون کے آئی پیڈ سے ساری تصویریں ضائع کر دیں اور اسے اپنے بیگ میں ڈال کر شوہر کے لیے ویلنٹائن کا تحفہ لینے چلی گئی۔ راستے میں اس نے وہ آئی پیڈ ایک نالے میں پھینک دیا۔''

آرنلڈ بولا۔ ''سر لائل کا کہنا ہے کہ اس شور شرابے کی اہمیت چائے کی پیالی میں اٹھنے والے طوفان سے زیادہ نہیں۔ وہ بہترین وکیلوں کی خدمات حاصل کرے گا۔''

''میں نے اب تک جتنی کہانیاں سنی ہیں، ان میں یہ بہترین ہے۔'' ڈیبورا بولی۔ ''یہ بہت بڑا جرم ہوگا انٹونیا۔ اگر تم نے اسے نہ لکھا۔''

کھوٹ

تنویر واسطی

نیت اچھی ہو تو بڑے سے بڑے نقصان کے باوجود انسان فائدے میں رہتا ہے... اگر نیت میں کھوٹ ہو تو وہ کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی بدنیتی... اس نے احسان فراموشی کو بالائے طاق رکھ دیا تھا...

فراڈ سے باز نہ آنے والوں کا المیہ......

بلیک جرمن شیفرڈ کوئی شکاری کتا نہیں تھا لیکن اس نے اس بے رنگ و روغن لکڑی کے مکان کی سیڑھیوں کے نیچے بنی ہوئی الماری میں وہ ڈھانچا تلاش کر لیا۔ وہ غراتا اور بھونکتا ہوا واپس پلٹا۔ تبھی سراغ رساں بیو نے اپنی ٹارچ کی روشنی میں وہ ڈھانچا دیکھا جو ہڈیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جان ریون بیو، نیو اورلینز پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہومی سائڈ کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اور ان دنوں بیو اکیلا ہی اپنے فرائض انجام دے رہا تھا کیونکہ دوسرے آفیسر آپریشن کلین سوئپ میں مصروف تھے، وہ چار ستمبر دو ہزار چھ کا ایک روشن گرم دن تھا۔ اس مکان میں بجلی نہیں تھی اور اس کے بیرونی حصے پر مٹی کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی جو کہ زیریں نائنتھ وارڈ کے تمام مکانوں پر جمع ہو گئی تھی۔ یہ ایک سال پہلے آنے والے خوفناک طوفان قطرینا کی وجہ سے ہوا تھا۔

بیو نے گھٹنوں کے بل جھک کر دیکھا۔ اس کے ماتھے سے پسینا بہہ رہا تھا۔ اس کے ڈارک براؤن بال بڑھے ہوئے تھے اور اس نے دو دن سے شیو بھی نہیں بنایا تھا۔ اس نے ٹھوڑی کو مزید نیچے کیا اور تبھی اس کی نظر کھوپڑی کے عقب میں ایک سوراخ پر گئی۔ الماری میلے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی جو ہینگروں پر لٹکے ہوئے تھے جبکہ ایک کونے میں زنگ آلود وہیل چیئر بھی رکھی ہوئی تھی۔

بیو واپس آیا اور اس نے ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹ مائیک اسمتھ سے کہا کہ وہ کرائم لیب ٹیکنیشن کو بلا لے۔

اسمتھ بھی بیو کی طرح چھ فٹ دو انچ لمبا لیکن قدرے بھاری جسامت والا تھا۔ اس کے بال سرخی مائل بھورے اور آنکھیں سبز تھیں۔ ڈھانچے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”میں تو سمجھا تھا کہ ہم نے تمام لاشیں تلاش کر لی ہیں۔“ اسمتھ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور بیو سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس گھر میں کوئی دروازہ یا ٹوٹی ہوئی کھڑکی باقی نہیں بچی تھی۔

”کیوں نہ ہم ایک اور ڈوبی ہوئی عورت کی لاش لے کر میڈیکل آفیسر کے پاس چلیں۔“ اسمتھ نے ایک چھوٹے سے تولیے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

”تم نے اس کی کھوپڑی کی پشت پر سوراخ دیکھا؟“ بیو نے کہا۔

”ہاں، یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یعنی اسے قتل کیا گیا ہے۔“

آپریشن کلین سوئپ میں ایف بی آئی کے ساتھ مقامی سراغ رساں اور پولیس آفیسر بھی حصہ لے رہے تھے۔ اس کا مقصد ایک تو طوفان کی تباہ کاریوں کا جائزہ لینا تھا اور... اس کے ساتھ ہی وہ ان منشیات فروشوں کو بھی پکڑ رہے تھے جو ویران گھروں میں چھپ کر کاروبار کرتے تھے۔ یہ لوگ طوفان آنے کے بعد ہوسٹن اور اٹلانٹا چلے گئے تھے لیکن ایک سال بعد وہ نوتعمیر شدہ شہر میں دوبارہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب تک انہیں خاصی کامیابی ہوئی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

تھی اور تلاشی کے نتیجے میں انہیں اتنا اسلحہ بارود ملا جو افغانستان یا عراق کی جنگ میں دودنوں کے لیے کافی ہوتا۔ انہوں نے ویران مکانوں کے ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹریلرز کی بھی تلاشی لی۔ جس دن یہ ڈھانچا دریافت ہوا۔ اسی روز مختلف مکانوں سے بائیس افراد کو گرفتار کیا گیا جن کے پاس سے ستر گرام کوکین اور چھ پاؤنڈ چرس برآمد ہوئی۔

بیو باہر نکل کر ایف بی آئی کی اسٹیشن ویگن تک گیا۔ کولر میں سے پانی کی دو بوتلیں نکالیں۔ ایک اسمتھ کو دی اور دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کرائم لیب والوں کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی سفید اسٹیشن ویگن آگئی۔ وہ دونوں انہیں وہ ڈھانچا دکھانے لے گئے جو ڈیسلونڈ اسٹریٹ کے مکان نمبر 312 کی ایک الماری میں پڑا ہوا تھا۔ یہ مکان انڈسٹریل کنال سے دو بلاک اور دریائے مسی سپی سے تین بلاک کے فاصلے پر تھا۔

ان دونوں نے لنچ ایکمی اویسٹر ہاؤس میں کیا۔ یہ چھوٹا سا ریستوران گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ ہسپانوی زبان بول رہے تھے کیونکہ شہر کی تعمیرنو میں حصہ لینے کے لیے جنوبی اور وسطی امریکا سے یہاں آگئے تھے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اسمتھ نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں نے پہلے کبھی قتل کے کیس پر کام نہیں کیا۔ میں زیادہ تر وائٹ کالر کرائم دیکھتا ہوں پھر ہم کس طرح اس ڈھانچے پر کام کریں گے اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟“

”اس سے پہلے ہمیں پتا لگانا ہوگا کہ مقتول کون ہے؟ ہم کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے کیونکہ اس علاقے میں کوئی نہیں رہتا۔“

بیو اور اسمتھ نے لاش کے ہٹائے جانے کے بعد پینتالیس منٹ تک مکان کی تلاشی لی تھی اور انہیں وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے مقتولہ کے بارے میں کچھ پتا چلتا۔

”ہمیں جائداد کے ریکارڈ سے ابتدا کرنا ہوگی۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس مکان کا مالک کون ہے؟“ بیو نے کہا۔

رات کے کھانے پر ان کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس بار انہوں نے ایک دوسرے ریستوران کا انتخاب کیا۔ اس وقت تک وہ یہ معلوم کر چکے تھے کہ یہ مکان آخری بار 1922ء میں سیموئیل ڈی سلور اسٹین اور آئنا روک سلور اسٹین نے خریدا تھا۔ گویا سلور اسٹین اور ان کے وارث ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس کے قانونی مالک تھے۔ اس مکان کا جائداد ٹیکس کبھی ادا نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ لوزیانا میں پچھتر ہزار ڈالر سے کم مالیت کے مکانات ٹیکس سے مستثنٰی تھے۔ بجلی یا گیس کمپنی کا ریکارڈ بھی دستیاب نہیں تھا کیونکہ سارا ریکارڈ طوفان کی نذر ہوگیا تھا اور اب دونوں کمپنیاں کمپیوٹر فائلوں سے ریکارڈ تلاش کررہی تھیں۔ اسی طرح ووٹر لسٹ میں بھی اس مکان کے کسی مکین کے نام کا اندراج نہیں تھا۔

''پھر اس مکان میں کون رہتا تھا؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''لگتا یہی ہے کہ اس پر کسی نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔'' بیو نے کہا۔ ''شاید سلور اسٹین کا کوئی وارث نہیں تھا اور اس کے مرنے کے بعد کسی نے اس پر قبضہ کرلیا۔ نائنتھ وارڈ میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو قرض حاصل نہیں کرسکتے، ان کے پاس اپنی کوئی جائداد نہیں ہوتی۔''

''ایف بی آئی یہ چیک کرسکتی ہے کہ کسی نے اس مکان کو خریدنے کے لیے قرض کی درخواست تو نہیں دی؟''

پوسٹ مارٹم کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ یہ ایک مکمل انسانی ڈھانچا نہیں تھا۔ دائیں ران کی ہڈی کے علاوہ سیدھے ہاتھ کی بڑی ہڈی، ریڑھ کی ہڈی کے دو مہرے، سیدھے ہاتھ کی چھ ہڈیاں اور بائیں بازو کی چار ہڈیاں غائب تھیں۔ البتہ گولی اپنی اصلی شکل میں موجود تھی۔

''یہ کسی جانور کے چبانے کے نشانات ہیں۔'' پیتھالوجسٹ نے بائیں ران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔ ''شاید کتے ہڈیاں لے گئے۔''

کرائم لیب ٹیکنیشن نے گولی دکھائی اور بولا۔ ''لگتا ہے کہ اعشاریہ اڑتیس کے ریوالور سے چلائی گئی ہے۔ تم سہ پہر میں فون کرنا۔ اس وقت تک اس کی تصدیق ہوجائے گی۔''

بیو نے اسمتھ کے دفتر میں قدم رکھا تو ایف بی آئی آفیسر نے اسے بتایا۔ ''اس مکان کے لیے دو مختلف لوگوں نے قرض کی درخواست دی ہے۔ ان میں سے ایک ایڈا اسمتھ ہے جو اس وقت اٹلانٹا میں پناہ گزین ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا مکان دو منزلہ تھا جو طوفان میں بہہ گیا لیکن اس کے پاس ملکیت کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے اس کی درخواست مسترد کردی گئی۔ دوسرا پناہ گزین الفریڈ بی جونز ہے جس نے ہوسٹن سے درخواست دی تھی۔ ہمارے فراڈ یونٹ نے ایڈا اسمتھ کا تو پتا لگا لیا لیکن جونز کو ہوسٹن پولیس نے گولی ماردی۔''

''اب ہم کیا کریں گے؟'' اسمتھ نے پوچھا۔

''گڈول۔'' بیو نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''اونہہ۔'' اسمتھ نے برا سا منہ بنایا جیسے وہ اس خیال سے متفق نہیں تھا۔

''یہ ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے جو ضرورت مندوں کو خوراک، کپڑے، فرنیچر یہاں تک کہ نقد رقم بھی فراہم کرتا ہے۔'' بیو نے کہا۔ ''جیک کی مدد سے ہم مطلوب شخص کا پتا لگا سکتے ہیں۔''

پینتالیس منٹ بعد وہ گڈول ہیڈ کوارٹر میں تھے جہاں انہیں ایک تیز وطرار عورت کلیری اسمتھ نے بتایا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اس شخص کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔ یہ ہم سے تین مرتبہ ہزار ہزار ڈالر لے چکا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک فولڈر کھولا اور اس میں رکھا ہوا کاغذ پڑھنے لگی۔

''ایلڈن گرین نے تینوں درخواستوں پر یہی نام لکھا لیکن دستخط اور سوشل سیکیورٹی نمبر مختلف تھے۔ اس نے 312 ڈیسلونڈ اسٹریٹ کے نقصان کا دعویٰ ہمارے امدادی مرکز پر کیا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور بولی۔ ''اس پر بھی وہی دستخط ہیں۔''

''کیا اس نے موجودہ پتا دیا تھا؟'' اسمتھ نے اپنا قلم اور نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

''اس نے ڈیسلونڈ کو ہی اپنا مستقل پتا بتایا البتہ عارضی پتے کے طور پر تین پناہ گاہوں کے نام لکھے۔''

''کیا ہمیں ان درخواستوں کی نقول مل سکتی ہیں۔''

''میں تمہارے لیے نئی کاپیاں نکلوادوں گی۔'' مسز اسمتھ نے سرد لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد بیو، اورلینز پولیس ڈپارٹمنٹ کی دومنزلہ عمارت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ حصہ سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا تھا۔ اسمتھ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''ایلڈن گرین، سان انٹونیو میں ہے۔ میں نے اس کے پیچھے دو ایجنٹ لگادیے ہیں۔''

بیو نے کہا۔ ''وہ پیرش جیل میں ہے۔ چلو اس سے بات کرتے ہیں۔''

''کیا؟'' اسمتھ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

بیو نے اپنا کوٹ اٹھایا اور بولا۔ ’’مجھے پہلا سبق یہ پڑھایا گیا تھا کہ پولیس کمپیوٹر ضرور چیک کرو۔ ایلڈن گرین ایک مہینے سے جیل میں ہے۔ اس پر تین ڈکیتیوں کے علاوہ غیر قانونی طور پر پانچ سو گرام کوکین رکھنے کا الزام ہے۔‘‘

ایلڈن گرین کا قد چھ فٹ پانچ انچ اور وزن اسمتھ سے پچاس پاؤنڈ زیادہ تھا۔ اس کا سر گنجا اور چہرے کے دونوں جانب زخموں کے نشانات تھے۔ ان کی ملاقات اورلینز پیرش جیل کی پہلی منزل پر واقع ایک چھوٹے انٹرویو روم میں ہوئی جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ شیرف کے ایک ڈپٹی نے گرین کے بائیں ہاتھ میں بندھی ہتھکڑی کو آہنی میز سے باندھ دیا جو بولٹ کے ذریعے فرش سے جڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پیروں میں زنجیر تھی اور اس نے قیدیوں والا اورنج سوٹ پہن رکھا تھا۔ اسمتھ نے اسے ان درخواستوں کی نقول دکھائیں جو انہیں گڈول سے ملی تھیں۔

’’تم اسی لیے یہاں آئے ہو؟‘‘ گرین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

’’کیا تم کبھی 312 ڈیسلونڈ میں رہے ہو؟‘‘

’’کئی سال۔‘‘

’’تمہارے علاوہ وہاں اور کون رہتا تھا؟‘‘

’’کئی لوگ، وہ ایسی جگہ تھی جہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔‘‘

بیو نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ جب اسمتھ نے اس سے پوچھا کہ اس گھر میں وہیل چیئر کون استعمال کرتا تھا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا اور اس سے سگریٹ مانگی۔

’’ہم سگریٹ نہیں پیتے۔‘‘ اسمتھ نے کہا۔

’’اچھا، تمہارے پاس چاکلیٹ تو ہوگی یا خالی ہاتھ چلے آئے ہو؟‘‘

ایلڈن گرین سے انہیں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی البتہ بیو نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ اگرچہ وہ قاتل نہیں ہے لیکن جانتا ہے کہ یہ قتل کس نے کیا۔ وہاں سے واپسی پر راستے میں اسمتھ نے پوچھا۔ ’’اب کیا پروگرام ہے؟‘‘

’’جیفرسن پیرش کرائم لیب چلو۔‘‘ اس نے اپنی نوٹ بک دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ہمیں گرین کا ریکارڈ دیکھنا ہے۔ وہ اکتوبر 2005ء میں طوفان کے فوراً بعد گرفتار ہوا تھا۔‘‘

اسمتھ نے دو صفحات پر مشتمل فہرست دیکھی اور بولا۔

’’اس کے پاس سے آتشیں اسلحہ برآمد ہوا تھا۔‘‘

’’شیرف کے دفتر نے اس سے ایک گن لی تھی۔ شاید اب بھی ان کے پاس ہوگی۔‘‘

’’یہ بھی ایک جرم ہے۔‘‘ اسمتھ نے نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔

کرائم لیب کی چیف ایگزامنر لوئیس بیکر ایک دراز قد عورت تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لیب کوٹ پہن رکھا تھا۔

’’تم جس ہتھیار کی بات کر رہے ہو، اب وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ایک جج کی مہربانی سے وہ گن ایلڈن گرین کو واپس کر دی گئی تھی۔ حالانکہ وہ گن سمیت پکڑا گیا تھا لیکن ڈسٹرکٹ اٹارنی کی طرف سے الزام واپس لینے کے بعد جج نے ایک مجرم کو وہ گن واپس کر دی۔‘‘

’’کیا تم سنجیدہ ہو؟‘‘ اسمتھ نے پوچھا۔

بیکر نے اس پر گہری نظر ڈالی اور بولی۔ ’’تم لوزیانا میں کب سے ہو؟‘‘

پھر وہ بیو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ’’ہم ہر ہتھیار کو ٹیسٹ کرتے ہیں۔ کیا میں نے تمہیں یہ بتایا کہ گرین کا ریوالور اعشاریہ اڑتیس کا تھا اور اس سے نائنتھ وارڈ میں گولی چلائی گئی تھی۔‘‘

’’کیا واقعی؟‘‘

بیکر نے بیو پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم نے اپنا نام بیو بتایا تھا؟‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ’’میں نے تمہارے بارے میں سن رکھا ہے۔‘‘ پھر اس نے اسے کئی کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تمہارے ریکارڈ کے لیے ہیں۔ جب تم وارنٹ گرفتاری لینے جاؤ گے تو یہ تمہارے کام آئیں گے۔‘‘

اسمتھ نے بیو کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

’’اب ہم اسے پکڑ سکتے ہیں۔‘‘

’’تم یہاں کی عدالتوں کے بارے میں نہیں جانتے۔ جب تک ہمارے پاس گن یا اعترافِ جرم نہ ہو، اس وقت تک یہ بیکار ہے۔‘‘

’’تم سنجیدہ ہو؟‘‘ اسمتھ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

بیو نے لوئیس بیکر کا شکریہ ادا کیا اور دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اسمتھ نے کہا۔

’’ہم نے یہ کیس حل کر لیا ہے۔‘‘

بیو نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ’’یہ کافی

نہیں ہے۔ ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ قتل کے وقت یہ گن گرین کے ہاتھ میں تھی اور اس کے لیے اعتراف جرم ضروری ہے۔“

”ہم اس کی گرفتاری کا وارنٹ لے سکتے ہیں۔“ اسمتھ نے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پاس اس کی گرفتاری کی ممکنہ وجہ ہے۔ اگر پولیس آفیسر کے پاس ایسے حقائق ہیں جن کی روشنی میں وہ کسی شخص کو مشتبہ سمجھتا ہے تو اس کے وارنٹ جاری ہو سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟“ اسمتھ نے کہا۔

بیو اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہم اس کے دوستوں سے ملیں گے۔ کوئی ایسا شخص جو ایلڈن گرین کو جانتا ہو۔ اس کی گن کے بارے میں اسے پتا ہو۔ شاید وہ بتا سکے کہ ہم کس کی ہڈیاں لے کر آئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ قتل کس نے کیا ہے لیکن ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس کا قتل ہوا ہے۔“

اسمتھ نے اپنا سر پیچھے کیا اور بولا۔ ”فلموں میں جس طرح قتل کا معما حل کیا جاتا ہے، یہ اس سے مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم ٹکڑے جوڑ کر کوئی تصویر مکمل کر رہے ہیں۔“

بیو نے اس کی بات سنی اور بولا۔ ”سب سے مشکل کام ان ٹکڑوں کو تلاش کرنا ہے۔“

”ایلڈن گرین کا واحد ساتھی ان دنوں جیفرسن پیرش کے بحالی مرکز میں مقیم تھا۔ لہٰذا اگلی صبح نو بجے ایک ڈپٹی جمی ریک مین کو جیل کے انٹرویو روم میں لے کر آ گیا۔ جمی نے اورنج کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ہلکے سانولے رنگ کا افریقی امریکن تھا اور دو دفعہ چوری کے الزام میں پکڑا جا چکا تھا۔ اس کے نامۂ اعمال میں تین ڈکیتیاں، شدید نوعیت کے حملے، مار پیٹ، چوری، لوٹ مار اور چرس رکھنے کے الزامات تھے۔ اسمتھ نے اپنا تعارف کروایا تو ایف بی آئی کا نام سن کر ریک مین کی بھویں تن گئیں۔ بیو نے کہا۔

”ہم تمہارے بارے میں کوئی بات کرنے نہیں آئے بلکہ تمہارے دوست ایلڈن کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔“

ریک مین نے کہا کہ وہ طوفان کے بعد پناہ کی تلاش میں چلا گیا تھا لیکن جلد ہی واپس آ گیا اور پانی بجلی کے بغیر

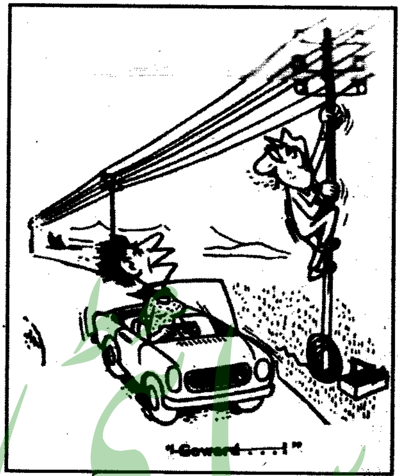

بس ڈر گیا میری گاڑی سے...... بزدل کہیں کا

بائی واٹر اور نائینتھ وارڈ کے اجاڑ مکانوں میں رہنے لگا لیکن ڈیسلونڈ اسٹریٹ کبھی نہیں گیا۔

”یہ ہولی کراس ہائی اسکول کے قریب ہے۔“

”میں جانتا ہوں لیکن وہاں کسی مکان میں نہیں رہا۔“

”تم نے کبھی گرین کے پاس کوئی گن دیکھی؟“

”نہیں۔“

وہ گرین کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتا سکا اور نہ ہی اسے وہیل چیئر کا کچھ پتا تھا۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کہا۔ ”میں اس کی سابق بیوی کو جانتا ہوں۔ وہ میری کزن میری ریڈ ہے۔“

”ہم میری کو کس طرح تلاش کر سکتے ہیں؟“ بیو نے پوچھا۔

”وہ عرصہ ہوا یہاں سے جا چکی ہے۔ قطرینا کے بعد وہ نیش ول چلی گئی تھی۔“

”اس کا کوئی دوست یا رشتے دار نیو اورلینز میں ہے۔“

ریک مین نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مزید کوئی مفید معلومات فراہم نہ کر سکا۔ بیو نے اسمتھ سے کہا کہ کیا وہ کوئی سوال کرنا چاہتا ہے۔

”اگر میری ریڈ تمہاری کزن ہے تو کیا تمہارا کوئی اور رشتے دار اس شہر میں ہے؟“

"میں نے یہ کب کہا کہ وہ میری کزن ہے۔ میرا مطلب تھا کہ وہ کزن جیسی ہے۔ ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔"

اس سہ پہر دفتر واپس پہنچ کر بیو نے اسمتھ کو فون کیا اور بولا۔ "میری ریڈ نیش ول میں نہیں ہے۔"

"پھر وہ کہاں ہے؟"

"وہ لیک چارلس میں فوڈ اسٹیمپ پر گزارہ کر رہی ہے۔" یہ کہہ کر بیو نے ریسیور ہاتھ میں پکڑا اور لیک چارلس میں سراغ رساں مائیک پیٹرسن کا نمبر ملانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسمتھ سے بھی رابطہ منقطع نہیں کیا تاکہ وہ یہ گفتگو سن سکے۔ مائیک کی آواز سن کر اس نے کہا۔ "میں نیو اورلینز پولیس ڈپارٹمنٹ سے سراغ رساں جان ریون بیو بول رہا ہوں، تم سناؤ کیا کر رہے ہو؟"

"کھیاں مار رہا ہوں۔" پیٹرسن نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں اپنے دفتر میں ایف بی آئی کے اسپیشل ایجنٹ مائیک اسمتھ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"اف میرے خدا، ایف بی آئی والوں کے ہوتے ہوئے تمہیں میری مدد کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ خیر کہو، کیا کام ہے؟"

"لیک چارلس میں ہمارا ایک امکانی گواہ ہے۔ تمہیں اس کا نام اور پتا لکھوا رہا ہوں۔ کیا تم میری خاطر اسے تلاش کر سکتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔ تم نام پتا بتاؤ۔"

بیو نے اسے میری ریڈ کے بارے میں معلومات اور لیک چارلس میں اس کے آخری پتے کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

"یہ علاقہ شہر کی حدود میں ہی ہے لیکن میں تمہاری خاطر پتا لگاؤں گا تاکہ تمہیں سٹی پولیس کو فون نہ کرنا پڑے۔"

"گڈ، میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور اسمتھ سے کہا۔ "بذریعہ سڑک سفر کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں لیک چارلس پہنچ گئے۔ سراغ رساں مائیک پیٹرسن چھوٹے قد کا باتونی شخص تھا۔ وہ انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک متوسط آبادی میں لے گیا جہاں اینٹوں کے بنے ہوئے سنگل اسٹوری مکان بنے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا میگنولیا کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا بیلچہ تھا جس سے وہ گھاس سے بڑھی ہوئی جڑوں کے درمیان نالی کھود رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر سراغ رسانوں پر گئی، وہ گھر کے دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے چلایا۔ "ماما، پولی، پولی......"

میری ریڈ طویل قامت دبلی پتلی عورت تھی۔ اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کے بال سرخی مائل بھورے جبکہ جلد کا رنگ چیری کی لکڑی جیسا تھا۔ اس کی گردن کی دائیں جانب ایک ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ جب اس نے جالی والے دروازے کے باہر سراغ رسانوں کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری۔ اس نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو لڑکا دوڑتا ہوا اندر گیا۔ اسمتھ نے اپنا کارڈ نکالا اور بولا۔

"ایف بی آئی، اسپیشل ایجنٹ اسمتھ اور میرے ساتھ شیرف آفس کے سراغ رساں پیٹرسن اور نیو اورلینز پولیس کے سراغ رساں بیو بھی ہیں۔"

اس عورت کی براؤن آنکھیں بیو پر جم گئیں اور وہ بولی۔ "مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟"

"کس بارے میں؟"

"گرین کے بارے میں جسے لوگ کو چائز کے نام سے بھی جانتے ہیں۔"

ریڈ نے ایک بار پھر بیو کے سینے پر لگے ہوئے بیج کو دیکھا اور انہیں اندر آنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ تینوں لیونگ روم میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ میری ریڈ نے ایزی چیئر سنبھال لی۔ اس کا بیٹا بھی سامنے ہی بیٹھ گیا۔

بیو نے اسمتھ کو موقع دیا کہ وہ میری ریڈ کے پس منظر کے بارے میں سوالات کرے۔ دونوں نے نوٹ بک نکال لی۔ میری ریڈ نے بتایا کہ وہ نیو اورلینز کے ایک فلاحی اسپتال میں پیدا ہوئی اور نائنتھ وارڈ میں پلی بڑھی۔ قطرینا سے پہلے وہ دس سال سے لوئر نائنتھ میں رہ رہی تھی۔ پیشے کے لحاظ سے وہ نرس تھی لیکن اس علاقے میں اسپتال نہ ہونے کے سبب اسے کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ اس نے بتایا کہ طوفان آنے کے بعد وہ لیک چارلس آ گئی۔ اسے چند اچھے لوگوں کی مہربانی سے یہ مکان کرائے پر مل گیا۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کی بیوی ڈانس اسٹوڈیو چلاتی ہے۔ جب اس نے اپنی کہانی ختم کی تو بیو نے پوچھا۔

"تم کو چائز کو کب سے جانتی ہو؟"

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تقریباً

نوبرس سے۔''

''کیا تم ڈیسلونڈ اسٹریٹ میں بھی رہی ہو؟''

''نہیں، ایلڈن وہاں رہتا تھا۔''

''آخری بار ایلڈن سے تمہارا رابطہ کب ہوا تھا؟''

''میں نے ایک سال سے اس سے ملنا چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ وہ ضرور دوبارہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہوگا۔''

''وہ پیرش جیل میں ہے۔'' بیو نے بتایا۔ اسی دوران وہ لڑکا اچھل کر میری کی ران پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔

''ایلڈن منشیات کا دھندا کرتا ہے۔ اس کی ساری عمر اسی میں گزر گئی۔ اسی لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔''

لڑکے نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بولی۔ ''اگر تم سوچ رہے ہو کہ یہ لڑکا ایلڈن سے ہے تو یہ غلط ہے۔''

''اس کے علاوہ اس گھر میں اور کون رہتا تھا؟''

''میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتی۔ سوائے اس بوڑھی عورت کے جو مکان کی مالکن تھی۔''

''اس کا نام کیا تھا؟''

''دوبدو۔ اس طرح کا نام کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس سے صرف دو مرتبہ ملی تھی۔ وہ محض ایک بوڑھی عورت ہے جو وہاں رہ رہی تھی اور اس نے ایلڈن کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔''

''کیا ان کی آپس میں رشتے داری ہے؟''

''وہ اسے آنٹی کہا کرتا تھا لیکن وہ اس کی آنٹی نہیں تھی۔ وہ معذور عورت وہیل چیئر کی محتاج ہوچکی تھی۔''

بیو نے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں کوئی ایسی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اس کے سر میں گولی مار دے؟''

ریڈ کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس کے نچلے ہونٹ میں لرزش شروع ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بمشکل تمام اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اپنے آنسو پونچھ کر دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

اسمتھ مضطرب نظر آرہا تھا جبکہ پیٹرسن بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ بیو نے اسے اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ریڈ کو غور سے دیکھنے لگا۔ ابھی اس کے سوالات ختم نہیں ہوئے تھے لیکن اسے صبر سے کام لینا تھا۔ بالآخر ریڈ نے ایک گہری سانس لی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''تم نے اسے جیل میں رکھا ہوا ہے۔''

''وہ پہلے سے ہی جیل میں ہے لیکن اب باہر نہیں آسکتا۔ میں اس پر قتل کا الزام عائد کرنے والا ہوں۔''

''اس نے اور بھی جرم کیے ہیں۔'' اسمتھ نے کہا۔ ''جن میں غیر قانونی طور پر آتشیں اسلحہ رکھنا اور گڈول سے تین مرتبہ فراڈ کرنا شامل ہے۔''

ریڈ کی نظریں بیو پر جم گئیں۔ وہ اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے نیچی آواز کر کے سرگوشی میں کہا۔

''تم مجھے مزید کیا بتا سکتی ہو؟''

''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ اپنے بیٹے کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''پچھلے کرسمس پر ایلڈن یہاں آیا تھا اور میرے پاس ہی ٹھہرا۔ وہ کار میں کوئی چیز بھول گیا جو میں نے اپنے بیڈروم میں رکھ لی۔''

اسمتھ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بولا۔ ''تمہارے بیڈروم میں کیا ہے؟''

''وہ اپنی گن میری کار میں بھول گیا تھا۔ اس نے مجھے چند روز بعد فون کیا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ اس نے وہ گن میرے پاس نہیں چھوڑی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ واپس آئے۔''

میری ریڈ نے وہ گن اپنے بستر کے گدے کے نیچے چھپا کر رکھی تھی۔ وہ اعشاریہ اڑتیس کا اسمتھ اینڈ ویسن ماڈل 15 تھا اور اس کا سیریل نمبر وہی تھا جو لوئیس بیکر کی رپورٹ میں لکھا گیا تھا۔

بیو نے گھر واپس آتے ہوئے گاڑی کی رفتار آہستہ رکھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پولیس اسے تیز رفتاری کی وجہ سے روکے اور اس کے پندرہ منٹ ضائع ہوجائیں۔ وہ مسلسل اس بوڑھی عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو معذوری کی وجہ سے وہیل چیئر کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئی تھی اور اپنے آپ کو طوفان کی تباہ کاریوں سے بچانے کی جدوجہد کرتی رہی کہ ایک ذلیل شخص نے اس کے سر میں گولی ماردی تاکہ گڈول سے پیسے وصول کرسکے۔

اسمتھ نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا اور اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم کس طرح ثابت کریں گے کہ وہ ڈھانچا دوبدو کا تھا۔''

''نائنتھ وارڈ میں کئی بدور رہتے ہیں۔ اگر انہیں اس ڈھانچے کے بارے میں بتایا جائے تو ان میں سے کوئی اس مکان کی وراثت کا دعویٰ کرسکتا ہے اس کے لیے ان کا ڈی این اے کروانا ہوگا۔''

وارنٹ گرفتاری حاصل کرنے میں ڈیڑھ دن لگ گیا، بیو نے جج کے سامنے تمام ثبوت رکھے اور قتل کے الزام

میں ایلڈن گرین کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کیا جبکہ اسمتھ نے اس پر غیر قانونی اسلحہ رکھنے اور فراڈ جیسے الزامات عائد کیے۔ پہلے ان کی منظوری اٹارنی کے دفتر سے لی گئی پھر اسے ایک فیڈرل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔

انہوں نے اورلینز پیرش جیل میں داخل ہونے سے پہلے اپنے ہتھیار بیو کی گاڑی کی ڈکی میں رکھے اور ایک ڈیجیٹل ریکارڈر لے کر انٹرویو روم میں بیٹھ گئے۔ گرین کی ٹانگوں میں زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پڑی ہوئی ہتھکڑی کا دوسرا سرا میز سے منسلک تھا۔ اس کے ہمراہ آنے والے ڈپٹی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور خود باہر نکل گیا۔

بیو نے اپنا ریکارڈر، استثنیٰ فارم اور دو کینڈی بار نکالیں اور گرین کے سامنے بیٹھ گیا جبکہ اس مرتبہ اسمتھ کو کھڑا ہونا پڑا۔ گرین نے کینڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے وہ صدیوں کا بھوکا ہو لیکن بیو نے انہیں پیچھے کرلیا پھر اس نے ریکارڈر آن کیا۔ اس میں تاریخ اور وقت کے ساتھ وہاں موجود لوگوں کے نام ریکارڈ کیے اور گرین کو اس کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا۔ جسے سننے کے بعد گرین نے فارم پر دستخط کردیے جس کا مطلب تھا کہ وہ بیو سے بات کرنے کے لیے تیار ہے۔

''تم یہ گفتگو کیوں ریکارڈ کررہے ہو؟'' گرین نے کہا۔ ''تم مجھ پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔''

بیو اس کا مطلب سمجھ گیا۔ گرین کی دلچسپی صرف باتوں کی حد تک تھی۔ اس کی بات سن کر بیو دل ہی دل میں محظوظ ہونے لگا کہ مجرم یہ کیوں سوچتے ہیں کہ وہ سراغ رسانوں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں۔

''میرا اندازہ تھا کہ تم دوبارہ آؤ گے۔'' گرین نے کہا۔

''تم نے ایسا کیوں سوچا؟''

''بس یہ محض میرا اندازہ تھا۔'' گرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بیو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت دے چنانچہ اس نے وقت ضائع کیے بغیر سوال داغ دیا۔ ''312 ڈیسلونڈ کس کی ملکیت ہے؟ میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارا نہیں ہے۔''

گرین پیچھے کی جانب جھکا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم مجھے گڈول سے فراڈ کے الزام میں گرفتار کررہے ہو جبکہ اس میں کوئی جان نہیں ہے۔''

بیو نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ ''اس مکان کا مالک کون ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' گرین نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''ہمیں وہاں سے ایک وہیل چیئر ملی ہے، وہ کس کی تھی؟''

''وہیل چیئر......!'' گرین نے اس طرح کہا جیسے اس نے کوئی انہونی بات سنی ہو۔

''تمہارے پاس اسمتھ اینڈ ویسن کا اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور ہے؟''

گرین کی پیشانی پر بل پڑ گے۔ اس نے اسمتھ کی طرف دیکھا پھر دوبارہ بیو پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس کوئی گن نہیں ہے۔''

''طوفان کے فوراً بعد اکتوبر میں تمہارے پاس ایسی ایک گن تھی؟''

''میرے پاس؟'' گرین نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔'' بیو بولا۔ ''جیفرسن پیرش شیرف آفس نے تم سے وہ گن لی اور بعد میں واپس کردی۔''

گرین نے کینڈی بار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بار دے دو۔''

''یہ تمہیں بعد میں ملے گی۔ پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔''

گرین نے اپنا سر ادھر اُدھر گھمایا اور اسمتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا تعلق ایف بی آئی سے ہے، تم یہاں صرف کھڑے ہونے کے لیے آئے ہو۔''

''میرا ساتھی ہم دونوں کی نمائندگی کررہا ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرے پاس گن تھی۔ وہ چوری کا مال نہیں تھا۔ جب عدالت کی تسلی ہوگئی تو جج نے وہ گن مجھے واپس کردی۔''

یہ کہتے ہوئے گرین کی آواز بھرا گئی اور وہ پریشان نظر آنے لگا۔ ''اب وہ گن میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''اگر کسی نے اسے استعمال کیا ہے تو میں اس کا ذمے دار نہیں ہوں۔ جب دوسری بار طوفان آیا تو وہ گن کہیں گم ہوگئی تھی۔''

''وہ گن تم سے کہاں گم ہوئی؟'' بیو نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ جانے والی چیز تھی سو چلی گئی۔''

بیو نے اس کی طرف کینڈی بار بڑھا دی اور انتظار کرنے لگا کہ وہ کب اسے کھول کر ٹکڑا منہ میں رکھتا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

’’جب جیفرسن کے سپاہیوں نے تمہیں گرفتار کر کے وہ گن تم سے لی تو اس سے پہلے وہ تمہارے پاس کتنے عرصے سے تھی؟‘‘

’’مجھے معلوم نہیں۔ شاید دو سال۔‘‘

’’قطرینا سے پہلے؟‘‘ بو نے اسمتھ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’ہمیں قطرینا سے پہلے اور بعد میں ہونے والے تمام واقعات کا جائزہ لینا ہے۔‘‘

’’ہاں، وہ میرے پاس کچھ عرصہ رہی۔‘‘ گرین نے بار کا بقیہ حصہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

’’دونوں مرتبہ طوفان آنے کے موقع پر وہ تمہارے پاس تھی۔‘‘ بو نے پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘

بو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ’’دودو بدو۔‘‘

گرین نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے اسمتھ کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔

’’تم دودو بدو کو کب سے جانتے تھے؟‘‘

گرین نے دوبارہ کندھے اچکائے اور بولا۔ ’’وہ اس کا مکان تھا۔‘‘

’’کیا تم اسے آنٹی نہیں کہتے تھے؟‘‘

گرین نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور بولا۔ ’’اب میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہوں گا۔‘‘

بو نے ریکارڈر بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ’’ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ میرا دوست تمہیں غیر قانونی اسلحہ رکھنے اور فراڈ کے الزام میں گرفتار کرنا چاہتا ہے جبکہ میرے پاس قتل کے الزام میں گرفتاری کا وارنٹ ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ گرین نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

’’تم نے وہیل چیئر میں بیٹھی ایک عورت کو گولی ماری۔ جب ہم عدالت میں جائیں گے تو تم کیا سمجھتے ہو کہ جیوری کس کی بات کا یقین کرے گی۔‘‘

بو نے اسمتھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’اچھی طرح دیکھ لو کہ دروازہ بند ہے۔‘‘

اسمتھ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور دروازہ چیک کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خوش قسمتی سے میٹل ڈیٹیکٹر اس چاقو کا پتا نہیں لگا سکا جو بو نے اپنے کوٹ کی جیب میں چھپا رکھا تھا۔ جب اس نے وہ چاقو نکالا تو گرین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بو نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی اور تیزی سے اٹھ کر میز کی دوسری جانب سے اس کے بال پکڑ لیے پھر اس کے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور چاقو کا دس انچ والا پھل اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

’’یہ جنگ میں استعمال ہونے والا چاقو ہے اور بڑی صفائی سے آدمی کی کھال اتارتا ہے۔‘‘

گرین نے خوف زدہ انداز میں بو اور اسمتھ کو باری باری دیکھا پھر اس کی نظریں دوبارہ بو پر جم گئیں۔

’’میری طرف دیکھو کوجائز۔‘‘ بو نے غراتے ہوئے کہا۔ ’’میں لاکوٹا ہوں اور میرا تعلق اوگلالا قبیلے سے ہے۔ اگر تم اس الزام سے بری ہوگئے، اگر کوئی ہوشیار وکیل تمہیں بچانے میں کامیاب ہوگیا، اگر تم میری ریڈ یا اس کے بیٹے کے پیچھے گئے تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور اس چاقو سے تمہارے جسم کا ایک ایک عضو الگ کردوں گا اور تم مرنے سے پہلے اپنا خون بہتے ہوئے دیکھو گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے چاقو اس کی ناک سے لگا دیا۔ گرین نے آہستہ سے سر ہلایا تو اس نے چاقو واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ایلڈن نے ایک گہری سانس لی۔ اب اس کی آنکھوں سے ناراضی جھلک رہی تھی۔ بو نے اسمتھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’ہمارا کام ختم ہوگیا۔‘‘

باہر نکلتے ہوئے اسمتھ نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ’’میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اس کے سر کی کھال اتار دو گے۔‘‘

’’ایف بی آئی ایجنٹ کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا۔‘‘

ان دونوں نے کار کی ڈکی سے اپنے ہتھیار نکالے اور اپنے ہولسٹر میں رکھ لیے۔ بو نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ’’بعض اوقات انسان کتنا ظالم اور بے حس ہوجاتا ہے۔ جس بوڑھی عورت نے اسے پناہ دی، اس کو ہی قتل کردیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس عورت کا کوئی وارث نہیں ہے اور اس کے مرنے کے بعد وہ مکان متروکہ املاک میں شمار ہوگا۔ اس کی مرمت کے لیے اس نے گڈول سے قرض حاصل کرنا چاہا مگر وہاں بھی وہ فراڈ سے باز نہیں آیا اور تین مختلف درخواستیں دے کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ واقعی اگر آدمی کی نیت میں کھوٹ ہو تو وہ کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔‘‘

اسمتھ نے اس کی بات غور سے سنی اور سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ ایک لمحہ

ارشد بیگ

نازک لمحے کسی کی بھی زندگی کو تہ و بالا کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں... ایسے ہی ایک کمزور لمحے کی گرفت... جب ایک جانور نے اسے انسانیت کا سبق سکھادیا..

درندہ صفت سفاک شخص کا ایک یادگار ریل......

تیمور کی بلّی نے پانچ بچّے دیے تھے۔ جس طرح اس کی بلّی ریشماں خوبصورت تھی اسی طرح اس کے بچے بھی خوبصورت تھے۔

گول مٹول سے۔ ریشمی بالوں سے بھرے ہوئے۔

اس کی بلی ایرانی نسل کی تھی جو اس کے ایک دوست نے تحفے میں لا کر دی تھی۔ پہلے تو تیمور کا دل چاہا کہ وہ اس بلی کو واپس کر دے یا کسی اور کے حوالے کر دے لیکن اس کا دل نہیں مانا۔ بلی کی خوبصورتی نے اس کا دل موہ لیا تھا۔

ویسے وہ ایک بے رحم انسان تھا...... بہت ہی بے رحم۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ سرد و بے رحم آنکھیں۔

وہ جب کسی کو گھور کر دیکھتا تو سامنے والے کی جان نکل جاتی تھی۔ وہ صرف ایک بات کہا کرتا۔ ”بس کر بابا زندگی پکڑ......“

اس جملے کے بے شمار مطلب نکل سکتے تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ تو نے غلطی کی ہے۔ اس کی سزا ملے گی۔ دوسرا مطلب یہ تھا کہ اب تجھے ہمیشہ کی زندگی کی طرف سفر کر جانا چاہیے۔ اس جملے کو جاننے والے اور وہ جو اس کی فطرت سے واقف ہوتے تھے، وہ یہ سن کر کانپ کر رہ جاتے تھے۔

عام طور پر اس جملے کے بعد اس کا دوسرا جملہ یہی ہوتا۔ ”بابا“ اب اس بے چارے کو چلا جانا چاہیے۔“ یعنی اب اس

کا کام ٹھکانے لگا دینا ہوگا۔

اس کے بندے پھر اس بدنصیب کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے جاتے۔ جس کے لیے یہ جملہ کہا گیا تھا۔

اس کا نام تیمور تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے۔ لیکن وہ خود کو تیمور لنگ کہلوایا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں اس کی ایک ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ زخم تو ٹھیک ہوگیا تھا لیکن چال میں ہلکی سی لنگ آگئی تھی۔

اس کے مزاج میں بے رحمی کی وجہ سے اس کے بے تکلف دوست بھی اس سے نالاں رہتے تھے۔ ''یار جب تیرا کام تیرے رعب سے چل... جاتا ہے تو پھر اتنی بے رحمی کس لیے۔''

وہ ہنس دیا کرتا۔'' یہ بے رحمی دشمنوں کے لیے نہیں۔ دوستوں کے لیے ہے'' وہ کہا کرتا۔

کیا مطلب؟

''دیکھ پیارے۔ دشمن سامنے ہوتا ہے۔ اس سے مقابلہ آسان ہوتا ہے۔ دوست چھپے ہوتے ہیں۔ پتا نہیں چلتا کہ کب وار کر جائیں۔ تو ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے ایسی بے رحمی بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہماری لائن ایسی ہے کہ اس میں نرمی نہیں چلتی۔ ذرا نرمی کی اور کوئی گردن پر سوار ہوگیا۔ سمجھے۔''

لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے سگے سالے کو کسی بات پر بڑی بے رحمی سے مار دیا تھا۔ وہ کسی کو معاف کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ جب بھی اس کے سامنے کسی کو لایا جاتا، وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا۔ اپنا سر کھجاتا اور دھیرے سے بولتا۔ ''بس کر بابا۔ زندگی پکڑ۔'' اور جس کو سامنے لایا جاتا، اس پر غشی طاری ہوجاتی تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔ زندگی پکڑ کا مطلب ہے کہ زندگی کی خیر مانگ۔ اب تیرا وقت ختم ہوگیا۔

اس کے بے شمار کاموں میں ایک کام اغوا برائے تاوان بھی تھا۔ اس کے کارندے پورے شہر میں شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے۔ اور کسی کی بھی ریکی کرنے کے بعد تیمور کو اس کی مکمل رپورٹ دی جاتی۔

''یہ نام ہے۔ یہ عمر ہے۔ یہ کاروبار ہے۔ اس کی روٹین کیا ہے۔ کس وقت گھر سے نکلتا ہے۔ اکیلا ہوتا یا ڈرائیور بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ گارڈز تو نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو ان کے پاس کون سا اسلحہ ہوتا ہے۔ اس کی کمزوری کیا ہے۔ اس کے گھر والے کون کون ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ کہا کرتا۔''اغوا برائے تاوان کوئی عام جرم نہیں ہے۔ یہ بہت ٹیکنیکل کام ہے۔ اس میں بہت ہوشیاری کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھ ایسوں پر ڈالنا چاہیے جو زیادہ شور نہ کریں اور جن کے گھر والے آسانی سے خوف زدہ ہو کر تاوان کی رقم ادا کردیں۔

ابھی تک تیمور کے گینگ کو اس جرم میں پکڑا نہیں جاسکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کام کیا جاتا تھا۔ وہ خود یہی کہا کرتا کہ اس کے طریقے سائنٹیفک ہوتے ہیں۔

لیکن اس بار معاملہ کچھ اور ہوگیا تھا۔ اس کے بندے ایک نوجوان کو اٹھا لائے تھے۔

تیمور انسانوں کی مختلف نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ ہر طرح کے لوگ شکار ہو کر اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ نوے فی صد ایسے ہوتے تھے جو خوف سے کانپ رہے ہوتے۔ اپنی زندگی کی بھیک مانگا کرتے۔ عام طور پر زیادہ عمر کے دولت مندوں کی حالت غیر ہوا کرتی تھی۔ ان کے برعکس نوجوان خاموش رہا کرتے۔ شاید نوجوانی کے زعم میں یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہوتی۔

دوسرے نوجوان بھی خوف زدہ رہتے تھے۔ لیکن یہ بہت بری طرح سہما ہوا تھا۔ تیمور اس کو گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس نوجوان کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ تھی۔ اچھا خاصا خوش شکل بھی تھا لیکن خوف نے اس کے نقش بگاڑ دیے تھے۔

تیمور کے سامنے آتے ہی وہ بری طرح رونے لگا۔

''خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے۔ میری ممی پریشان ہوں گی۔ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔ ان کو نیند نہیں آتی۔''

تیمور مسکرا دیا۔''اوئے ہمت کر جوان۔ کیوں عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہا ہے۔ چھوڑ دیں گے تجھے۔ پہلے تیرا جغرافیہ تو معلوم کرلیں۔ کیا کام کرتا ہے تیرا باپ؟''

'میرے ڈیڈ کا انتقال ہوچکا ہے۔'' اس نوجوان نے بتایا ''ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔''

''کیا؟'' تیمور کو یہ سن کر ایک شاک سا لگا تھا۔ اس کو تو بتایا گیا تھا کہ یہ نوجوان ایک ارب پتی تاجر کا بیٹا ہے۔ اب یہ بتا رہا تھا کہ وہ ایک غریب نوجوان ہے۔ اس کے باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔

تیمور نے اس بندے کو آواز دی جو اس کو اٹھا کر لایا تھا۔ وہ تیمور کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔''اوئے یہ کس کو اٹھا کر لے آیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی باس۔ ہم سے غلطی ہوگئی۔'' اس بندے نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔''یہاں آکر ہم کو احساس ہوا کہ یہ کوئی اور ہے۔''

''بھول کے بچے۔'' تیمور نے اس کے چہرے پر گھونسا رسید کردیا۔''جانتا ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے۔ ہم اس کا کیا کریں۔ یہ تو کسی مفلس کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔''

تیمور کے آدمی کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا

کہ ان سے ایک ایسی غلطی ہو گئی تھی جو تیمور کے نزدیک قابلِ معافی نہیں تھی۔ تیمور نے اپنی عادت کے مطابق اپنا سر کھجایا ہی تھا کہ وہ آدمی اس کے پیروں پر گر پڑا۔ ”باس، اب ایسا کبھی نہیں ہوگا“ وہ خوف سے بلک رہا تھا۔ ”معاف کر دو مجھے۔“

تیمور نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بے رحم آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ آدمی لرز کر فرش پر لیٹ گیا۔ اس کے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ وہ اب فریاد بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز جیسے بند ہو گئی تھی۔

تیمور کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جس نوجوان کو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ اس پر سکتے کا عالم طاری تھا۔

تیمور نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اب تو بتا تیرا کیا کیا جائے؟ اس نے اپنے پیروں کے پاس گرے ہوئے آدمی کو زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ ”جا کھڑا ہو جا حرام خور۔ یہ تیری پہلی اور آخری غلطی تھی۔ اس کے بعد...“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

وہ آدمی اپنی جان بچ جانے پر تیمور کا شکریہ ادا کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ تیمور پھر اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اب بتا۔ تیرا کیا کیا جائے۔ ہم تیرا اچار تو ڈال نہیں سکتے۔“

نوجوان سکتے کی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ”خدا کے لیے جانے دیں مجھے۔ میری ممی رو رہی ہوں گی۔ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتیں۔ جب تک میں گھر نہ لوٹوں ان کو چین نہیں ملتا ہے۔ وہ پریشان رہتی ہیں۔ دعائیں کرتی رہتی ہیں۔ خدا کے لیے میرے حال پر رحم کریں۔“

اس کا گڑگڑانا اور اس کی فریاد سن کر آس پاس کھڑے تیمور کے ساتھی زور زور سے ہنسنے لگے۔

”بات سن۔“ تیمور زور سے گرجا۔ ”یہ ہمارا اصول نہیں ہے۔ جو ایک بار یہاں آجائے ہم اسے جانے نہیں دیتے۔ کیوں چھوڑ دوں تجھے۔ تاکہ تو واپس جا کر ہمارے خلاف پولیس میں چلا جائے۔ چینل والوں کے پاس چلا جائے تاکہ وہ ڈھنڈورا پیٹنے لگیں کہ اس شہر میں کیسا ظلم ہو رہا ہے۔ دن دہاڑے لوگوں کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ حکومت کیا کر رہی ہے؟ کیوں یہی سب ہوگا نا؟“

”نہیں۔“ نوجوان بلبلانے لگا۔ ”میں کسی کو نہیں جانتا۔ مجھے کسی کے پاس نہیں جانا ہے۔ اپنی ممی کے پاس جانا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ پاگل ہو گئی ہوں گی۔“

اسی دوران تیمور نے اپنی بلی کی آواز سنی۔ وہ چاروں طرف بلبلاتی پھر رہی تھی۔

بلی تیمور کے پاس آکر اس کے پیروں کے پاس لیٹ گئی۔

تیمور نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ بھائی، میں نے بتایا نا کہ جو یہاں آجائے“ وہ واپس نہیں جاتا۔ تجھے کیسے جانے دیں۔ اب تو یہیں رہے گا۔ ہمارا کام کیا کرے گا۔ سمجھے؟“

”خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔“ نوجوان نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”ایسا ظلم نہ کریں۔“

بلی نے اپنے بدن کو زور زور سے تیمور کی ایک ٹانگ سے رگڑنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میاؤں میاؤں بھی کرتی جا رہی تھی۔

”اوئے۔“ تیمور نے اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہوا ہے اس کو؟ کیوں بے چین ہو رہی ہے۔“

”باس۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کے ایک بچے کو دلدار نے اٹھا لیا ہے۔ اسی لیے بے چین ہو رہی ہے۔“

دلدار اسی اڈے کا ایک چہیتا نوجوان تھا۔ تیمور کے پاس وہ اس وقت آیا تھا جو وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ اس کے بعد اس کی واپسی نہیں ہو سکی تھی۔ تیمور اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس وقت دلدار وہاں نہیں تھا۔

”بلا کر لاؤ اس کو۔“ تیمور نے ایک آدمی کو حکم دیا۔

دلدار کچھ دیر بعد اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کہاں ہے اس کا بچہ؟“ تیمور نے بلی کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے پاس ہے باس۔“ دلدار نے سہم کر جواب دیا۔

”جا واپس کر اس کو اور ہاں۔“ اس نے اپنے خاص آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے علاقے سے باہر چھوڑ آؤ۔“

”باس ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا“ اس آدمی نے کہا۔

”ہاں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہوا ہوگا کہ کسی جانور نے انسان کو کوئی سبق سکھا دیا ہو۔ جاؤ۔ لے جاؤ اس کو۔ اس کی ماں بھی بے چین ہو رہی ہوگی۔“

نوجوان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

تیمور نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر سر کھجانے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ ”جا بابا۔ زندگی پکڑ۔“ لیکن اس نے اپنا ہاتھ جھکا لیا۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ نوجوان رو رہا تھا۔

”چل بھائی۔“ تیمور کے آدمی نے اس سے کہا۔ ”چل تجھے پہنچا دیتے ہیں۔“

تیمور کے آدمی کے ساتھ چلنے سے پہلے تیمور نے اس بلی کے پاس جا کر اسے اپنی گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اس کے بچوں کے پاس چھوڑ دیا۔

سویرا

سرور اکرام

وہ بادشاہوں سے ملے... شاعروں... مصوروں سے... موسیقی کے سُروں سے کھیلنے والوں سے اور عام انسانوں سے بھی... جہاں بھی جھوٹ کے قدم گئے لوگ زیادہ مطمئن اور پُرسکون نظر آنے لگے... جب سچ کے قدم پہنچتے تو لوگوں کے چہرے بجھ جاتے... تلخ سچ کے باوجود پُرامید اور مایوسیوں کو شکست دینے والے پُرعزم فاتحین کا کارنامہ... صعوبتوں... اور مصیبتوں کو جھیلنے کے باوجود وہ وطن کی محبت سے سرشار تھے... ان کے افکار ان کے نغمے زندہ اور تصورات آباد تھے...

دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی اثر انگیز داستاں......

ابھی دن کے گیارہ بجے تھے۔

استاد نزاکت ہوٹل کی طرف جاتے جاتے رک گئے۔

اس ہوٹل سے اور اس بابا سے ان کی پرانی شناسائی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے اس بابا کو دیکھتے آ رہے تھے۔ یہ ہوٹل اس شہر میں شاعروں اور ادیبوں کی بہت بڑی پناہ گاہ تھی۔ شہر بھر کے شاعر اور ادیب اس ہوٹل میں جمع ہو کر مختلف ادبی اور علمی گفتگو کیا کرتے۔ اسی لیے یہ ہوٹل نقصان میں چل رہا تھا کیونکہ اکثر شاعر اور ادیب مفلوک الحال تھے۔

اس ہوٹل کا ملک منیر بھائی خود بھی شاعری کا شوق رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اکثر اشعار مہمل ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ کسی نہ کسی سے اصلاح لیتا رہتا تھا۔ خاص طور پر امجد بریلوی سے۔ جو اس ہوٹل کے مستقل گاہک تھے۔ خود استاد نزاکت بھی اس ہوٹل میں آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہ ایک کلاسیکل سنگر تھے لیکن موجودہ دور کی بے تکی موسیقی نے کلاسیکل گانے والوں کو فراموش کروا دیا تھا۔

استاد ایک گنی انسان تھے۔ ان کی معلومات کلاسیکی میں

بہت زیادہ تھی لیکن وہ ہمیشہ شکوہ ہی کرتے رہتے تھے۔ بہت کم لوگ ان کے فن کے قدردان رہ گئے تھے۔ استاد ایک خاص مزاج کے انسان تھے۔ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔

استاد اس فقیر کو اسی فٹ پاتھ پر ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے۔ وہ فقیر بھی کوئی فقیر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک بے نیازی سی ظاہر ہوا کرتی۔ کبھی کبھی وہ استاد نزاکت کو اشعار بھی سنایا کرتا تھا جس سے یہ اندازہ ہوجاتا کہ اس نے بھی اچھے دن دیکھے ہوں گے۔ جب موج میں ہوتا تو انتہائی گہری باتیں کیا کرتا جس سے پتا چلتا کہ اس کا مطالعہ بھی بہت اچھا ہے۔ ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے استاد اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے پاس رک جایا کرتے تھے۔

اس دن بھی استاد اس کے پاس آکر رک گئے۔ ”کیسے ہو بھائی؟“ اُستاد نے خوش دلی سے پوچھا۔

فقیر نے گردن اٹھا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ”زندہ ہوں بھائی، اب اور کیا چاہیے؟“ استاد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”بھائی میاں خدا تم کو سلامت رکھے۔ اب اس دور میں تم جیسے ملتے کہاں ہیں؟ میں نے تم کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے برسوں سے تم کو دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں استاد۔“ فقیر نے ایک گہری سانس لی۔ ”گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جانہ سکی...... تم جہاں چھوڑ گئے تھے میں وہیں ہوں اب تک۔“

”بھائی میاں! تمہاری ان ہی باتوں نے تو اپنا گرویدہ کرلیا ہے۔“ استاد نے کہا۔ ”ویسے ایک بات ہے کہ ہم ناقدری کے دور میں پیدا ہوگئے ہیں۔ مجھ ہی کو دیکھ لو۔ اتنا بڑا کلاسیکل گائیک اور کوئی جانتا ہی نہیں، واہ۔“

جس وقت ان دونوں کی باتیں ہو رہی تھیں، اس وقت ہوٹل کا مالک منیر ایک رجسٹر لیے بیٹھا تھا۔ اس ہوٹل کا اکلوتا ویٹر اور چائے بنانے والا اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا جس کا نام شہنشاہ تھا۔ اس ہوٹل کی ظاہری حالت بہت خستہ تھی۔ دو چار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ چار پانچ مرتبانوں میں بسکٹ وغیرہ تھے۔ ایک طرف ایک میز پر جواد بیٹھا تھا۔ وہ بھی ایک دانشور قسم کا انسان تھا۔

منیر نے گردن اٹھا کر شہنشاہ کو دیکھا۔ ”کل جواد صاحب نے کتنی چائے پی تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”تین کپ۔“ شہنشاہ نے بتایا۔ ”اس کے علاوہ پکوڑے بھی تھے۔“

”یہ پکوڑے کہاں سے آگئے؟“

”سامنے والی دکان سے اُدھار لے کر آیا تھا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ یہ اُدھار کا سلسلہ بند ہی کردیں۔ میں جب پرانے ہوٹل میں تھا تو اتنی بخشش مل جاتی تھی کہ پوری تنخواہ ایک طرف اور بخشش ایک طرف۔ اور ایک یہاں کے کسٹمر ہیں کہ ادھار کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ بہت سوں کو تو سگریٹ بھی اپنی جیب سے لا کر دیتا ہوں۔“

”پھر تو تم ایسا کرو کہ پرانے ہی ہوٹل ..... چلے جاؤ، وہاں عیش کروگے۔“

”اب تو کوئی بھی نہیں رکھے گا صاحب۔“ شہنشاہ نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”کیا بتاؤں صاحب! ہمارے اس ہوٹل کی ساکھ بہت خراب ہوگئی ہے۔ مارکیٹ میں مشہور ہے کہ جس نے یہاں کام کرلیا وہ کسی کام کا نہیں رہا۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ لکھ کر لگادیں کہ اس ہوٹل میں شاعروں اور ادیبوں کا داخلہ منع ہے۔“

منیر کچھ دیر تک شہنشاہ کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بے وقوف! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے یہ ہوٹل پیسے کمانے کے لیے کھولا ہے؟“

”تو پھر کیوں کھولا ہے صاحب؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ منیر نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال لیا۔ ”سنو، میں نے ایک تازہ غزل کہی ہے۔ گرچہ یہ زمین بہت مشکل تھی لیکن میں نے بھی کمال کردیا ہے۔ عرض کیا ہے۔“

شہنشاہ نے جلدی سے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”خدا کے لیے مجھے تو معاف کردیں صاحب۔ شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”تو پھر سمجھ میں آگیا نا کہ میں نے یہ ہوٹل کیوں کھولا ہے؟ یہاں کے گاہکوں کو ہر حال میں میری شاعری سننی پڑتی ہے۔ یہ سہولت اور کہاں ملے گی؟ اچھا جاؤ دیکھو جواد صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ بے چارے بہت دیر سے اکیلے بیٹھے ہیں۔“

شہنشاہ، منیر سے جان چھڑا کر جواد کی طرف آگیا۔

”صاحب چائے لے آؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، دو کپ لے آؤ۔ ایک میرے لیے ایک نفیس صاحب کے لیے۔ وہ پان لینے رک گئے تھے نہ جانے کہاں رہ گئے۔“

اس دوران نفیس اور نزاکت ہوٹل میں داخل ہوگئے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

شہنشاہ تینوں کے لیے چائے لینے کچن کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

جواب نے پوچھا۔ ”بھائی کہاں رک گئے تھے؟“

”جواد بھائی! ایک تو یہ نزاکت میاں مل گئے تھے۔ پھر پان کی دکان پر ایک زمین ذہن میں آگئی تھی۔ میں نے سوچا اس پر دو چار قافیے ہی سوچ لوں۔ زمین تو مشکل ہے۔ باندھنا آسان نہیں ہوگا۔ رات کی آنکھیں۔ بات کی آنکھیں۔ ذات کی آنکھیں۔ پریشانی تو ہوگی لیکن چلو کوشش کر لیتے ہیں۔“

”نفیس بھائی! ہم جیسوں کا گزارا اب اسی قسم کی زمینوں پر رہ گیا ہے۔“ جواد نے کہا۔

”ہاں بھائی، دوسری قسم کی زمین اب ہمارے پاس کہاں سے آئے؟ اسی زمین پر اب گل بوٹے کھلانے ہیں۔“

”بھائی میاں! زمینیں تو کسی زمانے میں اپنے پاس بھی بہت تھیں۔ اب تو صرف ایک کوارٹر پر گزارا ہے۔“ نزاکت نے کہا۔

جواد نے نزاکت کی طرف دیکھا۔ ”یار چھوڑو۔ کن باتوں میں لگ گئے۔ اس دن تمہاری ٹھمری جوسنی تو مزہ آگیا۔“

”آپ لوگوں کی شاعری کی طرح موسیقی بھی بہت باریک کام ہے جواد صاحب۔“

اس دوران شہنشاہ نے چائے لا کر رکھ دی تھی۔ ”نزاکت بھائی! آج تو وہ سنا دیں، مورا بانکا سانوریا۔“

”نہیں بھائی۔“ نزاکت نے پیالی اٹھالی۔ ”آج نہیں پھر کبھی سہی۔ آج گھر پر کچھ کام ہے۔“

نزاکت نے پیالی خالی کر کے میز پر رکھ دی۔ ”اب اجازت دیں۔ کام نمٹا کر آتا ہوں۔“

”تمہارے یہ نزاکت صاحب بھی کمال کے آدمی ہیں۔“ جواد نے کہا۔

”ہاں، یہ بے چارہ اپنے فن کو سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ کبھی اس کے دن بھی بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں

نزاکت گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھے باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ شہر کے ایک غربت زدہ علاقے میں بنا ہوا یہ مکان ٹین کی چھت کا تھا۔ ایک بڑا سا آنگن اور دو کمرے۔ اس گھر میں اس کے ساتھ اس کا بیٹا فہیم رہا کرتا تھا جو ابھی بے روزگار تھا لیکن اس کی منگنی محلے کی ایک لڑکی رضیہ سے ہوگئی تھی۔ منگنی کو دو سال ہو چکے تھے مگر ابھی تک شادی کی کوئی اُمید دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

نزاکت کے اس مکان کا بیرونی دروازہ ہر وقت کھلا ہی رہتا تھا۔ فہیم کو احساس ہو گیا تھا کہ نزاکت گھر آ کر باورچی خانے میں چلا گیا ہے۔ وہ تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔ باورچی خانے سے برتنوں کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید نزاکت کھانا بنانے میں لگ گیا تھا۔ یہ اس کی ڈیوٹی تھی۔ اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے فہیم کو چونکا دیا۔ اس نے دروازے پر جا کر دیکھا۔ محلے کا ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ فہیم نے پوچھا۔

”انکل کہاں ہے؟“

”کون انکل؟“

”وہی جو اس گھر میں رہتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا گاتے رہتے ہیں۔ آ آ آ آ۔“ لڑکے نے نقل اتاری۔

فہیم تلملا کر رہ گیا تھا۔ ”اچھا اچھا، کام کیا ہے؟“

”وہ کل میری پتنگ لے گئے تھے۔ ان سے کہیں میری پتنگ واپس کر دیں۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گا۔ تم دفع ہو جاؤ۔“

لڑکا چلا گیا تو فہیم بڑبڑاتا ہوا اندر آ گیا۔ ”حد ہوگئی، ابا بھی کیسی کیسی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔“

نزاکت نے ایک ٹرے میں کھانا لا کر تخت پر رکھ دیا۔

”ابا! یہ کیا حرکت ہے؟“ فہیم نے پوچھا۔

”ابے اب کیا ہو گیا۔ کیوں تاؤ کھا رہا ہے؟“

”ایک بچہ آیا تھا اپنی پتنگ واپس لینے۔“ فہیم نے بتایا۔

”اب آئے تو اس سے بول دینا کہ اس کی پتنگ کٹ گئی۔ ابے مانجھا ہی دو کوڑی کا تھا...... جب میں اپنے مانجھے سے پتنگ اڑایا کرتا تو گنتی کرنے والے بھول ہی جاتے تھے کہ استاد نزاکت نے ایک پتنگ سے کتنی پتنگیں کاٹی ہیں۔“

”ابا تم نے تو محلے میں منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ بچوں کے ساتھ پتنگین اڑاتے ہو۔“

”ابے یہ بہت ثواب کا کام ہے۔“

”بچوں کے ساتھ پتنگیں اڑانا۔“

”نہیں، بچوں کا دل بہلانا...... تجھے کیا معلوم، وہ ایک نوکرانی کا بیٹا ہے۔ محلے کا کوئی بچہ اس کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا۔ اس بہانے اگر وہ کچھ دیر کو خوش ہو جاتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ مولا کو میری یہ ادا... پسند آ جائے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ چل کھانا کھا۔ میں اس بچے کو دوسری پتنگ دلوا دوں گا۔“

فہیم نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ ”ارے یہ کیا پھر وہی

دہی روٹی؟“

”ابے دہی سے گرمی مرتی ہے۔“ نزاکت نے کہا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جب دہی بازار سے آتا ہے۔ روٹیاں تندور سے آتی ہیں تو پھر تم یہ باورچی خانے میں کیا کھٹر بٹر کرتے رہتے ہو؟“

”ابے یہی تو پورے ملک میں ہو رہا ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے پورے ملک میں؟“

”یہی کہ ہر سال بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں کہ اس سال ملک میں یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا۔ دولت کی بارش ہو گی اور جب سال ختم ہوتا ہے تو ورلڈ بینک سے جا کر قرضے لے آتے ہیں۔ سالن بنانے کی کوشش کرتا ہوں اور جب نہیں بنتا تو جا کر بازار سے دہی لے آتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے اماں کا انتقال ہوا تھا۔“ فہیم تپ کر بولا۔

نزاکت نے ایک گہری سانس لی۔ ”بیٹا! مرحومہ کا انتقال تو اپنی یادداشت کی خرابی سے ہوا تھا۔ تو تو جانتا ہے کہ تیری ماں کو بھولنے کی بیماری تھی۔ ایک بار سانس لینا بھول گئیں، پورے دو گھنٹوں تک سانس نہیں لی۔ بس اسی میں انتقال ہو گیا۔“

”کہیں تم نے ان کے منہ پر تکیہ تو نہیں رکھ دیا تھا؟“

”ابے کیوں باپ پر الزام لگا رہا ہے۔ اس وقت تو میں چھت پر راگ ملہار گا رہا تھا۔ تو نے ہاتھ کیوں روک لیا کھاتا رہ۔“

”نہیں ابا، میں کھا چکا۔ اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ وہیں کھا لوں گا۔“

”موقع ملے تو میرے لیے بھی کچھ لیتے آنا۔“

فہیم نے کچھ کہنا چاہا پھر جھلا کر بولا۔ ”ابا میری بات مانو۔ تم کوئی کام پکڑ لو، جیسا بھی ہو۔“

”ابے کیسی اولاد ہے۔ باپ سے کہہ رہی ہے کہ کوئی کام پکڑ لو۔ خود نہیں کر رہا۔“

”ابا تم تو جانتے ہو کہ میں کتنی محنت کرتا ہوں۔ کتنی کوشش کر رہا ہوں۔ تم کام کرنے لگو گے تو گھر کا خرچ چلے گا۔ تم اپنے آپ کو کلاسیکل سنگر کہتے ہو لیکن میں نے کبھی تمہارا گانا نہیں سنا۔“

”ابے کلاسیکل سنگر گانا سناتے نہیں ہیں۔ ٹھونستے ہیں۔ ویسے میری شان معلوم کرنی ہو تو جا کر مہاراجا پٹیالہ سے معلوم کر۔ میں روزانہ اپنے راگ سے ان کے محل میں روشنی کیا کرتا تھا۔“

”ابا! اب ایسی بات ہر ایک سے مت کہنا۔ ورنہ واپڈا والے پکڑ کر لے جائیں گے کہ چلو روشنی کرو۔“

”بیٹا! اگر اپنی حکومتوں کو اتنا ہی خیال ہوتا تو اب تک کتنے ڈیم بن چکے ہوتے۔ کتنے پروجیکٹ شروع ہو جاتے۔ اچھا اب تو جا مجھے بھی ہوٹل جانا ہے۔ وہاں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کچھ دیر کا بول کر آیا تھا۔“

”ابا تمہارے سارے جاننے والے بھی فالتو بیٹھے رہتے ہیں۔“

”فالتو نہیں بیٹھتے، ملک کے مسائل پر غور کرتے رہتے ہیں۔“

اس وقت اس ہوٹل میں شہرام بھی آ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ ایک مصور تھا۔ اس کی بنائی تصویروں کی دو تین نمائش بھی ہو چکی تھیں۔ اس بار وہ پھر کسی نمائش کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

”شہرام صاحب، میں نے سنا ہے کہ آپ پھر کسی نمائش کی تیاری کر رہے ہیں؟“ نفیس نے پوچھا۔

”جی بھائی، کچھ تصویریں اکٹھی ہو گئیں، سوچ رہا ہوں کہ ایک نمائش کر ہی ڈالوں۔“

”اور اس بار کا موضوع کیا ہو گا؟“ جواد نے پوچھا۔

”یہاں کا سبجیکٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہی غربت، گلیوں میں کھیلتے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے۔ کچلی ہوئی عورتیں۔ بوجھ اٹھاتے ہوئے مزدور۔ کچے گھروں کی گرتی ہوئی دیواریں، ان کے علاوہ یہاں اور کیا ہو سکتا ہے؟“

شہرام کی باتیں منیر نے بھی سن لی تھیں۔ وہ کاؤنٹر چھوڑ کر ان کی میز کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”شہرام صاحب! ہمارے ملک کا صرف یہی چہرہ تو نہیں ہے نا اور بھی بہت کچھ ہے۔ آپ جن لوگوں کی بات کر رہے ہیں، ان کے چہروں کو ذرا باریکی سے پینٹ کریں۔ غربت کے باوجود ان کے چہروں پر اُمیدوں کے اجالے بھی دکھائی دیں گے۔ وہ بھوکے سو تو جاتے ہیں لیکن دوسری صبح ان کے عزم پھر سے تازہ ہوتے ہیں جس گاؤں میں غربت پاؤں پسارے رہتی ہے، اسی گاؤں کے کھیتوں میں فصلوں کی شادابی بھی ہوتی ہے۔ ذرا اس کو بھی تو پینٹ کریں۔“

”منیر ٹھیک کہہ رہے ہیں شہرام صاحب! آپ کی تصویریں دیکھ کر زندگی سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔“

منیر اپنی بات کہہ کر چلا گیا تھا۔

”آپ لوگوں کو معلوم ہے؟“ شہرام نے کہا۔ ”مجھے یو این او کی طرف سے آفر ملی ہے کہ میں وہاں جا کر اپنی تصویروں کی نمائش کروں۔“

”یہی تو پالیسی ہے۔“ نفیس نے کہا۔ ”آپ اپنے ملک

کا جتنا بھیانک اور غربت زدہ چہرہ بنائیں گے، باہر اتنا ہی سراہا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ آسکر اور نوبل بھی مل جائے۔"

"لیکن سچائی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نفیس صاحب۔" شہرام نے کہا۔

"شہرام صاحب! سچائی کا ایک ہی رخ نہیں ہوتا۔ اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ مایوسی کے ساتھ امید بھی ہوا کرتی ہے۔ اندھیرے کے ساتھ اجالا بھی ہوتا ہے۔" جواد نے کہا۔ اس نے اس گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تھا۔

منیر اپنی جگہ سے اٹھ کر پھر اس میز کے پاس آگیا تھا۔ اس نے جواد کی بات سن کر تالیاں بجائیں۔ "واہ جواد صاحب! دل خوش کر دیا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو اس ملک سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ آپ یہی بولتے رہتے تھے۔ یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر۔"

"بے وقوف آدمی، یہ میں طنزیا مذاق کے لیے نہیں بولتا۔ دکھ سے بولتا ہوں۔ رنج کا پہلو ہے اس میں۔ فیض صاحب نے بہت کرب کے عالم میں کہا ہے۔ اس میں ایک خواہش چھپی ہوئی ہے۔ ایک تمنا ہے کہ کاش یہ اجالے داغ دار نہیں ہوتے۔"

"پتا نہیں بھائی، مجھے تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ملا۔ میری پنشن رکی ہوئی ہے۔ میں دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔" شہرام نے کہا۔

"شہرام صاحب، آپ کی ناراضی بجا ہے۔" نفیس نے کہا۔ "لیکن کسی ایک شخص یا ادارے سے ناراض ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پورے ملک سے بدگمان ہوجائیں۔"

"بھائی نفیس، یہ تمہارے کلاسیکل سنگر کہاں رہ گئے؟ کچھ دیر کا بول کر گئے تھے؟" جواد نے پوچھا۔

"کسی کام میں اٹک گئے ہوں گے۔" نفیس نے کہا۔ "وہ ایسے ہی آدمی ہیں۔ من موجی قسم کے۔"

اس وقت نزاکت ایک نوجوان کو گھیرے بیٹھا تھا۔ وہ نوجوان اس سے کلاسیکل کی تربیت لینے آیا تھا۔ اس کو رخصت کرنے کے بعد وہ ہوٹل کی طرف جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا طبلچی سلطان داخل ہوا۔ نزاکت نے تنخواہ پر اس کو رکھا ہوا تھا۔ لیکن کئی مہینوں سے اسے پیسے نہیں دیے گئے تھے۔

"السلام علیکم استاد۔" اس نے اندر آتے ہی نزاکت کو سلام کیا۔

"ابے دس دفعہ کہا ہے کہ کلاسیکل سے پیار کرنے والوں کو وقت کا پابند ہونا چاہیے۔"

"اب مجھے کلاسیکل سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" سلطان جھلا کر بولا۔

نزاکت کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ "ایسا مت کہہ بیٹا، اگر تو نے کلاسیکل کو چھوڑ دیا تو تاریخ تجھے معاف نہیں کرے گی۔"

"اور اگر میں پیسے لے کر نہیں گیا نا تو میری بیوی مجھے معاف نہیں کرے گی۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"

"مبارک ہو بیٹا! تو اب جا کر فنکاروں کی برادری میں شامل ہوا ہے۔ معاشرہ یہ سمجھتا ہے کہ فنکار اسی وقت بنتا ہے جب اسے بھوکا رکھا جائے۔ اسی لیے فنکاروں کو پیسے ویسے نہیں دیے جاتے۔ بس پیٹ پر پتھر باندھ کر گاتے رہو۔ شاعری کرتے رہو۔ تصویریں بناتے رہو اور طبلہ بجاتے رہو۔ ویسے بھی ہمارے ملک کے فنکاروں کو صرف شہرت چاہیے۔"

"لیکن میں نے بہت سے فنکاروں کو دیکھا ہے، ان کے پاس تو بہت پیسے ہوتے ہیں۔"

"ابے یہ چار دن والے فنکار ہیں۔ سچا فنکار ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ تو یقین کر دو سو سال کے بعد تاریخ میں تیرا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا کہ اس ملک میں ایک ایسا فنکار بھی تھا کہ جب وہ طبلہ بجاتا تو ستارے روشن ہوجاتے تھے۔"

"مجھے ایسا انتظار نہیں کرنا ہے استاد۔ میرے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔"

نزاکت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھ بیٹا! کلاسیکل میوزک کا فیسٹیول ہونے والا ہے۔ مجھے اس میں بلایا ہے۔ طبلے پر تو ہی سنگت کرے گا۔ اس میں بہت پیسے ملیں گے۔"

"فیسٹیول تو پچھلے سال بھی ہوا تھا۔ وہاں تمہاری آواز ہی نہیں نکلی تھی۔"

"ابے مجھے کسی نے سیندور کھلا دیا تھا۔" نزاکت نے بتایا۔

"کس نے کھلایا تھا سیندور؟"

"ایک عورت تھی۔ میں نے تو سیندور اس کی مانگ میں ڈالنے کے لیے خریدا تھا لیکن اس نے مجھے پانی میں گھول کر پلا دیا۔ بس میری آواز ہی ختم ہوگئی۔"

سلطان پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں سے کچھ نہیں ملنے والا۔ اسی دوران باہر سے کسی لڑکی کی آواز آئی۔ وہ فہیم کو بلا رہی تھی۔ "فہیم، فہیم! انکل، انکل!"

"واہ! کیسی سریلی آواز ہے استاد۔" سلطان نے کہا۔

"ابے یہ میرے بیٹے کا سنگیت ہے۔ تو اس کے چکر میں مت پڑ جانا۔" نزاکت نے آواز دی۔ "بیٹا آؤ، اندر آجاؤ۔"

ایک اسمارٹ سی لڑکی اندر آگئی۔ اس نے اندر آکر

نزاکت کو سلام کیا۔ نزاکت نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''رضیہ تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟''

''جی انکل، بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے سلطان کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''بیٹا! یہ آنے والے دور کا بہت بڑا فنکار ہے۔ ابھی تو اس کے حالات خراب چل رہے ہیں لیکن چار پانچ مہینوں میں اس کے حالات بدلنے والے ہیں۔''

''وہ کیسے انکل؟'' رضیہ نے پوچھا۔

''یہ اگلے الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے اور ہمارے یہاں جو الیکشن میں کھڑا ہو جائے اس کو بیٹھنے کے بھی پیسے مل جاتے ہیں۔''

سلطان نے جلبلا کر پوچھا۔ ''استاد! تم نے میرے بارے میں تو بتا دیا۔ اب یہ بتاؤ یہ کون ہیں؟''

''ابے بتایا نا کہ یہ میرے بیٹے کی منگیتر ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ منگیتر ہی رہے گی۔ شادی وادی کی نوبت نہیں آنے والی۔''

''ایسا نہ کہیں انکل۔ مجھے امید ہے کہ فہیم کو جاب مل جائے گی۔''

''ابے اسی آسرے پر تو زندگی گزار دی۔ حکومت نے میری کلاسیکل خدمات پر مجھے تین لاکھ کا چیک دیا تھا۔ تین بار باؤنس ہو چکا ہے۔'' نزاکت نے بتایا۔

''آپ نے شکایت نہیں کی؟''

''کی تھی شکایت۔ کہنے لگے جب تک زندہ ہو چیک باؤنس ہوتا رہے گا۔ اس کو کیش کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ انتقال کر جاؤ۔ دوسرے ہی دن کوئی وزیر اخبار والوں اور ٹی وی والوں کی بھیڑ لے کر پہنچ جائے گا اور تصویر کھنچواتے ہوئے چیک دے جائے گا۔ تم بتاؤ، تم کس کام سے آئی ہو؟''

رضیہ نے سلطان کی طرف دیکھا۔

''فکر مت کرو۔'' نزاکت نے کہا۔ ''اس کے سامنے بول دو۔ اس کا کام صرف سننا ہے۔''

''انکل، اماں نے کہا ہے کہ اگر فہیم کو نوکری نہیں ملی تو وہ میری منگنی کسی اور سے کر دیں گی۔''

''فرض کرو تمہاری کہیں منگنی ہو گئی۔ اس طرف فہیم کو بھی نوکری مل گئی، پھر کیا ہوگا؟'' نزاکت نے پوچھا۔

''پھر اماں دونوں کی تنخواہیں دیکھیں گی۔ جس کی تنخواہ زیادہ ہوگی، شادی اسی سے پکی کر دیں گی۔'' رضیہ نے کہا۔

''واہ، لگتا ہے تمہاری اماں نے وہ والی پارٹی جوائن کر لی ہے جس کا نعرہ ہے حال نہ دیکھو، مال کو دیکھو۔''

''استاد تمہاری باتوں میں اتنی تلخی کیوں ہوتی ہے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''ابے جب زندگی میں تلخیاں ہیں تو باتوں میں مٹھاس کہاں سے آئے۔''

''اچھا استاد، میں تو جا رہا ہوں، مجھے اجازت دو۔''

''تو کہاں جائے گا؟''

''ایک جگہ پکوڑے بنانے کا کام مل رہا ہے، سوچ رہا ہوں وہی کر لوں۔''

''بہت اچھا ہے اور ہاں دیکھ اگر وہاں گلاب جامن بنانے کا بھی کام ہو تو مجھے بتا دینا۔''

سلطان بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نزاکت نے رضیہ سے کہا۔ ''بیٹا! تم بیٹھو، میں باورچی خانے سے آلو لے کر آتا ہوں، چھیلنا ہے۔''

''انکل، آلو مجھے دے دیجیے گا، میں چھیل دوں گی۔''

''نہیں بیٹا تم نہیں چھیل سکو گی۔ میں ایک خاص تکنیک سے چھیلتا ہوں۔ مغلوں کے شاہی باورچیوں کا فن تھا۔ سینہ بہ سینہ ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے۔''

''انکل ایک بات تو بتائیں۔ کیا ہمارے بادشاہ اسی قسم کے ہنر میں وقت برباد کرتے تھے؟''

''بیٹا، ان پر بس ایک دھن سوار ہو گئی تھی کہ جس طرح بھی ہو ملک کو برباد کر دو۔ اس بات پر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے تھے کہ خدا نے ایک ملک دے دیا ہے۔ اس کی حفاظت کریں۔''

''انکل، آپ بھی تو بہت بُرا بھلا بولتے رہتے ہیں۔''

''نہیں بیٹا، میں صرف کچھ خاص لوگوں اور خاص اداروں کو بُرا کہتا ہوں۔ وطن اور مٹی کو کبھی بُرا نہیں کہا۔''

''تو ہمارے بادشاہوں نے اس طرح ملک برباد کیا۔''

''یاد رکھو بیٹا، بادشاہ یا شہزادہ کسی ایک خاص کردار کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک مزاج کا نام ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ ایک ذہنیت، ایک mentality آج بھی ایسے لوگ ملیں گے۔ تم نے کسی وزیر یا مشیر کو روڈ پر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کیا قافلہ ہوتا ہے۔ کتنی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ کتنی پولیس ساتھ ہوتی ہے۔ صرف ایک آدمی کے لیے۔ عوام چاہے جھک مارتی رہے۔ میں اس کے خلاف ہوں۔ ورنہ یہ ملک تو اللہ کا تحفہ ہے۔''

رضیہ اس وقت بہت عقیدت سے اس آدمی کو دیکھ رہی تھی جو بظاہر پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن جس کی باتوں میں کتنی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

گہرائی اور کتنا درد تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا فقیر نہ جانے کن خیالات میں تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے دانشور اور شاعر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ شہنشاہ کی آواز نے فقیر کو چونکا دیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے کھڑا تھا۔ ”یہ لو بابا، چائے۔“

فقیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شفقت بھری مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے پیالی لے لی تھی۔ ”خدا تجھ کو خوش رکھے۔ تو میرا کتنا خیال رکھتا ہے۔“

شہنشاہ اس کی کرسی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ”تمہیں دیکھ کر اپنا باپ یاد آتا ہے بابا۔“

”اب کہاں ہے تیرا باپ؟“

”وہ مر گیا ہے بابا۔“ شہنشاہ نے بتایا پھر تلخی سے ہنسا۔ ”بے چارے نے میرا نام شہنشاہ رکھا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا شہنشاہ ایک ہوٹل میں بیرا بن جائے گا۔“

”تو کیا ہوا، تیرا دل تو بادشاہوں والا ہے نا۔ سب کچھ ہے تیرے پاس۔ اچھا یہ بتا، یہ جو تیرے ہوٹل میں باتیں ہوتی رہتی ہیں، کیا کیا باتیں ہوتی ہیں؟“

”بابا، ان کی باتیں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ موٹی موٹی باتیں سمجھ سے باہر ہیں۔ ہاں، یہ جو اپنا مالک منیر ہے نا، اس کو بہت مزے آتے ہیں۔ وہ ان کی باتیں سنتا رہتا ہے۔ وہ خود بھی تو شاعری کرتا ہے بابا۔“

”اچھا، اب تو میرا ایک کام کر۔“ فقیر نے ایک پرزہ نکال کر شہنشاہ کو دے دیا۔ سنو، یہ ان لوگوں میں سے کسی کو دے دینا۔“

”اب تو وہ لوگ کل ہی آئیں گے۔“ شہنشاہ نے کہا۔

”چلو کوئی بات نہیں، کل دے دینا۔“

”میں کچھ دیر بعد آ کر پیالی لے جاؤں گا۔“ شہنشاہ نے کہا۔

شہنشاہ کچھ دیر بعد واپس آیا تو فقیر نظیر اکبر آبادی کی ایک نظم زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

”دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی۔“

”واہ بابا! یہ تو بہت اچھی شاعری تھی۔“ شہنشاہ نے کہا۔ ”لیکن تم ابھی تک یہیں ہو؟“

”ہاں بیٹا۔“ فقیر نے ایک گہری سانس لی۔ ”پتا نہیں کیوں آج جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ لیکن تم ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے؟“

”بابا، ہوٹل کا تھوڑا کام تھا وہ نمٹا کر جا رہا ہوں۔ بابا، تم سوتے کہاں ہو؟“

”اب کیا سونا۔“ فقیر نے ایک گہری سانس لی۔

رات کیا سوئے کہ اک عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا۔

”ایک بات کہوں، تم مجھے کوئی معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ شہنشاہ نے کہا۔ ”تم دیکھنے میں ایسے ہو۔ جس طرح میں نام کا شہنشاہ ہوں اسی طرح تم بھی کچھ اور ہو۔“

”ارے نہیں بیٹا، میں ایک عام سا انسان ہوں۔“

”تم سوتے کہاں ہو؟“

”صابر کو تو جانتے ہو نا، وہ گیراج والا۔ وہ اللہ کا بندہ مجھے اپنے گیراج میں سونے کی اجازت دے دیتا ہے۔“

”تمہارا اپنا کوئی نہیں ہے؟“

”کیوں نہیں ہے۔“ فقیر ناراض ہونے لگا ”بیس کروڑ کا خاندان ہے میرا۔ یہ پوری قوم میرا خاندان ہی تو ہے۔ ورنہ کوئی غیروں کے لیے اتنی قربانی کہاں دیتا ہے۔ جتنی قربانی ہم نے دی ہے۔ ہم ہندوستان سے کئی لوگ چلے تھے۔ میرا باپ، میری ماں، دادا، دادی، میرے دو بڑے بھائی۔ لیکن صرف میرا باپ اور میری ماں یہاں تک پہنچ سکے۔ باقی سب راستے میں مار دیے گئے۔ ایسی قربانی کوئی غیروں کے لیے تو نہیں دیتا ہے نا، اپنوں کے لیے دیتا ہے۔ اسی لیے یہ بیس کروڑ لوگ میرے اپنے ہیں، میرے اپنے۔“

شہنشاہ اس فقیر کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا وہ فقیر۔

”اور ہاں۔“ فقیر کو کوئی بات یاد آ گئی تھی۔ ”ایک بات اور...... پرسوں چودہ اگست ہے۔ میرا خاندان بارہ اگست کو ہندوستان سے چلا تھا اور جب چودہ کی صبح کو یہاں پہنچا تو صرف دو آدمی تھے۔ میرا باپ اور میری ماں۔ اسی لیے میں ہر سال چودہ اگست کی صبح ضرور مناتا ہوں۔ اپنے خاص انداز سے۔ اس بار تم میرے پاس آ جانا۔“

☆☆☆

اس وقت بھی ہوٹل میں کم ہی لوگ تھے۔

ایک میز کے گرد نفیس، جواد، شہرام بیٹھے تھے۔ ہوٹل کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مالک منیر میز کی طرف آیا۔ اس نے نفیس سے کہا۔ ”نفیس صاحب آپ سے ایک کام ہے۔ دو منٹ کے لیے تشریف لائیں۔“ منیر نفیس کو اپنے ساتھ ایک طرف لے آیا تھا۔

”کہو منیر، خیریت تو ہے نا؟“

”نفیس صاحب، اس دن آپ ذکر کررہے تھے کہ آپ کو اپنی بیٹی کی میڈیکل کی فیس دینی ہے۔ بہت پریشان ہورہے تھے۔“

”ہاں میاں، بات تو پریشانی کی ہے۔“ نفیس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب ہم جیسے لوگ ایک ساتھ اسّی ہزار کہاں سے لائیں۔“

”نفیس صاحب، یہ چیک ہے اسی ہزار کا۔“ منیر نے ایک چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ رکھ لیں، اس وقت کام آجائیں گے۔“

”ارے نہیں، اتنی بڑی رقم میں کیسے لے سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں لے سکتے۔ آپ کی بچی میری بھی بچی ہے۔ اس کے علاوہ میں آپ کو قرض دے رہا ہوں جب ہو تو واپس کردیجیے گا، پلیز۔“

نفیس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ ہوٹل والا اس کا کون ہوتا تھا۔ کوئی بھی تو نہیں۔ لیکن اس نے کتنا بڑا مسئلہ حل کردیا تھا۔ اس نے منیر کو سینے سے لگا لیا۔

”اب چلیں، جا کر بیٹھ جائیں۔“ منیر نے کہا۔ ”کسی کو بتائیے گا نہیں۔“

نفیس اپنی میز کی طرف آگیا۔ یہاں ایک بحث چھڑی ہوئی تھی۔ شہرام کہہ رہا تھا۔ ”اونہہ آزادی۔ ستر برس ہوگئے، کیا ملا ہے ہمیں؟“

جواد نے نفیس کی طرف دیکھا۔ ”نفیس صاحب! آپ بتائیں، کیا آپ مایوس ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ نفیس نے اپنی جیب میں موجود چیک کو محسوس کیا۔ ”نہیں، مایوس لوگ جینے کی آرزو نہیں کرتے۔ لیکن میں جینا چاہتا ہوں تاکہ اپنے ملک کا روشن سویرا دیکھ سکوں۔“

اس دوران شہنشاہ ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی جیب سے فقیر کا دیا ہوا کاغذ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ ”صاحب! یہ کاغذ کل فقیر بابا نے دیا تھا کہ آپ لوگوں کو دے دوں۔“

نفیس نے کاغذ لے کر پڑھنا شروع کردیا۔ اس پر ایک شعر لکھا تھا۔ ”یہ اور بات ہے کہ اندھیروں میں کاٹ دی...... لیکن ہیں روشنی کا بھرم ہم فقیر لوگ۔“

”واہ، واہ! کیا اچھا شعر ہے۔“ جواد نے تعریف کی۔ ”صاحبِ ذوق معلوم ہوتا ہے۔“

”صاحب، بابا نے کہا ہے کہ وہ چودہ اگست ایک خاص انداز سے مناتا ہے۔ اس نے آپ سب کو بلایا ہے۔“

”کیسے مناتا ہے؟“ جواد نے پوچھا۔

”یہ آپ خود معلوم کرلیں صاحب۔“

”چلیں نفیس صاحب، اس سے بات کرتے ہیں۔“ جواد نے کہا۔

فقیر اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوگیا تھا۔

”بھائی، میں نے سنا ہے کہ تم چودہ اگست ایک خاص انداز سے مناتے ہو؟“ جواد نے پوچھا۔

”جی صاحب، میں نے شہنشاہ سے کہا تھا کہ آپ لوگوں کو بھی میری طرف سے بول دے۔“

”بھائی، ہمیں بھی تو پتا چلے کہ کیسے مناتے ہو، ہم ضرور آئیں گے۔“

”لیکن بہت سویرے آنا ہوگا صاحب۔ سورج نکلنے سے پہلے۔“ فقیر نے کہا۔ ”اس کے علاوہ فیض صاحب کی دعا مل کر پڑھنی ہوگی۔“

”کون سی دعا؟“

”خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پہ اترے۔“

”واہ! یہ تو ہم سب کو یاد ہے۔“

”بس میں یہی چاہتا ہوں صاحب۔“

”ٹھیک ہے۔ کم از کم میں تو آجاؤں گا۔“ نفیس نے کہا۔

”اور میں بھی آؤں گا۔“ جواد بول پڑا۔

☆☆☆

سورج طلوع ہورہا تھا۔ اس کی کرنیں ابھی بہت نرم تھیں۔ وہ سب مل کر ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں نزاکت، منیر، شہنشاہ، نفیس اور جواد تھے۔ سورج نکل رہا تھا اور دعا کے بول گونج رہے تھے۔

”خدا کرے کہ مری ارض پاک پہ اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز، جس کی کوئی مثال نہ ہو

دعا گونج رہی تھی اور نئے دن کا سورج طلوع ہورہا تھا......

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللّٰہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایتُ اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیم ُالحق
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حنا ءڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

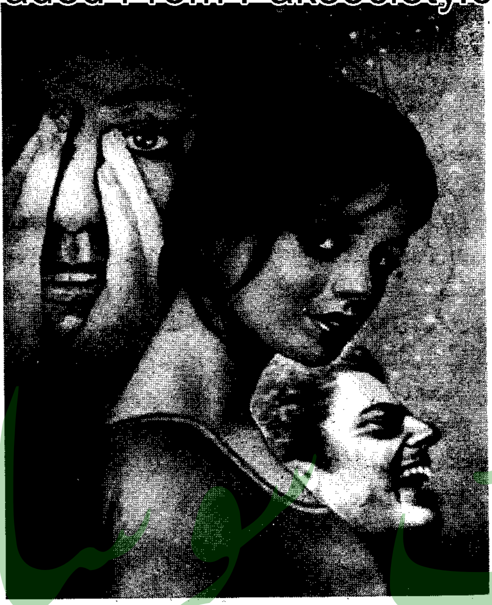

سرورق کی پہلی کہانی

لہو کا کھیل

روبینہ رشید

اعتدال کے راستوں پر چلنے والے ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں... خصوصاً صحت جیسے معاملات میں کوئی بھی بداعتدالی سنگین نقصان سے دوچار کردیتی ہے... کھلاڑیوں کے حوالے سے بنی گئی دلچسپ وسنگین تحریر... وہ صحت مند تھے... چاق و چوبند تھے... مگر تیز سے تیز تر کی خواہش نے انہیں غلط راہوں پر ڈال دیا... ایک ہی وقت میں زندگی ماردینے والے کھلاڑی... ان کی اچانک موت نے ہر کسی کو پریشان اور ہراساں میں مبتلا کردیا تھا۔

معاشرے کے ان سیاہ چہروں کے گھناؤنے عکس جو زندگی کو دھندلا رہے تھے۔ اس ماہ کے سرورق پر ایک رقت انگیز تحریر

موسم صبح سے ہی نہایت خوشگوار تھا۔ شرجیل احمد اپنی نئی اور آرام دہ ریکلائیز (آرام کرسی) پر نیم دراز ایک غیر ملکی اسپورٹس میگزین کے صفحات پلٹ رہا تھا۔

اتنی دیر ایک جگہ بیٹھنا ویسے اس کی سرشت میں بالکل نہیں تھا۔ وہ اپنے کھیل کے مانند ہمیشہ حرکت میں رہنا پسند کرتا تھا مگر یہ اتوار کی دوپہر تھی اور آج کا اتوار اس کے لیے مکمل ریسٹ ڈے تھا۔ چھ دن بعد چودہ اگست تھی اور چودہ اگست کو ان کی ٹیم کو گورنر کے سامنے میچ کھیلنا تھا جس کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مطلب مسلسل پریکٹس تھا۔

اس کے دو ہی شوق تھے ایک فٹ بال اور دوسرا اسپورٹس میگزین پڑھنا......فٹ بال میں آگے جانے کے لیے اسے جس توانائی کی ضرورت تھی اس کا شارٹ کٹ بھی اس نے ڈھونڈ نکالا تھا اور اب وہی اس کا سب سے بڑا شوق بن چکا تھا جس سے وہ پندرہ منٹ پہلے ہی لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس کی ابتدا پرفارمنس میں جادوئی تیزی کے لالچ میں ہوئی تھی مگر کب وہ اس کا اس قدر عادی بن گیا کہ اس کے بغیر رہنا دشوار ہو گیا، یہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہو پایا تھا۔

اس کی عمر ابھی صرف 19 سال تھی۔ وہ صوبے کی فٹ بال ٹیم کا سب سے کم عمر کپتان تھا اور بین الاقوامی سطح پر اسے بہترین فٹ بالرز میں شمار کیا جانے لگا تھا۔

'ایک دن اس میگزین کے سرورق پر میں ہوں گا۔' اس نے صفحہ پلٹتے ہوئے سوچا اور غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ داہنے ہاتھ سے بائیں کہنی کو کھجایا۔ 'ایسا ضرور ہوگا۔' وہ خواب کی کیفیت میں خود کو ٹائٹل پر دیکھ رہا تھا مگر اسے فوراً اس کیفیت سے باہر آنا پڑا۔ بازوؤں میں ہونے والی مسلسل خارش نے اسے آگے سوچنے نہیں دیا۔ اسے ایک عجیب سی چبھن محسوس ہو رہی تھی اور وہ بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں اور کندھوں کو کھجا رہا تھا۔

"یہ......یہ مجھے ہو کیا رہا ہے؟" وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں پر موٹی موٹی سرخ دھاریاں پڑتی جا رہی تھیں۔ مسلسل کھجانے سے جلد پر خراشیں بھی ابھر آئی تھیں مگر کھجلی اتنی شدید تھی کہ وہ خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ اب یہ چبھن اس کے ہاتھوں اور کندھوں سے ہوتی ہوئی سینے اور پیٹھ تک آگئی تھی۔ اس نے بے اختیار جرسی اتار پھینکی اور سامنے لگے درخت کے تنے سے پیٹھ کو رگڑنا شروع کر دیا مگر اس سے بھی اس کی تکلیف میں صرف اضافہ ہی ہوا تھا۔

وہ دوڑتا ہوا اندر کی جانب لپکا۔ گھر پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے کمرے میں الرجی سے بچانے والا ایک مرہم موجود ہے۔ الماری سے مرہم نکال کر اس نے بمشکل ٹیوب کو کھولا اور اسے اپنے ہاتھوں اور سینے پر دیوانہ وار ملنا شروع کر دیا مگر نتیجہ اب بھی صفر ہی رہا تھا۔ اس نے ٹیوب کو زمین پر پھینکا اور ایک بار پھر باہر نکل آیا۔ اب اسے مدد کی تلاش تھی۔ کوئی ڈاکٹر شاید اسے اس عذاب سے بچا سکے۔ اس نے سوچا اور اسی حالت میں گیٹ کی طرف بڑھا۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس کے پورے جسم میں گویا آگ سی بھڑک گئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے جسم کو نوچ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس کے جسم پر سرخ دھاریوں اور خراشوں کا جال سا بن گیا تھا جن سے خون رس رہا تھا مگر وہ خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ دو قدم آگے بڑھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ زمین پر گرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے۔ اس کی رگ رگ میں شعلے دہک رہے تھے۔ وہ گھاس پر تڑپ رہا تھا جو اس کے خون سے سرخ ہو رہی تھی پھر اس کے حلق سے تکلیف میں ڈوبی ایک آخری چیخ برآمد ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ ساکت ہو گیا۔

☆☆☆

وہ نہایت بردباری سے چلتا ہوا اسٹیج کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دونوں طرف کرسیوں پر بیٹھے بے شمار افراد زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔ سامنے اسٹیج پر کئی نامور چہرے اس کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں سنہری قلم کی شکل میں بنا وہ ایوارڈ تھا جسے حاصل کرنا ہر صحافی کا خواب ہوتا ہے۔ ابھی اس نے اسٹیج پر چڑھنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک تیز گڑگڑاہٹ نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ تالیوں کی گونج مدھم پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج، ایوارڈ، روشنیاں سب گدھے کے سر سے سینگ کے مانند منظر سے غائب ہو گئیں۔ اگلے ہی لمحے وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا تھا۔ بیڈ سائڈ پر رکھا فون مسلسل چنگھاڑ رہا تھا۔ اتنے اچھے خواب سے اس طرح بیدار کرنے پر اس نے خون آشام نگاہوں سے فون کو گھورا۔ کال کرنے والا بھی خضر کی نیند کی مضبوطی اور کچے پن سے اچھی طرح واقف نظر آ رہا تھا اسی لیے استقامت سے گھنٹیوں پر گھنٹیاں بجائے جا رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے فون اٹھایا۔ اسکرین پر چمکنے والا نام اس کے کلاس فیلو احمد کا تھا۔ اس کی نظر نام اور وقت پر ایک ساتھ پڑی تھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔

"ہیلو......کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟" وہ ریسیور میں غرایا۔

"توبہ، نہ سلام نہ دعا......کیا بہت گہری نیند میں تھے؟" احمد نے معصومیت سے پوچھا۔

"احمد اس وقت صبح کے سات بجے ہیں، میں رات کو دو بجے کے بعد سوتا ہوں۔"

"اچھا، اچھا......اصل میں، میں اگلے ہفتے پیر کو تمہارے شہر آ رہا ہوں، سنا ہے کوئی زبردست میچ ہونے والا ہے۔ اس کی کوریج کے لیے آ رہا ہوں۔ کچھ انٹرویوز بھی کرنا

ہیں۔ تمہیں یہی بتانے کو فون کیا تھا پھر دن بھر میں کام میں الجھ جاؤں گا تو بھول نہ جاؤں اس لیے سوچا ابھی کر لیتا ہوں۔ ویسے صحت کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے صبح صبح اٹھنا۔"

"اوکے...... ضرور تشریف لاؤ۔ اب اگر تمہارا صحت نامہ ختم ہوگیا ہو تو میں سولوں تھوڑی دیر؟" اس نے پوچھا۔

"کس قدر چڑچڑے ہوتے جارہے ہو تم، لگتا ہے کہ بڑھاپا تیزی سے آرہا ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ کوئی اچھا بڑا اخبار یا چینل جوائن کرلو، پیسے ویسے کماؤ...... کب تک اس چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے اخبار سے چپٹے رہو گے۔" احمد نے ہمدردی سے کہا۔

"احمد، تم سے پیر کو ملاقات ہوگی، اپنا پروگرام مجھے ای میل یا واٹس اپ کردینا...... اور ہاں اپنے مشورے کے مطابق کسی بڑے شہر کے بڑے اخبار سے میرا اپائنٹمنٹ لیٹر ساتھ لیتے آنا۔" وہ دانت پر دانت جما کر بولا اور فون کاٹ دیا۔

احمد اس کا کلاس فیلو اور اچھا دوست تھا۔ یونیورسٹی کے بعد خضر نے اپنے شہر کے روزنامے "اخبار" کو جوائن کر لیا تھا جبکہ احمد ایک بڑے انگریزی روزنامے سے منسلک ہو گیا تھا جو اب ایک چینل کا بھی مالک تھا۔ خضر، احمد کی ترقی سے خوش تھا مگر احمد ہر ملاقات یا گفتگو میں اسے یہ یاد دلانا نہیں بھولتا تھا کہ یونیورسٹی میں ہر سبجیکٹ میں ٹاپ کرنے والا خضر ترقی کی دوڑ میں اس سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ خضر نے گہری سانس لی۔

وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کرسکتا ہے مگر مقابلے اور لابنگ کے اس دور میں آگے بڑھنے کے لیے کام کے علاوہ جو کچھ کرنا پڑتا تھا' وہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا پھر وہ روزنامہ اخبار کی اپنی ملازمت سے مطمئن تھا۔ اس وقت وہ اپنے دفتر کا سینئر رپورٹر تھا۔ ویسے بھی اس پر کوئی لمبی چوڑی ذمے داریوں کا بوجھ تو تھا نہیں۔ اس کے والد کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ اس کی والدہ نے اسے اور اس کی بڑی بہن خدیجہ کو پالا پوسا۔ خدیجہ کی شادی کے چند ماہ بعد ہی وہ بھی دارِفانی سے کوچ کر گئیں۔ خدیجہ کے شوہر کی ملازمت امریکا میں تھی۔ کاغذات مکمل ہوتے ہی وہ بھی امریکا جا بسی تھی اور ایک بار خضر اس سے ملنے امریکا گیا تھا۔ خضر نے آبائی مکان بیچ کر شہر کے ایک بہتر علاقے میں ایک آرام دہ اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ صحافت اس کا شوق بھی تھا اور پیشہ بھی۔ یوں زندگی اچھی کٹ رہی تھی۔

اس نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ فون دوبارہ گنگنا اٹھا۔

"اُف کیا مصیبت ہے، بند ہی کر دیتا ہوں۔" وہ جھنجلا کر اٹھا مگر اسکرین پر اخبار کے ایڈیٹر جمال صاحب کا نام دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اتنی صبح ان کے فون کا مطلب کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ہی ہوسکتی تھی۔

"جی جمال صاحب......"

"خضر تم سو رہے ہوگے مگر سونے کا وقت نہیں ہے یہ فوراً کھڑے ہو جاؤ اور دفتر پہنچو۔" وہ اپنے مخصوص تیز تیز لہجے میں بولتے جارہے تھے۔

"مگر جمال صاحب ہوا کیا ہے؟ بتایئے تو مجھے......"

"بھئی تم آؤ تو...... بتانے اور پوچھنے کے لیے ہی تو بلا رہے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ کل رات شہر میں دو قتل ہوگئے ہیں۔"

"دو قتل......"

"ہاں، ہاں...... اور اب یہ نہ کہنا کہ قتل تو ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی تو بے حسی چھا گئی ہے ہم پر...... ارے میاں ہر قتل ایک کہانی ہوتی ہے مگر یہ جو دو قتل ہوئے ہیں' یہ ہماری ینگ فٹ بال ٹیم کے ستاروں کے ہوئے ہیں، بس اب تم نکل آؤ میاں...... پھر بات ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ خضر کی نیند اب مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے میں وہ دفتر کے اندر تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ روشن تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ آمنہ اس سے قبل ہی دفتر پہنچ چکی تھی۔

آمنہ "اخبار" کے مالک کی بھتیجی تھی۔ وہ امریکا سے فوٹوگرافی پڑھ کر آئی تھی اور اب "اخبار" کی فوٹوگرافر تھی۔ خضر اگر روزنامہ اخبار کو چھوڑنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا تو اس کی ایک وجہ وہ بھی تھی۔

"تو تم پہنچ گئیں......" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"اور کیا، جمال صاحب کا تو تمہیں پتا ہے، فون بھی تار کی طرح کیا تھا...... ویسے یہ ہو کیا رہا ہے؟" وہ بولی۔

"یہ تو تم بتاؤ......" خضر اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی نیا سیریل کلر گھس آیا ہے۔" وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "ورنہ کسی کو ان دو بچوں

کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ضرور یہ کوئی اور چکر ہے۔“

”ارے آمنہ ضروری نہیں کہ یہ کسی سیریل کلر کا کام ہو۔“

”تم مت مانو...... مگر مجھے لگ رہا ہے کہ یہ کوئی بڑا چکر ہے۔ میں نے تو اباجی کا چھوٹا پسٹل اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“ وہ اپنے خوب صورت بالوں کو جھٹکا دے کر بولی۔

”باپ رے۔“ خضر نے نروس سی ہنسی کے ساتھ اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کیا مطلب......“ آمنہ نے گھور کر پوچھا۔

”کس بات کا مطلب؟“

”اس ہنسی اور اس باپ رے باپ کا؟“ وہ اسے گھور رہی تھی۔

”ڈر گیا ہوں نا پستول کی موجودگی اور اس کے نتائج کے بارے میں سوچ کر...... خود ہی سوچو اگر کوئی مجرم ہمارے سامنے آ... گیا اور تم نے گولی چلا بھی دی تب بھی جتنا میں تمہارے نشانے کے بارے میں جانتا ہوں اس سے خطرہ مجھے بھی لاحق ہے۔ یاد نہیں جب ہم کورٹ پر گئے تھے اور تم نے بال کو باسکٹ میں ڈالنے کے لیے پھینکا تھا اور وہ اس ناچیز کے سر پر لینڈ کر گئی تھی جبکہ...... باسکٹ بال تو گولی سے خاصی بڑی ہوتی ہے...... ہوتی ہے نا؟“ وہ خود کو آمنہ کے پھینکے ہوئے کشن سے بچاتے ہوئے بولا۔

”تم حالات کو سمجھ نہیں رہے ہو شاید۔“ وہ بولی۔

”سمجھ رہا ہوں مگر میں تمہیں خوف زدہ نہیں دیکھنا چاہتا۔“ خضر اس بار سنجیدگی سے بولا۔ ”چلو اب جمال صاحب کی طرف چلتے ہیں۔“

ایڈیٹر کے کمرے کی جانب جاتے ہوئے خضر کے ذہن میں کئی سوالیہ نشان رقصاں تھے۔

کیا واقعی شہر میں کوئی سیریل کلر آ گیا تھا؟ اور اگر تھا بھی تو اس نے ان نوجوان لڑکوں کو کیوں قتل کیا؟ انہوں نے ایسا کیا کیا تھا؟ یا وہ ایسی کسی چیز میں شامل ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں ان کے حصے میں موت آئی تھی؟

”کہاں کھوئے ہوئے ہو میاں؟“ جمال صاحب کی کرخت آواز نے خضر کو چونکا دیا۔ وہ اپنی کرسی پر براجمان تھے۔ پڑھنے کی عینک حسبِ معمول ان کی ناک کی پھننگ پر دھری تھی اور وہ اس کے اوپر سے اسے گھور رہے تھے۔

”میں ان دونوں لڑکوں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”خبر کیا ہے سر؟“

”یعنی خبر بھی اب میں تمہیں بتاؤں گا؟“ وہ ملامتی انداز میں بولے۔ ”میاں خبریں جاننے کے لیے ہی اخباروں میں رپورٹرز رکھے جاتے ہیں۔ خیر تم فوراً تھانے جاؤ...... دیکھو وہاں سے کیا خبر ملتی ہے، جو بھی تفصیلیں ملے پکڑ لو، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے اور آمنہ تمہیں خضر کے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے کچھ اچھی تصاویر چاہئیں، سمجھ گئیں نا......“ فون کی گھنٹی بجی تو وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ خضر اور آمنہ کو انہوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔

”کیا آپ کو یقین ہے؟“ چند لمحے خاموشی سے سننے کے بعد انہوں نے پوچھا پھر بولے۔ ”جی، ٹھیک ہے، آپ کا شکریہ۔“ انہوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر نروس انداز میں اپنی عینک اتار کر میز پر رکھی پھر اگلے ہی لمحے دوبارہ پہن لی اور خضر اور آمنہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”ٹیم کے ایک اور لڑکے کا قتل ہو گیا ہے۔“

☆☆☆

خضر اور آمنہ تھانے پہنچ کر قدرے حیران ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں اس چھوٹے سے شہر میں جہاں اس طرح کی وارداتیں کم ہوتی ہیں ایک رات میں تین لڑکوں کے پُراسرار قتل کی وجہ سے جو افراتفری یا بھاگ دوڑ نظر آنی چاہیے تھی، وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ سپاہی اونگھ رہے تھے۔ ایس ایچ او اور انسپکٹر تھانے میں موجود نہیں تھے۔ جب وہ ڈی ایس پی کے دفتر میں پہنچے تو وہ میز پر ٹانگیں پسارے دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا مگر خلال والی ایکٹی ویٹی اسی طرح جاری تھی۔

”خیریت ہے رپورٹر صاحب...... صبح صبح تھانے میں؟“ وہ خضر کو دیکھ کر مسکرایا۔

”ڈی ایس پی صاحب کیا آپ نہیں جانتے کہ ہم کیوں آئے ہیں؟“ خضر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جوابی سوال کیا۔ ”میرے حساب سے تو اور بھی لوگوں کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔“

”اچھا، اچھا...... میں سمجھا شاید فٹ بالروں والے معاملے کی خبر لینے آئے ہیں۔ بھئی اس کے لیے تو منسٹر صاحب نے خود خبر بھجوائی ہے۔“

”کیسی خبر......؟“

”اچھا...... تو آپ کو پتا ہی نہیں ہے حالانکہ علاقے کے تو سب سے بڑے اخبار کے وڈے رپورٹر ہو آپ جی...... بھائی بات یہ ہے کوئی قتل شتل نہیں ہوا ہے۔“ وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ افواہ ہے اور وہ تینوں لڑکے زندہ ہیں؟" خضر نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کی آدھی بات بالکل درست ہے کہ قتل کی افواہ اڑی تھی مگر لڑکے زندہ نہیں ہیں۔"

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" آمنہ نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ تینوں لڑکوں نے خودکشی کی ہے۔"

"خودکشی؟" آمنہ اور خضر نے ایک ساتھ پوچھا۔

"ہاں جی......" ڈی ایس پی نے حتمی انداز میں کہا۔

"ایک ہی ٹیم کے تین لڑکوں نے ایک ہی رات الگ الگ جگہوں پر خودکشی کرلی...... کیا یہ بات ماننے والی لگتی ہے؟" خضر نے اسے گھورا۔

"جی لگے یا نہ لگے ہوا تو ایسا ہی ہے۔"

"میڈیکل رپورٹ آگئی ہے؟"

"اتنی جلدی کیسے آجائے گی؟" وہ گویا خضر کی حماقت پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔ "شام یا کل تک آجائے گی۔"

"پھر آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ خودکشی ہے؟" اس بار آمنہ نے پوچھا۔

"بی بی ہمارا بھی کوئی تجربہ ہے آخر...... دراصل شواہد یہی بتارہے ہیں کہ یہ لڑکے ڈرگ استعمال کرتے تھے۔ اس کا اوورڈوز موت کی وجہ بن گیا ہے۔ ہمیں تینوں کے پاس سے میتھ کی باقیات ملی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میتھ ڈرگ ہے۔" وہ رازداری سے بولا۔

"لیکن......" خضر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اگر فرض کرلیا جائے کہ وہ ڈرگز استعمال کرتے تھے تب تو انہیں اس کی مقدار کا علم ہوگا پھر وہ اس قدر کیوں استعمال کریں گے۔ اگر یہ اتفاق ہے تو بھی اسے کسی ایک کے ساتھ ہونا چاہیے...... پھر کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ وہاں پر یہ ڈرگ بعد میں ڈالی گئی ہو۔"

"دیکھیے خضر صاحب! ہم ان بچوں کے والدین کو مزید دکھی اور بدنام نہیں کرنا چاہتے۔ یہی منسٹر صاحب نے بھی کہا ہے پھر اس طرح ٹیم کا نام بھی بدنام ہوتا ہے اسی لیے اسے خودکشی ہی کہا جارہا ہے۔"

"ہم......" خضر چند لمحے سوچتا رہا۔ "رپورٹ شام سے پہلے نہیں آئے گی؟"

"نہیں، ایس ایچ او اور انسپکٹر گئے ہیں۔ شرجیل احمد کے مکان پر کچھ شواہد.... کو رجسٹر کرنا تھا جس کے بعد وہ رپورٹ لے آئیں گے۔ تم بعد میں یہیں آکر ان سے بات کرسکتے ہو۔"

صاف نظر آرہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خضر اور آمنہ اس معاملے میں کسی سے بھی بات کریں۔

"اوکے ڈی ایس پی صاحب معلومات کا شکریہ، ہم چلتے ہیں۔" خضر کچھ سوچتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ "امید ہے کہ آپ رپورٹ کے آتے ہی مطلع کریں گے۔"

"بالکل، کیوں نہیں، آپ کو خبر مل جائے گی۔"

"خضر ہمیں فوراً شرجیل احمد کے گھر جانا چاہیے۔" آمنہ باہر نکلتے ہی بولی۔ "یہ موٹا کچھ گڑبڑ کررہا ہے شاید وہاں سے ہی کچھ معلوم ہوسکے۔"

"ہوسکتا ہے مگر مجھے یہ معاملہ اتنا آسان نہیں لگتا، ایسا کرو آمنہ اب گاڑی تم چلاؤ، میں اس دوران کچھ فون کالز کرتا ہوں۔" خضر چابیاں آمنہ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

شرجیل احمد کا گھر وہاں سے بیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ خضر اس دوران فون پر مصروف رہا تھا جبکہ آمنہ خاموشی سے گاڑی چلاتی رہی تھی۔ خضر نے بات ختم کرکے فون جیب میں رکھا اور آمنہ کی جانب دیکھ کر آنکھیں نچائیں۔

"کیا معلوم ہوا...... ٹیم کے منیجر سے بھی بات کی تم نے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"ہاں یار...... کچھ عجیب سلسلہ ہے، سرکاری اہلکاروں حتیٰ کہ ٹیم کے لوگ تک اس حوالے سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ کوئی گہرا اور بڑا معاملہ لگتا ہے۔ مرنے والے تین لڑکوں میں سے دو کا تعلق دیگر علاقوں سے ہے۔ ان کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور فارنسک کے بعد ان کے آبائی علاقوں میں روانہ کردی جائیں گی۔" خضر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ارے تم رک کیوں گئیں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کیونکہ شرجیل احمد کا گھر آگیا ہے۔" آمنہ نے گاڑی سائڈ پر لگاتے ہوئے کہا۔

یہ متوسط طبقے کی ایک اچھی آبادی تھی۔ شرجیل کے گھر کے باہر غالباً تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے ٹینٹ لگایا گیا تھا۔ ٹینٹ کی دوسری جانب ایک پولیس موبائل بھی موجود تھی۔ خضر اور آمنہ مکان میں داخل ہوئے۔ اندر موجود ملازم انہیں ڈرائنگ روم تک لے آیا۔ سادگی سے سجے ڈرائنگ روم میں شرجیل کے والد، والدہ، چھوٹے بھائی کے علاوہ چند عزیز، ایس ایچ او اور انسپکٹر بھی موجود تھے۔ شرجیل کی والدہ مسلسل رو رہی تھیں جبکہ اس کے والد کا چہرہ ہر

احساس سے عاری نظر آرہا تھا۔ ایس ایچ او کی نظر جونہی خضر پر پڑی وہ تیر کی طرح ان کی طرف آیا تھا۔

”آپ یہاں کیا کررہے ہیں خضر صاحب؟“ وہ دھیمی مگر سخت آواز میں بولا۔

”وہی...... عبدل صاحب۔“ خضر اس کے سینے پر لگی نیم پلیٹ کو پڑھ کر بولا۔ ”جو آپ کررہے ہیں یعنی اپنی ڈیوٹی۔“

”میں یہاں بیان ریکارڈ کررہا ہوں اور آپ کو ان لوگوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟ آپ ہمیں اس بات سے کیسے روک سکتے ہیں؟“ آمنہ بولی۔ ”ہمیں بھی ان سے بات کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کو ہے۔“

”غلط، میں یہاں اس وقت انچارج ہوں اور موقعِ واردات پر کون آئے گا اور کیا کرے گا اس کا فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے۔“

”واردات......“ خضر نے دہرایا۔ ”مگر ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ کے ڈی ایس پی نے ہمیں اس بات کا یقین دلایا ہے کہ یہ کوئی واردات یا قتل نہیں ہے۔“

”وہ درست کہہ رہے ہیں مگر پھر بھی ہم شواہد..... وغیرہ اکٹھے کررہے ہیں۔ میڈیا کے لیے خبر جاری کردی جائے گی۔“

”یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔“ آمنہ بولی۔

”خضر صاحب میں آپ سے درخواست کررہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ ایک دکھی خاندان کے لیے مزید مسائل کھڑے نہیں کریں گے، آیئے میں آپ کو باہر تک چھوڑ دوں۔“

خضر نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا پھر کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ آمنہ ایک لمحہ اپنی جگہ کھڑی رہی پھر بددلی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ ایس ایچ او باہر تک ان کے ساتھ آیا تھا جب تک ان کی کار آگے نہ بڑھی وہ وہیں کھڑا تھا۔

”یہ لوگ کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔“ آمنہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہی بہ آوازِ بلند کہا۔ وہ خضر کے خاموشی سے باہر آجانے کے فیصلے سے خوش نہیں تھی۔

”ہاں مگر کیا...... یہ جاننا آسان نہیں لگتا۔“ خضر نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اور ایکسیلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

☆☆☆

دفتر میں داخل ہوتے ہی استاد نے خضر کو موسم گرم ہے کی نوید سنا دی تھی۔ استاد اخبار کا سب سے پرانا ملازم اور ہر مرض کی دوا تھا۔ چائے بنانے سے لے کر اندر باہر کے سارے کام اس کے سپرد تھے۔

”خیریت......“ خضر نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ”مگر میٹر گھوما ہوا ہے صاحب کا...... دو بار تم لوگوں کا پوچھ چکے ہیں اور کہا ہے کہ جیسے ہی آئیں...... اندر کمرے میں بھیج دوں۔“

”چلو چلتے ہیں۔“ آمنہ مسکرائی۔ مالک کی بھتیجی ہونے کے ناتے صرف وہی ایسی تھی جس کے سامنے جمال صاحب کا جلال دم توڑ جاتا تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔

”آیئے میاں...... آپ بھی آیئے بی بی...... تشریف لایئے، بیٹھیے۔“ جمال صاحب ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے۔ آپ جناب سے لبریز گفتگو اس بات کا اشارہ تھی کہ وہ واقعی غصے یا شدید تناؤ کا شکار تھے۔ خضر اور آمنہ خاموشی سے میز کے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”آخر تم دونوں کیا کرتے پھر رہے ہو؟“ وہ دو لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے۔

”وہی جو ہمارا کام ہے اور جس کے لیے آپ نے ہمیں بھیجا تھا۔“ خضر سادگی سے بولا۔ ”ڈی ایس پی بلکہ پورے ڈپارٹمنٹ کا رویہ ہی سمجھ میں آنے والا نہیں ہے، وہ اس سارے معاملے کو لپیٹ دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی انہوں نے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہم دفتر میں بیٹھ کر ان کی بھیجی ہوئی خبر کا انتظار کریں۔“

”پھر آپ نے کیا کیا؟ تحقیق کا دائرہ بڑھا دیا اور شرجیل احمد کے گھر جا پہنچے۔“

”اوہ تو ساری خبریں تو ہیں آپ کے پاس پھر ہم سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟“ خضر سر جھٹک کر بولا۔ ”ہمیں اپنی اسٹوری بنانے کے لیے معلومات درکار ہیں اور اب تک جو سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ پولیس اس معاملے کو خودکشی اور اوورڈوز کا رنگ دینا چاہتی ہے اور اس معاملے میں منسٹر اسماعیل کا نام بھی لیا جارہا ہے۔ کچھ ہے سر جو بہت غلط ہے اور یقیناً ہمارے قارئین اس معاملے کی حقیقت جاننا چاہیں گے۔“

”مگر ڈی ایس پی اور منسٹر اسماعیل دونوں کا یہ کہنا ہے کہ کوئی کچھ جاننا نہیں چاہتا اور اس کوشش سے ٹیم کا نام بدنام ہوجائے گا اور تو اور خود میرے باس یعنی پبلشر صاحب کا بھی ایک چیختا چنگھاڑتا فون آچکا ہے۔“ جمال صاحب پھٹ

پڑے۔

''پھر ہم اپنا کام کس طرح کریں؟''

''کسی بھی طرح کرو مگر مجھے پبلشر یا کسی کا بھی فون نہیں آنا چاہیے، سمجھ گئے تم لوگ۔'' وہ اپنے ہاتھ کو پستول کی طرح لہراتے ہوئے بولے۔

آمنہ نے ان کی بات سن کر مشینی انداز میں اثبات میں سر ہلایا جبکہ خضر اس کا چہرہ دیکھے بغیر جانتا تھا کہ اب وہ اس اسٹوری سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی، نہ ہی خود خضر کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔

''سمجھ گئے نا، اب تم دونوں جاؤ میرا وقت ضائع نہ کرو۔'' انہوں نے محفل برخاست کا اعلان کرتے ہوئے عینک لگالی تھی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں فٹ بال ٹیم کے کوچ کے دفتر میں کھڑے تھے۔ اس بار آمنہ نے اپنی اسپورٹس کار نکالی تھی۔ دفتر میں کوئی نہیں تھا۔

''اب کیا کریں......؟'' آمنہ نے پوچھا۔ ''میں اس خالی دفتر کی علامتی تصویر بنالیتی ہوں۔''

''کیا میں کچھ مدد کرسکتا ہوں؟'' اس سے پہلے کہ خضر کوئی جواب دیتا ایک آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ خضر نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ شہزاد خان تھا، دو جونیئر کوچز میں سے ایک...... شہزاد خان ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا۔

''کیا حال ہے شہزاد؟'' خضر نے پوچھا۔

''بس ٹھیک، میں تو ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں آسکا ہوں۔ یقین نہیں آرہا کہ وہ تینوں مرچکے ہیں...... اور وہ بھی اس بُری طرح......'' وہ جھرجھری سی لے کر بولا۔

''واقعی...... یہ ایک بڑا دھچکا ہے مگر شہزاد، اس بُری طرح سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''ارے کیا تمہیں پتا نہیں...... کیسے رپورٹر ہو یار، یہ بات تو تقریباً سب کو ہی معلوم ہوچکی ہے۔ جن لوگوں نے فرانسک جانے سے پہلے ان کی لاشیں دیکھی ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ان کی بُری حالت تھی۔ ان کا پورا جسم بُری طرح نچا ہوا تھا اور وہ اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے تھے۔'' شہزاد نے رازداری سے بتایا۔

''کیا......؟ کیا ان کی موت کسی دوا کے اوورڈوز سے نہیں ہوئی تھی؟''

''مجھے نہیں پتا مگر اکثر لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ شمال کے جنگل سے کوئی وحشی درندہ شہر میں گھس آیا ہے اور یہ اس کی ہی حرکت ہے۔ ذرا سوچو اگر یہ سچ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خون آشام درندہ اب بھی کہیں آزاد گھوم رہا ہے...... اُف کس قدر خوفناک بات ہے۔''

''شہزاد، کیا ان لاشوں کی حالت اتنی بُری تھی؟'' آمنہ نے اسے کریدا۔

''بہت بری، سارا جسم زخموں اور خراشوں سے بھرا پڑا تھا۔ رگیں پھٹ گئی تھیں، سنا ہے کہ لاشوں کو پوسٹ مارٹم اور ضروری کارروائی کے بعد خصوصی باکس میں بند کرکے دیا جائے گا۔ ایک تو ان کی حالت کی وجہ سے اور پھر اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس سے ہر طرف خوف پھیلنے کا خطرہ جو ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''اوہ، یہ تو ہماری سوچ سے زیادہ پریشان کن صورتِ حال ہے۔'' آمنہ بولی۔ ''آپ بھی محتاط رہیے گا شہزاد صاحب۔''

''جی...... جی بالکل۔'' شہزاد خان کے چہرے پر خوف کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

''کوچ نعمان صاحب کیسے ہیں؟'' خضر نے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہیں مگر ظاہر ہے کہ ان حالات نے انہیں بہت زیادہ متاثر کیا ہے، ہماری ٹیم ایک خاندان کی طرح تھی۔''

''وہ اس وقت موجود ہیں؟''

''ہاں وہ گراؤنڈ میں اپنی مخصوص بینچ پر مل جائیں گے، آؤ میں تم لوگوں کو وہاں پہنچا دیتا ہوں۔''

گراؤنڈ میں داخل ہوتے ہی انہیں کوچ نعمان نظر آگئے تھے۔ وہ سیدھے ہاتھ پر بنی ایک بینچ پر ساکت سے بیٹھے تھے۔ وہ خود فٹ بال کے بہترین کھلاڑی رہ چکے تھے۔ کسرتی جسم اور شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے چہرے پر افسوس، فکر اور تناؤ کے تاثرات جمے ہوئے تھے۔

خضر کے لیے اس لمحے تک تین لڑکوں کی اس طرح موت ایک سنسنی خیز خبر سے زیادہ نہیں تھی مگر اب کوچ کو دیکھ کر اور ان سے اس حالت میں سوال و جواب کرتے ہوئے اسے شرمندگی سی محسوس ہورہی تھی مگر اسے بہرحال اپنا کام تو کرنا ہی تھا۔

''شرجیل بہت جلد بہترین فٹ بالرز میں شامل ہو جاتا۔ ان لڑکوں کے سامنے پوری زندگی پڑی تھی۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ نشے کی خاطر وہ ایسے کیسے برباد کرسکتے ہیں؟'' وہ خضر اور آمنہ کو بیٹھنے کی جگہ دیتے ہوئے بولے۔

''یہ واقعی عجیب لگتا ہے، لگتا ہے نا؟'' خضر نے

پوچھا۔

’’تو تم اپنی خبر کے لیے میرے تاثرات لینے آئے ہو؟‘‘

’’اگر آپ بہتر محسوس نہ کر رہے ہوں تو ہم دوبارہ آجائیں گے۔‘‘ آمنہ نے کہا۔

’’نہیں، نہیں، سب وقت ایک جیسے ہی ہیں آمنہ۔‘‘

’’شکریہ نعمان، میرے لیے بھی یہ سوال ایک معما بنا ہوا ہے کہ آخر اتنے ہونہار کھلاڑیوں کو کیا چیز اس نشے کی طرف لے گئی؟‘‘ خضر بولا۔

’’دنیا میں کامیاب، ہونہار اور بہترین مستقبل رکھنے والے ایتھلیٹ بھی آج کل ڈرگز استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ شارٹ کٹ کا دور ہے ہر ایک کو فوری کامیابی چاہیے خواہ اس کی قیمت کچھ ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے، خصوصاً جونیئر اور ملکی سطح پر لوگ یہ سوچ کر اسے استعمال کرتے ہیں کہ فی الحال انہیں چیک نہیں کیا جائے گا۔ وہ اس گمان میں ہوتے ہیں کہ بین الاقوامی مقابلوں تک پہنچ کر وہ اسے چھوڑ دیں گے مگر ایسا کرنا اکثر اوقات ممکن نہیں رہتا۔‘‘

’’کیا آپ جانتے تھے......؟‘‘

’’مجھے شک تھا مگر اس شہر میں کسی کو اس بات کی پروا نہیں تھی حتیٰ کہ ان کے والدین تک کو نہیں...... سب کو کامیابی سے زیادہ دلچسپی ہے۔‘‘

’’تو کیا آپ نے اس حوالے سے شرجیل کے والد سے بات کی تھی؟‘‘

’’ہاں، ایک بار میں نے اس کے والد اور پھر ہماری ٹیم کے سرپرست اعلیٰ وزیر اسماعیل صاحب سے بھی اس کا اظہار کیا تھا۔ شرجیل کے والد نے اس بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا۔ والدین اگر وقت پر بچوں پر نظر رکھ لیں اور ان کی مصروفیات کو جانتے رہیں تو بعد میں رونے کی نوبت کم آتی ہے۔‘‘ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ’’منسٹر صاحب نے ان سے زیادہ سخت ردِعمل دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس طرح وہ زیادہ بہتر کارکردگی دے سکتا ہے تو مجھے خاموش رہنا چاہیے۔ مجھے اس بات پر بہت افسوس ہوا تھا۔‘‘

’’کیا واقعی میتھ ایتھلیٹس کی جسمانی طاقت بڑھا دیتی ہے؟‘‘

’’ہاں...... اس سے طاقت و توانائی دونوں دگنی ہو جاتی ہیں۔ اسٹیمنا بڑھ جاتا ہے مگر یہ سب مختصر مدت کے لیے ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے اثرات جسم کو اور خصوصاً ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔‘‘

’’مگر تب بھی کیا یہ بہت غیر معمولی سا نہیں لگتا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر تین افراد جو اس کو کافی مہینوں سے استعمال کر رہے تھے اوورڈوز لے کر مر جائیں؟‘‘ خضر نے پوچھا۔

’’کیا کہا جا سکتا ہے؟‘‘ کوچ نے کندھے اچکائے۔

’’یا پھر تم دونوں بھی اس خون آشام درندے والی کہانی پر یقین کرتے ہو؟‘‘

’’آپ کا کیا خیال ہے؟‘‘

’’میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں میں نے تم سے ابھی جو بھی باتیں کی ہیں، کیا میں تم دونوں پر یقین کر سکتا ہوں کہ یہ آف دی ریکارڈ رہیں گی؟‘‘

’’اوہ۔‘‘ خضر نے گہری سانس لے کر ٹیپ ریکارڈر بند کیا۔ ’’اوکے، میں وعدہ کرتا ہوں، اگر حالات مزید پُراسرار ہوئے اور ان میں سے کسی بات کو سامنے لانا پڑا تو میں آپ سے پوچھ کر گمنام ذرائع سے یہ خبر دوں گا، منظور؟‘‘

’’ٹھیک ہے مگر صرف اس صورت میں اگر اس سے کسی قاتل کو پکڑا جا سکے کیونکہ میں موت کے بعد ان بچوں یا ان کے والدین کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ تم میرے حوالے سے رسمی بیان تیار کر لینا۔‘‘ وہ دونوں کار میں بیٹھنے تک بالکل خاموش رہے تھے۔

’’خون آشام درندہ، نچی ہوئی لاشیں...... مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی درندہ ایک ہی دن میں تین مختلف جگہوں پر تین افراد کو قتل کر سکے؟‘‘

’’پتا نہیں...... مگر اس سب کو جاننے کا ایک طریقہ ہے۔‘‘ آمنہ بولی۔

’’اوہ شاید تم پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بات کر رہی ہو، میں نہیں سمجھتا کہ ڈپارٹمنٹ صحیح رپورٹ منظرعام پر آنے دے گا۔‘‘

آمنہ جواباً مسکرائی۔ اس نے ایکسیلریٹر دباؤ بڑھایا اور بولی۔ ’’شاید تم بھول گئے ہو، پوسٹ مارٹم کرنے والا چیف میڈیکل آفیسر میرے ماموں کا بیٹا ہے۔‘‘

☆☆☆

جمال صاحب اپنے کمرے میں تنہا تھے۔ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ درمیانی قدوقامت، سفید بالوں اور اپنی گہری پُرسوچ آنکھوں کی وجہ سے وہ ایک روایتی ایڈیٹر ہی نظر آتے تھے۔ اس وقت وہ گہری سوچ میں تھے۔

تین پُراسرار اموات اور ان کے نتیجے میں سامنے آنے والا دباؤ انہیں ذہنی تناؤ میں مبتلا کرنے کے لیے کافی

تھا۔ ذہنی دباؤ سے بچنے کے لیے تو آٹھ سال پہلے وہ ایک بڑے اخبار کی ملازمت چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ ٹینشن، ہائپر ٹینشن، بلڈ پریشر میں اضافہ اور پھر ہارٹ اٹیک، وہ ان سب سے گزر چکے تھے۔

وہ شروع سے جانتے تھے کہ یہاں کوئی گڑبڑ تھی۔ ملازمت کے پہلے ہی ماہ ایک پُراسرار فون کال نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ اگر انہیں اس جگہ اور اس اخبار کا ایڈیٹر رہنا ہے تو انہیں کچھ چیزوں اور کچھ لوگوں کے بارے میں اپنی آنکھیں، کان اور زبان بند رکھنی ہوگی۔ دوسری صورت میں انہیں یہاں سے جانا ہوگا۔ جمال صاحب نے پہلے راستے کا انتخاب کیا تھا جس کے بعد انعام یا بونس کی صورت میں انہیں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ کے علاوہ نوٹوں کا ایک لفافہ گھر کے دروازے پر ملنے لگا تھا جس نے ان کے بہت سارے مسائل حل کردیے تھے۔ ان کی بیگم کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان سالوں میں انہوں نے دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیجا۔ تعلیم مکمل کر کے انہوں نے وہیں ملازمت شروع کردی تھی۔ اس لفافے کی مدد سے ہی جمال صاحب اپنا چھوٹا سا گھر خریدنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اتنے سالوں میں وہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ پبلشر کا مفاد اور مرضی بھی اسی بات میں تھی یوں سب ٹھیک چل رہا تھا مگر اب ان اموات نے انہیں بے چین کردیا تھا۔ کیا اس کا تعلق بھی اس پُراسرار طاقتور شخص سے تھا؟ اگر ایسا ہوا اور اس کا راز کھل گیا تو وہ اسے کیسے سامنے لاسکیں گے؟ اور اس سب کا نتیجہ کیا ہوگا؟

فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔

''جمال......'' دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر وہ سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ ''تم فٹ بالروں والی کہانی کے لیے کیا کررہے ہو؟''

''میں ہمیشہ کی طرح پوری احتیاط کروں گا۔'' انہوں نے جواباً کہا۔

''شاباش! مجھے معلوم تھا مگر میں نے یہ اس لیے پوچھا ہے کہ تمہارے دو رپورٹرز اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ وہ نیویارک ٹائمز یا بی بی سی کے لیے کام کررہے ہیں۔ انہیں جہاں نہیں ہونا چاہیے وہ وہاں بھی نظر آرہے ہیں۔ تمہیں ان پر نظر رکھنا ہوگی، سمجھ گئے نا......؟''

''جی بالکل...... میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔''

''گڈ۔'' اور اس کے ساتھ ہی کال کٹ گئی۔ جمال نے گہری سانس لے کر پشت کرسی پر ٹکادی۔ یہ اتنا آسان نہیں لگ رہا تھا مگر انہیں یہ کسی نہ کسی طرح کرنا ہی تھا مگر وہ اسے اس طرح کرنا چاہ رہے تھے کہ ان کی اصول پسندی پر بھی بات نہ آئے اور کسی کو ان پر شک بھی نہ ہو۔

☆☆☆

ڈیش بورڈ پر رکھا خضر کا فون اچانک رقص کرنے لگا تھا۔

''ہیلو باس......''

''تم کہاں ہو؟'' جمال صاحب کی آواز ابھری۔

''سر! ہم کوچ نعمان کے تاثرات لینے گئے تھے۔''

''اوکے، میں چاہتا ہوں کہ تم جتنی جلد ممکن ہوسکے دفتر پہنچو، مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔''

''کیا آپ کو کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟''

''ہاں اور وہ یہ کہ تم غیر ضروری طور پر دوسروں کے معاملات میں دخل دے رہے ہو۔''

''باس، میں اپنا کام کررہا ہوں۔'' خضر بولا۔

''تمہارا کام وہ لکھنا ہے جس کی میں تمہیں ذمے داری دوں، اب تم دفتر پہنچو تاکہ ہم بیٹھ کر بات کرسکیں۔'' کال بند ہوگئی تھی۔ خضر چند لمحے فون کو دیکھتا رہا۔

''جمال صاحب کا برتاؤ بہت عجیب وغریب ہے۔'' وہ بالآخر بولا۔

''تو وہ کب عجیب نہیں ہوتا۔'' آمنہ مسکرائی۔

''نہیں، وہ کچھ مختلف انداز میں عجیب لگ رہے ہیں۔ میں کہنا نہیں چاہتا مگر وہ بالکل ڈی ایس پی کی طرح نظر آرہے ہیں جو اس سارے معاملے کو دبانا چاہتا ہے۔''

''تم شاید کچھ زیادہ ہی سوچ رہے ہو۔'' آمنہ نے اسے ٹوکا۔

''ہوسکتا ہے، انہوں نے ہمیں جتنی جلد ممکن ہوسکے دفتر پہنچنے کا حکم دیا ہے۔''

''جتنی جلد ہوسکے کا ترجمہ میرے لیے یہ ہے کہ فرانسک سے واپسی پر......ٹھیک ہے نا۔'' آمنہ ہنسی۔

''تم جانتی ہو تم ایک مکمل صحافی ہو، نڈر اور بے باک۔'' خضر ڈرامائی انداز میں بولا۔ آمنہ اس کی بات سن کر آداب بجالائی تھی۔

وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ دفتر سے نکلنے کے بعد سے ہی ایک شہزور ٹرک خاموشی سے ان کا پیچھا کررہا تھا۔ اب بھی وہ ایک محتاط فاصلے سے ان کے تعاقب میں تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ڈرائیور نے رپورٹ دینے کے لیے موبائل پر ایک کا ہندسہ دبایا اور بولا۔ ”یوں لگ رہا ہے جیسے وہ دونوں دفتر واپس جا رہے ہیں۔“

”گڈ۔“ دوسری طرف موجود شخص اس خبر سے خوش ہوا تھا۔ ”اگر وہ کہیں اور رکیں تو مجھے خبر دینا مت بھولنا۔ میں اس سب کو کسی بڑی خبر کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہتا۔“

☆☆☆

سعید احمد نے اپنا کلپ بورڈ میز پر رکھا اور ہمت کر کے سعد خان کے بے جان جسم پر نظر ڈالی۔ یہ ایک لمبا کمرا تھا جہاں اسٹریچرز پر تین لاشیں موجود تھیں۔ دیوار پر ایک طرف ایک بڑی کمپیوٹر اسکرین تھی۔ ساتھ بنے کاؤنٹرز پر مختلف آلات لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک میز اور چند کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا، وہ دس سال سے فرانسک ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا۔ اس سے قبل ڈاکٹر کی تعلیم اور پھر خصوصی تربیت میں وہ بہت سی لاشوں کا پوسٹ مارٹم اور رپورٹنگ کر چکا تھا۔ اس سے قبل بھی وہ قتل اور حادثوں سے متاثرہ متعدد مسخ لاشیں دیکھ چکا تھا مگر آج جو کچھ اس کے سامنے تھا اس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

تینوں لاشوں کے جسم پر کوئی بھی جگہ خونی خراشوں سے خالی نہیں تھی۔ ابتدائی جائزے میں ہی اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ کسی خون آشام درندے کا کام نہیں ہے۔ گہرے زخموں کے مانند پڑی یہ خراشیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ابتدائی معائنے کے بعد عین اس وقت جب اسے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ درندہ نہ سہی مگر یہ کسی ایسی مخلوق کا حملہ ہے جس نے اپنے شکار کو خود کو بچانے کی مہلت تک نہیں دی۔ اس کی نظر سعد کے ناخنوں پر پڑی۔ وہ اچھل سا پڑا تھا پھر اس نے تینوں لاشوں کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔

جو کچھ سمجھ آ رہا تھا وہ قابلِ یقین نہیں تھا۔ یہ معاملہ اس سے زیادہ پُراسرار اور حیران کن نظر آ رہا تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے محدب عدسے سے ان تینوں کے ناخنوں کا دوبارہ جائزہ لیا۔ ان کے ہر ناخن کے ساتھ نچی ہوئی کھال کے ریشے لٹک رہے تھے۔

اسے حتمی نتیجے تک پہنچنے کے لیے چند مزید ٹیسٹ کرنے تھے مگر جو نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ لڑکوں نے کسی بھی وجہ سے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کو اس بری طرح اور اس قدر تیزی سے نوچا تھا کہ جسم کی چھوٹی بڑی رگیں کٹ گئی تھیں۔ خون کا تیزی سے بہہ جانا ان کی موت کی وجہ بنا تھا۔

یہ کیسے ہوا تھا۔ کون سی چیز کسی انسان کو اس طرح اپنی جان لینے پر مجبور کر سکتی ہے؟ یہ سوال اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ اس نے کاؤنٹر سے فرسٹ فائنڈنگ فارم لیا اور اسے بھر کر اپنے کلپ بورڈ پر لگایا۔ وہ فوری طور پر چند ٹیسٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ہیلو...... ڈاکٹر سعید احمد۔“ وہ فون کان سے لگا کر عادت کے مطابق بولا۔

”تم نے کیا معلوم کیا ہے؟“ دوسری طرف سے آنے والی آواز نے سوال کیا۔

”آپ کون بول رہے ہیں؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو ڈاکٹر کہ میں کون بول رہا ہوں۔ میرے سوال کا جواب دو، ان لڑکوں کی موت کس طرح ہوئی ہے؟“

ڈاکٹر ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر اس نے کسی غیر مرئی چیز کو گویا نگلا اور پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ خون کا بہہ جانا موت کی وجہ بنا ہے۔“

”نہیں...... ڈرگ کا ضرورت سے زیادہ استعمال ان کی موت کی وجہ ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں سر مگر ان کی ٹاکس اسکریننگ ہمارے پاس موجود ہے ان میں سے کسی نے بھی کسی ڈرگ کو ضرورت سے زیادہ استعمال نہیں کیا ہے۔“

”میرے خیال، میں شاید تم ٹھیک طرح سے سن نہیں پائے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ ان کی موت ڈرگ کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوئی ہے اور تمہیں ٹاکس اسکریننگ کو بھی ضائع کرنا ہوگا۔ بات سمجھ میں آ گئی ہے نا۔“

”او کے سر، میں سمجھ گیا ہوں۔“ ڈاکٹر نے دھیمی آواز میں کہا جس کے ساتھ ہی فون کٹ گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اسے یہ حکم ماننا ہی تھا۔ نہ ماننے کی صورت میں اس کی ملازمت کا بحال رہنا ناممکن تھا۔ ملازمت کے ابتدائی دنوں میں اس سے ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی اور اس کے دستاویزی ثبوت اس ”آواز“ کے پاس تھے۔ اس نے آج تک اس شخص کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ اس کی ہر بات ماننے کا پابند تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ہر بار اپنی فرمانبرداری کی قیمت بھی مل جایا کرتی تھی۔

اس نے فون میز پر رکھا اور دوسرا فارم نکال کر حکم کے مطابق رپورٹ تیار کرنے لگا۔ اپنی پرانی رپورٹ اس نے الگ رکھ لی تھی۔ وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے جعلی رپورٹ

تیار کرنے کے باوجود خود اپنے تجسس کے لیے اس کیس پر کام کرنا چاہ رہا تھا۔

فارم مکمل کر کے اس نے لیب کو ٹاکس اسکریننگ ضائع کرنے کا حکم دیا۔ ابھی وہ اس سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اسے آمنہ کی آواز سنائی دی۔

''احمد بھائی کہاں ہیں آپ.....؟'' وہ غالباً اندر آچکی تھی۔

ڈاکٹر تیزی سے کھڑا ہوا۔ اس نے لپک کر دو لاشوں پر شیٹ ڈالی، تیسری لاش تھوڑے فاصلے پر تھی اور آمنہ کے قدموں کی چاپ قریب آتی جا رہی تھی اس لیے اس نے پہلی ترجیح اپنے کلپ بورڈ کو چھپانے کو دی اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے دونوں جانب ان دونوں نے ایک ساتھ ناب گھمائے تھے۔ ناب ہلتا دیکھ کر آمنہ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا جس کے فوراً بعد دروازہ کھل گیا تھا۔

''ارے تم آمنہ۔'' ڈاکٹر نے باہر نکل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اسے مقفل کر دیا۔ ''آؤ کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر دیا، آپ اپنا کام کرتے رہیے نا، مجھے تو دو منٹ کا کام ہے۔'' وہ اندر جانا چاہ رہی تھی۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے میں ویسے بھی اپنا کام کر چکا ہوں، تم آؤ۔'' وہ اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ آمنہ نے مڑ کر مقفل دروازے کو گھورا۔ اسے ہر قیمت پر اس کمرے میں جانا ہے، اس نے سوچا اور ڈاکٹر کے پیچھے چل پڑی۔

☆☆☆

خضر باہر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ آمنہ اکیلی اندر جائے گی اور اپنے ماموں زاد بھائی کو اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ انہیں لاشوں کو دیکھنے کا موقع دے۔

خضر اس کی بات مان گیا تھا مگر اب اس کے لیے انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ان لاشوں کے بارے میں اتنا سن چکا تھا کہ اب انہیں خود دیکھنا چاہ رہا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر آمنہ ڈاکٹر کو رضامند نہ کر پائی تو ان کی ساری محنت خاک ہو جائے گی۔

اس نے آمنہ کے اندر جانے کے بعد دو منٹ تک انتظار کیا تھا پھر عمارت میں داخل ہو گیا تھا۔ استقبالیہ پر کوئی موجود نہیں تھا۔ خضر کا اندازہ بھی یہی تھا کہ اگر انہیں رپورٹ میں گڑبڑ کرنا ہو گی تو دفتر میں زیادہ لوگ موجود نہیں ہوں گے۔ وہ تیزی سے اندر کے بلاک کی طرف بڑھا۔ اسے ڈاکٹر اور آمنہ کی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''پلیز احمد بھائی، میں تصویر نہیں بناؤں گی، مجھے صرف ایک لمحے کے لیے ان لاشوں کو دیکھنا ہے۔'' آمنہ بولی۔

''نہیں آمنہ، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی رپورٹ ڈپارٹمنٹ میں بھیج دوں گا، تمہیں وہاں سے کاپی مل جائے گی۔'' ڈاکٹر نے نرم مگر حتمی لہجے میں جواب دیا۔

''آخر مسئلہ کیا ہے ڈاکٹر سعید احمد۔'' آمنہ کا صبر جواب دے گیا تھا۔ ''آپ آخر کیا چھپا رہے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں مگر تم بھول رہی ہو کہ تمہیں نہ تو یہاں آنا چاہیے تھا اور نہ یہ ضد کرنا چاہیے، یہ لاشیں تفتیش کا حصہ ہیں تم جانتی ہو۔''

''مطلب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ قتل ہیں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا ہے اور آمنہ اب تم مجھے کام کرنے دو، مجھے گھر واپس جانے سے پہلے پوری رپورٹ تیار کرنا ہے۔'' ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر آمنہ کے لیے راستہ بنایا تھا۔ کمرے سے وہ پہلے باہر آئی تھی۔ باہر آتے ہی اس کی نظر ایگزیمنیشن روم کے مقفل دروازے کے باہر کھڑے خضر پر پڑی۔ وہ فوراً مڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

''ٹھیک ہے میں جاتی ہوں مگر مجھے صرف 5 منٹ دیں، مجھے آپ سے اپنے ایک مسئلے پر بات کرنا ہے احمد بھائی۔'' اس نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا تھا۔

خضر بند دروازے کو دیکھ کر مسکرایا اور ہاتھ میں پکڑی پن لے کر لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

شہ زور ٹرک میں بیٹھے شخص نے دوسری سگریٹ سلگائی اور ایک لمبی جمائی لی پھر اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''آخر یہ دونوں کیا کر رہے ہیں اندر۔'' اس نے بیزاری سے سوچا، اتنے میں اس کا فون بجا۔

''کیا وہ یہاں سے نکل گئے؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''نہیں باس، وہ ابھی تک اندر ہیں، میرے لیے کیا حکم ہے؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

”یوں لگتا ہے کہ جیمز بانڈ کی اس جوڑی کو خوف زدہ کرنا ہی پڑے گا۔ پہلی ڈگری کافی ہوگی، تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔“

فون بند کر کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ سے ایک کاغذ نکالا۔ وہ صرف فرسٹ ڈگری والے حکم سے کبھی خوش نہیں ہوتا تھا مگر کرنا تو اسے وہی تھا جو کہا گیا تھا۔ وہ بال پین نکال کر کاغذ پر جھک گیا۔

☆☆☆

خضر کو تالا کھولنے میں چند لمحے لگ گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے مگر اسے بھی اس سے قبل اس طرح لاک کھولنے کا ایک یا دو بار ہی اتفاق ہوا تھا اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنے فلیٹ کی چابیاں دفتر میں بھول آیا تھا۔ بالآخر کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ لاک کھلا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ اندر داخل ہوتے ہی مختلف کیمیکلز کی تیز بو نے اس کا استقبال کیا تھا۔ خضر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل خود کو کھانسنے سے روکا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ کمرے میں تین اسٹریچر موجود تھے، ان میں سے دو پر شیٹس پڑی ہوئی تھیں۔ خضر نے پہلے اسٹریچر پر سے چادر اٹھائی اور ایک لمحے کے لیے ساکت سا ہو گیا۔ وہ سعد خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کئی بار اس سے مختلف حوالوں سے بات کر چکا تھا مگر اس وقت اس کو پہچاننا تقریباً ناممکن تھا۔ تکلیف اور دہشت نے اس کے نوجوان چہرے کے نقوش کو بگاڑ دیا تھا جبکہ جسم پر زخموں اور خراشوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔

”کسی دوا کی زیادتی انسان کا یہ حال کر سکتی ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے دوسری چادر ہٹائی، وہ ان تینوں میں سب سے کم عمر راحیل تھا۔ تیسرے اسٹریچر پر شرجیل احمد کی لاش تھی۔ وہ چند لمحوں تک ان تینوں کو دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر جیب سے اپنا آئی فون نکالا اور تینوں کی تصاویر بنانا شروع کر دیں۔ ہر اینگل سے تصویریں بنانے کے بعد اس نے ان کی ایک ویڈیو بھی بنا لی۔ جو کچھ اس کے سامنے تھا اسے بغیر ثبوت کے کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ تصاویر اور ویڈیو بناتے ہوئے اس نے اس بات کا پورا خیال رکھا تھا کہ ان میں فرانسک کا ایگزام روم اور اس کے تمام لوازمات بھی نظر آئیں۔

کام ختم ہوتے ہی اس نے پہلے دو اسٹریچرز پر پہلے کی طرح چادریں ڈالیں، کمرے سے نکلا، دروازے کو لاک کیا اور دبے قدموں عمارت سے باہر نکل گیا۔ آمنہ جب باہر آئی تو وہ کار میں موجود تھا۔ آمنہ نے کار میں بیٹھتے ہی اس کی جانب دیکھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتی خضر بول پڑا۔

”اوہ یہ کیا ہے......؟“ اس کا اشارہ ونڈ شیلڈ کی طرف تھا۔ اس کے متوجہ کرنے پر آمنہ نے سامنے دیکھا تو ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے والے وائپر کے نیچے ایک کاغذ لگا ہوا تھا جس پر ان دونوں کا نام لکھا تھا۔ وہ خضر کو جواب دیے بغیر تیزی سے نیچے اتری اور کاغذ کو نکال کر کھولا۔ اس پر بڑے بڑے حرفوں میں صرف ایک جملہ لکھا تھا۔

”خود کو روک لو...... ورنہ تمہارا انجام بھی ان لڑکوں جیسا ہو سکتا ہے۔“

”آمنہ کیا ہے یہ......؟“ خضر نے پوچھا۔

”دھمکی......“ وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ہم......تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صحیح جا رہے ہیں اور اس سب کے پیچھے بہت کچھ چھپا ہے۔“ خضر نے پرچے کو پڑھ کر جیب میں ڈال لیا تھا۔

”لگتا ہے کہ تمہیں اندر کچھ ایسا نظر آیا ہے جس نے سب واضح کر دیا ہے۔ بتاؤ اندر کیا دیکھا تم نے؟“

”مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا کہ میں نے کیا دیکھا ہے اور یہ کہ کسی دوا کا کوئی بھی ڈوز کسی کو اس حالت میں پہنچا سکتا ہے۔“ خضر سر ہلا کر بولا ”مگر میں نے اس سب کی تصاویر اور ویڈیو بھی بنا لی ہے اور تمہارے آنے سے پہلے اسے اپنی ای میل پر بھی محفوظ کر لیا ہے۔“

”واؤ...... زبردست خضر، یہ پہلا ثبوت ہی ہماری کہانی کو صحیح ثابت کر دے گا، مجھے دکھاؤ۔“

”میرا خیال ہے کہ راستے میں یہ دیکھنا مناسب نہیں پھر بھی اگر تم دیکھنا ہی چاہتی ہو تو ڈرائیونگ مجھے دے دو۔“

”نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔“ آمنہ نے جواب دیا۔ خضر نے اس کے جواب پر ایک تصویر کھول کر فون اس کے سامنے کر دیا۔

تصویر پر نظر پڑتے ہی آمنہ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی اور گاڑی لہرا کر رک گئی تھی۔

☆☆☆

”اُف یہ سب ناقابلِ برداشت ہے خضر......“ آمنہ بالآخر بولی۔ وہ اب دفتر کی جانب جا رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار اسٹیئرنگ وہیل خضر کے ہاتھ میں تھا اور اس کا فون آمنہ کے ہاتھ میں۔ ”خضر...... چھ مس کالیں......“ وہ اچانک بولی۔

"کس کی......؟ جمال صاحب کی تو نہیں؟" خضر نے پوچھا۔

"ان کی ہی ہیں اور لو یہ پھر آ گئی کال......"

"جمال صاحب بھی کسی خطرناک بیوی کی طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" خضر چڑ کر بولا۔ "تم کیا کہتی ہو، کیا ہمیں ان کو کچھ بتانا چاہیے؟"

"بالکل، میرے خیال سے تو ہمیں انہیں سب بتا دینا چاہیے۔"

"ایک بار پھر سوچ لو، وہ جس قسم کے موڈ میں صبح سے ہیں، کیا انہیں یہ سب بتانا اور دکھانا مناسب ہوگا؟"

"مگر یہ بھی تو سوچو کہ جھوٹ بولنے کے باوجود انہیں بہر حال معلوم تو ہو ہی جائے گا، جمال صاحب سے کچھ چھپانا ممکن نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔"

"دیکھو...... انہیں تصویروں کے بارے میں ابھی کچھ مت بتانا بلکہ کسی کو بھی نہ بتانا۔ یہ خود تمہارے لیے بہت اچھا ہے، یوں سمجھ لو کہ وہ تصویریں تمہاری انشورنس ہیں۔ اس دھمکی کے بعد یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ یہ لمبا چکر ہے۔"

"ٹھیک ہے، لاؤ فون دو۔" وہ بولا۔

اتنی دیر میں فون بند ہو چکا تھا لہٰذا خضر نے خود جمال صاحب کا نمبر ملایا۔

"تم کہاں غائب ہو میاں؟" وہ سخت غصے میں تھے۔ "میں نے تمہیں فوراً پہنچنے کو کہا تھا اور اس بات کو بھی ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا۔"

"سوری باس! ہم دراصل فرانسک کی طرف چلے گئے تھے۔"

"کیا لینے گئے تھے تم لوگ وہاں؟ تم لوگ خود کو سمجھ کیا رہے ہو، جیمز بانڈ اور اگاتھا کرسٹی۔ میاں تفتیش کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں جمال صاحب مگر آج ہمیں کہیں سے بھی کوئی درست جواب نہیں مل رہا ہے۔"

"اس کی وجہ تمہارا رویہ ہے، تم صحافی سے زیادہ پولیس والے بن گئے ہو......اب فوراً آؤ دفتر۔"

خضر نے سر ہلاتے ہوئے فون بند کیا اور آمنہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

ان سے کافی پیچھے شہ زور ٹرک موجود تھا۔ ڈرائیور کو کسی بہتر موقع کی تلاش تھی مگر سڑک پر ٹریفک کافی تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور کم کر لی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں اور دن ابھی ختم نہیں ہوا۔ شام کو یقیناً اسے اپنا کام مکمل کرنے کا بہتر موقع مل جائے گا۔ اس نے سگریٹ جلائی اور گانے کی آواز بلند کر دی۔

☆☆☆

خضر کو اندازہ تھا کہ جمال صاحب بھرے بیٹھے ہوں گے اور ان کے دفتر پہنچتے ہی شروع ہو جائیں گے۔ وہ دونوں ذہنی طور پر ان کے سوالات کی بمباری کے لیے بھی تیار تھے مگر جو وہ کہہ رہے تھے اُس کا خیال بھی ان دونوں کو نہیں آیا تھا۔

"خضر تم نے تاثرات پر مبنی مضمون تیار کر لیا؟" انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

"تاثرات پر مبنی؟" خضر نے بھونچکا ہو کر انہیں دیکھا۔ صحافتی دنیا میں لوگوں کے تاثرات کو من و عن لکھ دینا آسان کام سمجھا جاتا ہے۔

"ہاں......اور مجھے اس ایڈیشن کے لیے صرف اسی آرٹیکل کی ضرورت ہے۔" انہوں نے متانت سے کہا۔ "تم کل صبح تک بھی مضمون دے سکتے ہو۔" ان کی اس وضاحت نے خضر کو یک دم مایوس اور اداس سا کر دیا تھا۔ اس کا جوش و جذبہ لحہ بھر کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس کا زبردست تحقیقاتی رپورٹ بنانے کا خواب زمیں بوس ہو گیا تھا۔

"جمال صاحب کیا واقعی آپ صرف ایک تاثراتی مضمون چاہتے ہیں۔ صبح تو ہم نے کچھ اور طے کیا تھا۔ ہم نے سارا دن اس اسٹوری پر کام کیا ہے اور آپ یقین جانیں کہ یہ تین نوجوانوں کی حادثاتی موت سے بہت آگے کی چیز لگ رہی ہے۔"

"تم بھول رہے ہو کہ سنسنی خیزی ہماری پالیسی نہیں ہے اور یہاں ان چیزوں کو کوئی پسند بھی نہیں کرتا۔ دوسری اور آخری بات یہ ہے کہ میں اس حوالے سے کسی اور اسٹوری میں دلچسپی نہیں رکھتا۔"

"مگر باس......!"

"خضر تم نے میری بات سن لی نا......؟ اب یہ بات یہیں ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں اس لیے میری بات کو سمجھ لو......اب مجھے پرسوں والی تعلیمی کانفرنس کی خبر کٹنگ بھیج دو۔" انہوں نے میٹنگ برخاست کر دی تھی۔ خضر ایک لمحے وہاں کھڑا رہا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر خاموشی سے اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کا بقیہ دن معمول کے کاموں میں گزر گیا تھا۔ اسے جمال صاحب کے رویے پر حیرت تھی مگر وہ جو کچھ دیکھ چکا تھا اُس کے بعد

پیچھے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آمنہ اس فیصلے میں اس کا ساتھ دے گی یا نہیں مگر وہ اس اسٹوری کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مکمل رپورٹ دیکھ کر جمال صاحب کا فیصلہ بدل جائے گا۔

چھٹی کے وقت وہ اور آمنہ ایک ساتھ دفتر سے نکلے تھے۔ ان دونوں کی گاڑیاں پارکنگ میں تھیں۔

''خضر! کیا جمال صاحب نے تم سے اس حوالے سے مزید کوئی بات کی......؟'' گاڑی کے قریب پہنچ کر آمنہ نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ اب صرف ایک تاثراتی مضمون چاہتے ہیں۔'' خضر مایوسی سے بولا۔

''میں آج دوپہر کے بعد چائے بنانے کے لیے اٹھی تھی تو پچھلا دروازہ کھلا نظر آیا، میں اسے بند کرنے گئی تھی مگر جمال صاحب وہاں باہر کھڑے بڑی دھیمی آواز میں کسی سے فون پر بات کررہے تھے۔''

''وہ کیا کہہ رہے تھے؟''

''میں پوری بات تو نہیں سن پائی مگر میں نے ایک جملہ پورا سنا تھا، وہ کسی سے کہہ رہے تھے کہ ''میں نے ان دونوں کو کنٹرول کرلیا ہے۔''

''تمہارے خیال میں، وہ ہمارے بارے میں بات کررہے تھے؟''

''اور کس کے بارے میں کریں گے؟ جس طرح وہ ہلکی آواز میں چھپ کر بات کررہے تھے وہ ان کا انداز نہیں ہے۔ یہ سب بہت عجیب ہورہا ہے۔ مجھے کچھ خوف سا آرہا ہے نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے؟''

''تم خوف زدہ ہو......؟'' خضر نے حیرت سے پوچھا۔

''تھوڑی بہت...... کیا تم شام کو فری ہو، ہم آٹھ بجے کہیں کھانا ساتھ کھا سکتے ہیں اور اس سب پر بات بھی کریں گے۔''

خضر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ دفتر میں مغرور مشہور آمنہ اسے خود کھانے کی دعوت دے رہی ہے۔

''کیوں نہیں ہم آٹھ بجے قابلی پر ملتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''ٹھیک ہے۔'' آمنہ نے جواب دیا اور پھر ان دونوں کی گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہوگئیں۔

شہ زور ٹرک اب خضر کے پیچھے تھا۔

☆☆☆

دن کا اُجالا رات کے اندھیرے سے بغلگیر ہورہا تھا۔ خضر گاڑی چلاتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا۔ دن بھر کے واقعات کسی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر چل رہے تھے اور ان سے جنم لینے والے سوالات اسے الجھا رہے تھے۔ سب سے زیادہ حیران کن رویہ جمال صاحب کا تھا اور آمنہ...... آمنہ کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اسے شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی۔ درمیانی قدوقامت، سنہری چہرہ، دمکتی آنکھیں، مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں پڑنے والا ڈمپل، چمکتے ہوئے بھورے بال۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی کشش تھی اور آج وہ اس کے ساتھ ڈنر کرنے جانے والا تھا۔ گویا اس کا اچھا وقت شروع ہوچکا تھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔

اب وہ اپنے اپارٹمنٹ سے دو تین میل کی دوری پر ہی تھا۔ اسے سڑک کا یہ حصہ بہت پسند تھا۔ دونوں طرف دور دور تک درخت ہی درخت تھے۔ درخت جو انسانوں کے لیے زندگی کی نوید ہیں۔ کاش لوگ درختوں کی اہمیت سمجھ لیں تو موسموں کا تغیر زندگی کو نگلنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس نے سوچا۔

وہ سڑک پر مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار جھٹکے نے گاڑی کو تیزی سے آگے کی جانب دھکیل دیا۔ خضر نے بمشکل اپنے سر کو ونڈ شیلڈ سے ٹکرانے سے بچایا۔ وہ سیٹ بیلٹ لگانا بھول گیا تھا۔ افتاد پڑنے پر اس نے میکانکی انداز میں بیلٹ لگائی۔

''یہ...... یہ کیا مصیبت ہے......؟'' اس نے پیچھے دیکھا۔ تھوڑی دور کسی ٹرک کی ہیڈ لائٹس اسے اپنے پیچھے آتے محسوس ہوئیں۔ خطرے کے احساس پر اس نے ایکسلریٹر پر اپنا پیر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے ٹرک اور کار کے درمیان فاصلہ بڑھا مگر اگلے ہی لمحے ٹرک نے دوبارہ کار کو ٹکر ماری۔ اس بار ٹکر پہلے سے بہت زیادہ زوردار تھی۔ کار اچھل کر دوبارہ سڑک پر آئی۔ اسٹیئرنگ وہیل، بریکس کچھ بھی کام نہیں کررہا تھا۔

تیسری ٹکر نے گویا کار کو اچھال ہی دیا تھا۔ وہ سڑک سے اتر کر درختوں، پتھروں، جھاڑیوں سے ٹکراتی تیزی سے اچھلتی آگے بڑھ رہی تھی۔ خضر اسٹیئرنگ وہیل اور بریکس پر اپنی پوری طاقت صرف کررہا تھا مگر سب کچھ اس کے قابو سے باہر ہوچکا تھا۔ کار کسی رولر کوسٹر کے مانند آگے بڑھ رہی تھی۔

پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس دھماکے کے ساتھ ہی

کار بھی رک گئی۔ درختوں نے ایک بار پھر انسان کو بچا لیا تھا۔ گاڑی دو بڑے درختوں کے درمیان پھنس گئی تھی۔ ونڈ شیلڈ سے باہر تھوڑے فاصلے پر چھوٹی سی جھیل نظر آ رہی تھی۔ خضر کا سر اسٹیئرنگ پر پڑا تھا، اس کے ماتھے سے خون کی ایک لکیر سی نکل کر اس کے گالوں تک آ پہنچی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ اب بھی گیئر پر تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اسماعیل شیر محمد اپنی طویل و عریض قیمتی اسٹڈی میں بیٹھا ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اسٹڈی میں تمام فرنیچر شیشم کی خاص لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ ہال نما کمرے کی تمام دیواریں کتابوں کے شیلف سے سجی تھیں جن میں دنیا کی نادر کتابوں کے ڈھیر موجود تھے۔ یوں تو اس کا پورا محل ہی دیکھنے کے قابل تھا۔ اسے نادر اور اینٹیک چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا مگر کتابوں سے اسے عشق تھا۔ اس کے پاس ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں جن میں سے اکثر اس نے پڑھ رکھی تھیں۔ مگر اس وقت اس کا دھیان سامنے موجود کتاب پر نہیں تھا۔ وہ اپنے علاقے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ اس کا شہر تھا۔ یہاں سب کچھ اس کی منشا کے مطابق ہی ہوتا تھا۔ وہ برسوں سے یہاں کا نظام چلا رہا تھا اور اب جو کچھ بھی غلط ہوا تھا اسے ہی اس کو ٹھیک بھی کرنا تھا مگر......

اس نے دانت بھینچ کر سوچا۔ وہ احمق رپورٹر اور اس کی ساتھی اس کا وقت ضائع کر رہے تھے اور اسے وقت ضائع کرنے والے لوگ پسند نہیں تھے۔ وہ کسی کو اپنے کاموں میں دخل دینے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی غلط مثال قائم ہوا سے اس راستے کو ہی بند کر دینا تھا۔

اس نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور فون اٹھایا۔ عین اسی لمحے فون بج اٹھا۔ دوسری طرف موجود شخص کی گھبرائی ہوئی آواز اس کے لیے ایک اور بری خبر لائی تھی۔ ”سر...... خضر غائب ہو گیا ہے۔“

”غائب ہو گیا، کہاں غائب ہو گیا؟ اور وہ لڑکی......“

سر اس کی کار سڑک سے اتر کر جھیل کے پاس درختوں میں جا کر پھنس گئی تھی۔ میں وہاں پہنچا تو وہ کار میں نہیں تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا مگر اس کا سراغ نہیں ملا، وہ لڑکی اب بھی قابلی پر اس کا انتظار کر رہی ہے۔ کیا مجھے اس کے پیچھے جانا ہے؟“

”نہیں، خضر کے بغیر وہ کچھ نہیں کر پائے گی۔ تم اسے ڈھونڈو اور جب وہ مل جائے تو اس بات کو یقینی بناؤ کہ وہ کہیں اور نہ جا سکے۔ تمہاری حماقت کی وجہ سے اب ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔“ وہ غرایا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

آمنہ کافی دیر سے خضر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس دوران وہ ایک کپ کافی اور فرنچ فرائز لے چکی تھی مگر خضر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس نے فون اٹھایا پھر کچھ سوچ کر واپس رکھ دیا۔ وہ پہلے ہی اسے تین کالز کر چکی تھی جن میں سے ایک بھی ریسیو نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں مصروف ہو گیا ہو مگر ایسی صورت میں بھی وہ اس کا فون ضرور اٹینڈ کرتا بلکہ ایسی صورت میں تو خود اسے فون کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سوچا۔ ”پھر کیا ہوا ہوگا، کہیں کوئی کسی بھی طرح اسے روکنا چاہتا ہو تو......“ دھمکی والے اس خط کے الفاظ اسے یاد آ گئے تھے۔ ”کہیں خضر کے ساتھ کچھ غلط تو نہیں ہو گیا؟“ اب اس کے لیے ریسٹورنٹ میں بیٹھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ پیسے میز پر رکھ کر باہر نکل آئی۔

خوف بُری طرح اس کے اعصاب پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی مشکوک فرد اسے اپنی طرف متوجہ نظر نہیں آیا۔ وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی اور اگلے ہی لمحے اس کی اسپورٹس کار خضر کے گھر کی جانب جانے والے راستے پر تھی۔

”اس نے مجھے کال کیوں نہیں کی؟“ یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ اب خضر کے گھر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی۔ درختوں سے بھری سڑک کی طرف مڑتے ہی اسے پولیس کی گاڑی اور گاڑی اٹھانے والا ٹرک نظر آیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کہیں خضر کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟ کسی نے اسے مار تو نہیں دیا؟ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ پولیس کار میں ایس ایچ او عبدل حبیب موجود تھا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

”اوہ آپ......“ وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ شاید آپ ہماری کچھ مدد کر سکیں۔“

”آپ کا کیا مطلب ہے؟“ آمنہ نے اسے گھورا۔

”مجھے یہاں سے میرے ایک سب انسپکٹر نے اطلاع دی کہ ایک کار جنگل میں درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی ہے۔ میں اسے ہی دیکھنے یہاں آیا ہوں، وہ کار خضر کی ہے۔“ آمنہ نے سانس روک لی۔ وہ اپنی پریشانی کا اظہار

اس کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''کیا آپ نے وہاں تک جا کر دیکھا ہے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر......؟''

''آپ کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں؟''

''یہی کہ خضر کہاں ہے؟ کیا وہ زخمی ہوا ہے؟''

''میں جب وہاں پہنچا تو یہاں صرف کار تھی۔''

''اس بات کا کیا مطلب ہے کہ وہاں صرف کار تھی؟'' آمنہ جھنجلا کر بولی۔ ''خضر کہاں غائب ہو سکتا ہے؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' ایس ایچ او نے کندھے اچکا کر کہا۔ ''یہ البتہ طے ہے کہ اس حادثے میں کوئی دوسری کار موجود نہیں تھی۔ نہ جانے کس طرح اس کی کار بے قابو ہوئی اور سڑک سے اُتر گئی۔''

''آپ کے خیال میں وہ زندہ ہوگا؟'' آمنہ نے لرزتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کار کی حالت دیکھ کر یہ کہنا کہ وہ اُتر کر ٹہلتا ہوا کہیں چلا گیا ہو، مشکل ہے مگر ہم دیکھ رہے ہیں۔''

''اوکے، آپ کو جیسے ہی کوئی خبر ملے پلیز مجھے بھی بتایئے گا۔'' آمنہ اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولی۔

''ضرور۔'' آمنہ اس کا جواب سننے سے قبل ہی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آگئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ خضر ایک محتاط ڈرائیور رہا ہے اور اسے یقین تھا کہ یہ صرف ایک کار کا حادثہ نہیں تھا یقیناً اس سے زیادہ کچھ ہوا تھا۔

مگر اس وقت وہ اس کے بارے میں بھی سوچ نہیں پا رہی تھی اس کے ذہن کی سوئی ایک ہی سوال پر اٹکی ہوئی تھی۔ ''خضر آخر کہاں تھا؟''

☆☆☆

خضر کو ہوش آیا تو پہلا احساس سر میں شدید درد کا تھا مگر اگلے ہی لمحے وہ درد کو بھول گیا تھا۔

وہ اس وقت ایک کرسی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

کمرے میں موجود واحد بلب اس کے چہرے سے تھوڑے سے فاصلے پر جگمگا رہا تھا۔ اس کی روشنی اسے اندھا کیے دے رہی تھی۔ کمرے میں عجیب سی بو بسی ہوئی تھی۔

''میں کہاں ہوں؟'' وہ بڑبڑایا۔

لمحے بھر میں اسے وہ ٹرک یاد آگیا تھا جس نے اس کی کار کو ٹکر مار کر سڑک سے اتار دیا تھا۔ اس کی کار درختوں میں پھنس گئی تھی۔ وہ کار سے اتر بھی گیا تھا۔ اسے وہاں ایک شخص نظر آیا تھا، اس شخص نے قریب آکر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا تھا۔ خضر کو اپنی گردن میں تیز چبھن کا احساس ہوا تھا، اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ یقیناً اسے بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا تھا اور نہ جانے وہ کب سے یہاں اس طرح پڑا تھا۔

''آمنہ نے نہ جانے اس کا کتنا انتظار کیا ہوگا اور پتا نہیں اسے یا باقی لوگوں میں سے کسی کو اس کی گمشدگی کی خبر ملی بھی ہوگی یا نہیں۔'' وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہارر فلموں والی چرررر کی آواز کے ساتھ کوئی دروازہ کھلا اور ایک شخص اس کے سامنے آگیا۔ اس نے چہرے پر ماسک پہن رکھا تھا۔

''تم خضر احمد ہو نا؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے، مجھے یہاں اس طرح کیوں لایا گیا ہے؟''

''تم سے جو پوچھا جا رہا ہے پلیز صرف اس کا جواب دو۔''

''ہاں میں ہی خضر احمد ہوں، اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''خضر سکون سے میرے سوال کا جواب دو، اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔''

''کیا تم نہیں جانتے کہ اغوا ایک جرم ہے اور تم اس کے لیے جیل جا سکتے ہو۔'' خضر نے پوچھا۔

''خضر میرے پاس فالتو کی گیدڑ بھبکیاں سننے کا وقت نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو کہ تم کچھ نہیں کر پاؤ گے۔ لہٰذا سکون سے میری بات سنو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

اس بار وہ تھوڑے سخت لہجے میں گویا ہوا۔ خضر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''او کے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''یہ کہ تم کچھ نہ کرو۔ اگر تم ان لڑکوں کی موت کے بارے میں تحقیقات کرتے رہے تو اس سے بہت سے لوگ ناراض ہو سکتے ہیں۔ اس سے خود تمہاری سلامتی کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''اور اگر میں انکار کر دوں......؟'' خضر نے پوچھا۔

''تم اتنے احمق نہیں ہو سکتے اور ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ تم اپنی محنت کو بھول جاؤ، تم چند ماہ بعد اس کہانی کو چھاپ سکتے ہو۔''

"تم نے یہ ساری محنت مجھے صرف یہ سمجھانے کے لیے کی ہے۔" خضر نے حیرت سے پوچھا۔

"تم میری محنت کو بھول جاؤ۔ تمہارا کام میری بات کو ماننا ہے، سمجھ گئے تم......؟"

"ہاں۔"

"بہترین، مجھے خوشی ہے کہ تم نے سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی نقاب پوش شخص نے خضر کی گردن پر ہاتھ پھیرا، اس کے ہاتھ میں موجود سوئی نے خضر کو لمحے بھر میں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔

☆☆☆

الارم کی تیز آواز بالآخر خضر کو جگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ حواس بحال ہوتے ہی اسے ماسک والا شخص یاد آیا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے گھر اور اپنے بستر پر تھا۔

"تو کیا رات کے واقعات ایک بُرا خواب تھے۔" اس نے گڑبڑا کر سوچا۔ کار کے حادثے میں اسے سر پر چوٹ لگی تھی۔ اس نے بالوں کے درمیان ہاتھ پھیرا وہ چوٹ وہاں موجود تھی۔ وہ اٹھ کر تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا۔ نیچے اس کی کار بھی موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سب خواب نہیں تھا، اسے اٹھا کر لے جانے والے اسے بحفاظت اس کے گھر پہنچا گئے تھے۔

وہ اس گورکھ دھندے کے بارے میں جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا پھر اسے آمنہ کا خیال آیا اور اس نے اس کا نمبر ملایا۔

"خضر...... کیا یہ تم ہو......؟" آمنہ نے پہلی گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا تھا۔

"ہاں آمنہ، مجھے کل کے لیے افسوس ہے۔"

"کل کے لیے افسوس...... میں تو خدا کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ تم زندہ ہو۔ جب کل مجھے پتا چلا کہ تمہاری کار تباہ ہو گئی، میں تب سے صرف یہی دعا کر رہی تھی۔"

"آمنہ، کیا آج مجھے دفتر تک لفٹ مل جائے گی؟" وہ بولا۔

"بالکل، میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔" آمنہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

فون رکھ کر وہ تیزی سے تیار ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آمنہ وقت کی بہت پابند ہے اور اگر اس نے پندرہ منٹ کہے ہیں تو پندرھویں منٹ پر وہ اس کے سامنے ہوگی۔ فون اور چابیاں لے کر وہ کمرے سے نکلنے ہی والا تھا تب اس کی نظر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے لفافے پر پڑی، اس پر اس کا نام لکھا تھا۔

اس نے لفافہ اٹھایا عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے لفافہ اپنی جیب میں رکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آمنہ دروازے پر موجود تھی۔

"مطلب یہ کہ تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔" آمنہ اس کی داستان سننے کے بعد بولی۔

خضر جواب میں ایک لمحہ خاموش رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے آمنہ کو اس خط کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں پھر اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اس پر ہی اعتماد کر سکتا ہے۔

"ابھی مجھے اپنے ڈریسر پر سے یہ خط ملا ہے۔" اس نے جیب سے لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ "یقیناً اسے ان ہی لوگوں نے رکھا ہوگا۔"

"تو پھر اسے کھول کر پڑھو نا......" آمنہ بولی۔

خضر نے خط کھولا اور بہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔

"خضر صاحب!

ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ اس سارے معاملے میں آپ کو کچھ تکلیف تو ضرور پہنچی ہے اور آپ کے ذہن میں بہت سے سوالات ہوں گے مگر اس وقت آپ کو ان کے جواب نہیں دیے جا سکتے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہماری کل کی ملاقات کے بارے میں کسی سے گفتگو نہ کریں۔ اس حوالے سے کوئی کہانی تیار کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ اس وقت آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ چپ چاپ اپنا کام کریں جب وقت آئے گا ہم آپ کو خود تمام معلومات فراہم کر دیں گے اور اس دن آپ پر اسے کہیں بھی چھاپنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اگر آپ نے ہماری اس درخواست کے خلاف کام کیا تو ہمارے پاس اپنی بات منوانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں جو یقیناً آپ کو پسند نہیں آئیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس خط یا رات کے واقعات کے بارے میں جمال، آمنہ یا کسی سے بھی ذکر نہیں کریں گے...... یہی سب کے لیے بہتر ہوگا۔"

"انہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" آمنہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ میں دو کام کر چکا ہوں یعنی تمہیں ساری تفصیل بھی بتا دی اور خط بھی پڑھوا دیا۔" وہ بڑبڑایا۔

"فکر مت کرو، میں کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گی......

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اللہ نہ کرے اگر کچھ برا نہ ہوا تب تک۔“

”ارے آمنہ مجھے کیا ہونا ہے......“

کیا تم پاگل ہو، کل تم قتل ہو سکتے تھے۔ نہ جانے یہ کوئی سیکرٹ ایجنسی کے لوگ ہیں یا کوئی اور، اور پھر جب تمہاری کار درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہوئی تب بھی...... اللہ نے تمہاری جان بچائی ہے۔“

”ایک منٹ...... تمہیں یہ کس نے کہا کہ میری کار تباہ ہو چکی ہے۔“

”ایس ایچ او عبدل حبیب نے......“

”مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری کار کو نقصان تو ضرور پہنچا تھا مگر وہ ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی پھر اس نے تم سے جھوٹ کیوں بولا؟“ خضر بولا۔

”معلوم نہیں......“ آمنہ نے جواب دیا۔ ”اس وقت کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا۔“

”آمنہ مجھے تو یہ لگ رہا ہے کہ ہم ابھی ان اموات کے حوالے سے وہیں کے وہیں ہیں مگر جب اتنے لوگ اتنی شدت سے ہمارے پیچھے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے ہم انجانے میں ان کے کسی راز تک پہنچ گئے ہیں اور میں اب پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا۔ شاید یہ اسٹوری مجھے صحافت میں وہاں لے جائے جو میری منزل ہے۔ میں تمہیں اس خطرناک راستے پر ساتھ چلنے کو نہیں کہہ سکتا......“

”بس۔“ آمنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میری گاڑی کے بغیر تم فی الحال کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتے مسٹر...... میں تمہارے ساتھ ہوں مگر ہمیں سوچ سمجھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں اب جمال صاحب کے حکم کے مطابق تاثراتی مضمون لکھوں گا، اس کور کے نیچے میں اپنا کام بھی کروں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر اب دفتر چلیں۔“

”بالکل میڈم......“ خضر بولا۔

وہ اخبار کے دفتر پہنچے تو پارکنگ کے باہر پولیس موبائل موجود تھی۔ ایس ایچ او اور دو انسپکٹر اس کے پاس کھڑے تھے۔ آمنہ کی کار کو آتا دیکھ کر انہوں نے ریڈیو پر کسی سے گفتگو شروع کر دی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ آمنہ نے کار پارکنگ کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں مگر کچھ گڑبڑ ہے۔“ خضر بولا۔

خضر ابھی گاڑی سے اترا بھی نہیں تھا کہ ایس ایچ او اس کے قریب آ کر بولا۔ ”خضر صاحب آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔“

☆☆☆

خضر کے لیے منگل کا آغاز پیر سے زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ ابھی صبح کے دس ہی بجے تھے اور وہ گرفتار ہو کر تھانے کے لاک اَپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس پر نشے کی حالت میں گاڑی چلانے اور حادثے کا الزام تھا اور اب وہ لاک اپ میں تنہا بیٹھا جمال صاحب اور آمنہ کی مدد کا منتظر تھا۔ ذرا سی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ وہ منحنی سی قامت والا عجیب و غریب شخص اس سے کچھ فاصلے پر گندی زمین پر بیٹھا خود بھی گندگی کا حصہ لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دانت پیلے تھے اور چہرہ شاید مہینوں سے نہیں دھلا تھا۔ وہ شاید کافی دیر سے خضر کو دیکھ رہا تھا پھر وہ بیٹھے بیٹھے ہی اس کی جانب کھسک آیا۔

”میں رانا ہوں۔“ وہ اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ خضر نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما مگر وہ کچھ بولا نہیں تھا۔

”تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں پاگل ہوں، ہے نا؟ میں پاگل نظر بھی آتا ہوں، شاید ہوں بھی مگر میں یہ جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں ہو۔“

”اچھا ذرا بتاؤ مجھے بھی، میں یہاں کیوں ہوں؟“ خضر کو وہ پاگل ہی لگا تھا۔

”کیونکہ تم اصولوں کے مطابق نہیں چل رہے تھے۔“

”ظاہری بات ہے اگر میں اصولوں کے مطابق چلتا تو لاک اَپ میں کیوں ہوتا، اس میں کیا خاص بات ہے؟“ خضر بولا۔

”نہیں، تم میری بات سمجھے نہیں......“ وہ بولا۔

”کیسی بات......؟“

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے اصولوں کے مطابق نہیں چل رہے ہو، خضر صاحب یہاں بہت طاقتور لوگوں کا راج ہے، جب تک تم ان کے راز نہیں جان جاتے وہ بہت اچھے لگتے ہیں مگر جب انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تم انہیں جان گئے ہو تو پھر وہ تمہیں برباد کر دیتے ہیں۔“

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟“

رانا نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا تھا۔ ”یہی سب میرے ساتھ ہو چکا ہے۔“ وہ اپنی رو میں کہے جا رہا تھا۔

”یہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے؟“ خضر اس کا

جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”ہاں، میں ایک اچھا بزنس مین تھا مگر جیسے ہی مجھے ان کا راز معلوم ہوا میری زندگی ہی بدل گئی۔“

”واقعی؟ اور وہ راز کیا ہے؟“

”کیا تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔ جب تم کسی راز کو جان جاؤ گے، تو پھر اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکو گے۔ انہیں اگر اس بات کا علم ہو گیا تو وہ تمہیں میرے جیسا بنا دیں گے یا اگر تم خوش قسمت ہوئے تو تمہیں مار ڈالیں گے۔“

خضر خاموشی سے رانا کا چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی باتیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔

”رانا کیا باتیں بنا رہے ہو تم؟“ ایس ایچ او کی آواز پر وہ بدک کر اپنی جگہ جا بیٹھا تھا۔ ”چلیے خضر صاحب آپ کے باس نے آپ کی ضمانت کرا دی ہے۔“ اس بار وہ خضر سے مخاطب تھا۔

خضر نے لاک اپ سے باہر آ کر رانا کی طرف دیکھا، وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

”وہ تمہاری نگرانی کر رہے ہیں، محتاط رہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ خضر ایک لمحے بے بسی سے اسے تکتا رہا پھر باہر نکل آیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ رانا سچ بول رہا تھا یا یہ بھی اس کے لیے کوئی تنبیہ تھی۔ جو بھی تھا وہ اسے بہت بے سکون کر گیا تھا۔

☆☆☆

”آخر تم سکون سے بیٹھ کیوں نہیں سکتے، نشے میں گاڑی چلانا اور خود کو حادثوں کا شکار کرنا...... یہ سب تم کیا کر رہے ہو؟“ جمال صاحب گاڑی میں بیٹھتے ہی پھٹ پڑے تھے۔

”آپ جانتے ہیں میں شراب نہیں پیتا اور کل جو ہوا تھا وہ مجھے خاموش کرانے کی کوشش تھی۔“ خضر بولا۔

”اب مجھے یہ کہانیاں مت سناؤ، بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں تمہیں کل سے معطل کر رہا ہوں، میرے اگلے حکم تک تم صرف دفتر کے اندر کام کرو گے۔ رپورٹنگ یا فیلڈ کا کوئی کام نہیں کرو گے، سمجھے......؟“

خضر کو یوں لگ رہا تھا جیسے جمال صاحب غصے کی اداکاری کر رہے ہوں۔ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے، یہ ایک اور معما تھا۔

دفتر میں داخل ہو کر نیوز روم کے سامنے انہوں نے ایک بار بہ آوازِ بلند خضر کی معطلی کا اعلان کیا اور اسے کمرے میں آنے کا کہہ کر اندر چلے گئے۔

خضر کے کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد جمال صاحب نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر میز پر جھک گئے اور خضر کو بھی قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سرگوشی نما آواز میں بول رہے تھے۔

”خضر خدا کے لیے تم اس اسٹوری سے الگ ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے آسان نہیں ہے، کسی رپورٹر کے لیے نہیں ہوتا مگر اس وقت یہ تمہاری سلامتی کے لیے ضروری ہے۔“

”میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں، کیا یہ میری ڈیوٹی نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ میں خبر کی صورت میں آپ کو لا کر دوں؟“ خضر بھی اسی انداز میں بولا۔

”نہیں، مجھے اس وقت اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس معاملے میں لوگوں سے ملنا، سوالات کرنا سب چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے مگر آپ نہیں جانتے کہ میں نے ان لاشوں کو کس حال میں دیکھا ہے۔“

”مجھے مت بتاؤ خضر، میں اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔“ جمال صاحب بولے۔

”کیوں آپ ایک مانے ہوئے ایڈیٹر ہیں، کیا آپ کے لیے سچ کی کوئی قیمت نہیں۔“

”بعض اوقات سچ بہت مہنگا پڑتا ہے، تم آج کے بعد سے اس چکر سے باہر نکل رہے ہو...... بولو میاں......؟“

”ٹھیک ہے جمال صاحب......“

”بس تو اب جا کر وہ مضمون مکمل کرو اور دفتر میں بھی اس حوالے سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا۔“ وہ بولے۔

خضر ان کی بات سمجھ گیا تھا۔ گفتگو کے اختتام پر وہ مایوس اور غصے کی اداکاری کرتا ہوا ان کے کمرے سے باہر آیا تھا اور اپنی نشست پر جا بیٹھا تھا۔

”کیا ہوا؟ کیا تم نے جمال صاحب کو رات کے واقعے کے بارے میں بتایا، وہ خط دکھایا یا نہیں؟“ چند لمحوں بعد آمنہ اس کے سامنے تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ آمنہ اس وقت یہ باتیں نہ کرے مگر وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ ”انہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا اصل میں انہیں حقیقت کا علم نہیں ہے۔ یہ بہترین موقع ہے تم انہیں وہ خط دکھاؤ تا کہ انہیں تمہاری بات پر یقین آ جائے اور لاشوں کی وہ تصویریں بھی جو ہمارا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔“

”آمنہ ہم اس پر لنچ پر بات کریں گے۔“ بالآخر خضر

کو اس کی بات کاٹنا ہی پڑی تھی۔ جمال صاحب کی گفتگو کا انداز اور ان کا خوف خضر کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ آمنہ کو بھی اس حوالے سے خبردار کر دے گا۔ وہ اسے کسی پریشانی میں پڑتا نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ اس راہ میں صرف خطرات ہی خطرات تھے۔

صبح کا باقی وقت تاثراتی مضمون کی تیاری میں گزر گیا تھا اب چونکہ وہ ''گراؤنڈ'' ہو چکا تھا۔ اس نے تمام تیاری ٹیلی فون پر ہی کی تھی۔ مرنے والے لڑکوں کے والدین، دوستوں، اسکول ٹیچرز، کوچز اور ساتھیوں سے انٹرویو اور ان کی رائے لی گئی تھی۔ ان سب کو ملا کر ایک ایڈیشن تیار ہو گیا تھا۔

وہ لنچ کے لیے چند لمحوں کی تاخیر سے باہر نکلا تھا۔ آمنہ پہلے سے ہی گاڑی میں اس کی منتظر تھی۔

''لنچ کہاں کرنا ہے؟''

''میں آج تمہیں اپنا خصوصی چکن سلاد کھلانے والا ہوں۔'' خضر خوش دلی سے بولا۔

''یعنی خضر کچن جانا ہے۔'' وہ بھی ہنسی۔

''بالکل یوں تو ہم کہیں بھی لنچ کر سکتے ہیں مگر وہاں ہم موجودہ صورتِ حال پر بات نہیں کر پائیں گے اس لیے آج خضر کچن ہی سہی۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' آمنہ نے جواب دیا۔

خضر کے اپارٹمنٹ پہنچ کر پہلے انہوں نے مل کر سینڈوچز اور سلاد بنائے۔ کھانے کے دوران خضر نے آمنہ کو جمال صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

''تو تمہارا مطلب ہے کہ دفتر میں کوئی بات کرنا محفوظ نہیں ہے؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے یہی اندازہ ہوا ہے۔''

''اور ان لوگوں نے اس خط میں تمہیں واضح طور پر کہا تھا کہ تم کوئی بھی بات مجھے یا جمال صاحب کو بھی نہیں بتاؤ گے، دوسری صورت میں وہ تمہیں سخت سزا دیں گے؟''

''ہاں، مگر تم یہ باتیں کیوں دہرا رہی ہو؟''

''اور میں نے اپنی حماقت میں تصویروں کا ذکر بھی کر دیا۔'' آمنہ کا چہرہ لحہ بہ لحہ فق ہوتا جا رہا تھا۔

''ہاں میں تمہیں اس سے روک ہی رہا تھا۔ ہم نے مردہ خانے میں ان لاشوں کی تصاویر یا وڈیو بنائی یہ تو جمال صاحب بھی نہیں جانتے اور اس کی خبر کسی کو ملنی بھی نہیں چاہیے۔ موجودہ حالات میں وہ ہمارے لیے انشورنس نہیں مصیبت بن سکتی ہیں۔'' خضر بولا۔ ''مگر تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہو آمنہ......''

''مجھے ایک خیال پریشان کر رہا ہے خضر۔'' وہ بمشکل بولی۔

''کیسا خیال......؟'' خضر نے سینڈوچ کا آخری لقمہ کھاتے ہوئے پوچھا۔

''جو لوگ اتنے خطرناک ہیں کہ ایک اخبار کے پورے دفتر کو ڈب کر سکتے ہیں تو پھر کیا انہوں نے یہاں تمہارے گھر پر تمہیں چھوڑتے ہوئے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا ہوگا؟ اگر میرا شک درست ہے تو ہم واقعی بہت بڑی مصیبت میں پڑ چکے ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

خضر اس کی بات سن کر ایک لمحے کو سن سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے جملوں پر جتنا غور کرتا جا رہا تھا اسے اس بات میں حقیقت نظر آ رہی تھی۔ یہ سو فیصد ممکن تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور بیرونی سمت کھلنے والی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اسے سڑک پر ایک سیاہ وین رکتی نظر آئی۔ وین کی اگلی نشستوں پر نظر پڑتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ شروع ہو گئی تھی۔ وہاں بیٹھے دونوں افراد کے چہروں پر وہی ماسک موجود تھا جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

''آمنہ اٹھو۔'' وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور بولا۔

وہ دونوں پچھلے دروازے سے دوڑتے ہوئے باہر نکلے اور اپارٹمنٹ کی دوسری جانب بنے نجی گیراجوں کی طرف مڑ گئے۔ خضر نے ایک گیراج کا تالا کھول کر کونے میں کھڑی موٹر سائیکل کو باہر نکالا۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''یہ میرا پرانا شوق اور اس وقت ہماری جان بچانے کا واحد ٹکٹ ہے، جلدی بیٹھو......''

آمنہ کے بیٹھتے ہی موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔ خضر کا اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک شخص عقبی طرف سے داخل ہوگا۔ اسی لیے اس نے عمارت کے گرد گھوم کر دوسری جانب سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس علاقے سے بخوبی واقف تھا اور اگر وہ یہاں سے نکل جاتے تو پھر وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں چھپ کر ان حملہ آوروں سے جان بچا سکتے تھے۔ دس منٹ بعد وہ کھلی سڑک پر تھے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' آمنہ نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''مجھے ایک ایسی جگہ کا علم ہے جہاں یہ ہمیں نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔'' خضر بولا۔

''کہاں؟''

''سمورا۔''

''سمورا؟ وہ جہاں لوگ موٹر سائیکل ریس کرتے ہیں؟''

''ہاں مگر اس وقت وہاں شاید کوئی نہیں ہوگا۔'' خضر بولا۔

چند لمحوں میں وہ سمورا پہنچ گئے تھے وہاں غار نما جگہیں بنا کر روڈ سائڈ ڈھابے بنائے گئے تھے جو شام ڈھلے کھلتے تھے۔ خضر نے ایک ڈھابے کی آڑ میں موٹر سائیکل روک کر آمنہ کو اترنے میں مدد دی۔ اس کے لیے موٹر سائیکل کی اس طرح کی سواری کا پہلا موقع تھا۔ وہ بائیک سے اترنے کے بعد بھی دو منٹ تک کانپتی رہی تھی۔

''اب...... اب ہم کیا کریں گے......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم تھوڑی دیر یہیں رہیں گے اور اس کے بعد شہر واپس جائیں گے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم جمال صاحب کو کال کرلیں۔''

''یہ مت کرنا، وہ تمہیں فوراً نوکری سے نکال دیں گے...... کیونکہ وہ یہی سمجھیں گے کہ تم وہی کچھ کررہے ہو جس کے لیے انہوں نے تمہیں روکا تھا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، کچھ اور سوچتے ہیں۔'' خضر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ دس منٹ کی ذہنی مشق کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔ ان حالات میں عموماً پولیس جائے پناہ ہوتی ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ ایسے میں جمال صاحب یا کوئی بھی ان کی سلامتی کا ضامن نہیں ہوسکتا تھا۔

''تم نے کل کہا تھا کہ تمہارا کوئی دوست یہاں آنے والا ہے اور وہ ایک بڑے چینل پر کام کرتا ہے، کیا وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا؟'' آمنہ نے پوچھا۔

عام حالات میں خضر، احمد سے مدد لینا شاید پسند نہیں کرتا مگر اس وقت اس کے پاس انتخاب کے زیادہ مواقع نہیں تھے اس لیے اس نے مختصراً الفاظ میں اپنے حالات لکھ کر احمد کو ایس ایم ایس کردیا تھا۔ خضر نے اسے کسی حکومتی ایجنسی سے رابطہ کرنے کو کہا تھا اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ان دونوں کی جان خطرے میں ہے۔ اسے یقین تھا کہ احمد جیسے ہی یہ میسج دیکھے گا حرکت میں آجائے گا مگر فی الحال اس کا فون بند جارہا تھا۔

خطرہ صرف یہ تھا کہ اگر وہ جلد اس پیغام کو نہ دیکھ پایا تو شاید اس کے بعد ان دونوں کو اس کی مدد کا فائدہ نہ ہوسکے۔ وہ بدترین حالات کا شکار تو تھے ہی مگر خضر کو اس جگہ پر عجیب سی بے چینی محسوس ہورہی تھی۔ جیسے وہ کسی غلط جگہ آگیا ہو۔ بالآخر وہ کھڑا ہوگیا۔

''مگر ہم جائیں گے کہاں؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''آمنہ یہاں سے تھوڑا پیچھے ''صحت مند'' ہے۔'' وہ بولا۔

''ہاں، ہاں منسٹر صاحب کی فیکٹری، آدھا شہر وہیں تو ملازمت کرتا ہے۔'' آمنہ نے کہا۔

''میں نے اس پر کئی بار فیچر بنایا ہے، اس کے اردگرد جنگل نما درخت ہیں جو ادارے نے خود اگائے ہیں اور پھر نہایت خوب صورت لینڈ اسکیپنگ بھی کی گئی ہے۔ ہم مدد آنے تک وہاں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بالکل کھلی جگہ ہے۔ یہاں ہمیں نشانہ بنانا اور پھر ٹھکانے لگانا دونوں ہی بہت آسان ہے یوں بھی اس شہر کے لوگ تو ایک رات میں تین تین نوجوانوں کی پُراسرار موت پر بھی نہیں چونکتے تو ہم جیسے بے چارے صحافیوں کو کون گھاس ڈالے گا۔'' وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ وہ فیکٹری کے اطراف میں پہنچے تو ہر طرف سناٹا سا تھا۔ انہوں نے درختوں کے درمیان جھاڑیوں میں موٹر سائیکل کو چھپایا اور فیکٹری کی طرف بڑھے۔ خضر کے پلان کے مطابق انہیں داہنی طرف لینڈ اسکیپنگ سے ملحق علاقے میں چھپنے کی جگہ مل سکتی تھی اور وہ اسی پلان پر کام کررہے تھے مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ تو عین اس وقت جب وہ داہنے پلاٹ کے باہر پہنچ گئے تھے فیکٹری میں جیسے ایمرجنسی لاگو ہوگئی۔ کئی مسلح گارڈز باہر نکل آئے اور یک دم تلاشی مہم شروع ہوگئی تھی۔

''یہ...... یہ کیا ہورہا ہے؟'' آمنہ نے سرگوشی کی۔

''ششش، معلوم نہیں لیکن اب ہمیں پلان تبدیل کرنا پڑے گا۔'' خضر آواز دبا کر بولا۔ ''ان کی نظر میں آئے بغیر اب اس طرف نہیں جایا جاسکتا۔''

''پھر......؟''

''ہمیں اب کوریڈور میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

"یہ خطرناک ہوگا......" آمنہ کے جواب پر خضر اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس سوچنے سمجھنے اور مشورہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ خضر نے آنکھیں بند کر کے اللہ سے مدد مانگی۔ آمنہ کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے کوریڈور کے اندر دوڑ لگا دی۔ چھوٹے سے کوریڈور کے ساتھ ہی ایک وسیع و عریض ویئر ہاؤس ملحق تھا۔ اندر ملگجی سی روشنی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف سامان کے بڑے چھوٹے ڈبوں کا ڈھیر تھا۔ باہر سے لوگوں کے بولنے کی تیز آوازیں وہ صاف سُن پا رہے تھے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت اندر آسکتے تھے۔ خضر نے چاروں جانب دیکھا۔ ڈبوں کے ڈھیر کے پیچھے وہ چھپ سکتے تھے مگر وہاں سے انہیں ڈھونڈنا بہت آسان تھا۔ جس طرح کی تلاشی وہاں ہو رہی تھی اس میں یہ ایک خطرناک انتخاب ثابت ہوسکتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر دیوار میں بنی الماری پر پڑی جس پر سیاہ حرفوں میں Janitor's closet لکھا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے دروازہ لاک نہیں تھا۔ خضر نے ناب گھما کر دروازہ کھول لیا۔

"اوہ یہ صفائی کے سامان وغیرہ کی جگہ ہے۔" آمنہ بولی۔

"جو بھی ہے آمنہ، اس وقت یہی ہماری جائے پناہ ہو سکتی ہے۔" یہ الماری کسی چھوٹے سے اسٹور کے مانند تھی۔ اس سامان کے باوجود وہاں آرام سے اتنی جگہ تھی جہاں وہ دونوں بیٹھ بھی سکتے تھے اور کھڑے بھی رہ سکتے تھے۔ اندر فینائل اور دیگر کیمیکل کی وجہ سے اس کی پچھلی سمت میں ہوا کی نکاسی کے لیے سوراخ بھی بنائے گئے تھے جو اس وقت ان دونوں کے کام آسکتے تھے۔ خضر نے دروازے کو بند کر کے اندر سے خود کار لاک لگا لیا۔ اب وہ اندر سے تو دروازہ کھول سکتے تھے مگر باہر سے اسے چابی کے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

"تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، وہ انسان ہے کوئی چھلاوا نہیں ہے۔ تم دونوں ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود اسے پکڑ نہیں سکے۔" اسماعیل شیر محمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"سر آپ بہت جلد اچھی خبر سنیں گے۔"

"مگر اچھی خبر میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟" وہ غرایا۔

"سر وہ بہت چالاک ہے، اس کے پاس موٹر سائیکل تھی اور وہ دونوں اس پر نکل گئے۔ ہم نے تلاشی لی ہے مگر وہاں کچھ نہیں ملا۔ ہم تھوڑی تاخیر سے سمورا پہنچ گئے تھے مگر وہ اس وقت تک وہاں سے بھی نکل چکے تھے۔ اب ہم فیکٹری پر ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ یہاں آئے ہوں کیونکہ یہ جگہ سمورا سے قریب ہے۔" دوسری جانب سے بولنے والا سہمے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یعنی وہ خود اپنی موت تک آپہنچا۔" سماعیل شیر محمد پہلی بار مسکرایا۔ "فیکٹری میں ریڈ الرٹ کا اعلان کر دو۔ سارے گارڈز کو ان کی تلاش پر لگا دو اور سنو انہیں بتا دینا کہ میری طرف سے انہیں دیکھتے ہی شوٹ کر دینے کے احکامات ہیں۔ بعد میں جو کرنا ہوگا میں بتا دوں گا۔" وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔

اسے ناکامی پسند نہیں تھی اور خضر نامی یہ رپورٹر اسے مات پر مات دیتا جا رہا تھا جس وقت سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے پاس لاشوں کی تصویریں موجود ہیں اس نے اسی وقت ان کی موت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ وہ بچ نہیں پائے گا۔ زندگی کی تلاش میں وہ موت کے منہ میں چلا آیا تھا۔ "صحت مند" اس کی ملکیت تھی اور اس کا وہ راز بھی جسے چھپانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

شعیب خان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ وہ "صحت مند" کے سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا۔ اسے ابھی ابھی فون پر بتایا گیا تھا کہ فیکٹری میں ایک عورت اور ایک مرد گھس آئے ہیں جو کہ ان کے ادارے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسے حکم دیا گیا کہ انہیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ اس حکم کے ملتے ہی فیکٹری میں موجود تمام گارڈز کو الرٹ کر دیا گیا تھا۔

شعیب یہاں کے کام کی حساسیت کو سمجھتا تھا۔ فیکٹری کے چلنے سے اس کا مفاد وابستہ تھا۔ یوں بھی اس کی سرشت اور پھر مسلسل مشق نے سوالات کی عادت ختم کر دی تھی۔ اسے حکم سننا اور اس پر عمل کرنا اس کی جبلت ثانی بن چکی تھی۔ پھر یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ وہ مسکرایا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

الماری میں انہیں باہر کی تمام آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ گارڈز کی دوڑ بھاگ اور اس دوران حالات پر تبصرے نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے

تھے۔

وہ دو دن سے جن سوالات کے جواب کی تلاش میں تھے' ان میں سے کچھ کے جواب الماری میں بند ہونے کے بعد مل گئے تھے۔

''سب لوگ ادھر آئیں۔'' ایک تیز تحکمانہ آواز نے خضر اور آمنہ کو الرٹ کر دیا تھا۔ ''جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہوا کہ دو جاسوس یہاں گھس آئے ہیں۔'' جاسوس کے لفظ پر خضر اور آمنہ نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ''ان سے ہمارے ادارے اور ہمیں شدید خطرہ ہے۔ باس نے انہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دیا ہے، آپ لوگوں نے سن لیا ہے ان کے لیے شوٹ ٹو کل کا آرڈر ہے۔''

خضر ساکت سا کھڑا یہ سب سن رہا تھا۔ الماری کے نیم اندھیرے میں بھی وہ آمنہ کی آنکھوں میں تیرتے خوف کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنی سانسیں روکے کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر میں قدموں کی چاپ اور گفتگو کی آوازیں کم ہوتی چلی گئیں۔ آمنہ اور خضر نے سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ باہر کوئی تھا جو اس الماری کی طرف آ رہا تھا۔ عین اسی وقت خضر کا فون سرسرایا، اس نے احتیاطاً فون کی بیل بند کر دی تھی۔ وائبریشن محسوس کرتے ہی اس نے غیر محسوس طور پر فون کو جیب میں دبا لیا تھا۔ وہ اور آمنہ سانس روکے کھڑے تھے۔ قدموں کی چاپ الماری کے دروازے کے عین سامنے آ کر تھم گئی۔ خضر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گارڈ دروازے پر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے پھر دروازے کا ناب گھوما۔ وہ غالباً دروازہ کھول کر الماری چیک کرنا چاہ رہا تھا۔ خضر نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دروازہ اندر سے بند کیا جا سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اب ان کا بچنا ناممکن ہے۔ اس نے آمنہ کا بازو پکڑا اور بدترین انجام کے لیے تیار ہو گیا۔

''یہ لاک ہے۔'' گارڈ زور سے چلّایا۔ ''یہاں کوئی آواز حتیٰ کہ دل کے دھڑکنے کی آواز بھی نہیں...... میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے ہمیں آفس جا کر چابی لانے کی ضرورت ہے۔'' ویئر ہاؤس کے اس حصے کو صاف ڈیکلیئر کر دیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم دوسری طرف چلتے ہیں۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

چند لمحوں میں قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

''اُف...... میں تو سمجھی تھی کہ آج ہمارا کام تمام ہو گیا۔'' آمنہ نے گہری سانس لے کر سرگوشی کی۔

''آج تو ہم مسلسل ہی موت زندگی کھیل رہے ہیں۔'' خضر بولا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ خضر کی گھڑی میں 6 بج رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ جمال صاحب انہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ اس نے موبائل کی روشنی کم کر کے اسے کھولا۔ تین مس کالز اور ایک میسج اس کا منتظر تھا۔ وہ جانتا تا کہ جمال صاحب کو پیغام لکھنا سخت ناپسند تھا۔ اس لیے اس نے پہلے میسج کھولا۔ وہ احمد کی جانب سے تھا۔ وہ ان سے فیکٹری کی، لوکیشن مانگ رہا تھا۔ خضر کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے فوری طور پر احمد کو لوکیشن کی تفصیلات بھیجیں۔ احمد کے جوابی میسج نے اسے بہت مطمئن کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے پوری تیاری کی ضرورت ہے مگر وہ اہم لوگوں کو اس کی اہمیت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔'' خضر نے ثبوت کے طور پر اسے لاشوں کی ویڈیو بھی بھیج دی تھی۔

''تمہیں یقین ہے کہ احمد کچھ کر پائے گا؟'' آمنہ نے پوچھا۔

''امید تو ہے اگر وہ یہ ہمارے لیے نہ بھی کرے تب بھی ایک بڑی خبر کا لالچ اسے ضرور کچھ کرنے پر مجبور کر دے گا۔ میں نے اسی لیے وہ ویڈیو اسے بھیجی ہے۔ ہمارے لیے تو اس وقت یہ بقا کا مسئلہ ہے۔'' خضر مسکرایا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔''

تھوڑی دیر میں پھر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔

''تم سب کو محتاط رہنا ہے، مال وقت پر ہر جگہ پہنچ جائے۔ سارے ٹرک، الگ الگ مقامات پر جائیں گے۔'' ایک آواز نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔

''مال......'' خضر نے سوچا، اس کی معلومات کے مطابق ''صحت مند'' وٹامنز اور گھر میں صفائی ستھرائی کا سامان تیار کرتی تھی۔

''جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو، ٹرکوں کی رفتار ہلکی رکھنا ہے، کسی کو اپنی جانب متوجہ نہیں ہونے دینا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوراً رابطہ کرنا ہے۔ اس سارے مال کو دو دن کے اندر جہازوں میں لوڈ ہو جانا ہے اور ہاں اس دوران وہ دونوں کہیں نظر آئیں تو انہیں گولی مار دینا۔ ہمارے پاس ان کے انتظام کا تمام بندوبست موجود ہے۔'' تھوڑی دیر میں وہاں دوبارہ خاموشی چھا گئی تھی۔ آمنہ اور خضر اس کے باوجود سانس روک کر بیٹھے رہے تھے۔

اگر کوئی اس وقت خضر سے پوچھتا تو شاید وہ اس

حوالے سے مزید کام کرنے سے توبہ کر لیتا مگر اب معاملہ اس کے ہاتھ سے باہر نکل چکا تھا۔ جو لوگ اس سب میں ملوث تھے انہوں نے ان دونوں کو اپنے لیے سیکیورٹی رسک سمجھ لیا تھا اور انہیں ہر صورت اپنے راستے سے ہٹانے کی تیاری کر لی تھی۔

☆☆☆

جمال صاحب بہت پریشان تھے۔ دوپہر سے خضر اور آمنہ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ انہوں نے خضر کے ساتھ بہت سختی کی ہے مگر وہ خود بھی اس کے لیے مجبور تھے۔

پانچ بجے انہوں نے ایک سب ایڈیٹر کو خضر کے گھر معلومات لانے کے لیے بھیجا تھا اور جو خبریں وہ لایا تھا اس سے وہ اور دہل گئے تھے۔ اس کے مطابق خضر کے اپارٹمنٹ کے نیچے آمنہ کی کار موجود تھی جس کے دو شیشے توڑ دیے گئے تھے۔ اوپر خضر کے گھر کے دروازے پر گولیوں کے نشان تھے جبکہ پچھلا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ گھر کے اندر ہر چیز بکھیر دی گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنے والوں کو کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔

وہ خضر کو تین کالز کر چکے تھے مگر ان کا فون ایک بار بھی ریسیو نہیں کیا گیا تھا۔ وہ خوف زدہ تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ ان کے دو مایۂ ناز رپورٹرز کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ ”مجھے کال کرو خضر...... کال کرو......“ وہ فون کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائے اور میز پر اپنا سر رکھ دیا۔

☆☆☆

اخبار کا مالک اور پبلشر اعجاز احمد بھی کچھ کم تناؤ کا شکار نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت فون تھا۔

”جی، اسماعیل صاحب...... کوئی حکم......“

”کیا واقعی تم میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو اعجاز......؟“ دوسری جانب سے طنزیہ انداز میں پوچھا گیا۔

”اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمہارے وہ دو رپورٹرز میرے لیے عذاب نہ بنے ہوتے۔“

”وہ اب میرے رپورٹر نہیں رہے ہیں سر، جیسے ہی وہ مجھے ملتے ہیں، میں انہیں ملازمت سے برخاست کر دوں گا۔“ وہ ملتجیانہ انداز میں بولا۔

”اپنی بھتیجی کو بھی......“

”ہاں، اسے تو پہلے کروں گا کیونکہ اسے خاندانی اقدار کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“

”بہترین......“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر یک دم زور سے چلّایا۔ ”یہ کافی نہیں ہے، انہیں ڈھونڈو۔ ورنہ نتائج بھگتنے کو تیار ہو جاؤ۔“ اور لائن کٹ گئی تھی۔ اعجاز احمد اس کے غصے سے سہم گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسماعیل شیر محمد کیا چیز ہے اور وہ کیا کر سکتا تھا۔ اب اسے فوری طور پر ان دونوں کو ڈھونڈنا تھا اور پھر انہیں اپنے اخبار، اپنے دفتر اور اپنی زندگی سے باہر نکال پھینکنا تھا تب ہی وہ سکون کا سانس لے سکتا تھا۔

☆☆☆

انہیں الماری میں بند ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت باہر سامان لایا اور لے جایا جا رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد بہت سے قدموں کی چاپ اور سامان رکھنے اور اٹھانے کی آواز انہیں لرزا رہی تھی۔ بالآخر کام ختم ہوتا نظر آیا۔ اس بار طویل خاموشی ہو گئی تھی۔ غالباً ان کا ”مال“ آگے جا چکا تھا...... اگلے روز کے لیے نیا مال ویئر ہاؤس میں ڈمپ کیا جا چکا تھا۔

تمام تر خوف کے باوجود خضر اس ”مال“ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مکمل خاموشی کے بعد بھی اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا پھر کچھ کہے بغیر تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ باہر ہر طرف خاموشی اور تاریکی تھی۔

”تم یہ کیا کر رہے ہو؟“ آمنہ کی آواز کانپی۔

”میں ان کا ’مال‘ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سرگوشی کی اور جیب سے موبائل نکال لیا۔ موبائل کی مدھم روشنی میں اسے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر رکھے باکس نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ آمنہ اسے روک پاتی، وہ کسی سائے کے مانند الماری سے نکلا۔ اس نے باکس کو تیزی سے کھولا اس میں سے ایک بوتل نکالی اور اسی سبک رفتاری سے دوبارہ الماری میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

”اگر انہیں معلوم ہو گیا تو بہت برا ہو گا۔“ آمنہ بولی۔

”اب صبح تک یہاں کچھ نہیں ہو گا، گھبراؤ مت۔“ خضر نے اسے تسلی دی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا اپنا دل سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اس نے اندھیرے میں بوتل کھولی۔ بوتل میں کچن صاف کرنے والے محلول کے بجائے سفید چمک دار ذرات بھرے ہوئے تھے۔

”یہ...... یہ میتھ ہے، نشہ آور دوا......“ آمنہ دھیرے سے بولی۔

”اوہ یعنی یہ چکر ہے۔ صحت سند در اصل ملک اور دنیا کی صحت چھین لینے کے کام میں مصروف ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com
http://paksociety.com

"اور یہی وہ راز ہے جسے سب سے چھپانے کے لیے زندگی کو موت نما لباس پہنانے میں وہ ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔"

خضر نے بوتل اور اس سے برآمد ہونے والے مواد کی اپنے موبائل کے ذریعے تصاویر بنائیں اور پھر ان تصویروں کو بھی احمد کو بھیج دیا۔ اس کے اندازے کے مطابق چند لمحے میں اس کا جواب آگیا تھا۔

"کیس بہت مضبوط ہوگیا ہے، تمہیں یقین ہے کہ وہاں ثبوت موجود ہیں؟"

خضر کے اثبات میں جواب کے بعد اس نے فوراً کارروائی کی یقین دہانی کرادی تھی۔

اس کے بعد وہ دونوں پھر اسی طرح اندھیرے میں بیٹھ گئے تھے۔ اب انہیں احمد اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد یکلخت خاموشی کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سے گونج اٹھی۔ وہ قدم الماری کی طرف ہی آرہے تھے۔ جس آواز سے وہ دونوں دہل گئے تھے، وہ کسی کی چین کی چابیوں کی آواز تھی۔

آمنہ اور خضر کو لگ رہا تھا جیسے ان کا دل ان کے کانوں میں دھڑک رہا ہو۔

پھر کسی نے دروازے میں چابی لگائی۔ لاک کی کلک کے بعد دروازے کی ناب گھومی آمنہ نے خضر کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ دروازہ یک دم کھلا اور کسی نے الماری میں لگے بلب کے بٹن کو دبا دیا۔

"خضر...... آمنہ، تم دونوں کیا کررہے ہو؟" ایک جانی پہچانی آواز ان کے کانوں میں آئی۔

اندھیرے سے اچانک روشنی نے ان کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا مگر جونہی وہ دیکھنے کے قابل ہوئے، فٹ بال ٹیم کے جونیئر کوچ شہزاد خان کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بھی اسی کی طرح ساکت ہوگئے تھے۔

"تم...... تم یہاں کیا کررہے ہو؟" خضر نے پوچھا۔ پھر خود ہی وہ اپنے سوال پر شرمندہ ہوگیا۔ شہزاد نے کمپنی کا جمپ سوٹ پہن رکھا تھا۔

"اصل میں مجھے زیادہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں شام کی شفٹ میں یہاں صفائی کا کام کرتا ہوں، پلیز تم کسی سے ذکر مت کرنا......" وہ بولا۔

"تم فکر مت کرو...... یہ بتاؤ کہ کیا تم ہماری مدد کرسکتے ہو؟"

"کیسی مدد؟ ہاں تم دونوں اس الماری میں کر کیا رہے ہو؟" اس نے دوبارہ پوچھا پھر ایک لمحے کو سہم کر ان کی طرف دیکھا۔ "کہیں تم دونوں ہی کو تو گولی مارنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے؟ مجھے گارڈز نے بتایا تھا کہ یہاں کچھ لوگ گھس آئے ہیں۔"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر ہم وہی دونوں ہیں۔" خضر بولا۔ "کیا تم ہمیں یہاں سے نکلنے میں مدد دے سکتے ہو؟"

"میں...... مگر تم مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ وہ تمہارے پیچھے کیوں ہیں؟"

"میں تمہیں سب بتادوں گا مگر اس وقت یہاں اتنی بات کرنا مناسب نہیں ہے کیا تم ہمیں یہاں سے نکال سکتے ہو؟"

"میں کوشش کرسکتا ہوں۔ میرے پاس صفائی کا کارٹ ہے، میں اس میں تمہیں چھپا کر لے جاسکتا ہوں مگر اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟"

"جو تم کہو۔" آمنہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم لوگ تیار رہو، میں اپنی پک اَپ لے کر آتا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر میں وہ کچرے کے ساتھ پک اپ

اہمیت

"یا تو اپنی ساری رقم میرے حوالے کردو یا مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔" ایک ڈاکو نے ایک کنجوس پر پستول تان کر کہا۔

کنجوس پستول پر نظریں گاڑ کر بالکل گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ ڈاکو نے کچھ دیر تک جواب کا انتظار کیا۔ پھر آنکھیں نکال کر بولا۔ "جلدی جواب دو۔ رقم یا زندگی، ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب تمہیں کرنا ہے۔"

"خاموش رہو۔" کنجوس نے کہا۔ "میں بھی اس مسئلے پر غور کررہا ہوں کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ اہمیت دوں۔"

☆☆☆

ایک سیدھا سادہ آدمی گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے زین لگا رہا تھا۔

"معاف کرنا۔" ادھر سے گزرنے والے ایک راہ گیر نے کہا۔ "تم نے گھوڑے پر الٹی زین رکھی ہے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" اس آدمی نے جواب دیا: "کیونکہ تمہیں یہ ہی نہیں معلوم کہ میرا کس سمت جانے کا ارادہ ہے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں سوار تھے۔ ان پر بڑی چادریں وغیرہ پڑی تھیں۔ شہزاد کے گارڈز کے ساتھ اچھے تعلقات نظر آرہے تھے۔ انہوں نے صرف اس سے زبانی گفتگو کی تھی، پک اپ کو چیک نہیں کیا گیا تھا۔ چند لمحوں میں وہ موت کی وادی سے باہر آچکے تھے۔ خضر کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اتنا آسان تھا۔ وہ فی الحال اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت تو وہ صرف اپنے اللہ کا شکر ادا کررہا تھا۔

پھر اس نے اپنا آئی فون نکالا اور جمال صاحب کو ایک ایس ایم ایس کیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس وقت صرف ان پر اعتبار کرسکتا تھا۔ اس نے انہیں کوچ شہزاد کے گھر پر ایک گھنٹے میں آنے کی درخواست کی تھی۔

دوسرا میسج اس نے احمد کو کیا تھا جس میں...... اس نے کوچ شہزاد کا ذکر کردیا تھا۔

☆☆☆

جمال صاحب خضر کا پیغام پڑھ کر خوش زیادہ ہوئے تھے یا پریشان یہ جانچنا مشکل تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے کہ وہ کیا کریں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے اس قدم کو پسند نہیں کیا جائے گا۔ پبلشر اعجاز احمد ویسے ہی انہیں خضر اور آمنہ کو برخاست کرنے کا حکم دے چکا تھا۔

دوسری طرف انہیں خضر سے لگاؤ تھا۔ اس میں انہیں اپنی جوانی نظر آتی تھی۔ پھر یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں اور انہیں ان کی کتنی ضرورت ہو۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

خضر کے اندازے کے مطابق شہزاد کے گھر کو دس منٹ کی مسافت پر ہونا چاہیے تھا مگر سفر اس سے طویل ہوتا جارہا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا خضر کے دل میں وسوسے پیدا ہوتے جارہے تھے۔ شہزاد صحت مند میں ملازمت کرتا ہے، اسے پیسوں کی ضرورت ہے پھر بھی وہ اتنی آسانی سے ان کی مدد کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ چیز اسے اچانک کھٹکنے لگی تھی۔

اچانک پک اپ رک گئی۔ وہ دونوں چادروں کے ہٹنے کا انتظار کررہے تھے۔ یک دم ان پر کمبل نما موٹی چیز آگری۔ خضر کو آمنہ کے چیخنے کی آواز آئی، وہ تیزی سے اس کی طرف مڑا تھا مگر اسی لمحے اس کے بازو میں کوئی چیز اتر گئی تھی جس کے بعد وہ پک اپ سے زمین پر آگرا تھا۔

خضر کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ ایک تاریک کمرے میں ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس بار ہاتھ پیروں کے ساتھ ساتھ اس کے منہ پر بھی ٹیپ لگادی گئی تھی۔ اس نے آمنہ کو آواز دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ اس کمرے میں تھی یا نہیں، اس اندھیرے میں یہ جاننا بھی ممکن نہیں تھا مگر اسے یقین تھا کہ وہ اسی کمرے میں ہوگی، وہ اس کی مہک محسوس کرسکتا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک گھٹی گھٹی سی آواز نے اس کے یقین کو پختہ کردیا تھا۔ وہ دونوں ہر ممکن آواز نکال کر ایک دوسرے کو اپنی موجودگی سے مطلع کررہے تھے۔

اچانک انہیں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں بے اختیار چیخنے کی کوشش کررہے تھے۔ اگرچہ وہ دبی دبی آوازیں بہت دھیمی تھیں مگر وہ دونوں ایک دوسرے کو بخوبی سُن سکتے تھے۔ دروازے سے اندر آنے والا اب نیچے کی طرف آرہا تھا۔

خضر کا دل ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ آنے والا دوست ہوگا یا دشمن...... شہزاد جس طرح انہیں یہاں باندھ کر گیا تھا اس سے یہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کسی کو لینے گیا ہے۔ اگر یہ وہی تھا تو ان کا انجام شاید قریب آچکا تھا۔ خضر نے مایوسی کے عالم میں آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

”کیا تم نے واقعی ان دونوں کو پکڑ لیا ہے؟“ اسماعیل شیر محمد نے سختی سے پوچھا۔

”جی سر بالکل! وہ میرے قبضے میں ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ کو ان کی ضرورت ہے۔“ شہزاد نے فون پر کہا۔

”ہمم...... پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”رقم...... مجھے پیسے کی اشد ضرورت ہے اور آپ کو ان لوگوں کی۔ اگر آپ مجھے 5 کروڑ روپے دے سکیں تو میں ان دونوں کو آپ کے حوالے کردوں گا۔“

”شاید تم جانتے نہیں کہ تم کس سے بات کررہے ہو؟“

”میں جانتا ہوں سر اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ بہت فراغ دل ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جگہ بتاؤ، میرے بندے تمہیں رقم پہنچا دیں گے۔“

تفصیلات طے کرکے اسماعیل شیر محمد نے فون رکھا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں بالآخر اس نے کامیابی حاصل کرلی تھی۔ وہ مسکرایا۔

☆☆☆

کلک کی آواز اور کمرے میں روشنی پھیل جانے پر خضر نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ دروازے کے پاس کھڑی شخصیت کو دیکھ کر اس کا دل خدائے عزوجل کے سامنے سجدے میں گر پڑا تھا۔ آج دوپہر کے کھانے سے پہلے تک وہ جسے اپنا دشمن سمجھ رہا تھا اس وقت انہی جمال صاحب کو یہاں دیکھنا اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں آزاد ہو کر جمال صاحب کی کار میں ان کے ہمراہ واپس جارہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب انہیں اپنی منزل کا علم تھا۔ احمد کا چلایا ہوا چکر کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ تینوں ایف آئی اے کے دفتر جارہے تھے جہاں ''صحت مند'' اور اسماعیل شیر محمد کے خلاف چھاپا اور کارروائی کی تیاری ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اسماعیل شیر محمد غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کے بندے خضر اور آمنہ کو لینے شہزاد کے فارم پر گئے تھے مگر وہاں انہیں کوئی نہیں ملا تھا جس کے بعد وہ شہزاد خان کو ہی ساتھ لے آئے تھے۔

''وہ کہاں ہیں؟'' اسماعیل غرایا۔

''مم...... میں نہیں جانتا، بس یہ معلوم ہوا ہے کہ اخبار کے ایڈیٹر۔ جمال صاحب اس طرف آئے تھے۔ انہیں میرے فارم اور ان لوگوں کی موجودگی کا علم کیسے ہوا یقین کریں میں نہیں جانتا۔'' وہ گھگیایا۔

''جمال......'' اسماعیل سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اپنے آدمیوں کی طرف مڑا۔ ''اسے یہاں سے گم کرو۔ مجھے ابھی ایک ضروری کام کرنا ہے۔''

ان سب کے جانے کے بعد اس نے ایک فون ملا کر کچھ ہدایات دی تھیں، اس کے بعد وہ گھڑی کو دیکھتا رہا جب اس کے حساب سے مقررہ وقت آ گیا تو اس نے ایک نمبر ملایا۔

''جی اسماعیل صاحب......'' دوسری طرف سے اعجاز احمد کی آواز ابھری۔

''تم کیا کر رہے ہو'' وہ غرایا۔

''مم...... میں نے ان دونوں کو نکال باہر کیا ہے......'' وہ گھگیایا۔

''اور وہ جمال...... تمہارا ایڈیٹر...... کیا تمہیں علم ہے کہ وہ ان دونوں سے مل گیا ہے۔''

''نہیں...... اگر ایسا ہے تو میں اسے بھی نکال دوں گا۔''

''یعنی تم یہ جانتے ہو کہ کام پورا نہ کرنے والوں کو برخاست کر دیا جاتا ہے......؟'' اسماعیل نے پوچھا۔

''ہاں......''

''تو پھر میں تمہیں برخاست کر رہا ہوں۔ اپنے ٹرمینیشن آرڈرز وصول کر لو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ دو منٹ بعد آنے والی کال نے کام ختم ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح شہر میں شہ سرخیوں کے ساتھ جگمگائی تھی۔ ایف آئی اے اور دو دیگر ایجنسیوں نے صحت مند پر چھاپا مار کر بہت بڑی مقدار میں نشہ آور چیزیں برآمد کر لی تھیں۔ اسماعیل شیر محمد گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کسی نے رات گئے اخبار کے پبلشر اعجاز احمد کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور سب سے بڑی خبر ان تینوں کھلاڑیوں کے بارے میں چھپنے والی رپورٹ تھی۔

فٹ بال کے کھلاڑیوں کو جونیئر کوچ طاقت و انرجی میں اضافے کا لالچ دے کر نشے سے متعارف کراتے تھے اور پھر ان پر نت نئے تجربات کیے جاتے تھے جن سے زیادہ قیمتی اور اثر پذیر نشے بنائے جاتے۔ وہ تین کھلاڑی بھی ایسے ہی ایک تجربے کی نذر ہو گئے تھے جس میں نشے کی غلط مقدار نے ان کے جگر کے افعال کو بگاڑ دیا تھا جس کے بعد خارش اور رگیں پھٹنے کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔ ان سب خبروں کی بازگشت پورے ملک میں کئی دن تک سنائی دی جاتی رہی تھی۔

اس قدر بھاگ دوڑ کے بعد آج خضر نے پورا دن سونے کا فیصلہ کیا تھا مگر صبح ہی صبح فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے اسے جگا دیا۔ اسکرین پر احمد کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر فون ریسیو کیا۔

''میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تمہارے لیے بڑے شہر کے ایک بڑے اخبار کا اپائنٹمنٹ لیٹر تیار ہو گیا ہے۔''

''بہت شکریہ احمد۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''مگر کیا تم یقین کرو گے کہ میں نے اپنے چھوٹے سے اخبار میں زندگی کی خوشی پالی ہے۔ میں یہاں بہت خوش ہوں اور تمہاری ترقی کے لیے دعا گو ہوں اور ہاں خبردار! مجھے صبح سات بجے فون مت کرنا۔'' دوسری طرف احمد کے طویل قہقہے کی آواز گونجی اور فون بند ہو گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سرورق کی دوسری کہانی

خود کردہ را

سید شکیل کاظمی

ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کو بہت ساری سہولیات دی ہیں وہیں اس نے ہماری ذاتی زندگی کو ذاتی نہیں رہنے دیا۔ ہمارے متعلق کوئی بھی، کبھی بھی، کچھ بھی جان سکتا ہے اور اس کا سامان ہم خود ہی کرتے ہیں۔ کچھ قریبی دوستوں کی رُوداد جو ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے مگر ایک اَن دیکھے تعلق اور جال میں مقید تھے۔ جس کی ہر کڑی ایک دوسرے سے منسلک تھی۔ کچھ مفاد پرست... اور ہوس گزیدہ ننگِ انسانیت لوگ انہی کڑیوں کو ملا کر ان کی زندگی میں زہر گھولنے کے لیے کمر بستہ تھے اور ان کی بے خبری ہی ان کے لیے سب سے بڑی سزا بننے والی تھی۔

چند ایسے کرداروں کی کہانی جو ہماری حقیقی زندگی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اس ماہ کے سرورق پر حیرت انگیز کہانی

وفاقی دارالحکومت میں زندگی رواں دواں تھی اور اس کا درجۂ حرارت بہت معتدل اور خوشگوار تھا۔ لوگوں کی چہل پہل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ملک کی سیاسی بساط پر ہمیشہ کی طرح اکھاڑ پچھاڑ جاری تھی۔ جہاں سب لوگ اپنے کاموں اور زندگی کی مصروفیات میں الجھے ہوئے تھے وہیں اسلام آباد کے ایک مشہور فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خفیہ میٹنگ منعقد کی گئی تھی۔ یہ نہایت ہی مختصر سی ملاقات تھی جس میں صرف کام کی چند باتوں، ایک بھاری رقم اور کچھ کاغذات کے سوا کسی چیز کا تبادلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں کل تین افراد شریک تھے۔ ان میں سے ایک کا نام داور تھا جو کہ جرائم کی دنیا میں خطرناک قاتل کے طور پر جانا جاتا تھا اور ایک بہت وسیع اور منظم نیٹ ورک چلا رہا تھا۔ ایک بہت بڑی سماجی و سیاسی شخصیت بلال احمد غوری جو کہ حالیہ الیکشن میں قومی سطح پر سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور اس کا ایک خاص آدمی زبیر احمد، یہ تینوں اس وقت دوسری منزل کے ایک لگژری سوئٹ میں موجود تھے۔ زبیر احمد کسی خاص مقصد کے تحت یہاں موجود تھا اور آج کل وہ بلال غوری کے ذاتی اسسٹنٹ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا ورنہ اس سے پہلے بلال نے ایک خوبصورت اور طرح دار حسینہ نادیہ کو اس پوزیشن پر رکھا ہوا تھا مگر اس کا حسن ہی اس کے لیے وبالِ جان ثابت ہوا تھا۔ یہ بات بلال غوری اور زبیر احمد کے علاوہ صرف نادیہ کو پتا تھی یا پھر اس بندے کو جس کے لیے داور سے آج میٹنگ رکھی گئی تھی۔ بلال غوری کا خاص آدمی زبیر، داور کو کام کے متعلق بریفنگ دے رہا تھا۔ داور خاموشی سے ساری تفصیلات سن رہا تھا اور اسے ذہن میں محفوظ بھی کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ ان معلومات کے ذریعے ہی وہ اپنا کام بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ داور کو جو کام دیا گیا تھا، یہ اس کے لیے مکھن میں سے بال نکالنے سے بھی زیادہ آسان تھا مگر اس میں صرف ایک الجھن تھی کہ جس بندے کو اسے ٹارگٹ کرنا تھا، اس کے متعلق اسے علم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے یا کہاں ملے گا۔ ابتدائی معلومات میں صرف تصویر اور نام ہی دستیاب تھا یا وہ موبائل نمبر جو وہ استعمال کرتا تھا مگر اب وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سوائے چند لوگوں کی سماجی رابطے کی ویب سائٹس سے لی گئی معلومات اور ان میں موجود چند تصاویر کے سوا کوئی واضح معلومات نہیں تھی۔ یہ داور کی پیشہ ورانہ زندگی میں انوکھی طرز کا کیس تھا۔ پہلے اس بندے کو زندہ حالت میں پکڑنا تھا تاکہ اس سے بلال کچھ معلومات لے سکے پھر

اسے منظر سے غائب کر دیا جاتا۔ مزید معلومات اور مدد کے لیے زبیر. احمد ہمہ وقت اس کے لیے فون پر موجود تھا کیونکہ وہ انٹرنیٹ اور اس پر موجود سماجی رابطے کی ویب سائٹس کے متعلق کافی علم رکھتا تھا اور اس میں ماہر بھی تھا۔ اسی خاص کام اور اہلیت کی وجہ سے بلال نے زبیر احمد کا انتخاب کیا تھا مگر وہ بندہ ابھی تک ان کی پہنچ سے دور تھا۔ داور کوئی سراغ رساں یا جاسوس ٹائپ کی چیز نہیں تھا کہ مطلوبہ بندے کی کھوج میں اکیلا نکل جاتا اور کامیاب و کامران لوٹ آتا۔ اس لیے اس کے پاس پہلی امید زبیر ہی تھا جو اس کی ٹھیک رہنمائی کر سکتا تھا کہ یہ دی گئی معلومات کس طرح کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ اپنے طور پر دی گئی معلومات پر ایک نظر ڈالنے کے لیے بیٹھ گیا اور آخر فائل بند کرتے کرتے اسے سمجھ آ چکی تھی کہ اسے کم از کم اپنے چار پانچ اور بندوں کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اس نے معمول سے دوگنی رقم طلب کی تو بلال غوری کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

”تم اپنی اوقات سے باہر ہو رہے ہو داور۔ یہ میرا ذاتی کام ہے اس لیے ایسا کر رہے ہو ورنہ پارٹی کا کام ہوتا تو آدھے پیسوں میں ہو جاتا“ بلال نے انتہائی غصے میں کہا لیکن اس میں بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔

داور ہنسنے لگ گیا ”بلال صاحب بات ایسی ہے کہ اگر ایک بندے کا کام ہوتا تو اتنے ہی لیتا، مگر پتا نہیں ان چھ بندوں میں سے کون جانتا ہو آپ کا مطلوبہ بندہ کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے چھ کے چھ بندوں کا بندوبست کرنا پڑے اس کے لیے مجھے پانچ چھ اور لڑکوں کو بھی کام پہ لگانا پڑے گا۔ کافی خرچے کا کام ہے۔ اب آپ بتاؤ سودا منظور ہے یا پھر مجھے اجازت ہے۔“ وہ بلال کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بلال اور داور کے درمیان ایک پرانی بدمزگی کے اثرات بھی تھے کیونکہ بلال نے ایک دفعہ اس کی ضمانت لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ اتنے بدنام زمانہ بندے سے اپنے تعلق کا کھل کے اظہار نہیں کر سکتا، یہ بات اس کے سیاسی کیریئر کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے کہ وہ ایک اجرتی قاتل کی ضمانت لے رہا ہے۔ بلال غوری کو بھی علم تھا کہ داور پرانی بات کو دل میں دبائے بیٹھا ہے اس لیے اب کام پڑنے پر اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے داور یہ کام کبھی نہ کرتا مگر سیاسی پارٹی کے ایک اور اعلیٰ عہدیدار کی سفارش پر داور کو ہامی بھرنی پڑی۔ آخر بلال نے ہتھیار ڈال دیے اور ساری رقم کیش کی صورت میں داور کے حوالے کر دی۔

☆☆☆

آج اسائنمنٹ نہ بنانی ہوتی تو عائشہ بھی باقی گھر والوں کے ساتھ اپنے چچا کے ہاں دعوت پر چلی جاتی مگر اسے کل ہر حال میں یہ اسائنمنٹ جمع کروانی تھی اس لیے وہ گھر میں رک گئی۔ ویسے بھی گھر والوں نے دو سے تین گھنٹوں میں واپس آ جانا تھا اور تب تک اسے پوری امید تھی وہ اپنا کام ختم کر لیتی مگر کام کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اسمارٹ

فون پر سوشل میڈیا پر بھی مصروف تھی اور کلاس فیلوز کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ لگا رہی تھی۔ عائشہ بہت محتاط اور ریزرو قسم کی لڑکی تھی اس لیے وہ ہر کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی نہ ہی اس نے کبھی اپنی تصویر کو سوشل میڈیا پر لگایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج کل لڑکیوں کو کس طرح جھوٹی تصویروں کے ذریعے بلیک میل کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ محتاط رہتی تھی۔ اس دوران اچانک ہی موسم کا مزاج تبدیل ہوگیا، دیکھتے دیکھتے ہی بادل چھا گئے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگ گئی۔ یہ موسم عائشہ کا پسندیدہ موسم تھا اس لیے وہ فوراً گیلری میں آگئی اور اپنے چہرے پر پڑنے والی بوندوں سے موسم کا لطف اٹھانے لگی۔ اچانک اس نے سوچا کیوں نا پروفائل پر بارش کی تصویر لگا کر اپ ڈیٹ کروں کہ لاہور میں بارش ہورہی ہے۔ اس نے گیلری میں کھڑے ہوکر ہلکی ہلکی بارش کا منظر اپنے اسمارٹ فون میں عکس بند کیا اور دو قدرے بہتر تصویروں کو پروفائل پر لگا دیا اور ساتھ ہی لکھ دیا اتنا رومینٹک موسم اور مجھے اکیلے گھر میں یونیورسٹی کی اسائنمنٹ سے سر کھپانا پڑ رہا ہے۔ اس کے کلاس فیلوز نے بھی معمول کی طرح اس سے سوال وجواب شروع کردیے۔

وہ اسائنمنٹ کو بھول کر کلاس فیلوز لڑکیوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگ گئی۔ ایک گھنٹا کب گزر گیا اسے پتا ہی نہیں چلا...... اچانک اسے ڈور بیل کی آواز آئی۔ اسے حیرت ہوئی کہ گھر والے اتنی جلدی آگئے۔ اس نے گیلری سے جھانک کر نیچے دیکھا تو وہاں ایک خوبرو لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے کسی سیل گرل کی طرح کے تھے جو گھر گھر جا کر اپنی مصنوعات کی تشہیر کرتی یا بیچتی ہیں۔ اس نے ایک عدد پی کیپ بھی پہن رکھی تھی۔ اس نے اوپر سے ہی کہا گھر میں کوئی نہیں اس لیے وہ کوئی چیز نہیں خرید سکتی۔ گیٹ پر موجود لڑکی نے اپنی پی کیپ اتار کر اوپر دیکھا اور کہا۔ ”میں کچھ بیچنے نہیں آئی۔ آپ کا ایک پارسل ہے جو ڈیلیور کرنا ہے۔“

پھر عائشہ کو سمجھ آیا کہ وہ کسی کوریئر کمپنی سے ہے۔ اس کے لیے یہ مقام حیرت تھا کہ لڑکیاں اب کوریئر کی جاب بھی کرنے لگی ہیں ورنہ اس نے ہمیشہ لڑکوں کو ہی دیکھا تھا یہ کام کرتے ہوئے۔ پارسل کا سن کر وہ تھوڑی الجھن میں مبتلا ہوئی مگر پھر سوچا ہوسکتا ہے ابو یا بھائی کے لیے آیا ہو ضروری تو نہیں میرا ہی ہو۔ اس کا کمرا پہلی منزل پر تھا۔ وہ اپنے کمرے سے اتر کر گیٹ پر آئی۔ جلد بازی میں اس نے گھر میں عام استعمال کا ایک سوتی دوپٹا سر پر اوڑھ لیا۔ یہ مشرقی اطوار اس کے خون میں شامل تھے حالانکہ گیٹ پر ایک لڑکی تھی کوئی مرد نہیں، لیکن وہ دوپٹے کو اپنے لباس کا جزو لازم سمجھتی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے لڑکی سے پارسل لیا اور واپس پلٹنے لگی تو لڑکی نے کہا ”پلیز اس پیپر پر وصولی کے دستخط تو کردیں۔“

”اوہ سوری، میں بھول گئی۔“ عائشہ نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ پیپر اور پنسل لینے کے لیے آگے بڑھی تو اس لڑکی نے برق رفتاری سے عائشہ کے چہرے پر اسپرے کردیا۔ عائشہ نے دہشت سے چیخ مارنے کی کوشش کی مگر اس لڑکی نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ چند ہی لمحوں میں عائشہ اپنے حواس سے بیگانہ ہوچکی تھی۔ لڑکی نے گیٹ سے سر باہر نکال کر تھوڑی دور کھڑی ایک گاڑی کو اشارہ کیا جس پر ایک کوریئر کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی گھر کے گیٹ کے پاس آکر رک گئی۔

☆☆☆

راولپنڈی صدر کی ایک معروف ترین شاہراہ پر جہاں گارمنٹس اور لائف اسٹائل دکانوں کی بہتات تھی وہیں زین کا دفتر زین ٹیکنالوجی ہاؤس کے نام سے تھا اور ساتھ ہی دکان بھی جس میں وہ کمپیوٹرز سے لے کے لیپ ٹاپ اور ٹیبلٹ کمپیوٹر سیل کرتا اور خریدتا تھا۔ زین بذاتِ خود ایک کمپیوٹر انجینئر تھا اور اس کے ساتھ ہی بلا کا ذہین بھی۔ جدید رجحان کی وجہ سے اس کا کاروبار بہت اچھا تو نہیں لیکن صحیح چل رہا تھا اور اس کی گزر اوقات ٹھیک ہورہی تھی مگر اب وہ تھوڑا آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک اچھی گاڑی اور راولپنڈی میں اپنا گھر بے شک وہ کوئی عام سا دس ضرب دس کا کوئی فلیٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے اس نے ایک منصوبے پر کام شروع کیا تھا لیکن سب کچھ الٹا ہوگیا اور زین کو اچانک ہی منظر سے غائب ہونا پڑا۔ کیونکہ وہ کچھ ایسا جان گیا تھا جو اس کی زندگی کے لیے خطرہ ثابت ہورہا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ عرصے کے لیے اپنا دفتر اور کرائے کا فلیٹ چھوڑ دیا تھا اور کسی دوسری جگہ آکر سستا سا کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ اصل میں بات وہاں سے شروع ہوئی تھی جب اس کی نادیہ نامی ایک لڑکی سے انٹرنیٹ پر دوستی ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کافی بے تکلف ہوتے گئے اور پھر ان میں ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ ایک ساتھ گھومنا پھرنا اور کھانا پینا اکثر چھٹی والے دن کا معمول بن گیا تھا۔ ایک دن نادیہ نے باتوں ہی باتوں میں زین کو بتایا کہ وہ بلال احمد غوری کی پرسنل اسسٹنٹ ہے۔ زین کے لیے یہ اطلاع

بہت معنی رکھتی تھی۔ کیونکہ بلال احمد غوری کوئی عام سا بزنس مین نہیں تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گروپ کا مالک تھا جس کے زیرِ اثر بہت ساری کمپنیاں چل رہی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک بااثر سیاسی پارٹی کا رکن اور اسمبلی کا ممبر بھی تھا۔ زین کے دماغ میں کھچڑی پکنی شروع ہوگئی کیونکہ وہ بلال کی پرسنل اسسٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ تھی۔ بے شک وہ سیاسی نہیں بلکہ کاروبار کی حد تک ہی بلال کی پرسنل اسسٹنٹ اور اکاؤنٹنٹ تھی مگر پھر بھی اس کی پہنچ اور تعلق سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زین کئی دن سوچتا رہا کہ وہ اس سے کون سا فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ کبھی وہ آسان شرائط کے ساتھ قرض لینے کی سوچتا اور کبھی بینک سے اس کی گارنٹی پر گاڑی نکلوانے کا...... لیکن اس کا ذہن کہیں ایک جگہ ٹھہر نہیں رہا تھا...... اور وہ براہِ راست نادیہ سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح یا تو وہ اسے منع کر دیتی یا پھر کسی بہانے سے ٹال دیتی، اس لیے اس نے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنے کا سوچا۔ آخر کافی دن کی سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک انوکھا اور خطرناک خیال آیا جس میں اس کی جان کو کئی خطرات لاحق ہو سکتے تھے مگر آگے بڑھنے کے لیے اس نے یہ رسک لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اب وہ اپنا لائف اسٹائل تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے نادیہ کو ایک لیپ ٹاپ گفٹ کیا، حالانکہ حالات اور اس کی جیب اس چیز کی بالکل اجازت نہیں دے رہے تھے، نہ ہی وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی مہلک قسم کے عشق میں مبتلا تھے۔ وہ بس برائے ضرورت یا وقت گزاری کے لیے ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے ورنہ دونوں کو ہی معلوم تھا کہ ان کی دوستی کا کوئی مستقبل نہیں۔ نادیہ اور زین ابھی تک ایک دوسرے سے اس لیے رابطے میں تھے کہ دونوں کی طبیعت میں صرف ایک چیز مشترک تھی۔ وہ کبھی ایک دوسرے سے سوال و جواب نہیں کرتے تھے کہ کس سے بات کر رہے تھے کہاں رہ گئے تھے یا یہ کس کا نمبر ہے وغیرہ وغیرہ۔ دونوں کے اندر باہمی سمجھوتے کی فضا قائم تھی۔ جب زین نے نادیہ کو ایک معروف کمپنی کا مہنگا لیپ ٹاپ بطور تحفہ دیا تو اسے بہت حیرت ہوئی اور ساتھ ہی اسے شک بھی ہوا کہ آخر زین بھی کہیں اسی ڈگر کی طرف تو نہیں چل پڑا کہ تحفے دے، احسان جتائے اور پھر اپنی مرضی کرے۔ اس لیے وہ لمحے بھر کو ہچکچائی تو زین نے فوراً بھانپ لیا۔ ”مجھے اس کمپنی کی طرف سے ایک ماہ میں سب سے زیادہ لیپ ٹاپس بیچنے پر دو عدد لیپ ٹاپس بطور بونس دیے گئے ہیں، کیونکہ میں ان کا لائسنس یافتہ ڈیلر بھی ہوں، اس لیے سوچا ایک تم کو دے دیتا ہوں، لیکن اگر تم تحفہ نہیں لینا چاہتیں تو قسطوں میں پیسے دے دینا، مجھے اعتراض نہیں۔“ زین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

نادیہ کو تھوڑی سی شرمندگی ہوئی کہ وہ ایسے ہی غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی۔ واجبی سے انکار کے بعد نادیہ نے وہ تحفہ قبول کرلیا۔ وہ خود کو زین کا قرض دار محسوس کرنے لگی تھی۔ زین کے خلوص اور دوستی کے بدلے وہ اسے ابھی تک اندھیرے میں رکھے ہوئے تھی۔ مگر شاید اب صحیح وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا دیتی، لیکن اسے موقع ہی نہیں ملا۔ زین چونکہ کمپیوٹر انجینئر تھا اس نے لیپ ٹاپ میں خفیہ سافٹ ویئرز اور ٹولز نصب کر دیے تھے جو عام صارف کی نظر میں نہیں آسکتے تھے۔ اس طرح اس لیپ ٹاپ پر ہونے والی ہر سرگرمی کی رپورٹ زین کسی بھی وقت حاصل کر سکتا تھا۔ نادیہ چونکہ پرسنل اسسٹنٹ کے ساتھ ساتھ بلال غوری کی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ بھی تھی اس لیے وہ آنے جانے والی رقوم اور دفتر کے اخراجات وغیرہ سب کی تفصیل رکھتی تھی۔ اس کام کے لیے دفتر میں اس کے پاس ایک بہترین ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر موجود تھا، مگر اپنا لیپ ٹاپ آنے کے بعد اس نے اپنی سہولت اور تبدیلی کی خاطر سارا کام اس پر شفٹ کرلیا۔ وہ خود کو اَپ گریڈ محسوس کر رہی تھی، کام زیادہ ہونے کی صورت میں وہ کام اپنے ساتھ گھر لے جاتی اور لیپ ٹاپ پر آرام سے کام ختم کر لیتی۔ دوسرا فائدہ لیپ ٹاپ کا نادیہ کو یہ تھا کہ وہ اپنے موبائل اور کیمرے کی ساری تصاویر اور ویڈیوز اس میں رکھ لیتی تھی ورنہ جب تک دفتر کا کمپیوٹر استعمال کرتی تھی وہ اپنی تصاویر اور ذاتی نوعیت کی چیزیں اس میں رکھنے سے احتراز کرتی تھی، کیونکہ دفتر کا کمپیوٹر وہاں ہر کسی کی پہنچ میں ہوتا ہے اور وہاں چیزیں محفوظ بھی نہیں رہتی تھیں۔

نادیہ اُس شام سے بڑی اَپ سیٹ تھی کیونکہ ان دونوں کا اس ویک اینڈ پر ملنے کا پروگرام تھا مگر اچانک زین نے بتایا کہ اس کے کسی دوست کی شادی ہے آزاد کشمیر میں۔ وہ کچھ اور دوستوں کو لے کر وہاں جائے گا اور ہو سکتا ہے اسے تین چار دن لگ جائیں۔ اس لیے ویک اینڈ کا پروگرام اگلے ہفتے کا رکھ لیتے ہیں۔ نادیہ کو معلوم تھا کہ اب زین سے ملاقات اگلے ہفتے ہی ہوگی۔ اس لیے اس نے وہ برانڈڈ گھڑی سنبھال کے رکھ دی جو زین کو تحفے میں دینے کا ارادہ تھا۔

☆☆☆

تقریباً پچھلے تین ماہ سے وہ پانچوں ملنے کا پروگرام بنا رہے تھے مگر ہمیشہ کوئی نہ کوئی ان میں سے مصروف ہو جاتا یا اسے کوئی کام پڑ جاتا اس لیے ان کی ملاقات موخر ہوتے ہوتے مارچ آگیا۔ یہ سب انٹرنیٹ پر دوست بنے تھے اور ان سب دوستوں میں باہمی دلچسپی کے امور صرف اور صرف دو ہی تھے۔ ایک ان کا پسندیدہ صحافی اور کالم نگار اعجاز بابر اور دوسرا ادب سے دلچسپی۔ اس لیے ان سب دوستوں نے مل کر ایک گروپ بنا لیا تھا جس میں وہ اپنے شوق اور خیالات کی ترویج کرتے اور ساتھ ہی دوسرے کالم نگاروں اور روزمرہ کے امور پر گفتگو کرتے۔ پھر اس گروپ میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے جن میں کئی عدد لڑکے، لڑکیاں اور کالم نگار بھی شامل تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہوتا گیا اور وہ انٹرنیٹ کی دنیا سے آگے نکل کر حقیقی دوستی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان میں سے دو رحیم یار خان سے تھے ایک کا نام اظہر علی اور دوسرا خاور حمید تھا۔ ملک ارسلان آزاد کشمیر سے تھا جبکہ محمد جمیل کا تعلق مری کے ایک نواحی علاقے سے تھا۔ ان کا پانچواں دوست زین العابدین روالپنڈی سے تھا۔ اظہر علی، محمد جمیل اور زین ایک دفعہ پہلے بھی مل چکے تھے راولپنڈی میں، جبکہ خاور اور ملک ارسلان کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ اسے لیے ان کا اشتیاق باقی تینوں سے زیادہ تھا۔

آخرکار اُن کا پروگرام فائنل ہوا کہ اظہر اور خاور رحیم یار خان سے راولپنڈی زین کے پاس آئیں گے، جہاں وہ ایک رات رکنے کے بعد صبح صبح مری میں جمیل کے پاس جائیں گے۔ مری میں دوپہر کا کھانا کھا کر اور تھوڑی بہت سیر کرنے کے بعد وہ چاروں ملک ارسلان کی طرف نکل جائیں گے آزاد کشمیر۔ جہاں آج کل ملک ارسلان کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں...... اور ان سب کا پروگرام بھی اسی لیے بنا تھا ورنہ کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آتی ہی رہتی تھی۔ اظہر اور خاور شادی سے قریباً ایک ہفتہ پہلے نکل پڑے تھے کیونکہ تین دن تو پکے شادی میں نکل جاتے باقی ایک دن آنے جانے میں اور کچھ وقت وہ پہاڑی علاقے کی سیر کرتے۔ سیر سپاٹے کا پروگرام اصل میں اظہر، خاور اور زین کا تھا کیونکہ جمیل اور ملک ارسلان تو اسی علاقے کے رہائشی تھے اور وہ ہر روز ہی ان سیرگاہوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتے رہتے تھے...... لیکن کہتے ہیں انسان جیسا سوچتا ہے ہمیشہ وہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اظہر اور خاور جب راولپنڈی پہنچنے والے تھے تو انہوں نے زین سے رابطہ کیا کہ وہ کہاں ہے، ہم جلد پہنچنے والے ہیں۔ زین کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کے موبائل فون پر کال بھی کی مگر اس کا نمبر بند ملا۔ وہ پریشان ہوگئے کہ پروگرام کے مطابق ان کو آج زین کی طرف قیام کرنا تھا۔ ویسے بھی زین اکیلا ہی رہتا تھا ایک فلیٹ میں اور اس کے فیملی والے اس کے آبائی گاؤں میں رہتے تھے، مگر اس کا نمبر ملتا تو کوئی بات بنتی۔ وہ پریشان ہوئے مگر زیادہ نہیں کیونکہ راولپنڈی کوئی قصبہ نہیں تھا کہ ان کو ایک رات رہنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ ملتی۔ اور زین کے نمبر پر بھی وہ پیغامات چھوڑ چکے تھے۔ اس کا جب بھی نمبر آن ہوتا اسے ان کے پیغامات مل جاتے اور وہ ان سے رابطہ کر لیتا۔

راولپنڈی بس اسٹینڈ پر اترتے ہی وہ ایک قدرے مناسب سے ریستوران کی طرف چلے گئے اور ایک رات کے لیے دو بیڈوں پر مشتمل کمرا کرائے پر لے لیا۔ سفر کی تکان کی وجہ سے انہوں نے کھانا کمرے میں ہی کھایا اور پھر لیٹ گئے۔ نیند ابھی ان کی آنکھوں سے دور تھی جب خاور کے موبائل پر ایک اجنبی نمبر سے پیغام آیا۔ وہ زین کی طرف سے تھا جس میں معذرت کی گئی تھی کہ وہ کسی انتہائی ذاتی نوعیت کے مسئلے میں پھنس گیا ہے۔ اس نے کہا تھا وہ دونوں اپنے پروگرام کے مطابق صبح مری نکل جائیں، میں کوشش کروں گا مری نہیں تو آزاد کشمیر میں آکر ان سے مل جاؤں گا اور میرا موبائل اور پرس کہیں گم ہوگیا ہے اس لیے میں کسی اور کے نمبر سے رابطہ کر رہا ہوں۔ آپ لوگوں کے نمبر میرے پاس محفوظ ہیں۔ جلد ہی نیا موبائل فون لے کر آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا اور ساتھ ہی تھوڑا دکھ بھی ہوا کہ زین کسی پریشانی سے دوچار ہے۔

اگلے دن وہ پروگرام کے مطابق مری پہنچے تو جمیل نے ان کو خوش آمدید کہا۔ وہ بھی زین کے متعلق سن کر پریشان ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق مری گھومنے گئے اور ڈیجیٹل کیمرے اور موبائل فون سے دھڑا دھڑ تصویریں بنانے لگے۔ آخر تھک ہار کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو تینوں نے چن چن کر اچھی اچھی تصویریں اپنی اپنی پروفائل اور مشترکہ گروپ میں لگا دیں اور ساتھ ہی کل کا پروگرام بھی بتا دیا کہ کل ہم انشاءاللہ آزاد کشمیر وادیٔ نیلم کی سیر کریں گے ملک ارسلان کے ساتھ۔ ملک ارسلان نے ان کو جواب میں خوش آمدید کہا اور یہ بھی کہ وہ ان کا بے صبری سے انتظار کرے گا۔ مگر اس نے بھی ایک سوال کیا کہ زین نظر نہیں آرہا آپ کے ساتھ تو خاور نے

اسے بتایا کہ زین بھی کل وہیں پہنچ رہا ہے۔ اگلی صبح وہ تینوں ملک ارسلان کی طرف پہنچ گئے، جہاں ان کی خوب خاطر مدارت ہوئی۔ ملک ارسلان شادی کی تیاریوں کی وجہ سے کافی مصروف نظر آرہا تھا، مگر اسے اپنے مہمانوں سے کیے وعدے کا بھی خیال تھا۔ آخر وہ وادیٔ نیلم جانے کی تیاری کرنے لگے تو اظہر نے اپنے فون سے ایک اور پوسٹ لگا دی کہ وہ وادیٔ نیلم کی طرف رواں دواں ہیں۔ زین ابھی تک نہیں پہنچا تھا نہ اس نے رابطہ کیا تھا۔

☆☆☆

گھر میں سوہا نے دو دن سے شور مچایا ہوا تھا کہ اس دفعہ اپنی پسندیدہ فلم سینما اسکرین پر ہی دیکھنی ہے اس لیے اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہن کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے حق میں ووٹوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی۔ اتوار کا پروگرام بن گیا اور سب بہن بھائیوں نے سینما ہال کی ٹکٹس ایڈوانس میں بک کروالیں۔ اتوار کو سوہا اپنے بہن بھائیوں سمیت پوری تیاری کے ساتھ سینما ہال فلم دیکھنے پہنچ گئی۔ انڈین فلموں کی پاکستان میں نمائش اب کوئی نئی بات نہیں رہی۔ وہ بھی ایک انڈین فلم دیکھنے ہی آئے تھے اور اس سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فلم کے دوران سوہا نے اپنے موبائل سے سوشل میڈیا پر یہ خبر لگا دی کو وہ اپنے بہن بھائیوں سمیت ایک انڈین فلم دیکھ رہی ہے اور ساتھ فلم کا نام لکھ دیا مگر احتیاط کے طور پر سینما کا نام نہیں لکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر سوال و جواب کی بوچھاڑ ہوگئی کہ کیسی فلم ہے اور کیا ہو رہا ہے اور اکیلے اکیلے پروگرام بنایا ہمیں بتایا ہی نہیں۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں اس کی پروفائل کا حصہ بنتی جا رہی تھیں۔ اس نے کچھ کا جواب دیا اور پھر انٹرول تک موبائل آف رکھا۔ انٹرول پر اس نے دوبارہ نئی پوسٹ لگا دی کہ بہت مزے کی فلم ہے مگر انٹرول کے بعد ہی پتا لگے گا کہ یہ اچھی رہی یا بری۔ وہ ریفریشمنٹ کے لیے کینٹین میں جمع ہو گئے اور اپنا اپنا آرڈر دینے لگے۔ سوہا فریش ہونے کے لیے واش روم کی طرف جانے لگی تو چھوٹے بھائی نے پوچھا۔ ''آپی کہاں جا رہی ہیں؟''

''میں آتی ہوں دو منٹ میں۔'' یہ کہہ کر وہ لیڈیز ریسٹ روم کی تلاش میں پہلی منزل کی طرف چل پڑی۔ انٹرول کی وجہ سے کافی رش تھا وہاں پر۔ ابھی وہ سیڑھیوں کے پاس ہی پہنچی تھی کہ سینما ہال کی انتظامیہ یونیفارم میں ملبوس ایک لڑکا بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا۔

''مس آپ کا نام سوہا افتخار ہے؟'' وہ بہت جلدی میں تھا۔

''ہاں، میرا ہی نام سوہا ہے۔ کیوں؟''

''وہ...... آپ کے بھائیوں کی لڑائی ہوگئی ہے پارکنگ میں کسی کے ساتھ...... آپ کی چھوٹی بہن نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا جلدی سے آپ کو بلا کے لے آؤں۔''

سوہا کے ایک دم ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پارکنگ کی طرف گئی۔ وہ لڑکا اس کے آگے آگے تھا۔ ''ادھر آیئے اس طرف۔'' وہ ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

پارکنگ میں پہنچتے ہی سوہا نے دیکھا وہاں پر تو خاموشی کا راج ہے اس لیے سوہا کو تھوڑی گڑبڑ محسوس ہوئی۔ اس کے دماغ نے خطرے کی گھنٹی بجائی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ کلوروفارم میں بھیگے ہوئے رومال نے سوہا کی ناک اور منہ ڈھک لیا۔ اسی وقت بغل میں آکر ایک ہائی روف رکی اور اس کا دروازہ کھلا۔ پھر اس لڑکے نے دھکیل کر لڑکھڑاتی ہوئی سوہا کو ہائی روف میں بٹھا دیا جس کے شیشے ٹنٹڈ تھے۔ اس کے بعد ایک جھٹکے سے ہائی روف پارکنگ سے نکل کر مین روڈ کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

داور پچھلے چھ سات سال سے جرائم کا بہت بڑا نیٹ ورک چلا رہا تھا۔ صوبے کے ہر کونے میں اس کے جاننے والے اور آدمی موجود تھے۔ وہ ایک خودساختہ ڈان بنا ہوا تھا۔ اپنے کام میں اسے اعلیٰ سرکاری افسران کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مگر وہ سیاسی پارٹیوں اور صنعت کاروں کی آپس کی دشمنی میں نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیشہ متوسط یا غریب طبقے کو نشانہ بنانے کا کام لیتا تھا تاکہ کبھی اسے دوسری طرف سے مخالفت یا مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ ہمیشہ انتقامی کارروائی سے محفوظ رہے۔ بلال غوری سے یہ کیس لینے سے پہلے بھی اس نے یہ احتیاط ملحوظ خاطر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ داور بہت کینہ پرور اور تندمزاج بھی تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اپنی بے عزتی کا بدلہ چکانے کے لیے اتنا کم انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ بلال غوری سے انتقام لینا چاہتا تھا اور اسے ایک ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے۔ بلال جتنا پریشان اور گھبراہٹ میں تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اس لڑکے کے پاس کوئی بہت ہی خاص معلومات یا چیز تھی جس کی وجہ سے وہ پہلے اسے زندہ پکڑنے کے لیے کہہ رہا تھا ورنہ وہ اسے سیدھا سیدھا مروا بھی سکتا تھا۔ اس لیے داور کا پروگرام تھا کہ جیسے ہی وہ لڑکا ہاتھ آتا ہے، پہلے وہ اپنے طور پر اس سے پوچھ گچھ کرے گا اور کام

کی بات معلوم کرنے کے بعد بلال کے حوالے کرے گا۔ وہ پہلی دفعہ کسی سیاست داں یا اعلیٰ طبقے کے بندے کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا سوچ رہا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اسے ریاض کی کال آ گئی۔ اس نے ریاض اور سارہ کو لاہور کی طرف بھیجا تھا کہ وہاں سے مطلوبہ لڑکیوں کو کسی بھی طرح یہاں آزاد کشمیر کے نواح میں موجود ایک گیسٹ ہاؤس پہنچانا ہے۔ اس نے کال ریسیو کی تو ریاض نے بتایا کہ وہ اور سارہ دونوں کو لے کر لاہور سے نکل پڑے ہیں اور شام تک وہ گیسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے۔ داور کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی سوچ بھٹکنے لگی تھی حالانکہ بلال غوری کی واضح ہدایت تھی کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچانا صرف معلومات لینی ہیں ڈرا دھمکا کر۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زبیر احمد نے اسے اطلاع دی۔ اس کے مطلوبہ لوگوں میں سے چاروں لڑکے اس وقت وادیٔ نیلم کی طرف نکلے ہیں اور اگلے دو تین گھنٹوں تک وہیں موجود ہوں گے۔ داور اس وقت اسی ریسٹ ہاؤس میں تھا اور یہاں سے وادیٔ نیلم ایک گھنٹے سے بھی کم کی ڈرائیو پر تھی۔ اس نے اپنے ساتھ دو اور بندوں کو لیا اور ایک جیپ میں وادیٔ نیلم کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

زین کو اتنا تو علم تھا کہ نادیہ دفتر میں لیپ ٹاپ استعمال ضرور کرے گی مگر اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہو شاید، کیونکہ وہاں ایک پورا انفارمیشن ٹیکنالوجی کا شعبہ تھا جو ایک لائسنس یافتہ اینٹی وائرس اور مضبوط ترین فائر وال کے ساتھ ایک محفوظ کنیکشن کو یقینی بناتا تھا کہ کوئی غیر ضروری معلومات یا صارف اس پرائیویٹ نیٹ ورک میں مداخلت نہ کر سکے.... فائر وال اور سیکیورٹی توڑنے کے لیے کسی ماہر ہیکر یا پروگرامر کی ضرورت تھی مگر زین نہ تو پروگرامر تھا اور نہ ہی ہیکر وہ صرف ایک کمپیوٹر انجینئر تھا...... اس لیے اس نے دوسرا لیکن طویل المیعاد منصوبہ بنایا تھا کیونکہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا تھا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ڈیپارٹمنٹ نے نادیہ کو لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ کی سہولت نہیں دی تھی۔ وہ انٹرنیٹ سے متعلقہ تمام کام اب بھی ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر پر ہی کرتی تھی۔ لیکن کچھ فائلز اور کام وغیرہ وہ اپنی ایکسٹرنل ڈرائیو میں لے جاتی تھی جب اسے گھر کام کرنا ہوتا تھا۔ گھر میں اس نے اپنا ذاتی انٹرنیٹ کا کنیکشن لیا ہوا تھا جس پر وہ ہلکے پھلکے دفتری کام کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا، موویز اور آن لائن شاپنگ وغیرہ کرتی تھی۔ رات کے وقت اس کی اکثر زین کے ساتھ لمبی بات ہوتی تھی۔

ادھر زین کے پاس بھی اس کے لیپ ٹاپ کی معلومات تب ہی جاتی تھی جب وہ گھر موجود ہوتی تھی۔ شروع شروع میں تو زین کھاتے اور بلز دیکھ دیکھ کر بور ہوتا گیا۔ اس کو کوئی کام کی چیز نہیں مل رہی تھی۔ زین اس بات سے جلد ہی اکتا گیا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ نادیہ کے لیپ ٹاپ سے یہ خفیہ سافٹ ویئرز نکال دے۔ وہ اسے بتائے بغیر یہاں سے سارے امور سرانجام دے سکتا تھا یہاں تک کہ اس کی ایک ایک فائل دیکھ سکتا تھا اور اس کے لیپ ٹاپ کا کیمرا بھی آن کر سکتا تھا۔ جسے اصطلاح میں ویب کیم بھی کہا جاتا ہے۔ زین نے نادیہ کے لیپ ٹاپ کا لنک کھولا اور آخری دفعہ ایک نظر مارنے بیٹھ گیا پھر وہ یہ سب ختم کر دیتا لیکن ایک فولڈر کی طرف اس کی توجہ چلی گئی جو کہ نادیہ نے آج صبح ہی کہیں اس میں بنایا تھا۔ اس فولڈر کا نام رکھا تھا سیکریٹ پروجیکٹ۔ زین کا اشتیاق بڑھ گیا۔ اس نے فوراً وہ فولڈر کھولا جس میں کافی تعداد میں تصاویر اور کچھ چھوٹی چھوٹی ویڈیوز بنی ہوئی تھیں۔ زین کے لیے وہ کسی ایٹم بم سے کم نہیں تھیں۔ یہ بلال غوری اور نادیہ کی تنہائی کی تصاویر تھیں اور ویڈیوز بھی...... جو کہ یقینی طور پر نادیہ کے موبائل سے لی گئی تھیں اور بلال غوری اس بات سے بے خبر تھا۔ نادیہ کے ساتھ اس کا کوئی بہت جذباتی رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں اور وقتی طور پر اسے نادیہ پر بہت غصہ آیا کہ وہ اس کے سامنے خود کو کتنی پاک صاف ظاہر کرتی تھی اسی لیے زین بھی کبھی حد سے زیادہ نہیں بڑھا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس نے فوراً نادیہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا، مگر وہ نمبر ڈائل کرتے کرتے اچانک رک گیا۔ اس کے ذہن میں یہی بات آئی کہ نادیہ نے یہ تصاویر کیوں بنائیں؟ کیا وہ بلال غوری کو بلیک میل کرنا چاہتی ہے یا کوئی اور مقصد تھا اس کا۔ زین نے تو یہ سارا کھٹ راگ اس لیے پھیلایا تھا کہ وہ بلال غوری کی ٹیکس چوری پکڑتا اور پھر میڈیا میں لے جانے کی دھمکی دیتا۔ اس کے بدلے وہ بلال غوری سے کچھ نہ کچھ فائدہ تو لے سکتا تھا اور اسے اپنی ماہرانہ رائے بھی دیتا کہ کس طرح اپنے نیٹ ورک اور کاؤنٹس کو محفوظ کیا جائے تاکہ دوبارہ کوئی یہ معلومات نہ لے سکے۔ مگر یہ سب دیکھ کر زین کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا، پھر بھی وہ سوچ رہا تھا جو کام نادیہ کرنا چاہ رہی ہے وہ کیوں نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے وہ

تصاویر اور ویڈیوز اپنے پاس محفوظ کرلیں اور وہ سافٹ ویئرز ویسے ہی رہنے دیے تاکہ مزید کوئی معلومات حاصل ہوں سکیں۔

اسے بلال غوری کے ذاتی ای میل ایڈریس کا پتا تھا کیونکہ بہت دفعہ اس نے نادیہ کا میل باکس چیک کیا تھا۔ اس نے ایک بہت واضح تصویر جس میں دونوں کے چہرے اور کرتوت صاف نظر آرہے تھے، بلال غوری کو بھیج دی اور ساتھ لکھ دیا میرے پاس ایسی بہت ساری موجود ہیں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ اگر اتنی بات تمہاری سمجھ میں آگئی تو اگلی بات کریں گے۔ زین نے احتیاط کے پیشِ نظر وہ ای میل ایک انٹرنیٹ کیفے سے نئی آئی ڈی بنا کے کی تھی۔ حالانکہ اس کو اس بات کی امید نہیں تھی کہ بلال غوری اتنی تفصیل میں جائے گا لیکن وہ ہر امکان مدِنظر رکھ رہا تھا۔ اس نے احتیاطاً اپنا نمبر بھی بند کردیا تھا اور ایک نیا نمبر لے لیا تھا۔ تاکہ نادیہ بھی اس سے رابطہ نہ کرسکے۔ مگر اسے اچانک یاد آیا کہ اس کے دوست کی شادی تھی آزاد کشمیر میں جہاں شمولیت کے لیے رحیم یار خان سے دو دوست آرہے تھے اظہر اور خاور اور ان کے ساتھ اس نے مری سے جمیل کو لیتے ہوئے ملک ارسلان کی شادی میں شامل ہونا تھا۔ اور وہ آج شام کو کسی وقت پہنچنے والے ہوں گے یا پہنچ گئے ہوں۔ اور وہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہے ہوں گے مگر اس کا نمبر تو بند تھا۔ اس لیے اس نے نئے نمبر سے خاور کو ایک پیغام بھیج دیا اور یہ لکھا کہ یہ کسی اور کا نمبر ہے اس کا پرس اور موبائل فون چوری ہوگیا ہے۔ وہ کسی ذاتی مسئلے میں الجھ گیا ہے، وہ اپنے پروگرام کے مطابق چلیں، وہ ان سے جلد آملے گا۔ خاور کا نمبر اس کی یادداشت میں محفوظ تھا، باقی ابھی تک اس نے صرف ضروری نمبرز ہی اپنی فون بک میں محفوظ کیے تھے۔

☆☆☆

بلال غوری کے لیے وہ ای میل ایک دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اُسے ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا شک نادیہ پر ہی گیا تھا کیونکہ نادیہ کے سوا دفتر کے پرائیویٹ کیبن میں کسی کی رسائی نہیں تھی۔ بس کبھی کبھار آفس بوائے اور کلینرز صفائی کی غرض سے آتے تھے مگر وہ اتنی جرأت نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی وہ اتنے قابل تھے۔ نادیہ کو اکثر اوقات وہ رات دیر تک کام کے بہانے روک لیتا تھا۔ نادیہ شروع میں بہت خوف زدہ تھی مگر پھر تحائف، پیسے اور عنایات دیکھ کر اس کی مزاحمت بالکل دم توڑ گئی تھی۔ وہ بلال کی ہر پیش قدمی کو روکنے کے بجائے ہوا دینے لگی اور بلال غوری بھی اس حسن کا اسیر ہوتا گیا۔ لیکن اب بلال بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک اعتماد کے بندے کو لیا اور نادیہ کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ نادیہ ایک کثیرالمنزلہ عمارت کے دوسرے فلور پر اکیلی رہتی تھی۔ عشا کی اذان ہو چکی جب بلال اپنے آدمی کے ساتھ نادیہ کے فلیٹ پر دستک دے رہا تھا۔ دستک سن کر نادیہ نے دروازہ کھولا تو بلال کو سامنے دیکھ کر اس کے حواسوں پر بجلی گری۔ اسے امید نہ تھی کہ بلال بھی یہاں آئے گا مگر اس کا انداز بتا رہا تھا، وہ بہت غصے میں ہے۔ بلال، نادیہ کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آیا اور اسے بیڈ پر دھکا دیا۔ اس کے ساتھ آئے آدمی نے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور سامنے بت بن کے کھڑا ہوگیا۔ نادیہ اس وقت زین کے ساتھ چیٹ میں مصروف تھی۔ زین کو انتظار کا کہہ کر ہی دروازہ کھولنے آئی تھی۔ مگر آگے یہ افتاد آگئی تھی۔ بلال غصے میں اس پر گرج رہا تھا۔

''تمہاری اتنی جرأت کہ مجھے بلیک میل کرو۔ تمہاری جیسی کئی لڑکیوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں میں۔ بتا کہاں ہیں وہ سب تصویریں جو تو نے بنائی ہیں؟'' اس نے نادیہ کے بالوں کو زور کا جھٹکا دیا۔ نادیہ کی کراہ نکل گئی۔ اس کو ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ بلال تک یہ بات کیسے پہنچ گئی۔ کیونکہ ابھی تو اس نے بلیک میلنگ شروع بھی نہیں کی تھی۔ وہ مسلسل انکار کرتی رہی کہ اسے کسی تصویروں کا علم نہیں۔ مگر بلال آہستہ آہستہ وحشی ہوتا گیا۔ وہ نادیہ کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس پر تشدد کرنے لگا۔ ادھر زین نے اکتا کر نادیہ کے لیپ ٹاپ کا کیمرا آن کردیا کہ دیکھے تو سہی وہ کہاں مصروف ہوگئی ہے۔ مگر سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کو ہکا بکا کردیا۔ نادیہ کے چہرے پر خون لگا ہوا تھا اور وہ سسک رہی تھی۔ جبکہ بلال نے ابھی تک اسے بالوں سے پکڑا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ کہا۔

''آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں، بتاؤ وہ تصویریں کہاں ہیں؟'' زین کو فوراً خیال آیا کہ اس کے جرم کی سزا نادیہ بھگت رہی ہے۔ اگر وہ بلال کو تصویر نہ بھیجتا تو نادیہ کی یہ حالت نہیں ہوتی...... اس نے اسکرین ریکارڈنگ آن کردی تھی۔ نادیہ کی برداشت ختم ہو چکی تھی۔ اسے اپنی جان بچانے کے لیے بتانا پڑا کہ تمام تصاویر اس کے لیپ ٹاپ میں موجود ہیں۔ بلال غوری نے اس کا لیپ ٹاپ چیک کیا اور فولڈر تک پہنچتے ہی اس نے بے تابی سے کھولا تو اندر اتنی

زیادہ تصاویر اور ویڈیوز دیکھ کر وہ مزید غضبناک ہوگیا، اس نے نادیہ کے چہرے پر زور کا تھپڑ مارا۔ زین مسلسل اسکرین پر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا جو ساتھ ساتھ اس کے کمپیوٹر میں محفوظ بھی ہو رہا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے بیٹھے خوف محسوس... ہونے لگا۔ پھر بلال غوری نے نادیہ سے پوچھا۔

”تم نے مجھے جو تصویر بھیجی تھی وہ کس کے ذریعے بھجوائی تھی؟ اور وہ تصویر بھی ڈیلیٹ کروا اپنی ای میل سے۔“ نادیہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔

”میں نے کوئی تصویر نہیں بھیجی، ابھی تو صرف بنائی تھی۔ بھیجنی تو دو ہفتوں بعد تھی جب میں کسی اور شہر چلی جاتی خاموشی سے...... تم کو تصویر بھیج کر یہاں اس طرح سکون سے بیٹھی ہوتی؟“ یہ سن کر وہ الجھن میں پڑ گیا۔ نادیہ کی بات بالکل ٹھیک تھی وہ اسی شہر اور اسی فلیٹ میں رہ کر کم از کم اتنی بڑی بے وقوفی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اگر یہ بات سچ تھی تو یہ اس سے بھی بڑی پریشانی تھی کہ یہ تصویریں کسی اور کے پاس بھی موجود تھیں۔ مزید تشدد کرنے پر نادیہ صرف یہ بتا سکی کہ اس نے ابھی تک کسی اور کو وہ تصویریں دکھائی ہیں نہ کسی کو پتا ہے۔ یہ صرف لیپ ٹاپ میں محفوظ تھیں۔ اسے نہیں معلوم کہ کیسے کسی اور کے پاس چلی گئیں۔

”کیا تمہارا لیپ ٹاپ کوئی اور بھی استعمال کرتا ہے؟“ اس نے استفسار کیا تو جاں بہ لب نادیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ نادیہ اس رخ پر لیپ ٹاپ رکھ کر استعمال کر رہی تھی کے پورے کمرے کا منظر واضح نظر آ رہا تھا اس لیے اس کمرے میں ہونے والی ایک ایک حرکت زین اپنے فلیٹ پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ بلال نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بندے کو اشارہ کیا، وہ لیپ ٹاپ لے کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ زین کو اس کا چہرہ بالکل اسکرین کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور کچھ دیر بعد اس نے گویا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

”سر یہ لیپ ٹاپ بگڈ ہے، یعنی اس لیپ ٹاپ پر ہونے والی ہر سرگرمی اور فائل کسی دوسرے بندے کے پاس جا رہی ہے۔“

وہ آدمی دراصل اس کی کمپنی میں آئی ٹی کا ماہر زبیر احمد تھا اور ساتھ ہی اس کا خاص آدمی بھی۔ اسی نے نادیہ کو دفتر میں لیپ ٹاپ انٹرنیٹ کی سہولت دینے سے انکار کیا تھا۔ یہ بات پتا لگنے کے بعد نادیہ ایک دفعہ پھر بلال غوری کے قہر کا نشانہ بنی۔ اس کی ٹوٹتی ہوئی سانس نے اس کا زیادہ دیر ساتھ نہیں دیا اور وہ یہ بتاتے بتاتے چپ ہوگئی کہ اسے زین نے یہ لیپ ٹاپ دیا تھا اس کے علاوہ اسے کچھ پتا نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے چپ ہوگئی تھی۔ زین کو اب وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ زبیر نے لیپ ٹاپ اپنے رخ پر رکھا ہوا تھا۔ پھر اچانک بلال کی آواز ابھری۔

”زبیر یہ لیپ ٹاپ پکڑو اور نکلو یہاں سے، مجھے لگتا ہے یہ مر چکی ہے۔“ زبیر نے تب تک بیک اینڈ پر چلنے والے تمام سوفٹ ویئرز اور ٹولز ختم کر دیے تھے۔ بلال کے کہنے پر زبیر نے فلیٹ کے اندر گیس کا چولھا کھلا چھوڑ دیا اور دوسرے کمرے میں ایک موم بتی جلا کر رکھ دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد یہ فلیٹ ایک خطرناک آگ کا شکار ہونے والا تھا۔ انہوں نے وہاں اپنی موجودگی کے تمام اثرات مٹائے اور خاموشی سے فلیٹ سے نکل آئے۔ اُدھر زین نے بھی ان دونوں کی آخری بات یہی سنی تھی کہ نادیہ مر چکی ہے۔ اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانا شروع ہوگیا۔ اس کی ایک چھوٹی سی غلطی نے نادیہ کی جان لے لی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور ان میں آنسو بھی تھے۔ نادیہ چاہے کیسی بھی لڑکی تھی مگر وہ اس کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی لیکن وہ زیادہ دیر اس کیفیت میں نہیں رہ سکا۔ اسے علم تھا کہ اگر اس نے جلد ہی اپنے تک پہنچنے والے تمام رستوں کو بند نہ کیا تو وہ جلد ہی اس تک بھی پہنچ جائے گا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی پروفائل کو ڈی ایکٹیویٹ کیا جس پر وہ نادیہ سے بات کیا کرتا تھا۔ اور پھر اگلے دن صبح ہی اپنا فلیٹ چھوڑ کر ایک سستے سے علاقے میں بیٹھک کرائے پر لے لی۔ اپنے دفتر پر بھی اس نے برائے فروخت کا بورڈ لگا کر ایک فرضی نمبر لکھ دیا تھا۔ اب کسی حد تک وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ اپنے طور پر اس کی احتیاط کافی تھی مگر وہ ایک اَن دیکھے جال میں مقید تھا جس کی صرف ایک کڑی اس نے اوجھل کی تھی باقی ساری کڑیاں کھلی تھیں اور انہی کڑیوں کو جوڑ کر بلال غوری اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

☆☆☆

زبیر احمد نے نادیہ کے لیپ ٹاپ سے تمام کام کی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ نادیہ نے جس لڑکے زین کی بات کی تھی، اس کی اپنی پروفائل تو سوشل میڈیا سے غائب ہو چکی تھی یعنی اس نے اس کو ختم کر دیا تھا۔ مگر ایک گروپ سے اس کے متعلق اور اس کے کچھ دوستوں کے متعلق اسے کافی اہم چیزیں ملیں تھیں۔ نادیہ بھی اسی گروپ کا حصہ تھی اس لیے زبیر کو بہت زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی معلومات نکالنے کے لیے۔ گروپ میں اس نے چھ بندوں کو

چنا تھا جن میں سے کوئی نہ کوئی ضرور زین سے متعلق کچھ کام کی معلومات مہیا کر سکتا تھا۔ اس نے دو لڑکیوں کو بھی اس شک کے دائرے میں رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں جو بات بندہ لڑکوں سے شیئر نہیں کرتا وہ کسی نہ کسی لڑکی سے ضرور کر دیتا ہے جیسے اپنی اور اپنی فیملی کی ذاتی معلومات وغیرہ جبکہ وہ ایک دوسرے پر کافی اعتماد بھی کرتے ہوں۔ زبیر نے ان دونوں لڑکیوں اور باقی چار لڑکوں کی پروفائل، معلومات اور تصاویر محفوظ کر لی تھیں، دونوں لڑکیاں کافی محتاط تھیں نہ ان کی کوئی تصویر موجود تھی اور نہ ہی کوئی اور سراغ کہ وہ لاہور کے کس ایریا میں رہتی ہیں۔ انہوں نے صرف اپنے شہر کا نام لکھا ہوا تھا اور کچھ خاص نہیں۔ زبیر نے گھنٹوں بیٹھ کر ان دونوں لڑکیوں کے متعلق کچھ شواہد اکٹھے کیے تھے ان کی پروفائل سے۔ سوہا افتخار نامی لڑکی نے اپنے بھائی کی شادی کی تصاویر لگائی تھیں جس میں اس کے کزن اور بھائی بھی تھے۔ اس نے وہ تصاویر محفوظ کر لیں۔ کیونکہ اگر بھائیوں تک وہ پہنچ جاتے تو بہن کو بھی آسانی سے ٹریک کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ دوسری لڑکی نے اپنے گھر کے سامنے ایک میونسپل پارک کی تصاویر شیئر کی ہوئی تھیں جو اس نے اپنے گھر کی گیلری سے بنائی تھیں۔ تصویر کو انلارج کر کے دیکھنے سے اسے پارک میں لگے ٹیوب ویل اور اس کے میٹر کا نمبر ملا جو کہ انتہائی دھندلا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس کو مزید واضح کر کے وہ نمبر حاصل کر لیا تھا۔ پھر اس نے لاہور میں اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے اس میٹر کی بالکل اصل لوکیشن معلوم کر لی تھی کہ وہ ماڈل ٹاؤن کے کس پارک میں لگا ہوا ہے۔ لڑکوں نے البتہ کوئی خاص احتیاط نہیں کی تھی۔ ان سب کی تصاویر اور باقی سرگرمیوں کی تفصیل آسانی سے مل گئی تھی۔ اس نے ایک اور بندے گل زمان کو بھی مارک کیا تھا جو کہ پشاور میں کسی فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس نے دفتر کی ریسپشن پر بیٹھ کر اپنی تصویر بنوائی تھی جس کی وجہ سے اس کے پیچھے کا سارا منظر شیشے کے دروازے سے نظر آ رہا تھا۔ اس کے بالکل عقب میں ایک مشہور چائنیز ریسٹورنٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ پورے پشاور شہر میں اس نام کے صرف دو ہی ریسٹورنٹ تھے۔ اس لیے وہ بندہ بہت آسانی سے ٹریک ہو سکتا تھا مگر اس نے اس کو خود ہی لسٹ سے نکال دیا۔ کیونکہ گروپ کی گفتگو سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ زین کے متعلق کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔ یہ سارا کام زبیر نے بہت جانفشانی سے کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ بلال اسے ضرور کسی بڑے انعام سے نوازے گا۔

زبیر نے ان چھ لوگوں کی ایک فائل تیار کی تھی جس میں ان ساری معلومات کا احاطہ کیا تھا اور ساتھ ہی تصاویر بھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک الگ فائل تیار کی تھی جو صرف زین کے متعلق تھی جس میں اس کے بارے میں کافی محدود معلومات تھیں جیسے اس کا موبائل نمبر اور اس کی کچھ تصاویر جو اسی گروپ میں دوسرے کسی ممبر نے لگائی تھیں جب اس کی اور زین کی کہیں ملاقات ہوئی تھی۔ نادیہ ان میں سے کسی کے ساتھ ایڈ نہیں تھی مگر اب زبیر نے نادیہ کی آئی ڈی سے ان سب کو ایڈ کر لیا تھا۔ زبیر اتنی سہولت سے اس لیے نادیہ کی پرسنل آئی ڈی استعمال کر رہا تھا کہ نادیہ کا پاس ورڈ خود کار طریقے سے محفوظ تھا ویب براؤزر میں، یعنی ایک دفعہ پاس ورڈ ڈالنے کے بعد وہ اس میں محفوظ ہو جاتا تھا اور بار بار پاس ورڈ ڈالنے کا جھنجٹ ختم ہو جاتا۔ لیکن اسی ایک چھوٹی سی سہولت نے نادیہ کی آئی ڈی کو بنا ہیک کیے کسی دوسرے کی دسترس میں دے دیا تھا۔ اب زبیر کو ان سب کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھی تاکہ وہ ان سب کو ٹریک کر کے داور کو مخبری کر سکے۔

آج کا دن انتہائی تھکا دینے والا تھا کیونکہ وہ صبح سے اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ آج ہی اتفاق سے اس نے بہت کام کی خبریں دی تھیں۔ سوہا نامی لڑکی نے اپنی پروفائل پر جب یہ خبر لگائی تھی کہ وہ ایک انڈین فلم دیکھنے لاہور کے ایک سینما میں گئی ہے اپنی فیملی کے ساتھ تو زبیر نے فوراً پتا کروالیا تھا فون پر بھی اور انٹرنیٹ سے بھی کہ یہ فلم لاہور کے کتنے سینما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی گئی ہے۔ لاہور میں کل تین سینما گھر ایسے تھے جو اس فلم کے قانونی حقوق رکھتے تھے۔ اس لیے اس نے ان تینوں سینما گھروں کے نام داور کو بتا دیے اور ساتھ ہی کہا کہ وہ اس کے بھائیوں کی وجہ سے اس کو پہچان سکتے ہیں اس لیے تینوں سینما گھروں میں اپنے بندے بھیج دے اس کے بھائیوں کی تصویریں دے کر۔ داور فوراً حرکت میں آیا تھا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سوہا نے دوبارہ لکھا کہ انٹرول ہے اور وہ ریفریشمنٹ کر رہے ہیں تو زبیر نے دوبارہ یہ اطلاع داور کو دے دی تھی۔ اور آخرکار اس کے بندوں نے فورٹریس اسٹیڈیم سے سوہا نامی لڑکی کو کامیابی سے اٹھا لیا تھا۔ اسی دوران عائشہ نامی لڑکی نے بھی اپنے گھر کی گیلری سے دوبارہ کچھ تصاویر لگائی تھیں۔ اس دفعہ تصویر میں اس کے اپنے گھر کا گیٹ اور گیلری کا جنگلا بھی بہت نمایاں تھا۔ ایڈریس تو

تقریباً اس کو معلوم تھا ہی مگر اب بہت واضح ہو گیا تھا اور سونے پے سہاگا یہ کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا داور کو بتایا۔ داور بھی کچھ دیر کے لیے بوکھلا گیا تھا کیونکہ اسے ایک وقت میں بہت سارے لوگوں کو ہینڈل کرنا تھا۔ اغوا کاروں کو بھی اور اغوا کنندگان کو بھی۔ اس کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں تھی مگر بلال کی ہدایت کے مطابق مطلوبہ بندے کے علاوہ کسی کو جانی یا کوئی اور نقصان نہیں پہنچانا تھا اور کام بھی نہایت صفائی سے کرنے کو کہا تھا۔ اس لیے داور اپنے محدود ہونے سے زچ ہو رہا تھا۔ بہرحال اس نے ریاض اور سارہ کو فوراً بھیج دیا تھا۔ ریاض ایک کوریئر کمپنی کا ڈرائیور تھا اور ساتھ ہی داور کے لیے کبھی کبھار غیر قانونی کام بھی کرتا تھا۔ کام کی نوعیت منشیات یا غیر قانونی اسلحہ ایک شہر سے دوسرے شہر لے کر جانا تھا کوریئر کمپنی کی گاڑی کا استعمال کرتے ہوئے۔ اسی لیے اس دفعہ بھی ریاض نے سارہ کے ساتھ مل کر یہی گاڑی استعمال کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور پھر اپنا مشن... کامیاب ہونے کی خبر دی تھی۔ داور نے اسے مزید ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ضمیر سے رابطہ کرے کیونکہ اس کے پاس دوسری لڑکی ایک محفوظ لوکیشن پر بے ہوش پڑی تھی۔ اسے بھی اسی گاڑی میں ڈال کر سارہ کے ساتھ آزاد کشمیر آ جائے۔ اس دوران وہ ان لڑکوں کی طرف جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جو کہ تازہ ترین اطلاع کے مطابق وادیٔ نیلم کی طرف گئے تھے۔ ان کو پہچاننا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ ان سب کی تصویریں داور کے پاس موجود تھیں۔ داور نے اس جگہ کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کیونکہ زبیر نے بتایا تھا کہ جلد یا بدیر سب لڑکے آزاد کشمیر میں اکٹھے ہوں گے اور ہو سکتا ہے زین بھی وہیں آ جائے۔

☆☆☆

ملک ارسلان اپنے تینوں دوستوں کو ساتھ لے کر وادیٔ نیلم آ گیا تھا۔ یہاں کا ہر راستہ اس کا دیکھا بھالا تھا، وہ میزبان کے ساتھ ساتھ گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا کیونکہ آسمان پر کہیں کہیں آوارہ بادل کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے اور ساتھ ہی دھوپ بھی وادی کو روشن کر رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور مبہوت کر دینے والے مناظر تھے۔ جمیل اور ملک ارسلان کے لیے تو کچھ نیا نہیں تھا مگر خاور اور اظہر قدرت کے اس حسن سے بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ وہ چاروں تصاویر بنانے اور سیر و سیاحت میں مصروف تھے جب ایک جیپ ان سے کچھ فاصلے پر آ کر رکی۔ کیونکہ وہ ذرا سڑک سے فاصلے پر چل رہے تھے اس لیے جیپ کا وہاں تک آنا ممکن نہیں تھا۔ اس میں سے چار بندے اترے، جنھوں نے دھوپ اور ہلکے سے موسم کے باوجود گرم چادریں لی ہوئی تھیں۔ ان چاروں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ملک ارسلان سے کہا۔

''وہ سامنے جیپ دیکھ رہے ہو؟ چپ چاپ جا کر اس جیپ میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ ہی اپنے تینوں دوستوں کو بھی لے چلو ورنہ......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنی چادر کچھ دیر کے لیے ہٹائی جس کے نیچے ایک خطرناک آٹومیٹک رائفل نظر آ رہی تھی جو اس کے شولڈر بیلٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے ہاتھ میں بھی ایک عدد پستول تھا جو بادی النظر میں کوئی کھلونا نما چیز لگ رہی تھی مگر اس کی بھیانک اور کالی بیرل موت کا خوف پیدا کر رہی تھی۔ ملک ارسلان کے لیے یہ بہت سبکی اور پریشانی کی بات تھی۔ ایک تو آج سے دو دن بعد اس کی شادی تھی اور دوسرا اس کے علاقے میں اسی کے مہمانوں کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔

''تم کون ہو اور کیا چاہیے تم کو؟'' اس کے جواب میں ارسلان کو اس آدمی نے جو کہ داور تھا ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ خاور، اظہر اور جمیل سے دونوں ذرا دور تھے اس لیے گفتگو تو ان کی سمجھ میں نہیں آئی مگر ملک ارسلان کو تھپڑ پڑتے دیکھ کر وہ فوراً اپنے دوست کی مدد کو بھاگے۔

جیسے ہی وہ پاس آئے، داور نے ان پر پستول تان لیا۔ وادی میں اس وقت بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ بھی اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اس لیے دوسروں کی نظر میں یہ کارروائی آنے کا امکان بہت کم تھا۔ ان سب کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ ان تینوں کو یہی محسوس ہوا کہ ملک ارسلان کی کوئی ذاتی رنجش ہے جس کی زد میں یہ لوگ بھی آ گئے ہیں۔ ملک ارسلان ایک طرف نظریں جھکا کر کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں اس تذلیل پر جل رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اس آدمی کی کھوپڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا مگر فی الوقت وہ کسی بھی بے وقوفی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک تو اس کے دوست ساتھ تھے دوسرے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ داور نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔

''اب سیدھے اس جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤ تو اچھا ہو گا۔ ورنہ مجھے مجبوراً تم سب کی ٹانگیں توڑ کر لے جانا پڑے گا۔'' وہ چاروں بے بسی کا احساس لیے ہوئے جیپ کی

طرف چل پڑے۔ داور اُن کے پیچھے پیچھے جھومتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ سب خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثر لیے جیپ میں جا بیٹھے۔ داور کے حکم پر جیپ اسٹارٹ ہوئی اور واپسی کے راستے پر چل پڑی لیکن اس سے پہلے ان چاروں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ ایک گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو کے بعد وہ لوگ داور کے خفیہ ٹھکانے یعنی ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

☆☆☆

ریاض اور سارہ نے داور کی ہدایت کے مطابق ضمیر سے رابطہ کیا پھر وہ اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے جہاں اس نے سوہا کو چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ عائشہ پہلے ہی ریاض کی گاڑی میں موجود تھی۔ ضمیر کے پاس پہنچتے ہی انہوں نے جلدی سے بے ہوش سوہا کو گاڑی میں منتقل کیا اور دونوں کو ایک بار پھر بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا تاکہ اگلے چار پانچ گھنٹے وہ ہوش میں نہ آسکیں۔ اس کے بعد ریاض اور سارہ آزاد کشمیر کی طرف نکل پڑے۔ ان کو راستے میں کافی چیک پوسٹوں پر رکنا پڑا، مگر گاڑی پر کمپنی کے نام اور ریاض کی واقفیت اور سلام دعا سے وہ بنا کسی خاص پریشانی کے مسلسل سفر کے بعد آزاد کشمیر پہنچ گئے۔ وہ کہیں آرام کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ ریسٹ ہاؤس پہنچتے ہی سارہ اور ریاض نے دونوں لڑکیوں کو گاڑی سے ایک کمرے میں منتقل کیا، پھر دونوں کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے۔ تب تک انہیں ہلکا ہلکا ہوش آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کمرے میں سوائے ایک قالین کے کچھ نہیں تھا، نہ کوئی کھڑکی نہ کوئی اور سامان کہ جس کی مدد سے وہ فرار ہونے کی کوشش کرتیں۔

سارہ نے دروازہ لاک کیا اور باہر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ اسے داور کا انتظار تھا جو کہ وادیٔ نیلم گیا ہوا تھا۔ ابھی ان کو بیٹھے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر جیپ کے رکنے کی آواز آئی۔ سارہ باہر دروازے کی طرف بڑھی جبکہ ریاض اتنی لمبی ڈرائیونگ کے بعد لاؤنج میں لمبی تان کر لیٹ گیا تھا۔ داور چار لڑکوں کو گن پوائنٹ پر لے کر اندر داخل ہوا۔ سارہ کو دیکھ کر داور مسکرایا اور اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکیاں بھی خیریت سے یہاں تک پہنچ چکی ہیں۔ داور نے بھی ان چاروں لڑکوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے باندھ دیے اور اسی کمرے میں جہاں پہلے دو لڑکیاں موجود تھیں، بند کر دیا لیکن اس سے پہلے وہ ان کی آنکھوں کی پٹیاں ہٹا چکا تھا۔ اپنے دو آدمیوں کو اس نے ریسٹ ہاؤس اور اردگرد نظر رکھنے کی ذمّے داری سونپ دی اور ایک آدمی کو گیٹ پر تعینات کر دیا۔ ریاض صوفے پر لیٹا لیٹا خوابوں کی وادی میں چلا گیا تھا۔ جبکہ داور سارہ کے ساتھ اپنے خاص کمرے میں آ گیا۔ ان کے جانے کے بعد اظہر، خاور اور جمیل نے ملک ارسلان سے تفتیش شروع کر دی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں، انہوں نے ہمیں کیوں اغوا کیا ہے؟ ملک ارسلان کے پاس کوئی جواب ہوتا تو وہ دیتا۔ اس کی لاعلمی اور بھی تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ اتنے پریشان تھے کہ کمرے میں موجود دوسرے کونے میں دونوں لڑکیوں پر بھی توجہ نہ دے سکے جو مسلسل ان کو شاک کی کیفیت میں گھورے جا رہی تھیں۔ آخر سوہا نے لرزتی زبان سے کہا۔

”ارسلان بھائی……! کیا یہ آپ ہیں؟ یہ اظہر، جمیل اور خاور آپ کے ساتھ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ عائشہ نے بھی ہمت کر کے کہا۔ ”میں آپ سب کو جانتی ہوں۔“ ان چاروں کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کہ وہ اتنی دور یہاں اجنبی لڑکیوں سے اپنا نام سن رہے ہیں۔ عائشہ اور سوہا ان چاروں کے لیے اجنبی ہی تھیں کیونکہ انہوں نے کبھی ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ چاروں ان دونوں کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ سوہا اور عائشہ نے ان چاروں کی کئی تصاویر دیکھی ہوئی تھیں اس لیے وہ فوراً سے پہلے ان کو پہچان گئی تھیں۔ ملک ارسلان کو ابھی تک اپنی بے عزتی نہیں بھولی تھی مگر کمرے کی صورتِ حال نے وقتی طور پر اس کو اُس شاک کی کیفیت سے نکال دیا تھا۔ اس نے سوہا سے پوچھا۔

”آپ نے مجھے بھائی کہا ہے اور میرے دوستوں کے نام بھی لیے ہیں، آپ ہم سب کو کیسے جانتی ہیں؟“ جواب میں جب سوہا نے اپنے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی عائشہ نے بھی اپنا تعارف کروایا تو ایک لمحے کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا۔ یہ چھ کے چھ لوگ ایک دوسرے کے انٹرنیٹ پر دوست تھے اور ایک ہی گروپ کے ممبر بھی۔ سوہا اور ملک ارسلان منہ بولے بہن بھائی بنے ہوئے تھے۔ یہ سارا گروپ ایک فیملی کی طرح ہی تھا۔ لیکن ان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ان سب کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ یہ سب کسی بڑی منصوبہ بندی اور سازش کا شکار ہوئے تھے۔

اسی سوچ اور کشمکش میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا پھر اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور داور اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ فائلیں تھیں اور سارہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں دروازے کے بالکل سامنے کھڑے ہو گئے۔ داور کی آنکھیں مسلسل عائشہ اور سوہا پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ رہی تھیں اور ایک کراہت کا احساس ان کے اندر پیدا ہو رہا تھا۔ جبکہ داور کو دوبارہ دیکھ کر ملک ارسلان پھر سے اسی جذباتی کیفیت میں چلا گیا۔

اس کے چہرے پر سرخی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ خاور اور جمیل خاموشی سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ اظہر نے اس دفعہ گفتگو کرنے کی ذمے داری اٹھائی۔ اظہر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ داور نے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس نے اظہر کو مخاطب کر کے کہا۔

”تم سب لوگ یقیناً یہ سوچ رہے ہو گے کہ تم کو یہاں کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے، تو میں بتاتا چلوں کہ مجھے کچھ معلومات چاہئیں ایک بندے کے متعلق اور میں جانتا ہوں تم لوگ اس کے بارے میں کافی جانتے ہو۔ اس لیے اگر تم نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا اور کوئی بات نہ چھپائی تو تم سب لوگ آرام سے واپس گھر جا سکو گے، اگر تم لوگوں نے تعاون نہ کیا تو پھر نتائج کے ذمے دار تم خود ہو گے۔“

اظہر نے فوراً کہا۔ ”آپ جو پوچھیں گے، ہم بتا دیں گے مگر آپ لوگ ہمیں یہاں سے جانے دیں، میرے اس دوست کی پرسوں شادی ہے۔ اور یہ جو دونوں لڑکیاں ہیں پتا نہیں ان کے گھر والوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔ پلیز آپ کو جو معلومات چاہئیں ہم بتانے کو تیار ہیں۔“

”شاباش! تم کافی عقلمند لگتے ہو۔“ داور نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”تو مسٹر عقلمند...... بات یہ ہے کہ مجھے تمہارے دوست زین کے متعلق معلومات درکار ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا یا ہو سکتا ہے۔ اور کس کس جگہ اس کے ملنے کی امید ہے؟“

زین کا نام سنتے ہی سب کے چہرے پر ایک دم حیرت اور بے یقینی کے تاثرات نظر آئے۔ تو گویا اس سارے مسئلے کا اصل محرک زین تھا۔ اظہر کو لگا کہ اس نے جلد بازی میں غلطی کی ہے، وہ زین کے متعلق اگر اس کو بتا دے تو یہ بندہ ضرور زین کو نقصان پہنچائے گا۔ کیونکہ اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ اس وقت سے مسلسل کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا جبکہ سارہ واپس لاؤنج میں چلی گئی تھی۔ اس کی خمار آلود آنکھیں بار بار بھٹک کر عائشہ اور سوہا پر جا ٹکتی تھیں۔

اظہر نے داور سے کہا۔ ”ہم زین کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے، ہم بس انٹرنیٹ کے دوست ہیں۔ اس سے صرف سلام دعا کی حد تک گپ شپ ہے۔“

داور نے اپنے ہاتھ میں موجود فائلوں میں سے ایک کو کھول کر اس میں سے ایک تصویر نکالی اور اظہر علی کی جانب پھینک دی۔ ”مجھے لگتا ہے تم لوگ گھر نہیں جانا چاہتے شاید۔“ داور غضب ناک آواز میں بولا۔

تصویر اظہر کے بالکل سامنے آ کر گری تھی لیکن اس کا رخ نیچے کی جانب تھا، اس نے جھک کر تصویر اٹھائی اور اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ تصویر دیکھ کر اب اس کے اپنے حواس پر بجلی گری تھی۔ یہ اس کی اپنی تصویر تھی زین اور جمیل کے ساتھ، ایک معروف ریسٹورنٹ میں جہاں وہ ایک دفعہ ملے تھے اور کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے تصویر بنائی تھی۔

”اب کیا کہتے ہو مسٹر عقلمند؟“ داور نے اظہر کا گریبان پکڑ کر کہا۔ ”تم لوگوں کے پاس صرف اور صرف ایک آخری موقع ہے، اگر تم لوگوں نے تعاون نہ کیا یا کوئی چالاکی دکھائی تو پھر میں اپنی مرضی کروں گا جو مجھے یقین ہے تم لوگوں کو پسند نہیں آئے گی خاص طور پر ان لڑکیوں کو تو بالکل پسند نہیں آئے گی۔ تم لوگ آپس میں مشورہ کر لو، میں دس منٹ بعد دوبارہ آتا ہوں۔“ داور یہ کہہ کے باہر نکل گیا۔

ان سب نے آپس میں سر جوڑ لیے مشورہ کرنے کے لیے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اظہر اور جمیل دونوں آنے والے حالات اور داور کی دھمکی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم جتنا بھی جانتے ہیں ہمیں بتا دینا چاہیے کیونکہ یہاں ہمارے ساتھ لڑکیاں بھی ہیں، ہماری کسی بھی غلط بیانی یا جھوٹ سے وہ ان کے ساتھ برا سلوک کر سکتے ہیں جو کہ ہمیں ہرگز منظور نہیں۔ زین ابھی ان کی پہنچ سے دور ہے، ہو سکتا ہے جب تک یہ اس تک پہنچیں ہم کو یہاں سے جانے دیا جائے پھر رابطہ ہوتے ہی ہم زین کو آگاہ کر دیں گے۔ جبکہ خاور اور ملک ارسلان محاذ آرائی کا سوچ رہے تھے۔ لیکن عائشہ اور سوہا نے خاور اور ملک ارسلان کو اس قسم کی بے وقوفانہ محاذ آرائی سے روک دیا تھا۔ آخر کار وہ سب ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے۔ اس لیے جب دوبارہ داور آیا تو انہوں نے حتی الامکان جو کچھ جانتے تھے بتا دیا۔ داور زیادہ مطمئن تو نہیں ہوا مگر ان کو تھوڑا وقت ضرور مل گیا تھا اور بات کل پر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

بلال کو داور کی نیت پر شبہ تھا۔ وہ جانتا تھا داور اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی گیم ضرور کرے گا اس لیے اس نے زبیر کو کہا تھا کہ داور کو جو بھی خبر دے ساتھ ساتھ اسے بھی بتائے اور ان سب لوگوں کے نمبر حاصل کرے جو اس وقت داور کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ زین، داور کی تحویل میں جتنی دیر زیادہ رہتا، اتنا ہی بلال کے لیے مسئلہ بن سکتا تھا۔ کیونکہ

زین کے پاس ایک تو بلال اور نادیہ کی تصاویر اور ویڈیوز تھیں اور دوسرا نادیہ اس کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔ اس نے حتی الامکان نادیہ کے فلیٹ سے اپنے ہونے کے آثار مٹا دیے تھے مگر بقول زبیر بعید نہیں تھا کہ زین کے پاس نادیہ کے قتل کی ویڈیو بھی موجود ہو۔ کیونکہ جب بے پناہ تشدد کی وجہ سے نادیہ کی موت واقع ہوئی، وہ اس وقت زین سے بات کر رہی تھی اور اس کا کیمرا ابھی آن تھا۔ اس کی تمام ریکارڈنگ زین کے پاس جا رہی تھی۔ بلال کے لیے یہ دونوں معاملات اپنی زندگی میں فی الحال سب سے زیادہ اہم تھے۔ اگر وہ تصاویر لیک ہو جاتیں تو اس کی تمام تر سیاسی ساکھ ختم ہو جاتی اور قتل عمد کی ویڈیو بھی منظرِعام پر آتی تو سیاست کے ساتھ زندگی بھی چلی جاتی۔ زبیر احمد نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے تھے کہ وہ داور کے کارندوں سے کس طرح رابطہ کر سکتا ہے اور ان سے ہونے والی ہر پیش رفت کا علم فوراً لگا سکتا ہے۔ خاص طور پر زین نامی لڑکے کے متعلق جو بھی معلومات ملتی جائیں، وہ پہنچاتے رہیں۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد آخر ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ اس نے داور کے نمبر کا ریکارڈ حاصل کیا۔ بلال کی وجہ سے اسے ان معلومات کے حصول کے لیے زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس نے اپنے موبائل سے داور کو کی گئی کالز کی تعداد اور وقت نوٹ کیا۔ خاص طور پر جب اس نے داور کو کوئی خبر پہنچائی تھی تو لازماً بات تھی داور نے اسی کال کے فوراً بعد اپنے کسی کارندے کو کال کی ہوگی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں لڑکیوں اور چاروں لڑکوں کو کامیابی سے ٹریک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس وقت وہ داور کے کسی خفیہ ٹھکانے پر موجود تھے۔ داور نے بلال غوری اور زبیر احمد دونوں کو اپنے اس ٹھکانے کے متعلق کوئی معلومات نہیں دی تھیں۔ زبیر احمد نے کافی غور و خوض کے بعد چار پانچ نمبرز نکال کر علیحدہ نوٹ کر لیے تھے۔ اسے یقین تھا کہ یہ وہی لوگ ہوں گے جو اس وقت داور کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس نے بلال کو تمام تفصیلات کے ساتھ وہ نمبر مہیا کر دیے۔ بلال غوری نے اس سے نمبر لیے اور اپنے پرائیویٹ کیبن میں چلا گیا۔ وہ شاید اکیلے میں ان سب سے بات کرنا چاہتا تھا۔ زبیر احمد ابھی اس بات کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسے داور کی کال آ گئی۔ داور نے اسے بتایا کہ ان چھ افراد سے کوئی خاص کام کی بات نہیں معلوم ہوئی کیونکہ وہ سب اس کے متعلق بہت کم جانتے تھے صرف اس کی ایک دکان اور فلیٹ کا بتایا ہے جس کو میں نے پہلی فرصت میں چیک کروالیا ہے مگر وہ ان دونوں جگہوں پر موجود نہیں۔ وہ چھوڑ کے کہیں جا چکا ہے۔ لیکن اس کے دو کزن کے متعلق معلومات ملی ہیں۔ تم ان کو انٹرنیٹ پر ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ ان میں سے ایک راولپنڈی میں ہی کہیں رہتا ہے اور ایک شاید لاہور میں۔ ہو سکتا ہے ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جانتا ہو کہ زین اس وقت کہاں ہوگا۔ داور نے جو نام لکھوائے تھے ان میں سے ایک عادل تھا اور دوسرا آذان حیدر...... زبیر احمد نے فوراً سے پہلے ان کی تلاش شروع کر دی۔ عادل رضا کی پروفائل جلدی مل گئی تھی مگر وہ بہت خاموش سی پروفائل تھی جس پر کوئی خاص ایکٹیوٹی نظر نہیں آئی نہ ہی لوکیشن کا کوئی اندازہ ہو سکا تھا۔ البتہ آذان حیدر کی پرو فائل میں کافی چیزیں کام کی ملی تھیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ پولیس کے اسپیشل یونٹ میں بھرتی ہو گیا تھا اور ٹریننگ کا آخری سیشن مکمل کرنے اٹک جا رہا تھا اور راستے میں راولپنڈی میں اس کا مختصر قیام بھی تھا۔ اس بات کے قوی امکان تھے کہ وہ زین سے ملے گا یا ملا نہ بھی تو کم از کم رابطہ ضرور ہوگا۔ اس نے یہ بات بلال غوری کو بتانے کے بعد داور کو بتا دی تھی کہ راولپنڈی میں اپنا بندہ تیار رکھو کسی بھی وقت کوئی سراغ ہاتھ آ سکتا ہے۔

☆☆☆

زین کل رات سے ہی بہت بے چین اور پریشان تھا۔ ایک تو بلال کا خوف اس پہ مسلط تھا کیونکہ اس کی شہرت زیادہ اچھی نہیں تھی کہ وہ معاف کرنے والا انسان ہیں۔ اگر زین اس کو تمام کہانی بتا کر تصاویر اور ویڈیوز واپس کر دیتا تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ بلال اسے زندہ یا اپنے پیروں پر واپس جانے دیتا۔ دوسرا اس کے وہ دوست جو اتنی دور سے اس کے پاس آئے تھے، اس نے انہیں صرف ایک پیغام بھیجنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ آج وہ یقیناً آزاد کشمیر پہنچ چکے ہوں گے۔ اس کا پروگرام بن رہا تھا کہ وہ بھی چپ چاپ آزاد کشمیر کی طرف نکل جائے۔ ایک تو وقتی طور پر یہاں سے ایک محفوظ مقام پر چلا جاتا، دوسرا دوستوں کی شکایت کا بھی ازالہ ہو جاتا۔

وہ جانے کی تیاریوں میں مشغول تھا کہ ایک اجنبی نمبر سے کال موصول ہوئی۔ زین نے فی الحال یہ نمبر کسی کو نہیں دیا تھا سوائے اپنے گھر والوں کے تاکہ وہ پرانے نمبر کو بند پا کر کہیں پریشان نہ ہوں یا پھر خاور کو ایک دفعہ پیغام بھیجا تھا۔ اسی شش و پنج میں کہ یہ کون ہو سکتا ہے کال ڈراپ ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے دوبارہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ زین نے

ڈرتے ڈرتے وہ کال موصول کی تو بے اختیار ایک اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ وہ اس کا ماموں زاد کزن آذان حیدر تھا جسے عام طور پر وہ حیدر ہی کہتا تھا۔ اس نے وہ نمبر زین کے گھر والوں سے ہی لیا تھا۔ کیونکہ وہ آج صبح صبح ہی راولپنڈی کی طرف نکلا تھا، اپنی پولیس ٹریننگ کے آخری مرحلے کے لیے۔ اس کا پروگرام تھا کہ راستے میں زین سے ملتا ہوا جائے گا کیونکہ ایک تو ان دونوں کی آپس میں بہت بنتی تھی، دوسرا حیدر اور زین کے بہت سے شوق مشترک بھی تھے۔ اسی وجہ سے باقی تمام کزنز میں ان کی جوڑی کافی مشہور تھی۔ زین نے حیدر سے استفسار کیا کہ وہ راولپنڈی کیا کرنے آرہا ہے؟ کیونکہ اس کو تو آگے آزاد کشمیر کی طرف نکلنا تھا۔ حیدر نے جواباً کہا۔

”بھائی آپ صرف ایک گھنٹا اور انتظار کریں میرا، میں بالکل نزدیک پہنچ چکا ہوں۔“ کوئی اور ہوتا تو زین اسے ٹال دیتا مگر حیدر کی وجہ سے وہ وقتی طور پر رک گیا۔ ویسے بھی ملک ارسلان کی شادی دوسرے دن تھی۔ آج رات تک بھی وہ وہاں پہنچ جاتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ حیدر کو زین کے پاس پہنچتے پہنچتے ایک کے بجائے دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ ٹریننگ کے دوران چونکہ موبائل فون پر پابندی ہوتی ہے اس لیے حیدر کے لیے یہ چھٹیوں کے دن اور سفر اس لحاظ سے بہت کشش رکھتے تھے کہ وہ اپنے موبائل پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرلیا کرتا تھا اور انٹرنیٹ پر بھی خوب آوارہ گردی ہو جاتی تھی۔ وہ بھی زین اور اس کے مشترکہ دوستوں کے ساتھ گروپ میں ایڈ تھا۔ اس لیے اس نے زین کے پاس پہنچنے سے پہلے گروپ میں بتا دیا تھا کہ وہ زین کے پاس جا رہا ہے اور ہوسکتا ہے دوپہر کا کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں۔ زین اس بات سے بے خبر تھا کہ حیدر نے نادانستگی میں اس کے لیے کیا مصیبت کھڑی کردی ہے۔

حیدر نے زین سے ملتے ہی گلہ کیا کہ آپ نے ایک تو فلیٹ تبدیل کرلیا اور دوسرا نمبر بھی نہیں بتایا اپنا۔ زین نے اسے وقتی طور پر یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ وہ فی الحال تھوڑا معاشی تنگدستی سے نبرد آزما ہے اس لیے اسے یہ سب کرنا پڑا اور نمبر دینے کا بھی خیال اسی لیے نہیں آیا کہ وہ کچھ پریشان تھا۔ زین نے اسے سختی سے یہ بھی تاکید کی کہ ابھی کسی دوست کو یا سوشل میڈیا پر میرا نمبر نہیں دینا کسی کو اور نہ ہی بتانا کہ تم میرے ساتھ ہو۔ حیدر کو دال میں کچھ کالا محسوس ہوا۔ وہ زین کو یہ بھی نہ بتا سکا کہ اس نے پہلے ہی یہ خبر سوشل میڈیا پر سب کے گوش گزار کردی ہے۔ لیکن تجسس سے مجبور ہو کے اس نے زین سے پوچھا۔

”بھائی خیریت تو ہے نا؟ کوئی ٹینشن والی بات تو نہیں۔“

زین نے اسے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”نہیں یار، بس ایک لڑکی کا چکر ہے۔ وہ پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ذرا تھوڑے دن سائڈ پر رہوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی۔“

حیدر نے محسوس کرلیا تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے ورنہ زین لڑکیوں سے بھاگنے والا نہیں بلکہ ان کو ڈیل کرنے والا بندہ تھا مگر اس نے اصرار نہیں کیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں ایک مشہور ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلے گئے۔ زین وہاں جانے پر کسی طور راضی نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی فاسٹ فوڈ آرڈر کرتے ہیں، وہ یہیں گھر پر دے جائے گا۔ اور یہاں کھل کے گپ شپ کرتے ہیں مگر حیدر بضد تھا کہ نہیں اسی ریسٹورنٹ میں جانا ہے پچھلی دفعہ بھی اس نے اسی جگہ لنچ کیا تھا اور اس کو وہ ذائقہ ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ مجبوراً زین کو وہاں جانا ہی پڑا۔

حیدر اپنے موبائل پر بہت مصروف نظر آرہا تھا۔ زین نے ایک دفعہ پھر اسے یاددہانی کروائی کہ میرے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ اس نے کہا۔

”آپ مطمئن رہیں آپ کے متعلق کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“ اسی دوران انہوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا تیار ہونے میں بیس سے تیس منٹ لگ جاتے تھے۔ کیونکہ ایک تو رش بہت تھا دوسرا تازہ تازہ ڈشز تیار ہوتی تھیں جن میں وقت صرف ہوتا ہے۔ حیدر اپنی ایک بالکل نئی نئی دوست کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا۔ اس لڑکی نے اسے خود ہی ایڈ کیا تھا اور اس کے متعلق چھوٹی موٹی باتیں پوچھ رہی تھی۔ وہ اسلام آباد کی رہنے والی تھی، اس نے حیدر سے کہا کہ وہ کبھی اس کے شہر لاہور آئی تو ملنے کی کوشش کرے گی۔ حیدر کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے کہا۔

”اگر واقعی آپ ملنا چاہتی ہو تو حکم کرو میں خود اسلام آباد آجاتا ہوں۔“ لڑکی نے جواب میں کہا۔

”بہت فرماں بردار ہیں آپ تو پھر لیکن اگر آپ آج ہی آئیں تو سوچا جاسکتا ہے۔“

حیدر نے خوشی سے جھومتے ہوئے اس پر ایک عظیم راز کھولا کہ وہ اس وقت راولپنڈی میں ہے ادھ تیس منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہے۔

لڑکی تھوڑا گھبرا کے بولی۔ ”اوہ نو...... آپ تو پہلے

سے یہاں موجود ہیں، یہ تو چیٹنگ ہے۔'' ابھی آپ راولپنڈی میں کس جگہ ہیں؟ کیونکہ میں بھی راولپنڈی میں گھر والوں کے ساتھ صدر تک آئی ہوں، شاپنگ کرنے، یہاں پاس ہی آنٹی رہتی ہیں اُن سے بھی ملنا تھا امی کو آج۔''

حیدر نے اسے فوراً بتایا کہ وہ اس وقت کس مشہور ریسٹورنٹ میں کھانے کا انتظار کر رہا ہے اور وہ چاہے تو یہاں آسکتی ہے۔ اسے معلوم تھا ابھی اتنی جلدی اس نے آنا ہے نہ ہی وہ اسے بلائے گی مگر بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ ایک بوائے اسکاؤٹ تھا۔ پولیس میں بھرتی ہونے والا نیا نیا جوان...... اس لیے وہ ابھی زندگی اور لوگوں کے معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا چن دیا گیا۔ حیدر نے اپنی دوست کو انتظار کا کہا کیونکہ وہ کھانے کو انتظار کروانے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ حسب معمول وہ کھانا بہت شاندار اور ذائقے والا تھا۔ زین نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی نظریں چاروں طرف گردش بھی کر رہی تھیں کہ کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آجائے۔ حیدر نے کھانا کھانے کے دوران جی بھر کے تعریف کی اور خوب انصاف کیا کھانے کے ساتھ۔ آخر ان کا کھانا ختم ہوا اور وہ دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ اب حیدر کو آگے کی بس پکڑنی تھی اور زین کو اپنے فلیٹ پر جانا تھا۔ اتفاق سے دونوں کی منزل کافی قریب تھی اس لیے دونوں نے سامنے کھڑی ایک ٹیکسی کو آواز دے کر بلایا۔ اسے بس اسٹینڈ سے ہوتے ہوئے زین کے فلیٹ تک جانے کا کرایہ پوچھا جو اس نے انتہائی مناسب بتایا، وہ بخوشی ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ان کے دل میں اس ٹیکسی ڈرائیور کے لیے متشکرانہ جذبات پیدا ہوئے جو عام لوگوں کی ...طرح مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ ایمانداری سے کام کرتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور عام راستہ استعمال کر رہا تھا اس لیے ان دونوں نے کسی بھی لمحے کے لیے اس کو مشکوک نہیں سمجھا۔ حیدر اپنے موبائل فون میں دوبارہ مگن ہو چکا تھا، جبکہ زین خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا جا رہا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا جناب جلدی تو نہیں میں پیٹرول ڈلوالوں آگے ایک پیٹرول پمپ آرہا ہے۔ حالانکہ پیٹرول ان دنوں پاکستان میں کسی خوش نصیب کو ہی ملتا تھا لیکن اس طرف ان دونوں کا دھیان ہی نہیں گیا۔

''ہاں کوئی مسئلہ نہیں، ہمیں کوئی خاص جلدی نہیں ہے۔'' حیدر فوراً ہی بول اٹھا۔ ساتھ ہی وہ دوبارہ اپنے موبائل کی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے آگے الٹے ہاتھ پر واقع ایک پیٹرول پمپ پر ٹیکسی روک دی۔

موسم خوشگوار تھا اس لیے دونوں نے اپنی اپنی سائڈ کے شیشے تھوڑے تھوڑے نیچے کیے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ اور ٹھنڈی ہوا دونوں کے حسین امتزاج سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حیدر موبائل فون پر مصروف ہونے کے سبب اور زین بے دھیانی میں یہ غور نہیں کر سکا کہ یہ پیٹرول پمپ فی الحال بند ہے اور تعمیر کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے۔ یہ ان کو تب احساس ہوا کہ کچھ تو گڑ بڑ ہے، جب دونوں طرف کے شیشوں سے کوئی انتہائی زود اثر مائع ان کے چہرے پر اسپرے کیا گیا۔ جس نے دس سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں دونوں کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے وہاں موجود ایک اور شخص کی مدد سے ان دونوں کو ایک وین میں منتقل کیا۔ یہ ایک طاقتور ڈبل کیبن گاڑی تھی اور اس کے شیشے بھی کلرڈ تھے۔ پھر وہی ٹیکسی ڈرائیور ان دونوں کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ اس کا رخ آزاد کشمیر کی طرف تھا۔ کیونکہ آخری اطلاع کے مطابق سب کو وہاں موجود ایک خفیہ ٹھکانے پر بلایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سب سے اہم بندہ لگا تھا اس لیے اس کا چہرہ جوش اور طمانیت سے لبریز تھا۔ یہ داور کے گینگ میں حال ہی میں شامل ہوا تھا اور منظور عرف موجو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس نے داور کو اطلاع دینے کی غرض سے فون نکالا ہی تھا کہ اسے کسی اور نمبر سے کال آنا شروع ہو گئی۔ اس نے کال اٹینڈ کی اور کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ زین اور حیدر پچھلی نشستوں کے درمیان رسیوں میں جکڑے آڑے ترچھے پڑے تھے۔

☆☆☆

داور نے زین کے دوستوں سے لی ہوئی معلومات زبیر احمد تک پہنچا دی تھیں۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ معلومات کسی کام آسکیں گی۔ کیا زین کے دونوں کزنز جانتے ہوں گے کہ وہ کہاں ہوگا اس وقت؟

اس کے بندے اسلام آباد اور راولپنڈی میں نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسے زین کو ڈھونڈنے کی جلدی بلال غوری کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کے پاس موجود معلومات یا کسی ایسی چیز کے لیے تھی جس کی وجہ سے بلال نے زین کو زندہ پکڑنے کے لیے کہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا داور کی بے چینی اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ریاض کو اس نے

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جنت کے پتے
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
مصحف
نمرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
نمل
نمرہ احمد
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
آبِ حیات
عمیرہ احمد
WWW.PAKSOCIETY.COM
ہم سفر
فرحت اشتیاق
داستان ایمان فروشوں کی
جلد اول
التمش
بن روئے آنسو
فرحت اشتیاق
www.paksociety.com
عبداللہ
ہاشم ندیم
پیرِ کامل
عمیرہ احمد
متاعِ جاں ہے تو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
من و سلویٰ
Man-o-Salwa
عمیرہ احمد
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو
فرحت اشتیاق
WWW.PAKSOCIETY.COM
خدا اور محبت
ہاشم ندیم
بارم
شمیرا حمید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
ٹوٹا ہوا تارہ
سمیرا شریف طور
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
قراقرم کا تاج محل
نمرہ احمد

آج صبح ہی واپس بھیج دیا تھا کیونکہ اس کے پاس کوریئر کمپنی کی گاڑی تھی وہ اسے دن میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ باقی اس کے ساتھ تین ساتھی اور سارہ ابھی بھی موجود تھے۔ سارہ مسلسل اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی مگر داور کی بے چینی کم نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک داور سارہ کے پہلو سے اٹھا اور اسی کمرے کی طرف آگیا جہاں اس نے سب کو بند کر کے رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پستول تھامتے ہوئے دروازہ کھولا۔ کمرے میں موجود سبھی لوگ چوکنا ہو گئے۔ داور کی نظر دونوں لڑکیوں پر جمی ہوئی تھی۔ اچانک داور آگے بڑھا اور جا کر عائشہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے کھینچنے لگا۔ وہ مسلسل چلّانے اور ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ سوہا کا رنگ بھی ایک دم ہی پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی زبان اور حلق دونوں خشک ہو گئے تھے۔ وہ کوئی آواز تک نہ نکال سکی۔ لیکن ملک ارسلان اور اس کے تینوں دوستوں کے لیے یہ کوئی قابلِ قبول حرکت نہیں تھی۔ سب سے پہلے اظہر نے کہا۔

”دیکھو تم جو بھی ہو، تم نے جو کہا ہم نے وہ کیا اور ساری معلومات بھی تم کو بتا دیں مگر تم اپنی زبان سے پھر رہے ہو، لڑکی کو چھوڑ دو۔“ ملک ارسلان پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا، اس نے بھی کہا۔

”تم اس کمرے سے لڑکی کو نہیں لے کر جا سکتے، یہ یہاں ہمارے ساتھ رہے گی۔“

داور نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ”میں تم سے اجازت لینے نہیں آیا، یہاں میں جو چاہتا ہوں، کرتا ہوں اس لیے تم چوزوں کے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اپنی چونچیں بند رکھو ورنہ مجھے اچھی طرح سے بند کرنی آتی ہیں۔“

اس نے عائشہ کو دوبارہ باہر لے جانا چاہا تو اس دفعہ جمیل اور خاور بھی درمیان میں آگئے۔ وہ داور کی نیت کو سمجھ چکے تھے اور ان سب کی غیرت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ داور کو اس کے مکروہ عزائم میں کامیاب ہونے دیں۔ داور کے ہاتھ میں پستول بدستور موجود تھا۔ وہ کل چھ افراد تھے جن میں دو لڑکیاں بھی تھیں مگر داور کا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس قدر گھٹیا، خطرناک اور مکار شخص ہے۔ وہ صرف سارہ اور داور کو ہی دیکھ رہے تھے۔ داور کے باقی تینوں ساتھیوں میں سے ایک کی ڈیوٹی گیٹ پر تھی اور باقی دو ساتھی باہر رہتے ہوئے مسلسل گیسٹ ہاؤس کی نگرانی کر رہے تھے۔ یعنی ایک طرح سے فی الوقت تین افراد ہی گیسٹ ہاؤس میں موجود تھے اور ان میں سے بھی ایک گیٹ پر موجود تھا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

ملک ارسلان نے کسی کو بتائے بنا ایک لائحہ عمل تیار کر لیا تھا اور وہ بہت بڑا رسک لینے جا رہا تھا۔ اگر اس بات کی بھنک بھی کسی کو پڑ جاتی تو وہ کبھی اسے ایسی حماقت نہ کرنے دیتے۔ داور نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

”آخری دفعہ کہہ رہا ہوں، چپ چاپ پیچھے ہو کر بیٹھ جاؤ ورنہ دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔“ عائشہ اس کی گرفت میں مسلسل مچل رہی تھی اور اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان سب کا داور سے فاصلہ سات فٹ کے قریب تھا۔ داور کی نظر ان سب کے چہروں پر تھی جو غصے اور جوش کے سبب سرخ ہونے لگے تھے۔ داور کو عائشہ کے چیخنے چلانے سے کوفت ہو رہی تھی اس نے ایک زوردار تھپڑ عائشہ کے گال پر دے مارا اور بولا۔

”خاموش ہو کر چپ چاپ ساتھ چلو ورنہ یہیں سب کے سامنے منورنجن شروع کر دوں گا۔“ عائشہ کو اپنے منہ میں نمکین خون کا ذائقہ محسوس ہوا ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ جس لمحے داور نے عائشہ کو تھپڑ مارا تھا، اس کی توجہ وقتی طور پر ان سب سے ہٹ گئی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ملک ارسلان نے چنگاڑتے ہوئے داور پر چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ داور کو لیتا ہوا سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہاں پر موجود سب لوگ مارے حیرت اور خوف کے گنگ ہو کر رہ گئے مگر پھر جیسے اچانک ہی انہیں ہوش آ گیا تھا۔

داور اور ملک ارسلان ایک دوسرے کی گردن دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ داور کی طاقت اور تجربہ ملک ارسلان سے کہیں زیادہ تھا اس لیے وہ ملک ارسلان پر حاوی آ چکا تھا۔ دیوار میں ٹکر لگنے سے پستول داور کے ہاتھ سے چھوٹ کے دور جا گرا تھا۔ اس دوران سارہ پتا نہیں کہاں کھسک گئی تھی بجائے وہ داور کی مدد کرتی وہ غائب ہو چکی تھی۔ یہ منظر دیکھ کو خاور کا لہو بھی جوش مارنے لگا۔

اس نے ایک ہی جست میں داور کے ہاتھ سے نکلے ہوئے پستول کو اپنے قبضے میں کیا۔ اظہر اور جمیل نے بھی اس دوران میں عائشہ کو واپس سوہا کے پاس بٹھا دیا اور داور کے مقابلے میں ملک ارسلان کی مدد کرنے لگے۔ داور ایک ساتھ تینوں کو نہیں سنبھال سکتا تھا لیکن پھر بھی اس نے ان تینوں کو اچھی خاصی ضربیں لگا دی تھیں۔ خاور نے پستول ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اس کا میگزین چیک کیا اس میں سات عدد گولیاں موجود تھیں۔ اس نے دوبارہ میگزین چڑھا کر سیفٹی کیچ کھولا اور پستول لوڈ کر کے داور کی گردن پر رکھ دیا۔ ”بس۔ اب اور نہیں۔ تم ذرا بھی ہلے تو سات کی سات گولیاں تمہاری گردن میں اتار دوں گا۔“ خاور نے کانپتے لہجے میں کہا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک پیشہ ور غنڈے کے سر پر پستول رکھ کر اسے ایسا حکم دے رہا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا مگر کوئی تجربہ کار شوٹر بھی نہیں تھا۔ داور کو لگ رہا تھا کہ اس کے کانپتے ہاتھوں سے کہیں ٹریگر نہ دب جائے اس لیے وہ سائڈ پر ہو کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی......

اس کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ پستول چلانا اس لڑکے کی بس کی بات نہیں۔ ہاں غلطی اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے گولی چلنے کے امکانات روشن تھے۔ خاور نے ملک ارسلان، اظہر اور جمیل کو کہا کہ دونوں لڑکیوں کو لے کر گیٹ کی طرف چلو۔ ملک ارسلان ابھی تک ہانپ رہا تھا اور اس کی سانس بمشکل بحال ہوئی تھی۔ وہ داور کے ہاتھوں مرحوم ہونے سے بال بال بچا تھا۔

انہوں نے داور کو کمرے میں بند کر کے کمرا لاک کیا۔ اظہر اور جمیل عائشہ اور سوہا کو لے کے آگے بڑھے جبکہ ملک ارسلان اور خاور سب سے پیچھے آ رہے تھے۔ ابھی وہ مین لاؤنج سے گزر ہی رہے تھے کہ خاور اور ملک رسلان نے اپنی گردنوں پر لوہے کا ٹھنڈا لمس محسوس کیا۔ انہوں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو دو عدد خوفناک آٹومیٹک رائفلز کا دہانہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ داور کے وہ ساتھی تھے جو گیسٹ ہاؤس کے باہر نگرانی کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ اور ان کو غالباً سارہ ہی لے کر آئی تھی کیونکہ اس وقت وہ ان دونوں کے بالکل عقب میں موجود تھی۔ ان میں سے ایک کے کہنے پر خاور نے چپ چاپ پستول اس کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں کو رکتا دیکھ کر باقی چاروں نے بھی مڑ کر دیکھا تو انہیں اپنی جان پھر سے شکنجے میں نظر آئی۔ وہ بھاگنا بھی چاہتے تو نہیں بھاگ سکتے تھے کیونکہ دس سے بارہ گز کا فاصلہ گولیاں پلک جھپکنے سے پہلے ہی طے کر لیتی ہیں۔ وہ ہارے ہوئے جواریوں کی طرح دوبارہ سر جھکا کر کمرے کی طرف چل دیے۔ جہاں انہوں نے داور کو بند کیا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی داور کو ان کی شکلوں پر مایوسی نظر آئی اور ساتھ ہی سارہ اور اپنے دونوں ساتھیوں کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی سمجھ میں فوراً ساری بات آ گئی۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا اور اپنے ایک ساتھی سے پستول جھپٹ لیا۔ اس کی خونخوار نظریں ملک ارسلان پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ ملک ارسلان نے ہی اس پر حملہ کرنے کی جرأت کی تھی۔ اس نے پستول کا رخ ارسلان کی طرف کر دیا۔ سب کا چہرہ خوف سے

سفید پڑ گیا تھا کہ اب شاید ہم سب کی جان جائے یا کم از کم ملک ارسلان کو تو وہ نہیں چھوڑے گا لیکن پھر اچانک اس نے پستول کا رخ نیچے کیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کہا۔

’’اس لڑکی یعنی عائشہ کو میرے کمرے میں لے کر آؤ اور کوئی بھی بیچ میں آنے کی کوشش کرے تو بے شک گولی مار دینا۔‘‘

یہ صورتِ حال پہلے سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوگئی تھی۔

داور کے دونوں ساتھیوں نے عائشہ کو گن پوائنٹ پر کھڑا کیا، وہ کمرے سے باہر کی طرف چل دیے۔ عائشہ ایسے چل رہی تھی جیسے کوئی زندہ لاش چل رہی ہو۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس دفعہ اس نے شور مچایا نہ ان میں سے کسی کی طرف دیکھنا گوارا کیا، وہ خاموشی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی کمرا لاک ہونے کی آواز آئی۔ وہ سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے اور سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ سوہا کا حال سب سے برا تھا، وہ برابر ہچکیوں سے رو رہی تھی...... ان سب کا خون کھول رہا تھا ایسی بے بسی پر۔

داور کے ساتھی عائشہ کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر واپس اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف نکل گئے۔ داور نے عائشہ کو دیکھا جو بالکل سفید لٹھے کی طرح ہو رہی تھی لیکن اس پر شیطان سوار تھا۔ اس نے اس کی خاموشی یا حالت کو نظر انداز کر دیا اور کھینچ کر بیڈ پر پھینک دیا۔ عائشہ کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ داور ابھی عائشہ کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اس کا موبائل فون گنگنانے لگا، اس نے ناگواری سے فون نکال کر دیکھا، یہ زبیر احمد کی کال تھی۔ اس نے بیزاری سے پوچھا۔

’’اب کیا ہو گیا ہے؟ کبھی تو سکون سے کوئی کام کرنے دیا کرو۔‘‘ جواب میں زبیر احمد نے کہا۔

’’ٹھیک ہے پھر تم سکون سے کام کرو، کیونکہ زین اس وقت راولپنڈی کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا ہے۔ تم اگر مصروف ہو تو پھر کسی دن اٹھا لینا اُسے۔‘‘ یہ سنتے ہی داور اچھل پڑا اور فوراً بولا۔

’’یار کیوں مذاق کرتے ہو، بتاؤ اس کی لوکیشن کیا ہے؟ میں ابھی اپنے بندوں کو بھیجتا ہوں۔‘‘ زبیر احمد نے جیسے ہی ریسٹورنٹ کا نام اور پتا بتایا، داور نے فوراً راولپنڈی میں موجود اپنے ایک نئے ساتھی منظور عرف موجو کو ساری تفصیل سمجھا کر بھیج دیا۔۔۔ وہ عائشہ کو کمرے میں چھوڑ کر باہر آگیا۔۔۔ اس نے سارہ کو کہا فی الحال وہ عائشہ کو واپس ان کے پاس چھوڑ آئے۔ کیونکہ لگتا ہے جلد ہی کوئی بڑی خبر ملنے والی ہے۔ آخر ایک گھنٹے کے بعد موجو کی دوبارہ کال آئی تو اس نے داور کو کامیابی کی خبر سنائی۔ داور خوشی سے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے موجو کو کہا تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں آزاد کشمیر پہنچے۔ اس نے موجو کو سارے راستے کی تفصیلات سمجھا دی تھیں۔ اُدھر کمرے میں عائشہ کی اتنی جلدی واپسی متوقع نہیں تھی اس لیے وہ سب بہت حیران اور خوش بھی ہوئے کہ وقتی طور پر ہی یہ خطرہ ٹل تو گیا۔ عائشہ نے سب کو بتایا کہ لگتا ہے زین ان کے ہاتھ لگ گیا ہے یا لگنے والا ہے۔ کیونکہ داور نے فون پر اس کے سامنے جو بات کی تھی اس سے اسے یہی سمجھ آئی تھی۔ وہ یہ سن کر متفکر ہو گئے لیکن ایک طرح کی طمانیت بھی تھی کہ شاید اب ان کو چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

پہاڑی علاقہ شروع ہوتے ہی گاڑی کو کافی جھٹکے لگ رہے تھے۔ روڈ تو کسی حد تک ٹھیک تھا لیکن کبھی کبھار بیچ میں کوئی کھڈا یا سڑک کا ایسا ٹکڑا آجاتا تھا جو کسی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔ منظور عرف موجو پھر بھی مسلسل ڈرائیونگ کر رہا تھا، اسے آزاد کشمیر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے وہ راستے کی خستہ حالی کو نظر انداز کر رہا تھا۔ زین اور حیدر بدستور دونوں سیٹوں کے درمیان انٹا غفیل پڑے تھے۔ ایک جگہ اچانک سامنے ایک بہت بڑا کھڈا آنے کی وجہ سے گاڑی کو شدید جھٹکا لگا۔ ڈبل کیبن ایک لمحے کے لیے بے قابو ہو گئی اور سڑک سے نیچے کھائی کی طرف جانے ہی والی تھی کہ موجو نے اسے بمشکل کنٹرول کر لیا۔ لیکن اسی دوران سیٹوں کے درمیان پڑے ہوئے زین کا سر سیٹ فریم کے ایڈجسٹنگ بولٹ سے ٹکرایا جو کافی حد تک باہر کو نکلا ہوا تھا۔ درد کی شدید لہر اسے بے ہوشی کی کیفیت سے باہر لے آئی۔ زین نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور اٹھنا چاہا تو اسے پتا لگا، اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کو بندھے ہوئے ہیں اور ٹانگیں بھی آزاد نہیں۔ ساتھ ہی دوسرے رخ پر اس کا ماموں زاد کزن آذان حیدر بھی بالکل اس کی طرح پابند رسن اوندھا پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو زین لیٹے لیٹے گہرے سانس لیتا رہا اور اپنی توانائی بحال کی۔ پھر اس نے حیدر کے بازو پر زور سے دانت گاڑ دیے، تکلیف محسوس کرتے ہی حیدر میں بھی بیداری کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ حیدر کے مکمل

ہوش میں آنے سے پہلے ہی زین نے اس کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔ ”خاموش رہنا، ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔“ یہ سنتے ہی حیدر کو جیسے اچانک ساری باتیں یاد آ گئی تھیں کہ کس طرح وہ کھانا کھا کر نکلے تھے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھے تھے پھر اسی ٹیکسی میں ان پر کوئی اسپرے کیا گیا تھا جس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ پولیس کی ٹریننگ لے چکا تھا اور اب آخری سیشن کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے اندر روایتی پولیس والوں کی طرح شکوک و شبہات اور اندیشے جنم لینا شروع ہو گئے۔ مگر یہ صورت حال زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی۔ زین نے اسے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ دانتوں سے اس کی رسی کھولنے کی کوشش کرو۔ موجو کا سارا دھیان اس وقت ڈرائیونگ پر تھا۔ کیونکہ گاڑی اب خطرناک چڑھائیوں اور ڈھلانوں سے گزر رہی تھی۔ ویسے بھی اسے امید نہیں تھی کہ اگلے دو تین گھنٹے دونوں کو ہوش آئے گا اس لیے وہ پورے اطمینان سے گاڑی چلا رہا تھا۔

زین کا اشارہ سمجھتے ہی حیدر نے اثبات میں سر ہلایا اور زین کی طرف رخ کر کے اس کے ہاتھ کی بندھی ہوئی رسیوں پر دانتوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ نائیلون کی باریک رسی تھی جو ان دونوں کے بازوؤں میں تقریباً پیوست ہو رہی تھی۔ اور اس کی بندشیں اور بھی زیادہ مضبوط اور باریک تھیں۔ اس لیے حیدر تھوڑی ہی دیر میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ حالانکہ یہاں موسم کافی حد تک خنک تھا مگر وہ جس زاویے سے آدھا ٹوئسٹ ہو کر یہ کوشش کر رہا تھا، وہ بہت دقت کا کام تھا۔ حیدر کو محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس کا کوئی دانت ٹوٹ جائے گا یا پھر ان میں سے خون رسنے لگے گا۔ لیکن وہ اپنی بقا کی جنگ سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک وہ رسیوں سے زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر ان کو محسوس ہوا کہ گاڑی ذرا آہستہ ہوئی ہے اور موجو کا ہاتھ ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر گیا ہے۔ وہ دونوں فوراً آنکھیں بند کر کے اسی حالت میں لیٹ گئے۔ یہاں تھوڑا راستہ سیدھا تھا اس لیے موجو نے ان پر ایک نظر ڈالنے کی تکلیف کر لی تھی۔ کوئی غیر معمولی بات نہ پا کر اس نے دوبارہ گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ حیدر اور زین دونوں کو جب اطمینان ہو گیا کہ موجو اب پیچھے نہیں جھانک رہا تو انہوں نے دوبارہ سے اپنی کوشش شروع کر دی۔

زین کی رسی کافی حد تک ڈھیلی ہو چکی تھی لیکن کھلی ابھی تک نہیں تھی۔ دس منٹ کی مشقت کے بعد زین کے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ لیکن رسی میں بندھے رہنے کی وجہ سے اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ کسی کام کے نہیں رہے۔ کچھ دیر میں ہاتھوں میں خون کی گردش رواں ہوئی تو اس نے حیدر کی رسیوں کو لیٹے لیٹے کھولنا شروع کر دیا۔ اسے وہ رسیاں ہاتھ سے کھولنے میں اتنی مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا حیدر کی کتنی ہمت ہے جو اس نے دانتوں سے وہ رسیاں کھول لی تھیں۔ آخر ان دونوں کے ہاتھ آزاد ہو گئے لیکن پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ اس کے لیے یا تو ایک بندہ دوسری طرف جاتا یا پھر پاؤں سمیٹ کر اپنی طرف لائے جاتے۔ لیکن جگہ کی تنگی کے باعث یہ دونوں کام مشکل نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں نے فی الحال پاؤں کھولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ گاڑی میں بھاگنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

زین نے لیٹے لیٹے نظر دوڑائی تو سیٹوں کے نیچے پرانے اور زنگ آلود کچھ پرزے پڑے ہوئے تھے انہی کے درمیان اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ ایک جیک رینچ تھا جو جیک کی ایڈجسٹمنٹ کے کام آتا تھا...... حیدر سمجھا کہ شاید زین یہ اس کے سر پر مارنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے اس نے زین کو آنکھوں میں تنبیہ کی کہ وہ ایسا نہ کرے ورنہ گاڑی بے قابو ہو کر سڑک سے نیچے پہاڑوں کی گہرائی میں جا سکتی ہے۔ زین نے اسے سمجھا دیا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ زین برق رفتاری سے اٹھا اور موجو کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ کر جیک رینچ اس کی گردن سے لگا دیا اور کہا۔ ”چپ چاپ گاڑی روک دو ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ تم لوگوں کو تو تلاشی لینا بھی نہیں آتی ورنہ میرا پنڈلی پہ بندھا ہوا پستول تم ایسے ہی نہ چھوڑ دیتے۔“

موجو نے ٹھنڈے لوہے کا لمس اپنی گردن پر محسوس کر لیا تھا۔ اس کے ہاتھ اس اچانک افتاد پر اسٹیئرنگ پر بہک گئے اس لیے گاڑی پھر ایک دفعہ بے قابو ہوتے ہوتے بچ گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو زین نے رینچ اس کی گردن میں گھسا دیا اور کہا۔ ”کوئی ہوشیاری نہیں۔“ موجو اپنے ساتھی کو کوس رہا تھا کیونکہ اس نے ہی ان دونوں کی تلاشی لی اور رسیوں سے باندھا تھا۔ اب نہ صرف وہ بندشوں سے آزاد تھے بلکہ ان کے پاس بظاہر پستول بھی موجود تھا۔ زین کے کہنے پر موجو نے کافی سائڈ پر کر کے گاڑی روک لی۔ زین نے حیدرر کو اشارہ کیا تو اس نے فوراً زین کے اور اپنے پاؤں آزاد کروائے۔ پھر حیدر دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ والی سائڈ پر آ گیا۔ اس نے موجو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کی بیٹھے بیٹھے تلاشی لی اور اس کے پاس موجود موبائل فون، نقدی اور ایک عدد پستول اپنے قبضے میں لے لیا۔ پھر وہ اسی طرح واپس پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ زین نے موجو سے پوچھا۔

''اب بتاؤ ہمیں کہاں اور کس کے کہنے پر لے کر جا رہے ہو؟''

موجو خاموش رہا تو پیچھے سے حیدر کا ایک زبردست تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ حیدر کی سخت انگلیاں اس کے چہرے پر ثبت ہو گئیں۔ موجو کا پستول اب ان کے قبضے میں تھا۔ موجو بتانے میں پس و پیش سے کام لے رہا تھا جب حیدر نے دوبارہ اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا مگر وہ بدستور خاموش رہا۔ حیدر غضبناک ہو کر آگے والی سیٹ پر چلا گیا۔ موجو خوف زدہ نظروں سے حیدر کو دیکھ رہا تھا کیونکہ حیدر کے تیور انتہائی جارحانہ تھے۔ اگلی سیٹ پر آتے ہی حیدر نے موجو کا سر زور سے اسٹیئرنگ وہیل سے دے مارا۔ موجو کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ حیدر نے اس کو بالوں سے پکڑ کر دو تین مزید جھٹکے دیے۔ موجو کی برداشت کمال کی تھی کیونکہ وہ ہنوز چپ تھا۔ زین کو کوفت ہو رہی تھی۔ وہ بے شک سڑک سے کافی ہٹ کر رکے ہوئے تھے لیکن کسی بھی وقت وہاں کوئی آ سکتا تھا اور وہ دونوں یہ معاملہ جلد ختم کرنا چاہ رہے تھے۔ زین سے رہا نہیں گیا۔ اس نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا کر موجو کی طرف تان دیا اور کہا ''جو پوچھ رہے ہیں بتا دو ورنہ یہاں گولی مار کر نیچے کھائی میں پھینک دیں گے''۔ موجو اس سے پہلے کوئی جواب دیتا، حیدر نے اس کا الٹا ہاتھ پکڑ کر اس کی درمیان والی انگلی توڑ دی۔ درد کی شدت سے موجو کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے ہتھیار ڈالنے والے انداز میں کہا۔

''مجھے صرف تم دونوں کو ایک جگہ پر پہنچانے کا کہا گیا تھا، کس کے حکم پر یہ مجھے نہیں بتایا گیا۔''

موجو نے ان دونوں کو داور کے متعلق بتا دیا اور یہ بھی کہ وہ کون سے گیسٹ ہاؤس میں لے کر جا رہا تھا۔ لیکن اس نے ان دونوں کو یہ نہیں بتایا کہ یہاں آنے سے پہلے اس کی فون پر کس سے بات ہوئی ہے اس لیے وہ صرف داور اور اس کے نامعلوم ساتھیوں سے نمٹنے کا سوچنے لگے۔ اسی دوران حیدر کو خیال آیا کہ اسے اب تک اپنی ٹریننگ اکیڈمی میں پہنچ کر رپورٹ کرنا تھا ورنہ اس کو غیر حاضر تصور کیا جاتا جو کہ ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اس نے موجو سے لیا ہوا موبائل دیکھا جس میں ابھی تک چارجنگ موجود تھی اور یقینی طور پر کریڈٹ بھی تھا۔ اس نے اپنے سیکیورٹی سپروائزر کو کال کر کے ساری کہانی بتائی کہ کس طرح وہ اغوا ہو کر آزاد کشمیر جا پہنچا ہے اور اس کے ساتھ اس کا کزن بھی ہے اور آگے مزید لوگ بھی ہیں جو اُن کی راہ تک رہے ہیں۔

سپروائزر نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ وہاں کے مقامی پولیس تھانے یا یونٹ کو کال کرتا ہے وہ اس کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کافی حوصلہ افزا بات تھی کیونکہ یہ دونوں خود کو موجو اور اس کے نامعلوم ساتھیوں کے مقابلے میں کمزور محسوس کر رہے تھے اس کی ایک وجہ تو پورے ہتھیاروں کا نہ ہونا اور دوسری وجہ تعداد میں کمی تھی۔ انہوں نے موجو کو بالکل اسی طرح پابند رسن کر دیا جیسے وہ پہلے خود تھے اور پھر پچھلی سیٹوں کے درمیان دھکیل دیا۔ اب زین اور حیدر دونوں کو مدد کا انتظار تھا۔ اس میں پتا نہیں کتنا وقت لگ جاتا اس لیے انہوں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا تا کہ گزرنے والوں کو یہی گمان ہو کہ کسی خرابی کے سبب کھڑے ہیں۔ گاڑی کے شیشے چونکہ کالے کیے ہوئے تھے اس لیے اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ اندر پڑا ہوا موجو کسی اور کی نظروں میں آ سکتا ہے۔ اس کی آواز نکلنے کے بھی چانس صفر فیصد سے زیادہ نہیں تھے کیونکہ حیدر نے .... ڈیش بورڈ میں پڑا صفائی کرنے والا کپڑا موجو کے منہ پر باندھ دیا تھا۔ اب وہ غوں غاں کے سوا کوئی آواز نکالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ان کی توقع کے برعکس ایلیٹ فورس کے جوانوں کی ایک گاڑی ایک گھنٹے سے بھی پہلے ان تک پہنچ گئی۔ اس میں کل چار لوگ تھے ایک ڈرائیور اور باقی تینوں چاق و چوبند جوان جن کے پاس آٹومیٹک اسالٹ رائفلز، ماؤزر اور چھوٹے ہینڈ گرینیڈز بھی شامل تھے۔ انہوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ وہ بنا کسی تردّد یا ہچکچاہٹ کے حیدر کی طرف آئے اور پوچھا۔ ''کیا آپ ہی آذان حیدر ہو۔'' جواب میں حیدر نے ہاں میں سر ہلایا تو انہوں نے موجو کے بارے میں استفسار کیا۔ حیدر کے بتانے پر انہوں نے گاڑی میں دیکھا اور موجو سے مزید تفتیش کرنے لگے تا کہ وہاں کارروائی کرنے کے دوران انہیں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو۔ وہ بہت پروفیشنل انداز میں معاملات ہینڈل کر رہے تھے۔ موجو نے کچھ مزید انکشافات کیے تھے اور اپنے ساتھیوں کی تعداد اور اسلحے کا بتا دیا تھا حالانکہ اسے یہ سب معلوم نہیں تھا لیکن اندازاً وہ یہ سب بتا رہا تھا۔ ایک تو وہ مزید تشدد برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھا اور دوسرا اسے وقت درکار تھا جو صرف تعاون کرنے کی صورت میں ہی مل سکتا

تھا۔

ان چاروں نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ زین اور حیدر کو انہوں نے کہا کہ آپ دونوں موجو کے ساتھ اسی کی گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ پچھلی نشست پر ان کے ساتھ سیف نامی جوان بیٹھ گیا اور باقی اپنی اسی جیپ میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی موجو کو بٹھایا گیا تھا اور اسے یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ ان دونوں کو پکڑ کے لے آیا ہے۔ اس لیے بظاہر ان دونوں کے ہاتھ دوبارہ رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔ گاڑی کے شیشے کالے ہونے کی وجہ سے امید نہیں تھی کہ سیف کو دور سے دیکھ لیا جائے گا۔ ویسے بھی دوسرے لوگ جیپ پر ان کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ موجو کا حلق خشک ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا اور وہ آنے والے لمحات کا سوچ کر فکر مند ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی پُرامید بھی تھا۔

☆☆☆

داور بڑی بے صبری سے موجو کا انتظار کر رہا تھا۔ ”اب تک موجو کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ سارہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر داور کی بے چینی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس سے رہا نہیں گیا تو اس نے فون اٹھا کر موجو کا نمبر ملایا۔ موبائل کی گھنٹی پانچویں چھٹی مرتبہ بجی تو موجو لائن پر موجود تھا۔ ”جی داور بھائی حکم کریں۔“

داور نے کہا۔ ”تمہیں اب تک یہاں میرے پاس ہونا چاہیے تھا، اتنی تاخیر کیوں کر دی؟“

”بس وہ راستے میں ٹریفک بہت بری طرح جام تھی اور گاڑی بڑی احتیاط سے چلانی پڑ رہی ہے اس لیے میں ذرا لیٹ ہو گیا۔ لیکن تیس چالیس منٹ تک میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہو۔“ موجو نے روانگی میں تاخیر ہونے کی معقول وجہ بتائی تو داور کو تھوڑا سا قرار آیا۔ فون بند ہوا تو موجو کی کنپٹی پر رکھا پستول سیف نے ہٹا لیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ داور کا فون اسی وقت آیا تھا جب فورس کے بندوں نے سب معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے ورنہ ہو سکتا تھا کہ زین یا حیدر کے ہوتے ہوئے موجو داور کو کوئی اشارہ دے دیتا یا چالاکی دکھا جاتا اور وہ ہوشیار ہو جاتا۔

داور نے باہر موجود دونوں بندوں کو چوکنا رہنے کا کہا اور گیٹ پر موجود گارڈ کو بھی۔ اپنے پاس بھی ہتھیار وغیرہ چیک کر چکا تھا۔ اب اسے موجو کا انتظار تھا۔ وہ اپنی کامیابی کے نشے میں دل ہی دل میں جھوم رہا تھا جب اسے زبیر احمد کی کال موصول ہوئی۔

زبیر نے اس سے پوچھا کہ بلال نے زین کے متعلق پوچھا ہے کیا نئی خبر ہے۔ ”زین اور اس کا کزن شاید کسی اور ریسٹورنٹ میں تھے یا پھر وہ وہاں سے نکل گئے تھے۔ کیونکہ میرے آدمی جب وہاں پہنچے تو ان کو دونوں میں سے کوئی بھی وہاں نظر نہیں آیا۔“ داور کمال سادگی سے جھوٹ بول رہا تھا۔

زبیر احمد نے جواب میں کہا۔ ”جیسے ہی کوئی اطلاع ملتی ہے یا پیش رفت ہوتی ہے، ہم کو فوراً بتایا جائے۔“ داور نے اثبات میں جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ وہ بلال کی بے چینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ زین اب سے صرف بیس پچیس منٹ کے فاصلے پر تھا لیکن اس نے جھوٹ بول کر ٹال دیا تھا۔ اسی دوران میں اسے باہر موجود ساتھیوں سے علم ہوا کہ ایک ڈبل کیبن جیپ گیسٹ ہاؤس والے ذیلی راستے پر مڑی ہے اور یقیناً اس کی منزل گیسٹ ہاؤس ہی ہوگی کیونکہ اس ذیلی سڑک پر گیسٹ ہاؤس کے سوا کوئی اور عمارت نہیں تھی۔

داور اپنے طور پر چوکنا ہو گیا اور اس نے اپنے باہر والے ساتھیوں کو بھی اندر آنے کا کہہ دیا۔ مزید پانچ منٹ بعد پارکنگ میں موجو کی جیپ رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکل کر موجو نے فوراً پچھلا دروازہ کھولا اور زین اور حیدر کو باہر نکال لیا۔ سیف سیٹوں کے درمیان چھپا بیٹھا تھا۔ اس لیے باہر سے دیکھے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ زین اور حیدر دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور یہ بہت معمولی بندشیں تھیں جو کہ ایک جھٹکے سے کھل جاتیں۔

جب تک موجو، زین اور حیدر کو اندر کی طرف لے کر جاتا باہر والے دونوں آدمی بھی گیسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ گارڈ کو حکم دے دیا گیا کہ اب کوئی بھی اندر آنے کی کوشش کرے تو بے شک اسے گولی مار دی جائے۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی زین کی نظر داور سے ٹکرائی اور اس کے پاس بیٹھی ہوئی سارہ سے بھی۔ داور نے خوش ہو کر موجو کو گلے لگایا اور کہا۔ ”واہ بھئی جوان، دل خوش کر دیا تو نے تو۔ کوہ نور ہیرا لے کر آیا ہے قسم سے۔“ زین کو حیرت ہو رہی تھی کہ یہاں بلال نظر نہیں آ رہا حالانکہ موجو نے بھی اس کا نام نہیں لیا تھا۔ اس نے صرف داور کے متعلق بتایا تھا مگر اسے علم تھا داور کے پیچھے کوئی اور نہیں بلال غوری ہی ہے۔

موجو کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے تھے، اسے علم تھا کہ وہ فورس کے جوان کسی بھی وقت یہاں ایکشن دکھا سکتے ہیں اور داور کو پتا لگتا کہ موجو نے ان کو کچھ بتایا ہے تو وہ ان کے اندر آنے سے پہلے اس کو جان سے مار دیتا۔ اسے منظر سے ہٹنے کی جلدی تھی اس لیے اس نے کہا۔ ”استاد میں ذرا ہولا ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے اشارے سے واش روم جانے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کا بتایا۔

داور ہنستا ہوا بولا۔ ”جا بھئی ہولا ہو یا بھاری۔ تجھے کون پوچھ سکتا ہے اب...... تو ہمارے لیے یہ دو تحفے جو لایا ہے۔“ داور کے ساتھیوں نے زین اور حیدر کو داور کے سامنے لا کھڑا کر دیا جبکہ موجود داور کی بات سنتے ہی رفوچکر ہو گیا تھا۔

ادھر سیف نے جیپ میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ باہر کا جائزہ لیا تو اسے گیٹ پر موجود گارڈ اور داور کے وہ دونوں ساتھی نظر آ گئے جو ابھی باہر سے اندر آئے تھے جیپ کے ساتھ۔ اس نے اپنے واچ ٹرانسمیٹر سے اپنے ساتھیوں کو اندر کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ ابھی ایکشن میں آنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان کو رکنا پڑا، کیونکہ ایک اور چمچماتی لینڈ کروزر گیسٹ ہاؤس کی طرف آتی دکھائی دی۔ اسپیشل فورس (کیونکہ یہ ایلیٹ فورس نہیں لگ رہی تھی) کے جوانوں نے فوراً اپنی پوزیشن تبدیل کی اور دفاعی اور کیموفلاج والے انداز میں چھپ گئے تاکہ نئے آنے والے کے متعلق فیصلہ کر سکیں وہ دشمن ہے یا کوئی غیر متعلقہ شخص۔ انہوں نے سیف کو بھی محتاط رہنے کی ہدایت کی اور کہا کہ جب تک ہم کارروائی نہ کریں، وہ خاموشی سے جیپ میں ہی بیٹھا رہے۔

جیپ گیٹ پر پہنچ کر رک گئی تو ہارن کی آواز سنائی دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ گیٹ کھول دیا جائے مگر بجائے اس کہ گیٹ کھولا جاتا، اندر سے گارڈ نے باہر آ کر ڈرائیور سے بات چیت شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ یہ گفتگو بحث اور گرما گرمی میں تبدیل ہونے لگی۔ معاملہ کسی طور پر سلجھتا نہ دیکھ کر گارڈ اندر کی طرف چل پڑا مگر ابھی وہ گیٹ بھی کراس نہیں کر سکا تھا کہ اس کی کھوپڑی ہوا میں اڑتی ہوئی نظر آئی۔ فائر کی آواز سنتے ہی داور کے دونوں ساتھی جو کہ لان میں تھے اپنی اپنی آٹومیٹک گنز سنبھال کر گیٹ کی طرف دوڑے۔ داور نے بھی فائر کی آواز سن لی تھی۔ وہ ابھی زین کے متعلق شش و پنج میں تھا کہ اس سے تنہائی میں تفتیش کرے یا سب کے سامنے کیونکہ اس کے پاس جو بھی تھا، وہ بہت قیمتی تھا اسی لیے بلال کے لیے یہ بندہ اتنا اہم تھا۔ مگر فائر ہوتے ہی اس نے زین اور حیدر کو دھکیل کر اسی کمرے میں بند کر دیا جہاں باقی سارے لوگ موجود تھے۔ اور خود اسلحہ لے کر سارہ کے ساتھ محفوظ کمرے میں منتقل ہو گیا جو کہ دوسری منزل پر واقع تھا۔ یہاں سے باہر لان اور گیٹ تک کا سارہ منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ گیٹ کے باہر اسے ایک لینڈ کروزر جیپ ریورس ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جیپ طوفانی رفتار سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ داور حواس باختہ ہو گیا حالانکہ وہ ایک حتی الامکان محفوظ جگہ پر تھا۔ اس کے دونوں ساتھی جو لان میں موجود تھے، وہ گھات لگائے بیٹھے تھے کہ جیسے ہی کوئی اندر آئے اس پر فائر کھول دیا جائے۔ جیپ طوفانی رفتار سے گیٹ کے ساتھ ٹکرائی اور ایک زور دار دھماکا سنائی دیا جو کہ گیٹ کی ایک سائڈ مکمل طور پر ٹوٹ جانے کا تھا۔ اس کے علاوہ جیپ کے سامنے کا حصہ بھی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ پورا بونٹ مڑ کے ٹیڑھا ہو چکا تھا اور ہیڈ لائٹس کی جگہ اب صرف شیشے کی کرچیاں ہی نظر آ رہیں تھیں۔ ونڈ اسکرین پر جیسے مکڑی کا جالا سا بن گیا تھا۔ اس پر غالباً گیٹ کے ستون کا کوئی بھاری ٹکڑا ٹکرایا تھا جس کی وجہ سے اندر بیٹھے ہوئے لوگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ داور کے دونوں ساتھیوں نے جیپ پر فائرنگ شروع کر دی کیونکہ یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ یہ لوگ دوست نہیں ہیں اس لیے اب وہ لوگ بھرپور حملہ کر رہے تھے۔ اسی دوران جیپ کا ایک شیشہ نیچے ہوا اور شاٹ گن گرجی۔ داور کا ایک ساتھی پیچھے دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہو گیا یہ غالباً ریپٹر گن تھی، دوسرے نے فوراً دفاعی انداز اختیار کیا اور پیچھے کی طرف چلا گیا۔ داور کے لیے اب خاموش تماشائی بنا رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس پہلے ہی نفری بہت کم تھی کیونکہ اسے اندازہ نہیں تھا اس طرح کے حالات پیش آ جائیں گے اور وہ ابھی تک اسی پریشانی میں تھا کہ یہ ناگہانی آفت کہاں سے آن ٹپکی ہے اور کون ہے جو اس کے بنے بنائے منصوبے کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ ادھر پارکنگ میں موجود دوسری جیپ کے اندر سیف دبکا بیٹھا تھا لیکن اس شور اور فائرنگ کے سلسلے نے اسے پریشان کر دیا اور اسے لگا کہ اس کے ساتھی ایکشن میں آ گئے ہیں اور شاید جلدی یا کسی اور وجہ سے اسے بتا نہیں سکے۔ اس نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا جب اسے واچ ٹرانسمیٹر سے سگنل موصول ہوئے اور اسے اندر کی صورتِ حال بتانے کا کہا گیا۔ کیونکہ اتنا تو ان کو باہر سے بھی نظر آ رہا تھا کہ نو وارد جو بھی تھے، ان کے ساتھ داور اور اس کے ساتھیوں کی ٹھن گئی ہے اس لیے وہ فی الحال زین اور حیدر کی طرف سے بے فکر تھے۔ سیف نے بھی سکھ کا سانس لیا ورنہ وہ ابھی نیچے اتر کر اکیلے ہی اس لڑائی میں کودنے جا رہا تھا اور بعید نہیں تھا وہ کسی گولی کا شکار ہو جاتا۔ اس نے جیپ کے سیاہ شیشوں سے ساری کارروائی دیکھی پھر اسے محسوس ہوا کہ چھت کی طرف سے اندر آنے والی جیپ پر فائرنگ ہو رہی ہے کیونکہ وقفے وقفے کے بعد جیپ سے شاٹ گن چھت کی طرف فائر کر رہی تھی۔ اب جیپ والوں کی پوزیشن تھوڑی خراب لگ رہی تھی

اس لیے سیف نے باقی تینوں ساتھیوں کو تمام تر صورتِ حال بتائی۔ یہ اب ان کے ایکشن کا وقت تھا۔

☆☆☆

نیم تاریک کمرے میں زین اور حیدر اندھوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دم زیادہ روشنی سے کم روشنی میں آنے کی وجہ سے فوری طور پر ان کی بصارت پر اثر پڑا تھا۔ کمرے میں موجود تمام لوگ خاموشی اور حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے چونکہ ان کی آنکھیں اس روشنی سے مانوس تھیں اس لیے ان دونوں کو پہچاننے میں ان کو کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ ان میں سے ایک شخص بے چینی سے آگے آیا اور زین کا بازو پکڑ کر بولا۔ ”زین...... آخر تم ان کے ہاتھ لگ ہی گئے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے ہم لوگ کل سے یہاں قیدی بنے ہوئے ہیں۔“ زین بھی کسی حد تک اب ان لوگوں کی شکلیں دیکھنے کے قابل ہو چکا تھا اوپر سے اپنا نام سنتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اظہر کو شناخت کر لینے کے بعد اس کے رہے سہے حواس بھی جواب دینے لگے۔ اسی دوران جمیل، خاور اور ملک ارسلان بھی اٹھ کر پاس چلے آئے۔ ان سب کو ایک ساتھ دیکھ کر جہاں زین کو حیرت کے جھٹکے لگے وہیں حیدر کے لیے بھی یہ آسانی سے ہضم ہونے والا منظر نہیں تھا۔ زین اور حیدر نے کونے میں بیٹھی ہوئی حیران و پریشان سوہا اور عائشہ کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ وہ ان کے لیے ہنوز اجنبی تھیں۔

وہ زین سے سوال پر سوال کرتے جا رہے تھے اور زین بوکھلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا کیونکہ وہ اتنا تو سمجھ چکا تھا کہ یہ سب جو اس وقت یہاں موجود ہیں اس کی وجہ سے ہیں۔ آخر زین نے تمام سوالوں کے مصلحت آمیز سچ اور جھوٹ پر مبنی جوابات دیے تو وہ لوگ تھوڑے پُرسکون نظر آئے۔ زین کو چونکہ پتا تھا باہر اسپیشل فورس کے جوان موجود ہیں اس لیے اس کی ہمت بندھی ہوئی تھی اور حیدر بھی گھبرایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ زین نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ سب بے فکر رہو، ان کا مسئلہ میرے ساتھ ہے، اور اب میں ان کے پاس ہوں تو آپ چاروں کو اپنے گھر جانے دیں گے بلکہ ہو سکتا ہے ہم بھی آپ کے ساتھ ہی چلے جائیں اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”یعنی ہم گھر والوں کے پاس نہیں جا سکیں گی؟ صرف یہ چاروں ہی جائیں گے مسٹر زین؟“ عائشہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ سب نے ان دونوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا...... کیونکہ ایک دم ہی زین کی آمد نے ان کو حواس باختہ کر دیا اور وہ جلد از جلد اپنے سوالوں کے جوابات لینے لگے تھے۔ مگر عائشہ کی بات سنتے ہی زین کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

”یہ کون ہیں؟“ اس نے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ عائشہ احمد چوہدری اور سوہا افتخار ہیں، اگر تمہیں بھول نہ گئیں ہوں تو۔“ اظہر نے زین پر حیرتوں کا ایک اور پہاڑ توڑتے ہوئے کہا۔ زین کو وہ کمرا گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ حیدر کی بھی حالت مختلف نہیں تھی۔ وہ سب ایک گروپ کے ممبر ہونے کے ناتے جانتے تھے کہ یہ دونوں کون ہیں اور کہاں سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ دونوں ہی بہت با اخلاق اور مہذب لڑکیاں تھیں...... لیکن اس وقت یہاں داور کی قید میں تھیں۔ مگر کیسے؟ زین کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

”یہ دونوں یہاں کیسے؟ اور آپ سب لوگ بھی کس طرح یہاں آ گئے ہو، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا لگتا ہے جیسے کوئی طلسمی کہانی چل رہی ہے اور ابھی میری آنکھ کھلے گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ زین نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے اس نے کبھی ان دونوں کو نہیں دیکھا تھا اور آج دیکھا بھی تو کس حال میں جبکہ وہ ایک درندے کے رحم و کرم پر تھیں اور وہ خود بھی زندگی داؤ پر لگا کر اسپیشل فورس کی آس پر داور کا سامنا کرنے چلا آیا تھا۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ انہیں باہر ایک بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی گرینیڈ یا بم کا دھماکا نہیں تھا ورنہ اس کی آواز مختلف ہوتی۔ وہ سب اپنی پریشانی بھول کر باہر کی آوازوں کو سننے لگے جہاں اب فائرنگ کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ زین اور حیدر کو یہی لگا کہ فورس کے جوان ایکشن میں آ گئے ہیں اس لیے وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔ جبکہ ملک ارسلان اور خاور ایک مرتبہ پھر مہم جوئی کا سوچنے لگے۔ وہ کچھ کرتے اس سے پہلے ہی حیدر نے ان کو منع کر دیا کہ ہمارے ساتھ اسپیشل فورس کے بندے آئے ہوئے ہیں اس لیے باہر کے معاملات وہیں ہینڈل کریں گے۔ جب تک ان کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملتی ہمیں اسی محفوظ جگہ پر چھپے رہنا ہے۔ فورس کا سن کر دونوں لڑکیوں سمیت باقی سب کی جان میں جان آئی۔ اب ان کو امید ہو گئی تھی کہ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے۔ حیدر کی چھٹی حس کچھ گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی اتنا تو وہ جانتا ہی تھا کہ فورس کے بندے اتنے شور شرابے کے ساتھ ایکشن نہیں کریں گے کیونکہ وہ روایتی پولیس والے نہیں تھے۔ یہ کوئی اور معاملہ تھا۔ اس کے اندر کا پولیس والا پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ حیدر نے دروازے کو اندر کی طرف سے لاک کر دیا اور سب سے کہا کہ وہ دروازے کے

سامنے سے ہٹ کے دوسرے رخ پر بیٹھ جائیں اور چوکنا رہیں۔ کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے اس لیے تیار رہیں۔ خاور اور ارسلان کے لیے تو جیسے یہ پسندیدہ بات تھی۔ اس لیے حیدر، خاور اور ملک ارسلان دروازے کے قریب چوکس انداز میں کھڑے ہوگئے۔ اسلحے کے نام پر ان کے پاس خالی ہاتھوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ موجو سے حاصل ہونے والا پستول بھی فورس کے جوانوں کے پاس تھا۔ جبکہ زین، اظہر اور جمیل دونوں لڑکیوں کے ساتھ کمرے کے دوسرے کونے میں دفاعی پوزیشن میں چلے گئے جو براہِ راست دروازے کی طرف نہیں تھا۔ اب ان کو باہر سے فورس کی مدد اور ہدایت کا انتظار تھا۔

☆☆☆

منظور عرف موجو داور کو واش روم کا بول کر سائڈ پر ہو گیا تھا۔ اس کے پاس جو پستول تھا وہ زین اور حیدر نے چھین لیا تھا۔ اب وہ خالی ہاتھ تھا مگر ٹی وی لاؤنج میں اس نے داور کے اسلحے کے چھوٹے سے ذخیرے کو دیکھ لیا تھا جس میں سات آٹھ تعداد میں آٹو میٹک رائفلیں اور تین عدد دستی بم موجود تھے۔ یہ صوفے کے پیچھے خلا میں رکھے ہوئے تھے۔ داور کو گن تبدیل کرتے وقت موجو کی نظر ان پر پڑ گئی تھی ویسے بھی یہاں اس نے اسلحے کا یہ چھوٹا سا ذخیرہ چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ موجو واش روم سے نکل کر واپس آ رہا تھا کہ اسے بھی گیٹ ٹوٹنے کا دھماکا سنائی دیا۔ پھر اس کے بعد فائرنگ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ وہ فوراً گھبرا گیا۔ اس لیے ایک اوٹ میں چھپ گیا۔ اسی لمحے اس نے داور کو سارہ کے ساتھ فرسٹ فلور پر جاتے ہوئے دیکھا۔ داور نے غالباً تین چار مزید بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ اسی ذخیرے سے لی گئی ہیں جس کے متعلق موجو کو علم تھا۔ داور اور سارہ کے اوپر جانے کے بعد موجو نے اپنی بقا کی خاطر ٹی وی لاؤنج کا رخ کیا اور صوفے کے پیچھے جھانکا۔ جہاں صرف ایک سیون ایم ایم پڑی تھی اور تین عدد ہینڈ گرینیڈ۔ داور ساری گنز اور دستی بم لے جاتا لیکن شاید وہ عجلت میں چھوڑ گیا ہوگا۔ کچھ نہ ہونے سے یہ گن اور ہینڈ گرینیڈز کا ہونا بہت غنیمت تھا۔ اس نے ہینڈ گرینیڈ اپنے لباس کی ایک محفوظ تہ میں چھپا لیے تھے۔ وہ ایک محفوظ پوزیشن لے کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف کم ہوگیا۔ اسے پہلے یہ محسوس ہوا تھا کہ فورس والوں نے حملہ کیا ہے لیکن لان میں موجود جیپ اور وہاں سے چاروں طرف ہوتی ہوئی فائرنگ سے اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس کی مدد پہنچ چکی ہے۔ مگر وہ محفوظ ابھی بھی نہیں تھا کیونکہ فورس نے ابھی ایکشن نہیں کیا تھا۔ پھر اسے اچانک سیف کا خیال آیا جو اس کی جیپ میں چھپ کر یہاں آیا تھا۔ یعنی فورس کا ایک بندہ پہلے سے یہاں موجود تھا اور یقینا باہر والوں کو مسلسل اندر کے حالات کی خبر دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ ابھری۔ اس نے سیف کو شکار کرنے کا پروگرام بنایا تاکہ اندر سے معلومات باہر تک نہ جا پائیں اور فورس والوں کا پلہ بھاری نہ ہوسکے۔

☆☆☆

فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس چونکہ عام راستے اور آبادی سے کافی ہٹ کر تھا اس لیے بہت کم امکانات تھے کہ فائرنگ کی آواز کسی تک پہنچ سکے۔ مرکزی سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں میں سے شاید کوئی آواز سن پاتا۔ داور تمام تر احتیاط کے ساتھ اور نپی تلی فائرنگ کر رہا تھا۔ لیکن جیپ کسی ٹینک کے مانند لان میں کھڑی تھی۔ داور کا اب صرف ایک ساتھی گیسٹ ہاؤس کی چھت پر موجود تھا۔ وہ وہاں پانی والی ٹنکی کے پیچھے سے جیپ پر فائرنگ کر رہا تھا مگر جیپ کی دونوں سائڈ کے پچھلے شیشے ہلکے سے نیچے ہوتے اور ایک آدھ برسٹ مار کر خاموش ہوجاتے۔ اچانک داور کی عقل نے کام کیا۔ جیپ کے شیشے بلٹ پروف تھے اسی لیے اتنی فائرنگ کے باوجود شیشے میں مکڑی کے جالے بُننے کے سوا کوئی خاص نقصان نہیں کرسکے۔ نہ ہی جیپ میں موجود لوگوں کی تعداد کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لیے داور نے فائرنگ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سارہ بھی ایک عدد پستول تھامے کرسی پر خوف زدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اب داور کو انتظار تھا کہ جیپ سے کوئی اترے تو وہ اس کو نشانہ بنائے لیکن وہ کسی پُراسرار مخلوق کی طرح لان میں جوں کی توں موجود تھی۔ داور کی طرف سے مزید فائرنگ نہ کرنے پر داور کا ساتھی جو چھت پر موجود تھا، محتاط ہوگیا اور فائرنگ میں وقفہ آ گیا۔ یہی وقت تھا جب موجو گن سنبھالتے ہوئے کاریڈور میں آیا۔ کاریڈور کے اوپر چھجا نما چھت ہونے کی وجہ سے وہ داور کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ موجو نے اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کاریڈور میں آکر جیپ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ جیپ کچھ لمحوں کے بعد چلتی ہوئی کاریڈور میں داخل ہو گئی۔ داور اور اس کے ساتھی نے بلاوجہ چار پانچ فائر کیے مگر کاریڈور میں پہنچتے ہی جیپ ان کے نشانے پر موجود نہیں رہی تھی۔ جیپ کے اگلے دونوں دروازے بیک وقت کھلے پھر دو گن بردار اور جسیم آدمی اترے۔ ”کیا رپورٹ ہے۔“ انہوں نے موجو سے استفسار کیا۔ جواباً موجو نے ان کو تمام

صورتِ حال بتائی اور یہ بھی کہ داور کے پاس اب ایک لڑکی سارہ اور چھت پر موجود ایک ساتھی کے سوا کوئی مدد نہیں ہے۔ اور یہی سچ بھی تھا۔ داور کسی کو مدد کے لیے بلا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اسے کچھ سوجھ نہیں رہی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ موجو نیچے واش روم میں گیا تھا تو ابھی تک سامنے کیوں نہیں آیا...... پھر موجو نے گویا ان کو خبردار کرتے ہوئے بتایا کہ سامنے صحن میں کھڑی جیپ میں ایک فورس کا بندہ موجود ہے اور کس طرح تین بندے باہر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟'' یہ بلال غوری کی آواز تھی جو جیپ سے ابھی ابھی برآمد ہوا تھا اس کے ساتھ دوسرا زبیر احمد اور ایک مزید باڈی گارڈ ٹائپ کا شخص جو دوسرے دونوں آدمیوں کی طرح ہی طویل القامت اور قوی الجثہ تھا۔ ان تینوں کو بلال غوری نے خاص طور پر ہائر کیا تھا۔ زبیر احمد کے ہاتھ میں بھی آٹومیٹک گن نظر آ رہی تھی۔ صرف بلال ہی واحد بندہ تھا جو خالی ہاتھ تھا۔ ''سر انہوں نے مجھے راستے میں ٹریپ کر لیا تھا۔'' موجو نے عاجزی سے بلال غوری کو بتایا۔

''تم کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم کو اطلاع ہی کر دیتے۔ اب ہم یہاں بری طرح پھنس گئے ہیں۔ دل تو چاہتا ہے تم کو ابھی جہنم رسید کر دوں۔'' بلال غضب ناک انداز میں موجو پر چلّا رہا تھا۔ پھر وہ جیپ کی طرف متوجہ ہوئے جہاں موجو کے مطابق سیف نامی جوان چھپا ہوا تھا۔ ان میں سے دو آدمیوں نے کور دیا اور تیسرا آدمی برق رفتاری سے جیپ کی اس سائڈ پر چلا گیا جو داور اور اس کے ساتھی کی زد میں نہیں تھی۔ اس نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھولے بغیر شیشے پر گن رکھ کر ایک طویل برسٹ فائر کیا...... ایک چھناکے سے شیشہ کرچی کرچی ہو کر گاڑی اور لان میں بکھر گیا اور بے شمار گولیاں جیپ کی باڈی اور سیٹوں میں گھس گئیں۔

☆☆☆

سیف نے جب ٹرانسمیٹر سے باقی ساتھیوں سے رابطہ کیا تھا تو اس کو فوراً ہدایت ملی تھی کہ وہ کوئی محفوظ جگہ دیکھ کر کور لے اور پھر اطلاع دے تاکہ کارروائی کی جا سکے۔ یہ نئے مہمان ان کی پلاننگ کا حصہ نہیں تھے اس لیے اب وہ نئے سرے سے لائن آف ایکشن تیار کر رہے تھے۔ اسی دوران سیف کو موقع ملا جب لان میں کھڑی جیپ کا ریڈور کی طرف گئی تو سیف نے پھرتی سے جیپ چھوڑ کر ایک محفوظ ٹھکانا تلاش کر لیا جو کہ گیسٹ ہاؤس کی پشت پر تھا۔ داور اور اس کے ساتھی کا سارا دھیان بلٹ پروف جیپ کی طرف تھا اس لیے سیف کی نقل و حرکت وہ محسوس نہیں کر سکے۔ سیف نے جیپ چھوڑتے وقت بلال اور اس کے تمام باقی ساتھیوں کو دیکھ لیا تھا لیکن چونکہ سب کی پشت اس کی جانب تھی اس لیے وہ کسی کو پہچان نہ سکا خاص طور پر بلال کو...... لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے نئے آنے والوں کی تعداد اور کسی حد تک اسلحے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اب محفوظ جگہ پر پہنچتے ہی اس نے تازہ ترین صورتِ حال کی اپ ڈیٹ دی۔ اس وقت باہر موجود تینوں ساتھیوں نے اپنے لائحہ عمل کو تھوڑا سا تبدیل کیا۔ بجائے سامنے سے گیٹ کی طرف حملہ کرنے کے وہ گیسٹ ہاؤس کے عقب سے باؤنڈری وال پھلانگ کر احاطے میں داخل ہوتے۔ سیف وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ وہ ابھی اطلاع دے کر کسی محفوظ مقام کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ اسے ایک طویل برسٹ سنائی دیا۔ اور ساتھ ہی شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ باہر سے آنے والی جیپ بلٹ پروف ہے۔ لہٰذا شیشہ ٹوٹنے کی آواز یا تو عمارت کے کسی حصے سے آئی ہے یا پھر جس جیپ میں وہ موجود تھا اس کو مشقِ ستم بنایا گیا ہے۔ یہ خیال کافی سوہانِ روح تھا، کیونکہ چند لمحات پہلے وہ وہیں موجود تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو اس کے شک کی تصدیق تھی گویا کہ منظور عرف موجو دو طرف سے کھیل رہا ہے۔ اور یہ نئی آنے والی پارٹی کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ ورنہ نئے آنے والوں لوگوں کو کیسے پتا چل سکتا تھا کہ سیف جیپ کے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اسے اپنے عقب میں دھپ دھپ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ بجلی کی سرعت سے مڑا اور اپنے ریوالور سے نشانہ لے کر فائر کرنے کا ارداہ ہی کیا تھا کہ اسے اپنے ساتھیوں کی جھلک دکھائی دی۔ وہ ایک طویل اور ٹھنڈی آہ بھر کے رہ گیا۔ سیف نے اب نیا لائحہ عمل سوچ لیا تھا اس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے راستے سے داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔

اپنی تیاری مکمل ہوتے ہی کمانڈر جس کا نام صہیب تھا، اس نے آرڈر کیا۔ ''گو اینڈ شوٹ ٹو کل بوائز''...... سب نے بیک وقت کہا۔

''یس سر۔'' اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی منزل کی طرف چل دوڑ پڑے۔

☆☆☆

جیپ کے شیشے پر فائرنگ کرنے کے کچھ دیر بعد جیپ کا دروازہ کھولا گیا تو خالی جیپ ان سب کا منہ چڑا رہی تھی۔ خالی جیپ پا کر بلال اور موجو کا چہرہ دھواں دھواں نظر آنے لگا۔ عین ممکن تھا سیف نامی اہلکار گیسٹ ہاؤس کے اندر ہوتا پھر وہ کہیں محفوظ مقام پر منتقل ہو گیا تھا۔ دونوں طرح سے ہی

صورتِ حال ان کے حق میں نہیں تھی۔ موجو نے بلال کو اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اندر سے آ رہا ہوں۔ اوپر والی منزل پر داور ہے اور نیچے اس نے تمام قیدیوں کو ر کھا ہے۔ اگر وہ اہلکار اندر ہوتا تو مجھ سے ضرور ٹکراتا۔ اس کا مطلب ہے وہ گیسٹ ہاؤس سے باہر ہی ہے۔“ بلال نے موجو کی اطلاع پاتے ہی سب کو اشارہ کیا اور اندر چلنے کا کہا۔ موجو کے ساتھ بلال اور دو باڈی گارڈ ٹائپ آدمی اندر کو چل دیے۔ تیسرا باڈی گارڈ جو جیپ پر فائرنگ کرنے گیا تھا وہ ان سے ذرا فاصلے پر تھا۔ جب تک وہ دروازے کے قریب پہنچتا۔ ادھر سے سیف اور اس کا ساتھی صہیب نمودار ہوئے۔ چونکہ اس کی پشت ان کی جانب تھی لہٰذا وہ نہ دیکھ سکا۔ اسی لمحے صہیب کی سیون ایس ایم جی رائفل کا سنگل شاٹ فائر ہوا اور وہ عقب سے اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گیا۔

وہ چکرا کر گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کے سامنے گر گیا۔ بلال سمیت دوسرے لوگ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پہلے ان کو یہ محسوس ہوا یہ داور یا اس کے ساتھی کی کارروائی ہے مگر جب اوپر چھت کی طرف سے بھی ان کو فائر کی آواز آئی تو انہیں کسی شک کی گنجائش نہیں رہی کہ فورس کے جوان ایکشن میں آ چکے ہیں۔ وہ فوراً اندر کی طرف بھاگے۔

چھت پر موجود داور کے ساتھی نے فائر کی آواز سنی اور ساتھ ہی کسی کے گرنے کی بھی۔ یقیناً کوئی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس لیے اس نے ٹینکی کی اوٹ لے کر صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اور اپنی موجودگی کی دلیل کے لیے ایک فائر کیا۔ یہی لمحاتی غفلت اسے بہت مہنگی پڑ گئی۔ جب تک اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب پہنچا ہے تب تک اس کی گردن ایک آہنی شکنجے میں کسی جا چکی تھی۔ اس کے حلق سے خرر خرر کی آوازیں آنے لگیں۔ کمانڈر نے اس کی گن اپنے قبضے میں لی اور اس کو زندگی کے قید سے آزاد کر دیا۔ وہ سب یہاں معمول کے ریڈ پر آئے تھے کہ اغوا کاروں کو گرفتار کر کے لے جاتے۔ مگر گیٹ پر موجود چوکیدار کے ساتھ ہونے والی کارروائی اور سیف کی خبروں نے ان کو انتہائی حدوں پر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر اب بھی کسی کے ساتھ نرمی سے پیش آتے یا گرفتار کرنے کی کوشش کرتے تو بہت زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا۔ اسی بنا پر ان کو شوٹ ٹو کِل والی صورتِ حال پر عمل کر رہے تھے۔ چھت خالی ہوتے ہی کمانڈر اور اس کے ساتھی گیسٹ ہاؤس کی پہلی منزل کی جانب چل دیے۔ نیچے سے ان کو تسلی بخش آوازیں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

داور مارے حیرت کے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ نیچے کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اس نے پریشانی کے عالم میں سارہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں خوف کے سائے گہرے نظر آ رہے تھے۔ سارہ اب تک داور کی سب سے چہیتی اور لمبا عرصہ تک رہنے والی محبوبہ تھی لیکن داور کی خباثت اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ سارہ کو قربانی کی بکری بنا کر خود کسی طرح موت کے گھیرے سے نکل جائے۔ اس نے سارہ کو تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ نیچے جو دو طرفہ فائرنگ سن رہی ہو، یہ میرے لوگ ہیں جو مدد کو پہنچ گئے ہیں۔ اب جلد ہی بازی ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔“

سارہ بے یقینی کے عالم میں داور کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ داور نے کہا ”تم بس کسی طرح نیچے کمرے میں موجود قیدیوں میں سے زین نامی لڑکے کو اوپر لے آؤ تو ہماری پوزیشن بہت اچھی ہو جائے گی۔ یہ لوگ ابھی آپس میں الجھے ہوئے ہیں اس طرف کسی کا دھیان نہیں ہوگا۔ ویسے بھی لاؤنج اور اس کمرے کا کافی فاصلہ ہے۔ میں تم کو کور کروں گا تم زین کو لے کر اوپر آ جانا۔“

سارہ ابھی تک تردّد کا شکار تھی...... مگر اسے یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی کیونکہ مرنے کا فی الحال اس نے بھی کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب داور کے ساتھ یہاں چلی آئی تھی مگر داور نے اسے چوائس نہیں دی تھی ایک طرح سے حکم دیا جو اسے ہر حال میں پورا کرنا تھا۔ وہ چاروناچار پستول ہاتھ میں تھامے اپنے محفوظ مسکن یعنی کمرے سے باہر نکلی جبکہ داور اسے بظاہر کور دیتے ہوئے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اصل میں گراؤنڈ فلور پر قابض پارٹی کا ردِعمل دیکھنا چاہ رہا تھا۔ سارہ احتیاط سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آ رہی تھی۔ سارہ کمرے کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکنی کے مانند چل رہی تھیں اور ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔ اس نے دروازے کے ہینڈل لاک میں چابی گھما کر دروازہ اَن لاک کیا اور ہینڈل پوری قوت سے گھمایا۔

☆☆☆

فورس کے دو جوان چھت کے راستے سے نیچے آ رہے تھے مگر دوسری منزل پر کھٹکا ہونے کی وجہ سے وہ محتاط ہو گئے۔ یہ کسی دروازے کے کھلنے کی آواز تھی۔ وہ مزید محتاط ہو

گئے کیونکہ اب ان کو گراؤنڈ فلور سے پہلے بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ کمانڈر نے جھانک کر نیچے دیکھا تو اسے سیڑھیوں سے ایک پستول بردار لڑکی نیچے جاتی دکھائی دی۔ جبکہ دروازے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ یہ یقینی طور پر داور تھا۔ کیونکہ یہ ان کے ریڈار پر کافی عرصے سے تھا مگر کوئی واضح ثبوت یا گواہ نہ ہونے کی بنا پر ابھی تک آزاد گھوم رہا تھا۔ داور کے متعلق ویسے بھی موجوان کو کافی بریف کر چکا تھا اس لیے ان کو ذرا سی بھی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ جیسے جیسے داور نیچے سیڑھیاں اتر رہا تھا، وہ بھی آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ لڑکی یعنی سارہ کے گراؤنڈ فلور تک جاتے جاتے داور ایسی پوزیشن میں آ گیا کہ وہ دوبارہ اپنے ٹھکانے پر آنے کے لیے اسے فورس کے جوانوں سے دو دو ہاتھ کرنے پڑتے۔ داور فورس والوں کے نشانے پر تھا مگر وہ فی الحال اس حق میں نہیں تھے کہ داور یا لاؤنج میں موجود لوگوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا جائے اس لیے وہ خاموشی سے داور کی کارروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ اچانک انہوں نے داور کو پلٹتے دیکھا، ساتھ ہی ایک خوفناک قسم کے برسٹ سے گیسٹ ہاؤس گونج اٹھا۔ ان کو لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ یقیناً لڑکی براہِ راست گولیوں کا نشانہ بنی تھی۔ داور نے اسے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ساتھ ہی داور ایک جھلک میں سرکاری اہلکاروں کو شناخت کر چکا تھا۔ اس کے آگے کھائی اور پیچھے کھڈے جیسی صورتِ حال تھی۔ اس نے خود کو محفوظ اوٹ میں چھپاتے ہوئے ان پر فائر کیا۔ اور ساتھ ہی اس نے سیڑھیوں کے نیچے بھی فائر کر کے اوپر آنے کا خیال لانے والوں کو تنبیہ کی۔ لیکن سیڑھیوں میں اتنی محفوظ آڑ میسر نہ تھی کہ وہ دونوں جانب سے بھرپور دفاع کر سکتا۔

فورس کے جوانوں پر جب داور نے فائر کیا تو وہ فوراً دیوار کے ساتھ لگ گئے اور کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ ہو گئے تھے۔ لیکن داور اب بالکل غیر محفوظ صورتِ حال سے دوچار تھا.... جوابی کارروائی کرنے کے لیے وہ اوٹ سے ذرا سا باہر نکلا ہی تھا کہ فورس کا جوان جو تاک میں بیٹھا تھا اس کی گن سے نکلنے والا قہقہہ داور کے لیے قیامت ڈھا گیا۔ دس بارہ گولیوں کا برسٹ داور کے جسم کے زیریں حصے میں لگا۔ اس کو اپنے کولہے کی ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی اپنی جان نکلتی دکھائی دینے لگی۔ وہ مزید مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے دونوں اہلکار ایک دوسرے کو کور دیتے ہوئے اسے اٹھا کر کمرے میں لے آئے جو کہ داور کی کمین گاہ تھی۔ داور کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر بستر کی چادروں کی پریشر بینڈیج بنا کر داور کو تین چادروں میں لپیٹ دیا...... لیکن ایک فیصد بھی امکان نہیں لگ رہا تھا وہ بچ پائے گا۔ اس فائرنگ سے گراؤنڈ فلور والے یقیناً آگاہ ہو چکے تھے کہ اوپر اور بھی لوگ ہیں اس لیے اب وہ مزید رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی گرفت اپنی آٹومیٹک رائفلز پر مضبوط ہو گئی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں چٹانوں کی سختی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ اب ان کا فیصلہ کن معرکہ تھا۔ انہوں نے واچ ٹرانسمیٹر پر سیف اور اس کے ساتھی کو اَپ ڈیٹ کیا پھر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

کمرے میں انتہائی خاموشی تھی۔ سب کی سانسوں کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ باہر ہونے والی فائرنگ سے وہ سبھی شش و پنج میں مبتلا تھے۔ حیدر نے سکوت کو توڑتے ہوئے زین سے کہا۔ ”بھائی موجو کو تو پتا ہے کہ فورس کے جوان ہمارے ساتھ ہیں۔ اس نے کہیں داور کو بتا نہ دیا ہو اور داور نے مزید مدد حاصل کر لی ہو۔“

زین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں یہ کوئی اور چکر لگ رہا ہے۔ داور کے ساتھی ہوتے تو وہ اب تک ہماری طرف ضرور آتے۔ ان کا نہ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ داور اور فورس والوں کے علاوہ کوئی تیسری پارٹی ہے۔ تم نے آگے دھماکا نہیں سنا۔ یہ آپس میں دوست نہیں ہیں۔ لیکن پریشانی یہ ہے کہ ہمارے حق میں اچھے ہیں یا برے، یہ ہم کو علم نہیں۔“

زین کی باتیں سن کر باقی لوگوں کو بھی تشویش لاحق ہو گئی۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے صورتِ حال کافی حوصلہ افزا تھی کہ فورس والے ایکشن لے کر داور اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرتے اور یہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے..... مگر اب معاملے کا رخ یکسر ہی تبدیل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ دروازے پر آہٹ سنائی دی، خاور اور ملک ارسلان ایک دم سے چوکنے ہو گئے۔ وہ کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔ ان کو دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ جیسے ہی ہینڈل گھوما ایک برسٹ فائر ہوا اور ان کو دروازے پر لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ حیدر ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ داور کے ساتھ نظر آنے والی طرح دار حسینہ سارہ کی چیخ ہے۔ برسٹ چونکہ سائڈ سے فائر کیا گیا تھا اس لیے دروازہ براہِ راست نشانہ بننے سے محفوظ رہا۔ حیدر اور زین دونوں نے دروازے کے نیچے سے خون کا چھوٹا سا تالاب بنتے ہوئے دیکھا تھا مگر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ لڑکیوں کو مزید

دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتے تھے جو کہ پہلے ہی فائرنگ کی آواز سن کر سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ حیدر کے مطابق اب وہ پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ کیونکہ دروازے کا لاک کھل چکا تھا۔ بے شک انہوں نے اندر سے چٹخنی لگائی تھی مگر وہ صرف ایک زوردار دھکے کی مار تھی۔ خاور اور ملک ارسلان کی کسی ممکنہ مہم جوئی کے پیشِ نظر اظہر اور جمیل نے ان دونوں کو دروازے کے سامنے سے ہٹا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کو مزید فائرنگ کی آواز سنائی دی جو کہ اوپر والی منزل پر ہو رہی تھی۔ حیدر کو طمانیت کا احساس ہوا۔ حیدر کو یقین ہو گیا کہ یہ خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں جو براہِ راست ان کی مدد کر رہے ہیں۔

حیدر نے زین کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔ زین کو اس اطلاع نے پرسکون کر دیا تھا مگر زین نے فی الوقت دوسرے ساتھیوں کو بتانا مناسب نہ سمجھا تاکہ جب تک کوئی واضح برتری یا ان کے حق میں صورتِ حال نہیں ہوتی یہ محتاط رہیں۔

☆☆☆

موجو، جو بلال کے کہنے پر لاؤنج میں پوزیشن سنبھال کر بیٹھا تھا کیونکہ اسے علم تھا کس کمرے میں سارے قیدی موجود ہیں۔ وہ بلال سے کہہ کر اپنی پوزیشن تبدیل کرنے ہی والا تھا کہ اسے سیڑھیوں پر سایہ لہرانے کا شبہ ہوا۔ وہ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی پوری توجہ اس وقت سیڑھیوں سے نیچے اترنے والے شخص پر تھی۔

اس نے دیکھا سارہ ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں چابی لیے نمودار ہوئی ہے۔ اس نے ٹریگر پر دباؤ بڑھایا ہی تھا کہ کسی خیال کے تحت رک گیا۔ یہ بہترین لمحہ تھا کہ سارہ دروازے کا لاک کھول دیتی اور ان کے اندر جانے کی راہ ہموار ہو جاتی۔ جیسے ہی سارہ نے دروازے کا لاک کھولا اور ہینڈل گھمایا موجو نے گن کا رخ سارہ کی طرف کر کے ایک طویل برسٹ مار دیا۔ سارہ تڑپتی ہوئی فاختہ کے مانند فرش پر گر گئی اور کچھ جھٹکے کھانے کے بعد زندگی کی قید سے آزاد ہو گئی۔ اس نے بلال کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ کمرے کا لاک کھل چکا ہے اور داور کی ساتھی لڑکی اس کا نشانہ بن گئی ہے۔ بلال غوری نے مزید ہدایات دینے کا ارادہ کیا تھا کہ اسے اوپر تلے سنگل شاٹ فائر سنائی دیے اور پھر ایک طویل برسٹ...... ساتھ ہی داور کی کریہہ چیخیں بھی۔ یہ ان سب کے لیے الارم تھا۔ اب یقینی طور پر فورس کے بندے داور اور اس کے ساتھی پر قابو پا کر یا ان کو ختم کر کے...... ان کی طرف آ رہے تھے۔

بلال نے بھرپور مزاحمت کا ارادہ کیا، اس نے اپنے دو باڈی گارڈز کو حکم دیا کہ کسی بھی طرح کمرے میں موجود لڑکوں میں سے اس کا مطلوبہ بندہ یا کوئی ایک دو یرغمالی اٹھا لیے جائیں تاکہ محفوظ راستہ مل سکے، اس کے لیے بھرپور حملہ کرنا ہو گا۔ جبکہ موجو لاؤنج کے مین گیٹ کی طرف سیف اور اس کے ساتھی کی پیش قدمی روکتا۔

دونوں گارڈز نے کمرے کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ بہت محتاط تھے لیکن موت ان کا مقدر بن چکی تھی۔ جیسے ہی ان میں سے ایک بندے نے دروازہ کھولنا چاہا تو اسے اندر کی جانب سے مقفل پایا۔ دونوں گارڈز نے پیچھے ہٹ کر کندھے کی ایک زوردار ضرب لگائی۔

دروازہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ایک برسٹ چلنے کی آواز آئی۔

یہ صہیب تھا جو پہلی منزل پر داور کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا چکا تھا جب وہ سارہ کو کور دینے کی خاطر نیچے جھانک رہا تھا۔ وہ اس وقت ان کی کارروائی دیکھ رہا تھا جب دونوں گارڈز دروازہ توڑنے کے لیے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس نے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ان دونوں کو نشانہ بنایا لیکن مرنے سے پہلے ایک گارڈ کی گن سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ نکلی جس کے نتیجے میں اندر سے بے شمار چیخیں سنائی دیں۔ صہیب اور نعمان داور کو بری طرح زخمی حالت میں چھوڑ کر اس کمرے کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

اس کمرے سے آنے والی چیخیں لڑکیوں کی تھیں کیونکہ انہوں نے ایک تو اتنے قریب سے فائرنگ سنی تھی دوسرا انہوں نے ملک ارسلان کو دہرا ہو کر لیٹتے ہوئے دیکھا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی فورس کے جوان صہیب نے ایک نوجوان کو دیکھا جس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور اس کے اردگرد سب لوگ جمع تھے۔ صہیب ان سب میں صرف حیدر اور زین کو ہی پہچانتا تھا۔ اس لیے اس نے سرکاری بندے یعنی حیدر سے پوچھا ”کیا صورتِ حال ہے؟ اور یہ زخمی کون ہیں؟“

”سر سب ٹھیک ہے صرف ان کی ٹانگ پر بلٹ ہٹ ہوئی ہے“ حیدر نے زخمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

اس نے گویا یہ سمجھ لیا تھا کہ اس وقت کمانڈنگ آفیسر صہیب ہی ہے۔ حیدر اور باقی تمام لوگ صہیب اور اس کے بلیک یونیفارم کو دیکھ کر اطمینان محسوس کرنے لگے لیکن اگلے ہی لمحے ان کو زخمی ملک ارسلان کا خیال آیا جس کی ٹانگ گارڈ

کے برسٹ کی زد میں آ گئی تھی۔ صہیب نے فوراً سے پیشتر ملک ارسلان کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ گولی نے ملک ارسلان کی ہڈی کو بظاہر کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ صہیب نے اپنے طور پر ابتدائی طبی امداد کے تحت زخم پر پریشر بینڈیج کر دی۔ لڑکیاں ابھی تک سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح بیٹھی تھیں۔ زین اور حیدر اب سوالیہ نظروں سے صہیب کی طرف دیکھنے لگے۔ گویا وہ اس سے آگے کا لائحہ عمل پوچھ رہے تھے۔ صہیب نے وائرلیس سیٹ نکال کر احاطے میں موجود سیف کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ سیف کے مطابق اب صرف تین ہی مزید آدمی رہ گئے ہیں۔ تمام مغوی بازیاب ہونے کے بعد وہ زیادہ آزادی اور آسانی سے آپریشن مکمل کر سکتے تھے۔

☆☆☆

بلال پر صورتِ حال آشکار ہو چکی تھی کہ اب فرار کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں بچا۔ اُس نے موجو سے بہت بے یقینی سے کہا ”موجو تم مسلسل فائرنگ کرتے ہوئے جیپ کی طرف جا کر اس کا دروازہ کھولو، میں تم کو کور دیتے ہوئے ساتھ ساتھ نکلوں گا۔“ وہ زبیر احمد کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ موجو نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک عدد پستول بلال غوری کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بلال کے لیے یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی مگر اب یہ سب چیزیں اس کے لیے قصۂ پارینہ ہو چکی تھیں۔ اس لیے پستول پر اس کی گرفت کمزور تھی اور اس کے ہاتھوں میں لرزش واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ مگر فی الحال یہ مسئلہ ان کی بقاء کا تھا اس لیے وہ ایک جوش اور ولولے سے لاؤنج کراس کر کے داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔ موجو نے اپنی آٹومیٹک گن جو کہ جرمن ساختہ سیون ایم ایم تھی پوری طرح تیار رکھی ہوئی تھی۔ جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا۔ ان کا استقبال پانچ گولیوں کے چھوٹے سے برسٹ سے ہوا۔ یہ سیف کے ساتھی صائم خان کی طرف سے وارننگ تھی۔ اس کا نشانہ بالکل سچا اور بے داغ تھا۔ موجو نے طیش کے عالم میں ان کی طرف رخ کر کے اپنی گن کا دہانہ کھول دیا۔ حالانکہ وہ ایک محفوظ آڑ میں تھے۔ ساتھ ہی وہ بھاگتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا۔ زبیر احمد نے بھی حتی المقدور اپنا حصہ ڈالتے ہوئے فائرنگ میں حصہ لیا۔ موجو کے ہاتھ میں داور کے اسلحے سے نکالا ہوا ایک ہینڈ گرینیڈ موجود تھا جو اس نے پن نکال کر اس کونے کی طرف اچھال دیا جہاں سیف اور صائم خان آڑ لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بلال پستول تھامے اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ان دونوں کی پیش قدمی محسوس کر کے صائم خان نے فائرنگ کے لیے پوزیشن لی اور موجو کے سر کا نشانہ لے کر فائر داغ دیا۔ فضا میں سب مشین گن اور ہینڈ گرینیڈ کے دھماکے کی آواز ایک ساتھ آئی۔ سیف جو کہ صائم کو کور دینے کے لیے اس سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا، دھماکے کی شدت سے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ذہن پر تاریکی چھا رہی تھی، اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے جو آخری منظر دیکھا، وہ صائم خان کا خون میں لت پت جسم تھا جو اس سے چند میٹر کی دوری پر پڑا ہوا تھا۔ صائم خان نے جاتے جاتے بھی اپنے نشانے کی لاج رکھی تھی۔ موجو کے سر سے مغز بہہ کر فرش کو آلودہ کر رہا تھا جبکہ بلال موجو کے ہاتھ سے چابی لے کر جیپ کا دراوزہ کھولنے میں مصروف تھا۔ اس دوران زبیر احمد مسلسل گن پکڑے ہوئے چاروں طرف محتاط نظروں سے کسی ممکنہ حملہ آور سے نمٹنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور جیپ کا دروازہ کھل گیا۔ اس آواز نے اسے جہاں جیپ کی طرف متوجہ کیا، وہیں اس کی خوشی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ اب یہاں سے نکلنے کے آثار بہت روشن نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

صہیب نے نعمان سمیت حیدر اور زین کو ساتھ لیا، جبکہ باقی سب کو پیچھے آنے کا کہا۔ ملک ارسلان اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے خاور کا سہارا لے کر چل رہا تھا۔ صہیب نے حیدر کو ایک نائن ایم ایم پستول تھما دیا تھا، یہ غالباً موجو والا پستول ہی تھا۔ اس کے پاس اور بھی اسلحہ تھا جو کسی اور کو دیا جا سکتا تھا۔ مگر وہ صرف ایک سرکاری، ملٹری ٹرینڈ بندے اور اس کی پروفیشنل تربیت پر بھروسا کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اسلحے کے معاملے میں۔

”آپ لوگ تب تک آگے نہیں آئیں گے جب تک ہم سب ایریا کلیئر نہ کر لیں۔“ صہیب نے حیدر اور زین کو چھوڑ کر باقی سب کو مخاطب ہو کر کہا۔ زین کو اس لیے شامل رکھا تھا کیونکہ پرائم ٹارگٹ وہی تھا۔ وہ ابھی لاؤنج کی طرف محتاط انداز میں بڑھ ہی رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے محتاط انداز میں پوزیشن لی تھی کہ دھماکے کی آواز سنائی دی۔ صہیب کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ایک دستی بم کا دھماکا تھا۔ اس نے تازہ ترین صورتِ حال کے لیے سیف کے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کیا۔ مگر سیف کی طرف سے کوئی سگنل موصول نہیں ہوا۔ پھر اس نے صائم خان سے بھی رابطے کی کوشش کی مگر وہاں سے جواب نہ ملا۔ یہ صورتِ حال کافی تشویش ناک تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور

حیدر کو کور دینے کے لیے کہا۔ جبکہ نعمان کو لے کر وہ اسالٹ پوزیشن میں لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ لاؤنج میں نیم تاریکی تھی۔ لیکن وہاں کی خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ لاؤنج میں فی الوقت کوئی نہیں۔ صہیب اور نعمان دونوں نے فوراً گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کی طرف پیش قدمی کی۔ زین اور حیدر دونوں خاموشی سے ان کے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے چاق و چوبند تھے لیکن اب اس بات کا کوئی احتمال نہیں رہا تھا۔ صہیب نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ نصف سے زیادہ کھل گیا اور اس کے بالکل سامنے صہیب کو جیپ کھڑی نظر آئی۔ جس کے سامنے دو آدمی تھے ایک کے ہاتھ میں گن جبکہ دوسرا اس کے دروازے میں چابی لگا کر دروازہ کھول چکا تھا۔ اب وہ دونوں اس میں سوار ہونے والے تھے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو پھر عین ممکن تھا وہ دونوں یہاں سے فرار ہو جاتے۔ صہیب نے تمام خدشات و خیالات کو بالائے طاق رکھا اور اپنی گن سیدھی کی اور جیپ میں سوار ہونے والے پہلے شخص یعنی بلال پر فائر کر دیا۔ عین اسی لمحے زبیر احمد نے خود کو بلال کی ڈھال بنا لیا۔ گولیوں کا رخ نچلے دھڑ کی جانب تھا اس لیے گولیاں لگتے ہی زبیر احمد دہرا ہو کر نیچے گر گیا۔ بلال اپنی یقینی ہار دیکھ کر بے دم ہو کر سیٹ پر جا گرا۔ اس کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا۔ صہیب بجلی کی رفتار سے آگے آیا جبکہ نعمان اسے مسلسل کور دیتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا۔

"تم جا کر سیف اور صائم کو دیکھو۔" صہیب نے بلال کو کار سے گھسیٹ کر باہر نکالتے ہوئے نعمان سے کہا۔

"یس سر۔" نعمان نے فوراً جواب دے کر لان کی دوسری سائیڈ کا رخ کیا۔ جہاں سیف اور صائم دونوں مورچا بنا کر بیٹھے تھے۔

زین نے حیدر کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ کیونکہ باہر صہیب کی کارروائی ان کی آنکھوں کے سامنے ہی انجام پائی تھی۔ صہیب، بلال کو جیپ سے باہر نکال چکا تھا اور اس کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔ جبکہ بلال کے چہرے پر اذیت اور شکستگی کے تاثرات نمایاں تھے۔ زبیر احمد کو کئی گولیاں لگی تھیں۔ لیکن وہ اس کے نیچے والے دھڑ میں لگی تھیں۔ اس لیے اس میں فی الحال جان باقی تھی۔ حیدر کو اس کا گن والا ہاتھ سیدھا ہوتا دکھائی دیا۔ اس کا نشانہ صہیب کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ حیدر جو کہ اب کافی ریلیکس ہو گیا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو صہیب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس کے نائن ایم ایم سے نکلی ہوئی دونوں گولیوں نے زبیر احمد کے چہرے میں روشن دان بنا دیا۔ صہیب نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو زبیر احمد کے ہاتھ میں گن اور حیدر کے نائن ایم ایم سے نکلتا ہوا دھواں اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔ اس نے سراہنے والے انداز میں حیدر کو دیکھ کر سر ہلایا۔

"سب کو باہر لے آؤ۔" صہیب نے زین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یعنی وہ حیدر کی یہاں موجودگی چاہتا تھا۔ اسی دوران صہیب کی آہنی گرفت میں موجود بلال نے اپنا تعارف کروانے کی کوشش کی۔ "تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں، میں ایک معزز سیاستدان ہوں، مجھے کچھ غنڈے پکڑ کر یہاں لے آئے تھے۔ میری کسی سے بات کرواؤ، ورنہ تم بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے"۔ وہ تکلیف کے عالم میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ صہیب کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ وہ اسے بلال غوری کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔ لیکن اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

"سر...... اِدھر آئیں۔" لان کی دوسری طرف سے نعمان کی تاسف بھری آواز سنائی دی۔ صہیب نے بلال غوری کو حیدر کے سپرد کیا اور خود نعمان کی طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ وہ ایک سپاہی تھا اور اس کی یہ ٹیم ایک بہترین ٹیم تھی جس میں وہ سب کو دوستوں نہیں بلکہ بھائیوں کی طرح محسوس کرتا تھا۔ نعمان کے لہجے سے اسے یقین تھا اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں۔ وہ ابھی تک فضا میں موجود دستی بم کے بارود کی مہک محسوس کر رہا تھا۔ لان کا دوسرا حصہ سامنے آتے ہی جیسے کوئی تاریک چادر اس کی آنکھوں کے آگے آ گئی تھی۔ صائم خان کا خون میں لت پت جسم اس کے سامنے تھا جس کے قریب نعمان کھڑا تھا۔ شدتِ غم اور غصے سے اس کی آنکھیں سرخ انگارا لگ رہی تھیں۔ اپنے ساتھی کی موت نے سب کو غمگین کر دیا تھا۔ اس کے بعد تمام کارروائی نہایت تیزی سے ہوئی۔ صہیب نے حیدر سے کہا۔

"حیدر، تم سب لوگوں کے گھر کا پتا اور ان کے سرپرستوں کے فون نمبرز لے لو تا کہ ان سے رابطہ کیا جا سکے۔" صہیب نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بات ختم کرتے ہی اسے فائر کی آواز سنائی دی۔ اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد سیف اُس کے سامنے تھا۔ "سر اس نے میری گن چھین کر بھاگنے کی کوشش کی اس لیے مجھے اسے ہٹ کرنا پڑا۔" سیف نے اپنی صفائی دیتے ہوئے کہا۔ اس کی

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
نمرہ احمد
فرحت اشتیاق
قُدسیہ بانو
نگہت سیما
نگہت عبدُاللہ
رضیہ بٹ
رفعت سراج

صائمہ اکرام
سعدیہ عابد
عفت سحر طاہر
تنزیلہ ریاض
فائزہ افتخار
سباس گُل
رُخسانہ نگار عدنان
اُمِ مریم

عُشنا کوثر سردار
نبیلہ عزیز
فائزہ افتخار
نبیلہ ابر راجہ
آمنہ ریاض
عنیزہ سید
اقراء صغیر احمد
نایاب جیلانی

اشفاق احمد
نسیم حجازی
عنایتُ اللّٰہ التمش
ہاشم ندیم
مُمتاز مُفتی
مُستنصر حُسین
علیمُ الحق
ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگزِشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آنکھوں میں کرب کے سائے کچھ مدھم ہو گئے تھے۔ صہیب کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے منہ سے صرف یہی نکل سکا ”ٹھیک ہے، فائنل رپورٹ میں یہ شامل کر دینا۔“ وہ جانتا تھا کہ سیف نے اسے کیوں مارا۔ کیونکہ شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا۔

☆☆☆

دولھے کا لباس اس کے جسم پر خوب بچ رہا تھا۔ وہ واقعی آزاد کشمیر کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ اس کی خوشی اس لحاظ سے بھی دوبالا تھی کہ اس کے تمام دوست اس کی شادی میں شریک تھے۔ بس اسے ذرا چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی کیونکہ اس کی ٹانگ کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔ ملک ارسلان پھر بھی خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کر رہا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ اس کی مہندی والے دن ہی ان سب کو پاک فوج کے اسپیشل یونٹ کے چار کمانڈوز نے ریسکیو کر لیا تھا۔ اور وہ شام تک ان سب کو ملک ارسلان کے گھر چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ باقی ساری ضروری کارروائی وغیرہ انہوں نے اُدھر ہی نمٹادی تھی۔ سب کے بچ جانے کی خوشی اپنی جگہ تھی لیکن وہ بھی صائم خان کی شہادت کا غم دل سے نہیں نکال پائے تھے۔ حالانکہ انہوں نے اسے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا نہ اس سے بات ہوئی تھی مگر وہ صرف ان لوگوں کی رہائی کے لیے ان درندہ صفت اور مفاد پرست لوگوں کی سفا کی کا نشانہ بن گیا تھا۔

بلال کے سیل فون سے اہم معلومات ملی تھیں اور اس واقعے میں ملوث باقی لوگوں یعنی ضمیر اور ریاض کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ داور بھی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ جبکہ زین کی دی ہوئی وڈیو سے نادیہ کے قتل کا معاملہ بھی سامنے آ گیا اور اس کے فلیٹ کی آتشزدگی کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ یوں جو سیاسی پارٹی بلال غوری کی موت پر واویلا کر رہی تھی اس کو بریک لگ گئے تھے۔ تمام دوست اب ملک ارسلان کو چھیڑ رہے تھے جو دُولہا بن کر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر افق کی سرخی نمودار ہوتی نظر آتی تھی۔ دونوں لڑکیاں یعنی سوہا اور عائشہ لڑکی کی طرف سے شریک ہوئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملک ارسلان کا سسرال چند گھر ہی دور تھا۔ لڑکیوں سمیت تمام لوگوں کے گھر والوں کے اطلاع دے دی گئی تھی اور سب کی اپنے گھر والوں سے بات بھی ہو گئی تھی۔ نکاح کی رسم سادگی سے ادا کی گئی اور پھر ایک پُرتکلف کھانے کا دور چلا۔ تمام تقاریب جب احسن طریقے سے انجام پا گئیں تو تمام لوگ زین کو لے کر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ ملک ارسلان بھی اپنی نئی نویلی دلہن کو کچھ دیر انتظار کا کہہ کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ زین کو لگتا تھا وہ شاید شادی کے ہنگامے میں بھول جائیں گے لیکن وہ بالکل نہیں بھولے تھے اور زین سے اصل کہانی سننا چاہ رہے تھے۔ زین نے حالات دیکھے تو اسے لگا یہی بہتر ہوگا کہ سب کچھ بتا دیا جائے تا کہ کوئی اور کبھی کسی وجہ سے سماجی رابطوں کے اَن دیکھے جال میں قید ہو کر ایسی صورتِ حال سے دوچار نہ ہو۔

زین نے شروع سے لے کر اب تک کی تمام باتیں تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کو بتا دیں۔ سب کے منہ مارے حیرت کے کھلے رہ گئے تھے۔ خاص طور پر سوہا اور عائشہ کی حالت دیدنی تھی کہ وہ کس قدر خطرناک لوگوں کے چنگل سے بچ نکلی ہیں۔ اور وہ خود کو جتنا محفوظ تصور کرتی تھیں یہ بالکل اس کے برعکس نکلا اور وہ چند ہی گھنٹوں میں ٹریس ہو گئیں۔ حیدر نے بھی اصل معاملے کی نزاکت کو دیکھا تو زین سے شکوہ کیا۔ ”بھائی آپ نے مجھے کیوں لاعلم رکھا۔“ اسی طرح جمیل اور اظہر بھی زین سے نالاں نظر آئے۔ جبکہ خاور اور ملک ارسلان، زین کی حمایت میں تھے‘ ماحول پھر سے خوشگوار ہو گیا تھا، اسی دوران حیدر کا سیل فون گنگنایا۔ وہ موبائل لے کر ذرا فاصلے پر چلا گیا تا کہ شور کی وجہ سے آواز میں مسئلہ نہ ہو۔ ”السلام علیکم، کیا آپ آذان حیدر بول رہے ہیں؟“ فون میں سے ایک مانوس آواز آئی۔

”وعلیکم السلام، جی میں آذان حیدر ہی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟“ حیدر نے ذرا محتاط انداز میں کہا۔

”میری ٹیم میں ایک آدمی کی جگہ ہے۔ کیا آپ جوائن کرنا چاہو گے؟ میں صہیب بات کر رہا ہوں۔“

حیدر نے فرطِ جذبات سے موبائل فون کو زور سے جکڑ لیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا جہاں سب دوست آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ اس کی نظر زین پر پڑی جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک زین کی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے حیدر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ یہ اثبات کی دلیل تھی اور زندگی کے ایک اہم فیصلے کی گھڑی۔ زین کا سر ہلا جو اس بات کی دلیل تھی وہ اس کال کرنے والے کے مقصد کو جانتا تھا اور یہ بھی کہ حیدر کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔ زین کیسے جانتا تھا حیدر نے یہ نہیں سوچا۔

”سر میں کب سے جوائن کر سکتا ہوں؟“ حیدر کے لہجے میں چٹانوں کی سختی عود آئی تھی۔ یہ اس کے آہنی عزم کی ایک نئی داستان کا آغاز تھا۔